ہندوستان کا صنعتی ارتقا

(1860 — 1939)

ہندوستان کا صنعتی ارتقا

(1860—1939)

مصنف

ڈاکٹر ڈی۔ آر۔ گیڈگل

مترجم

پروفیسر ام۔ صدیقی

ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی

بہ اشتراک

انڈین کونسل آف ہسٹاریکل ریسرچ، نئی دہلی

پہلا اُردو ایڈیشن ـــــ 1000 ـــــ 1978ء ـــــ 1899 (شک)

THE INDUSTRIAL EVOLUTION OF
'INDIA IN RECENT TIMES 1860-1939

قیمت 13/00

اس کتاب کا اردو ترجمہ انڈین کونسل آف ہسٹاریکل ریسرچ سے حاصل ہوا۔

پرنسپل پبلی کیشن آفیسر، بیورو فار پروموشن آف اردو، ویسٹ بلاک نمبر 8 آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی 110022
نے رائیش پریس 7 - A نرائنہ نئی دہلی سے چھپوا کر ترقی اردو بورڈ کے لئے شائع کیا۔

پیش لفظ

کسی بھی زبان کی ترقی کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس میں مختلف سائنسی، علمی اور ادبی کتابیں لکھی جائیں اور دوسری زبانوں کی اہم کتابوں کے ترجمے شائع کیے جائیں۔ یہ نہ صرف زبان کی ترقی کے لیے بلکہ قوموں کی معاشی اور سماجی ترقی کے لیے بھی ضروری ہے۔ اُردو میں اسکولوں اور کالجوں کی نصابی کتابوں، بچّوں کے ادب، لغات اور سائنسی کتابوں کی ہمیشہ کمی محسوس کی جاتی رہی ہے۔ حکومتِ ہند نے کتابوں کی اس کمی کو دور کرنے اور اردو کو فروغ دینے کے لیے ترقیِ اردو بورڈ قائم کر کے اعلا پیمانے پر معیاری کتابوں کی اشاعت کا ایک جامع پروگرام مرتب کیا ہے، جس کے تحت مختلف سائنسی و سماجی علوم کی کتابوں کے ترجمے اور اشاعت کے ساتھ لغات، انسائکلوپیڈیا، اصطلاحات سازی اور بنیادی متن کی تحقیق و تیاری کا کام ہو رہا ہے۔

ترقی اردو بورڈ اب تک بچّوں کے ادب کے علاوہ بہت سی نصابی، علمی، ادبی اور سائنسی کتابیں شائع کر چکا ہے جنھیں اردو دنیا میں بے حد مقبولیت حاصل ہوئی ہے، یہاں تک کہ بعض کتابوں کے دوسرے اور تیسرے ایڈیشن بھی شائع ہو رہے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب بھی اسی اشاعتی پروگرام کا ایک حصّہ ہے۔ مجھے امید ہے کہ اسے بھی علمی اور ادبی حلقوں میں پسند کیا جائے گا۔

(ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ عباس شارب)
پرنسپل پبلی کیشن آفیسر، بیورو فار پروموشن آف اردو،
وزارتِ تعلیم اور سماجی بہبود، حکومت ہند

فہرست

پیش لفظ

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن جو ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا تھا اس میں گذشتہ صدی کی پانچویں دہائی سے آغاز جنگ یعنی ۱۹۱۴ء تک کے ہندوستان کی اقتصادی تاریخ کا جائزہ پیش کیا گیا تھا۔ یہ تحقیقی مقالہ پہلے کیمبرج یونیورسٹی کے ماسٹر آف لیٹرس کی ڈگری کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ چند لفظی تبدیلیوں کے سوا یہ تقریباً اسی شکل میں طبع ہوا جس شکل میں یہ مرتب ہوا تھا۔ کتاب کے اس حصہ میں کوئی ترمیم بعد میں بھی نہیں ہوئی اور اس کی وہی صورت قائم ہے اور چودھویں باب پر ختم ہوتی ہے یعنی "جنگ سے ماقبل کا دور۔ ماحصل" ۱۹۲۹ء میں جب اس کا دوسرا ایڈیشن نکلنے لگا تو اصل کتاب میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا گیا جو ۱۹۱۴ء کے مابعد دور کی اقتصادی تاریخ کے تمام پہلوؤں پر حاوی تھا۔ ۱۹۳۳ء میں جب تیسرا ایڈیشن شائع ہونے لگا تو زمانہ کا لحاظ رکھتے ہوئے اس باب پر نظر ثانی کی گئی۔ ۱۹۴۲ء میں جب چوتھا ایڈیشن چھپنے لگا تو ۱۹۱۴ء کے مابعد دور سے متعلق باب میں کوئی ترمیم و اضافہ نہیں کیا گیا لیکن میں نے ایک طویل پیش لفظ شامل کر دیا جس میں تیسری دہائی کی مدت میں پیدا ہونے والی صورت حال کی اہم خصوصیات پیش کی گئیں تھیں۔

کچھ سال پہلے جب پبلشرز نے ایک نئے ایڈیشن کے لیے مزید نظر ثانی کا سوال اٹھایا تو میں کئی مسئلوں سے دوچار ہوا ان میں فرصت کی کمی کا مسئلہ بھی تھا۔ دو اہم فیصلے کرنے پڑے پہلا یہ کہ کس دور کا احاطہ کیا جائے اور دوسرا یہ کہ سابق مواد کو کس طرح پیش کیا جائے۔ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کا دور منطقی اعتبار سے مناسب دور ہے جسے مربوط طریقہ سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ غیر منقسم ہندوستان انگریزی سلطنت کے براہ راست انتظام کے تحت تھا اور ۱۹۳۷ء تک برما بھی اس سے ملحق تھا۔ اس لیے میرا پہلا ارادہ تو یہ تھا کہ اقتصادی تاریخ کے اس مطالعہ کو ۱۹۴۷ء تک سمیٹ لوں لیکن میرے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ اس پورے دور کا تشفی بخش طور پر

احاطہ کر سکتا اس لیے اس ایڈیشن کو دوسری جنگ عظیم کے آغاز یعنی ۱۹۳۹ء تک لے آنے ہی پر اکتفا کرنا پڑا۔

۱۹۱۴ء کے بعد کے پورے دور کا حال نظر ثانی کرتے وقت گویا از سر نو لکھا گیا ہے۔ اس لیے اس ایڈیشن میں تحریر کے دو مختلف حصے لازمی طور پر ایک ساتھ مل گئے ہیں۔ پہلا کیمبرج کا وہ اصل مقالہ ہے جو ۱۹۱۴ء تک کے دور سے تعلق رکھتا ہے اسے جان بوجھ کر اصل شکل میں قائم رکھا گیا ہے۔ اس کے اندر اس تالیف کے زمانہ کے بہت سے نشانات واضح طور پر ملیں گے۔ ایسا طریق اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ طلبہ نے اس جائزہ کو یقینی مفید سمجھا ہے اور اتنے برسوں کے بعد کسی نظر ثانی کے معنی یہ ہوتے کہ از سر نو ایک نئی کتاب لکھی جائے۔ دوسرا ۱۹۱۴ء سے ۱۹۳۹ء تک کی اقتصادی تاریخ کا ایک جائزہ ہے۔ یہ گویا دوبارہ لکھا گیا ہے۔

پہلا باب

تمہید

انیسویں صدی میں آمد و رفت کے طریقوں میں عظیم الشان انقلاب ہوا اس نے ساری دنیا کو ایک بڑی منڈی میں تبدیل کر دیا اور ایسی صورتیں پیدا کر دیں کہ قدیم اقتصادی اکائیاں ٹوٹ کر رہ گئیں۔ اقتصادی حالات میں انقلاب لانے والی قوتیں اب تمام بر اعظموں میں کار فرما ہیں۔ دنیا کی تاریخ میں اقتصادی تغیر کا تازہ ترین دور ایک قابل لحاظ حقیقت سے روشن ہے کہ انقلاب جو پہلے دنیا کے ایک خطہ میں لایا گیا وہ تقریباً دوسرے تمام خطوں کے اقتصادی ڈھانچے پر اثر انداز ہوا۔ ہندوستان اس احوال سے مستثنیٰ نہ رہا۔ ان قوتوں کا اثر اس نے بہت پہلے ہی محسوس کیا اور گذشتہ صدی ہی اس کے اقتصادی ڈھانچہ میں تبدیلی آ رہی تھی لیکن اس خاص وقت کا تعین کرنا مشکل ہے کہ تغیر پیدا کرنے والی قوتیں کب سرگرم عمل ہوئیں۔ کسی ملک کی تاریخ میں ایسے دو ادوار کے درمیان خطِ فاصل کھینچنا آسان نہیں، کسی دوسرے ملک کی نسبت یہ بات شاید ہندوستان کے لیے زیادہ صحیح ہے۔

ہندوستان میں انگریزی سلطنت کا قیام شاید اقتصادی تغیر کا سب سے پہلا سبب بنا اور ٹھیک اسی زمانہ میں ہندوستانی صنعت کا مقابلہ برطانوی صنعت کاروں سے شروع ہوا لیکن انگریزی سلطنت کا قیام خود سُست اور طویل العمل تھا کیوں کہ بنگال پر اگرچہ کلایو کے زمانہ میں قبضہ ہو گیا تھا پھر بھی تقریباً ایک سو سال کے بعد وائسرائے لارڈ ڈیفرین کے زمانہ میں اپر برما سلطنت میں شامل کیا گیا۔ ایک دوسرا اہم پہلو انگریزوں کے ذریعہ جاری کردہ لگان کا نیا طریقہ تھا یا اس کے گوناگوں نئے طریقے تھے جو مختلف صوبوں میں مختلف طور پر رائج تھے۔ اس کے علاوہ عدالتی انتظام کا نیا سسٹم بھی تھا۔ انتظام سلطنت میں یہ تمام تبدیلیاں انیسویں صدی کے شروع میں عمل میں آئیں لیکن ان کا پورا اثر ۱۸۵۰ء تک بھی نہ ہوا۔ یہ تمام تبدیلیاں آہستہ آہستہ ہندوستان کے قدیم اقتصادی ڈھانچے پر اثر انداز ہو رہی تھیں لیکن ان کا مجموعی اثر کسی اعتبار سے زیادہ نہ تھا۔ اس اقتصادی تغیر کا خاص اور

اہم سبب یہ تھا کہ ہندوستان سڑکوں، ریلوے اور نئے دخانی جہازوں کے راستوں سے کھل گیا تھا۔ اسی لیے ہندوستان کے مارکیٹ اور اس کی خام اشیاء کی سپلائی مغرب سے قریب ہوگئی، اس وجہ سے ہندوستانی تجارت وصنعت پر پیداوار اور مبادلہ (Exchange) کے مغربی طریقوں کا براہِ راست اثر پڑا اور اس نے ہندوستان کے صنعتی معاشرے کی تنظیم کو شدید طور پر متاثر کیا۔

اس ربط وضبط کے اثرات کا تشفی بخش علم حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ہندوستان کے قدیم ڈھانچہ کی ساخت کا جائزہ لیں۔ ہندوستان بنیادی طور پر ایک زراعتی ملک رہا ہے اور اب بھی ہے۔ ۱۸۷۲ء میں سارے ہندوستان میں صحیح معنوں میں پہلی مردم شماری ہوئی جس پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔ اس کے مطابق بالغ مرد کی آبادی کے تحت ۵۶٫۲ فی صد لوگ زراعت کے کاموں میں لگے تھے جس میں مزید ۱۲٫۳ فیصد مزدور کے طبقہ کو بھی شامل کرلینا چاہیئے۔ اس طرح بالغ مرد کی آبادی کے ۶۸٫۵ فیصد لوگ زمین سے روزی حاصل کرتے تھے![1] ہمارے پاس یقین کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں کہ پہلے بھی کبھی اس سے کم لوگ زراعتی کاموں میں مشغول رہے تھے لیکن ان اعداد وشمار سے بھی ہندوستان میں زراعت کی اصلی اہمیت کا پتہ نہیں چلتا کیوں کہ دیہات کی آبادی کے بہت سے لوگ جو کہ صنعتی کاموں میں لگے ہوئے تھے لیکن زراعت ان کا بھی معاون پیشہ تھی۔ اس زمانہ میں گاؤں ہندوستان میں ایک اہم اکائی کی حیثیت رکھتا تھا۔ ہندوستان کے مختلف حصّوں میں یہ اکائی سائز کے اعتبار سے مختلف تھی۔ میدانی علاقوں میں اوسط گاؤں بڑے ہوتے تھے جو انگلستان کے قصبات کے مشابہ تھے لیکن پہاڑی اور بنجر علاقوں میں یہ بہت چھوٹے ہوتے تھے۔ انہیں ہم مناسب طور پر ٹولہ یا بکھرے گھر بھی کہہ سکتے ہیں۔ ہندوستان کی مجموعی آبادی کی اکثریت کسان طبقہ پر مشتمل تھی انیسویں صدی کے شروع میں مختلف سیاسی حالات کی وجہ سے کسانوں کی اقتصادی حالت ہندوستان کے تمام خطوں میں ایک سی نہ تھی۔ بمبئی کے دکن علاقہ میں عام کسان تقریباً اتنے ہی خوشحال تھے جتنے ان کے ہمعصر انگلستان کے کسان جبکہ[2] ہندوستان کے دوسرے بہت سے خطوں میں ڈاکوؤں کی تباہیوں اور ملک کے عام غیر مستقل حالات کے باعث ان کی حالت بہت ہی خراب تھی۔ لیکن اس زمانہ میں کسانوں کی حالت عموماً پست قرار دی جاسکتی ہے۔

۱۔ یہ اعداد بھی بہت کم ہیں جیسا کہ بعد کی مردم شماریوں سے ثابت ہوتا ہے۔

۲۔ جی۔ کیٹنگ: رورل اکانومی اِن دی بمبئی ڈیکان، باب اوّل (۱۹۱۲)۔ ۱۸۰۲ء میں ہولکر کی پیش قدمی اور اوراس کے مابعد ہونے والے قحط کے پہلے تک یہ تبصرے خصوصاً دکن کے لیے صحیح ہیں۔

بنگال کا استمراری بندوبست چھوٹے چھوٹے کسانوں کو زمینداروں کے ظلم وستم سے محفوظ رکھنے میں ناکام رہا تھا اور دوسرے اکثر خطوں میں انگریزوں کے ذریعہ متعین زمینی لگان کی ابتدائی رقم (Assessment) بہت زیادہ تھی[۱] ۱۸۱۸ء میں جب انگریزوں کا قبضہ بمبئی کے دکن علاقہ پر ہوگیا تو اس علاقہ کے لیے یہ رقم بہت گراں ثابت ہوئی حالاں کہ یہ علاقہ کبھی بہت خوشحال علاقہ تھا[۲] ۱۹۳۶ء میں اس علاقہ کے لئے یہ محصولات بڑی حد تک کم کر دیے گئے لیکن ابتدائی مالگذاریوں کے مہلک اثرات سے نپٹنے میں کسانوں کو تقریباً ۲۵ سال لگ گئے۔ مدراس پریسیڈنسی میں بھی مالگذاری کا بڑی سختی سے مطالبہ ہوتا تھا، اس کی وجہ سے کسانوں کے خوشحال ہونے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا[۳] کاشتکاروں کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر بعد میں گورنمنٹ لگان میں کٹوتی کرنے پر مجبور ہوگئی۔ اس تخفیف اور دوسرے اسباب کی بدولت لوگوں کی حالت سنبھلنے لگی[۴]

انیسویں صدی کے نصف اول میں ہندوستان میں داخلی مواصلات کا حال بڑا ہی ناقص تھا۔ ملک کے زیادہ تر حصوں میں سڑکوں کا نام ونشان بھی نہ تھا اور اگر کوئی سڑک تھی بھی تو اس کی حالت بہت ہی غیر تشفی بخش تھی۔ سندھ، گنگا اور ان کی معاون ندیاں ہی واحد آبی راستہ تھیں جو کشتی رانی کے لیے بڑی حد تک کارآمد تھا۔ ان کشتی راں ندیوں اور چند عارضی سڑکوں کی وجہ سے شمالی ہندوستان میں رسل ورسائل کا حال اتنا زیادہ خراب نہ تھا جتنا کہ جنوبی ہندوستان میں۔ جنوبی ہندوستان کے حالات کا کچھ اندازہ تعمیرات عامہ کے ان کمشنروں کی رپورٹ سے لگایا جاسکتا ہے جنھیں مدراس کی گورنمنٹ نے مقرر کیا تھا۔ ان کا بیان یہ ہے کہ اس پریسیڈنسی میں صدی کے شروع میں سڑکوں کا گویا مکمل فقدان تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے صورت حال کو بہتر بنانے کی کوشش کی تھی لیکن اس پریسیڈنسی کے ان کمشنروں

۱۔ آر۔ سی۔ دت: انڈیا ان وکٹورین ایج حصہ اول

۲۔ پونا اور احمد نگر میں ہوئے فسادات سے کمیٹی کی رپورٹ، باب دوم ۱۸۷۵

۳۔ ایس۔ ایس۔ راگھو آینگر، گذشتہ چالیس برسوں میں مدراس پریسیڈنسی کی ترقیوں سے متعلق میمورنڈم حصہ سوم (۱۸۹۳)

۴۔ آر۔ برڈ اسمتھ شمالی جنوبی صوبہ کے کسانوں کی حالت، ۱۸۳۰میں کیا تھی اس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ان کی حالت مالیاتی سسٹم سے خراب ہے کیونکہ یہ سسٹم بڑا ہی سفاک اور تباہ کن ہے۔ کاشتکاروں کی آبادی غیر مطمئن ہے اور مالگذاری وعدالتی نظام کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے انتشار سے ان کے بیش قیمت حقوق سلب ہوگئے ہیں۔ (شمالی مغربی صوبہ اور پنجاب میں ۶۱-۱۸۶۰ء کے قحط کی رپورٹ، ص ۲۱)

نے ان میں سے سب سے اچھا سڑکوں کا جو حال لکھا ہے وہ بڑا ہی معنی خیز ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :
"تقریباً تمام سڑکیں (اگر ہم انہیں سڑکیں نام دیں) اسی حد تک بنائی گئی ہیں کہ ان پر صرف بیل گاڑیاں چل سکیں ۔ ان پر ایسی گاڑیاں آسکتی ہیں جن پر بوجھ ہلکا ہو، جن کی رفتار دھیمی ہو اور موسم سوکھا ہوا اور جنہیں تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر جانا ہو لیکن ان سڑکوں کے زیادہ تر حصہ پر پل تک نہیں ہیں۔ اس لیے جہاں تیز بارش میں کوئی نالہ بہہ نکلا تو راستہ کٹ جاتا ۔ بہت سی حالتوں میں یہ سڑکیں پہیوں کو بھی برداشت نہیں کرسکتیں ۔ برسات کے زمانہ میں جب زمین مرطوب ہو جاتی تو مویشیوں اور راہ گیروں کے علاوہ ان سڑکوں سے کوئی کام نہیں لیا جاتا"(۱) اس صورت حال میں یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اناج ڈھونے کا کرایہ بہت زیادہ ہوتا تھا، لہٰذا تجارت برائے نام تھی خراب سڑکوں کی وجہ سے ملک کے بیش تر حصوں میں چلنے والی گاڑیاں بہت ہی پرانے ڈھنگ کی تھیں۔ گاڑیوں کی بناوٹ پر سڑکوں کا کیا اثر پڑا ۔ اس کا عجیب و غریب ثبوت اس امر سے ملتا ہے کہ جیسے ہی صوبہ متوسط میں سڑکیں ۶۵ ـ ۱۸۶۰ء کے دوران بہتر ہوئیں تو اعلیٰ قسم کی گاڑیاں چلنے لگیں ۔(۲) کسی ملک کی برآمدی تجارت کے حجم پر مواصلات کی کمی کا تو اثر ہوتا ہے لیکن اس کی اندرونی تجارت پر اس کا اثر اور زیادہ ہوتا ہے ۔ ان اسباب کے زیر اثر بھاری اور سستے سامان کا نقل و حمل گویا ناممکن ہو گیا ایسے حال میں تجارت عموماً ہلکی اور بیش قیمت مصنوعات تک محدود ہو کر رہ گئی لیکن ان اشیا، کی بھی تجارت کوئی بڑے پیمانہ پر نہ تھی (۳) سنٹرل میوزیم سے متعلق اپنی رپورٹ میں ڈاکٹر برڈ ووڈ ۱۸۶۳ء میں لکھتے ہیں : "آگرہ کی کفت گری اور عمدہ صابن پتھر کے برتنوں کے بارے میں اس وقت تک بمبئی میں کوئی نہ جانتا تھا جب تک کہ پنجاب کے لفٹیننٹ گورنر نے میوزیم میں نہیں بھیجا"(۴)

---

۱ ۔ مدراس کی تعمیرات عامہ کے کمشنروں کی پہلی رپورٹ (۱۸۵۲ء) ـ ۱۸۴۶ء میں ایسی سڑکیں صرف ۱/۲ ـ ۱۱۳ میل تھی۔

۲ ۔ انڈین فیمین کمیشن (۱۸۸۰ء) کے سامنے مسٹر نکولس کی شہادت ، زراعتی ترقی سے متعلق باب ۔

۳ ۔ شمالی ہندوستان میں حالات بہتر تھے ۔ ندیوں کے کنارے

متوسط ہندوستان کے کچھ حصوں میں بھی ایسا حال تھا مثلاً مرزاپور کی ناگپور اور برار کے ساتھ کپاس کی تجارت اچھی ہوتی تھی لیکن یہ زیادہ تر بیلوں کے ذریعہ ہوتی تھی، گاڑیوں سے نہیں ۔ جے ۔ ایف رائل : کلچرل اینڈ کامرس آف کاٹن ان انڈیا ، ص ص ۳ ـ ۸۲ (۱۸۴۰ء)

۴ ۔ جے ۔ ایف ۔ واٹسن : ہندوستان کے صنعتی سروے کا پلان ، ص ۵ ، یادرتی (۱۸۷۲ء) میں اقتباس شدہ ۔

یہ تعجب کی بات ہے کیونکہ مرہٹوں کے دور سلطنت میں دکن اور شمالی ہندوستان کے درمیان تجارت کا بازار گرم تھا لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ شمالی ہندوستان کے بہت سے آرٹ کے نمونوں کے بارے میں ہندوستان میں کوئی بھی نہ جانتا تھا۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ "بہترین اور منفرد مقامی نمونوں کے لیے بھی بازار محدود رہا"۱۔ مختصر یہ کہ انیسویں صدی کے نصف اول میں ہندوستان کی تجارت سامان کی نوعیت اور فاصلہ طے کرنے کے اعتبار سے بہت ہی مختصر اور محدود رہی۔

ملک کی ایسی اندرونی تجارت کے پیش نظر ملک کے ایک حصہ میں جو قیمت ہوتی اس کا دوسرے حصوں کی قیمت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا۔ اس سے یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ تجارت کی اکائی محدود ہو جانے سے بالخصوص غلوں میں قیمتوں کا اُتار چڑھاؤ اچانک اور شدید ہوتا تھا ہندوستان ایسا ملک ہے جہاں اناج کا دام سال کی برسات پر منحصر ہوتا ہے۔ سڑکوں کی تعمیر سے پہلے مقامی فصل خراب ہو جانے پر جب کوئی بڑے اضلاع سپلائی کرنے سے قاصر ہوتے تو قیمتوں میں فرق بہت زیادہ ہوتا تھا۔ مثال کے طور پر: کیرا (گجرات) میں باجرا ۱۸۱۲ء میں ۲۰ سیر فی روپیہ بک رہا تھا جو ۱۸۱۵ء میں گھٹ کر ۱۳ سیر ہو گیا، سلیم (مدراس) میں چاول ۱۸۳۲ء میں ۷۵ سیر فی روپیہ فروخت ہو رہا تھا لیکن ۱۸۳۳ء میں یہ بڑھ کر ۲۳ سیر ہو گیا۔ دھولیا خاندیش میں جوار کی قیمت ۱۸۴۶ء میں ۱۹ سیر سے گر کر ۸۵ سیر تک پہنچ گئی تھی ۲۔ اتار چڑھاؤ کی ان صورتوں کا ملک کے مختلف حصوں میں ایک دوسرے سے واقعی کوئی ربط نہ تھا۔ دکن اور راجپوتانہ میں بھی ۱۸۰۳-۱۸۰۲ء میں ایک خوفناک قحط پڑا لیکن گجرات میں باجرا کی قیمت ۲۷ سیر فی روپیہ سے آگے نہ بڑھی۔ اس سے بہتر مثال یہ ہے کہ شمالی مغربی صوبہ میں ۱۸۳۳ء والے خوفناک قحط کے دوران آگرہ میں گیہوں کی قیمت ۱۳ سیر فی روپیہ قائم رہی لیکن خاندیش کی قیمتوں پر اس کا کوئی اثر نہ پڑا وہاں اس سال خوب پیداوار ہوئی تھی اور گیہوں ۱۶ سیر فی روپیہ کے حساب سے بک رہا تھا۔ ان حالات میں مقامی طور پر قلت اشیاء قحط کی صورت اختیار کر لیتی اور ایسے قحط کے نتیجہ میں اموات کبھی کبھی خوفناک حد تک پہنچ جاتی تھیں ۳۔

۱۔ جے۔ ایف۔ واٹسن: ہندوستان کے صنعتی سروے کا پلان، ص ۵، پاورقی (۱۸۷۲) میں اقتباس شدہ

۲۔ ۸۳-۱۸۸۲ء سال کے لئے مٹر پارلی رپورٹ (Moral and Material Progress Report) کے پرائس میمورنڈم سے لیا گیا ہے۔

۳۔ میجر جنرل برگس نے اپنی شہادت میں پارلیمانی منتخب کمیٹی کے سامنے کہا تھا "خاندیش میں ۱۸۲۳ء کے دوران غلہ ۶ شلنگ سے گھٹ کر ۸ شلنگ فی کواٹر ہو گیا۔ اورنگ آباد میں فی کواٹر ۴۳ شلنگ تھا بلکہ پونا میں فی کواٹر ۶۴ سے ۷۰ شلنگ تک بڑھ گیا لیکن برسات اور سڑکوں کی کمی کے باعث غلہ خاندیش سے پونا نہیں پہنچ سکا۔ ڈبلو۔ آر کیسل کا حوالہ "کاٹن ان دی بمبئی پریسیڈنسی، ص ۲۹۷ (۱۸۶۱ء)

ہندوستان کی زراعتی آبادی سب سے اہم تھی لیکن گاؤں میں صنعتی آبادی بڑی حد تک پھیلی ہوئی تھی۔ زراعتی معیشت کی برتری کے معنی یہ تھے کہ ہندوستان میں شہری آبادی اس وقت کم تھی شہری آبادی کل آبادی کی ۱۰ فیصد سے زیادہ نہیں ہوسکتی تھی۔ بہتیرے قصبے تو بڑے گاؤں جیسے تھے[1] ہندوستان کے زیادہ تر قصبے ان تین اسباب میں سے کسی ایک کی بنا پر آباد تھے: (۱) وہ زیارت گاہ تھے یا متبرک مقام۔ (۲) وہ دربار کے مراکز تھے یعنی کسی صوبہ کا دارالسلطنت (۳) تجارتی جگہ تھی جس کی خاص اہمیت تجارتی راستوں پر واقع ہونے سے تھی۔ ان اسباب میں پہلے دو بڑی اہمیت رکھتے تھے۔ اوّل درجہ کے خاص شہروں میں بنارس، الہ آباد، پوری، گیا وغیرہ آتے تھے۔ یہ تمام شہر اس وقت تک خوشحال رہے جب تک کہ مذہب کا رواج زوروں پر تھا کیونکہ ان کی شہرت اس سے وابستہ تھی لیکن جیسے ہی مذہب کا زوال ہوا اس سے متعلق شہر کی اہمیت بھی ختم ہوگئی۔ اس سلسلہ میں بودھ گیا کی مثال دی جاسکتی ہے۔ زیادہ تر زیارت گاہیں ہندوؤں کی تھیں اور ان میں معروف ترین زیارت گاہ نے کئی صدیوں سے انیسویں صدی تک مسلسل خوشحالی کے دن گذارے تھے لیکن ایسے شہر قدرتی طور پر تعداد میں کم تھے اور یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ وہ زیادہ شہروں کے ابھرنے کا موقع نہیں دیتے۔

دربار کے قیام کے ساتھ جو متعدد شہر وجود میں آئے وہ بڑے اہم تھے، یہ شاہی دربار ہو یا کسی چھوٹے صوبہ کے معمولی سردار کی فوجی چھاؤنی، بہر صورت شہروں کی نوعیت یکساں تھی[2] ان تمام شہروں کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ جیسے ہی دربار کی شان ختم ہوجاتی، یہ شہر تیزی سے ویران ہوجاتے۔ یہ نکتہ دکنی خطوں کی مثالوں سے واضح ہوسکتا ہے۔ پرانی راجدھانیاں جیسے پیٹھان اور دیوگیری ہندوؤں کی طاقت ختم ہوتے ہی غیر اہم اور زوال پذیر ہوگئیں اس کے بعد احمد نگر، بیجاپور اور گولکنڈہ کی مسلم سلطنتیں ابھریں، بیجاپور اپنے انتہائی عروج کے زمانہ میں ہندوستان کا عظیم ترین شہر تھا لیکن عادل شاہی خاندان کے زوال کے ساتھ ہی اس کی قدیم شان وشوکت یکایک مٹ گئی لے دے کر چند یادگاریں باقی رہ گئیں۔ ہندوستان میں دراصل شہری زندگی کی تمام خصوصیات درباری اثرات کے اسی پہلو سے

۱۔ اعداد و شمار کی عدم موجودگی میں یہ محض قیاس ہے۔ یہ عدد شمار فرض کرکے دیا گیا ہے کہ یہ تناسب ۱۸۷۲ء کے تناسب سے زیادہ مختلف نہ تھا کیونکہ اس صدی کے آغاز سے گرچہ انحطاط کی نمایاں مثالیں ملتی ہیں مثلاً مرشد آباد پھر بھی اس کے ساتھ ہی ساتھ متوازن ترقی بمبئی، کلکتہ اور کانپور وغیرہ میں ہوئی۔

۲۔ ڈبلو۔ ایچ سلیمن، ریمبلز اینڈ ریکلیکشن، مرتبہ وی۔ اے۔ اسمتھ، باب جلد دوم، باب ہشتم (۱۸۹۳ء)

ہی متعین ہوتی تھیں۔ امرا اور ان کے لواحقین سے ہی شہر آباد رہتا اور اکثر تو وہ صرف نیم مستقل چھاؤنی کی حیثیت رکھتا۔

شہروں کے آخری درجوں میں تجارتی یا بازرگانی شہر آتے۔ یہ شہر تجارتی راستوں پر مخصوص پوزیشن رکھنے کے باعث اہمیت رکھتے تھے۔ ایسے شہروں میں مرزا پور کی زندہ مثال ہے۔ اس کی خوشحالی وسط ہندوستان اور بنگال کے مابین تجارت کی وجہ سے ہی تھی۔ اس تجارتی راستہ پر یہ بڑا اہم مقام تھا کیونکہ دریائے گنگا میں کشتی رانی کا یہ بلند ترین نقطہ تھا اس لیے کہ وسط ہندوستان سے کپاس کی برآمد کا بڑا حصہ اس شہر سے گذرتا تھا۔ اس درجہ کے شہر زیادہ نہ تھے! چونکہ اس زمانہ میں ہندوستان کی اندرونی تجارت بہت زیادہ نہ تھی۔ اس لیے ایسے شہروں کی اہمیت محدود تھی لیکن یہ تجارتی شہر یقیناً ان شہروں سے کچھ زیادہ پائدار رہتے جو درباری مراکز ہونے کی وجہ سے قائم تھے۔

اقتصادی نقطۂ نظر سے ہندوستانی شہروں کی نمایاں خصوصیت ان کا غیر صنعتی کردار تھا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اس زمانہ میں ہندوستان کے شہروں میں صنعتیں نہ تھیں بلکہ یہ کہ ان شہروں کی شہرت صنعتوں کی وجہ سے نہ تھی۔ ہر شہر میں کچھ نہ کچھ صنعت ضرور ہوتی تھی اور یہ شہر کی نوعیت پر منحصر ہوتی تھی۔ بنارس میں تیرتھ استھان ہونے کے باعث پیتل، تانبے اور جرسی دھات (Bell-Metal) کی صنعتیں تھیں۔ سامان جو تیار ہو کر نکلتے وہ زیادہ تر مقدس ظروف (گنگا جل وغیرہ رکھنے کے لیے) اور پوجا میں استعمال ہونے والے سامان ہوتے۔ ان تمام شہروں میں جن کی خوشحالی کا انحصار دربار پر ہوتا، تعیشیاتی صنعتیں زیادہ فروغ پاتی تھیں اور چونکہ شہروں میں اس کا درجہ سب سے بلند ہوتا اس لیے شہری صنعتوں کی نوعیت کا تعین اسی سے ہوتا تھا۔ اس طرح ان شہروں میں تار اور گوٹا کناری (Tisel) کی صنعت، ہر طرح کے عمدہ سوتی کپڑے کی تیاری، نقاشی، سونے چاندی کا عمدہ کام، پتھر، ہاتھی کے دانت اور لکڑیوں پر نقاشی اور دوسری بہت سی خوب صورت دستکاریوں نے شہروں میں انتہائی بلندی حاصل کر لی تھی لیکن عوام کی ضرورت کی تمام مصنوعات گاؤں ہی میں تیار ہوتی تھیں۔ شہروں میں صرف ایک طرح کی صنعت ہوتی تھی یعنی آرٹ اور تعیشاتی صنعت۔ ان شہروں کی خوشحالی کا دارومدار لازمی طور پر امرا اور دربار پر تھا صنعت کے لئے

۱۔ مثلاً شمالی مغربی صوبہ کے ان شہروں میں جہاں کی آبادی ۲۰،۰۰۰ سے زیادہ تھی صرف ایسے چھ شہر تھے جو تجارت کی وجہ سے وجود میں آئے اور ایسے بہت سے شہروں میں کانپور نے حال ہی میں شہرت حاصل کی، دیکھیں شمالی مغربی صوبہ کی مردم شماری کی رپورٹ (۱۸۹۱)

دربار کا ہونا لازمی تھا۔ دربار سے علیحدہ ہوکر شہری صنعت زندہ نہیں رہ سکتی تھی یہی وجہ تھی کہ دربار ختم ہوتے ہی شہری زندگی کا سارا معاشی ڈھانچہ ٹوٹ پھوٹ کر رہ گیا۔ انیسویں صدی کی ایسی شکست وریخت کی دو مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ پہلی مثال لکھنؤ کی ہے جو اودھ کے نوابوں کا دارالسلطنت تھا۔ ۱۸۵۶ء میں اس صوبہ پر قبضہ ہوگیا، اور اس طرح قدرتی طور پر نوابی دربار کا خاتمہ ہوگیا۔ مسٹر ہوے ان تاثرات کا بیان اس طرح کرتے ہیں "یہ یقین کیا جاتا ہے کہ غدر کے چند برسوں کے بعد لکھنؤ کی آبادی اچانک گھٹ گئی۔ ہندوستان اور دوسرے صوبوں سے تعلق رکھنے والے وہ تمام لوگ لکھنؤ چھوڑ کر چلے گئے جو ملازمت کے سبب وہاں جمع ہوگئے تھے۔ آبادی کا وہ حصہ بھی رخصت ہوگیا جو مقامی سلطنت کے تحت خاص تجارتی حالات میں شہر سے وابستہ ہوگیا تھا"(۱) دوسری مثال تنجور کی ہے۔ مندرجۂ ذیل اقتباس ۱۸۹۱ء کے مدراس کی مردم شماری سے لیا گیا ہے: "اس میں کوئی شک نہیں کہ اس (تنجور) کا زوال آخری راجہ کی موت کے وقت سے ہوا ہے۔ جو ۱۸۵۵ء میں واقع ہوئی۔ دربار کا وجود خواہ وہ برائے نام ہی کیوں نہ ہو(۲) اس شہر کی آبادی پر گہرا اثر ڈالتا ہے جہاں یہ دربار ہوتے ہیں کیونکہ یہ سبھی قسم کے پیشہ وروں کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور ہندوستان میں اس سے بھی زیادہ برہمن کھنچ آتے ہیں۔"

انیسویں صدی کے نصف اول میں ہندوستان کے معاشی حالات کی تمام متذکرہ بالا خصوصیات بیشتر ملکوں میں پائی جاتی تھیں جو اسی طرح صنعتی انقلاب کے دور سے گذر رہے تھے لیکن ہندوستان میں گاؤں کی آبادی کی ایک ایسی خصوصیت تھی جس کی مثال کہیں دوسری جگہ نہیں ملتی۔ گاؤں کی آبادی کی تنظیم بلاشبہ ایسی تنظیم ہے جو تقریباً تمام یورپ اور ایشیا میں کبھی مشترک تھی لیکن ہندوستان میں اس نے جو شکل اختیار کی وہ عجیب و غریب تھی۔ بنگال کے مشرقی علاقہ اور آسام کو چھوڑ کر یہ ملک کے دوسرے تمام حصوں میں پائی جاتی تھی چونکہ آبادی کے تقریباً ۹۰ فیصد لوگ گاؤں میں بستے تھے اس لیے ہندوستان کے سماجی ڈھانچہ میں گاؤں کی تنظیم بڑی اہمیت رکھتی تھی۔ گاؤں کی جماعت نے ہندوستان کے ارتقاء پر مختلف طریقوں سے بڑا اثر ڈالا ہے مثلاً یہ گاؤں کی شاید مخصوص خود کفیل تنظیم ہی تھی جس نے ہندوستان کی تہذیب کو متعدد حملوں، حکمرانوں اور حکومت کی اتنی تبدیلیوں کی زد میں بھی محفوظ رکھا(۳) لیکن یہاں پر ہمارا مقصد معاشی ڈھانچہ سے متعلق خاص خاص نکات کو واضح کرنا ہے۔

۱۔ ڈبلیو۔ ہوے: شمالی ہند کی تجارت اور صنعت گروں سے متعلق رسالہ حصہ دوم ص ۲۹ (۱۸۸۰ء)

۲۔ خط کشیدہ الفاظ میرے ہیں۔

۳۔ "یہ جماعتیں آپس میں ریاست کی تمام چیزیں مختصر طور پر رکھتی ہیں اور اگر حکومت ختم ہو جانے تو بھی وہ اپنے افراد کو محفوظ رکھنے کے لئے کافی ہیں" ایلفنسٹن: دکن وغیرہ کے متعلق رپورٹ، آر۔سی۔ دت کے حوالہ سے کتاب مذکور

ہندوستان کا گاؤں باہری دنیا سے ربط پیدا کرنے کی دشواری کے باعث گویا ایک مکمل خودکفیل اکائی کی حیثیت رکھتا تھا۔ گاؤں کی تمام لازمی اشیاء مقامی طور پر ملتی تھیں صرف نمک چینی جیسی چیزوں کے لیے باہر کے مارکٹ کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ اور چھوٹے گاؤں میں تعیشاتی اشیا جیسے زیورات وغیرہ ان گاؤں میں تیار نہیں ہوتی تھیں۔ ایک مخصوص گاؤں کا حال حسب ذیل بیان سے ظاہر ہوگا۔

"گاؤں کی معمولی ضرورتیں پوری کرنے والی صنعتیں گاؤں میں ہی چلائی جاتی ہیں۔ پنجاب کے گاؤں خاص طور پر خودکفیل ہوتے ہیں، وہ غلہ پیدا کرتے ہیں، اپنے اوزار بناتے ہیں، گھریلو برتن تیار کرتے ہیں، گاؤں کے پجاری گاؤں ہی میں رہتے ہیں۔ ڈاکٹر کے بغیر یہ گاؤں اپنا کام چلاتے ہیں۔ نمک، مصالحہ، تیوہاروں میں پہننے کے لیے اچھے کپڑوں اور سکوں کی خاطر باہر کی دنیا کی طرف نظر اٹھاتے ہیں، سکوں کیلیے اس لیے کہ وہ لگان ادا کرے"۔[۱] پنجاب کے گاؤں کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ ہندوستان کے تمام گاؤں پر یکساں طور پر صادق آتا ہے۔ یاد رہے کہ انیسویں صدی کے آغاز میں جب لگان نقد صورت میں ادا نہیں ہوتا تھا تو گاؤں اس صورت سے جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے اور زیادہ الگ تھلگ ہوا کرتا تھا۔

گاؤں کی محض علیحدگی اہم نہیں اور نہ یہ امر کہ تمام کاریگر گاؤں میں لیتے تھے بلکہ ہندوستان کے گاؤں کی آبادی کی عجیب و غریب خصوصیت یہ تھی کہ بیشتر کاریگر گاؤں کے ملازم ہوتے تھے ان کاریگروں کے پاس ان کے اپنے کھیت ہوتے تھے جنھیں وہ مالگذاری کے بغیر یا کم مالگذاری پر مل جایا کرتے تھے اور ان کاریگروں کی آمدنی کے خاص ذریعوں میں سے ایک یہ تھا کہ سال بھر کی پیداوار کا ایک مقررہ حصہ انہیں ہر کاشتکار دیا کرتا تھا اس کے بدلہ وہ کاشتکاروں کے خاص خاص کام کیا کرتے تھے۔[۲] بڑھئی کو کھیتی کے سارے اوزار کی مرمت کرنا پڑتی اور بلا اجرت وہ ہر کاشتکار کے لیے اوزار بناتا۔ صرف ایسی چیزوں کے لیے جیسے گنا پیڑنا یا گاڑی بنانے کی اجرت انہیں الگ سے مل جاتی۔ گاؤں کے اس ملازم طبقہ سے تعلق رکھنے والے کاریگروں کی ذمہ داریاں اور فرائض ملک کے مختلف حصوں میں مختلف تھے۔[۳] لیکن یہ گرچہ

۱۔ ڈی۔ ایبٹسن: پنجاب کی مردم شماری کی رپورٹ ص ۱۸ (۱۸۸۱ء)

۲۔ یہ انتظام وہاں ہوتا تھا جہاں گاؤں آزاد کاشتکاروں کی جماعت پر مشتمل تھا۔ زمینداروں کے گاؤں میں تھوڑا فرق ہوتا تھا جس کا بیان بعد میں آئے گا۔

۳۔ فرائض اور خدمات ہی میں فرق نہ ہوتا تھا بلکہ یہ فرق کاریگروں میں بھی ہوتا تھا جو گاؤں کے ملازم ہوتے تھے کیونکہ جو کاریگر ملک کے ایک حصہ میں گاؤں کا ملازم ہوتا وہ دوسرے حصہ میں ایک آزاد کاریگر ہوتا۔ مختلف

باقی آگے صفحہ پر

مختلف ہوتے تھے تاہم ایک نمایاں خصوصیت ہر جگہ موجود تھی یعنی یہ کہ کاریگر گاؤں کے ملازم ہوتے تھے۔ گاؤں کے سبھی ملازم کاریگر نہ تھے کیونکہ بہت سے علاقوں میں کھیا، پجاری، منیب وغیرہ بھی اس طبقہ میں آتے تھے اور یہ بات بھی نہ تھی کہ ہر کاریگر گاؤں کا ملازم ہوتا تھا جیسے بُنکر کہیں بھی گاؤں کے ملازم کی حیثیت نہیں رکھتا تھا لیکن ایسے کاریگر عموماً گاؤں کے ملازم ہوتے جن کی خدمات گاؤں کی آبادی کے لیے ازبس ضروری تھیں یہ لوگ کاریگر طبقہ میں آتے تھے۔

اس نظام نے ہندوستان کی دیہی آبادی کو ایک مخصوص مستحکم شکل عطا کی اور صرف اس وجہ سے وہ باہری حملہ کی روک تھام کر سکے۔ گاؤں کے کاریگر کا درجہ چونکہ موروثی ہوتا تھا اس لیے اس سسٹم نے گاؤں کی پوری زندگی کو لکیر کا فقیر بنا دیا تھا۔ بلاشبہ یہ ایک بہت اچھا سسٹم تھا جس کے بدولت گاؤں کی ضروری خدمات خصوصاً ہنگامہ خیز دور میں فراہم ہو جاتی تھیں لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ کاریگروں کے طریقہ کار کی ترقی کے لیے روکاوٹ بھی بنا رہا۔ پہلی بات یہ ہے کہ گاؤں میں رہ کر جو کاریگر اپنے پیشہ کے تمام کاموں کو انجام دیتا وہ مہارت پیدا نہیں کرتا تھا اور محنت کی تقسیم بہت ہی محدود تھی ایسی صورت میں کاریگر کی اپنے ہنر میں مہارت اعلیٰ درجہ کی نہیں ہو سکتی تھی[1] اس سسٹم نے کاریگر کو بیرونی مقابلہ سے اچھی طرح محفوظ رکھا تھا۔ ایک کسان باہر کے کمہار سے برتن بہتر ہونے پر بھی نہیں خریدتا تھا کیونکہ وہ اپنے گاؤں کے کمہار کو اس کے لیے مسلسل قیمت ادا کیا کرتا تھا۔ باہری مقابلہ کے نہ ہونے کی وجہ سے ہی ہندوستان میں صنعت خاص علاقہ میں محدود نہ رہ سکی۔ شہروں میں تیار ہونے والے خوبصورت برتنوں کے سوا ہندوستان میں کوئی صنعت کسی علاقہ میں محدود نہ رہی[2] اس کا سبب محض مواصلات کی کمی ہی نہیں

(گذشتہ سے پیوستہ) حصوں کے لئے دیکھیں ڈبلو کروک: شمالی مغربی صوبہ، ہلیمین، کتاب مذکور جلد اول ص ص ۴-۳-۲، گرانٹ ڈف: مرہٹوں کی تاریخ۔ مرتبہ ایس ایم۔ اڈوارڈس جلد اول۔ دکن میں انتظام کسی حد تک عجیب و غریب تھا۔ کیونکہ "پنچالوں" یعنی پانچ قسم کے ہنر کی جماعتوں میں کاریگر جو پیشہ چاہتے اختیار کرتے (۱۸۹۱ء کی میسور مردم شماری کی رپورٹ دیکھیں) ایسی تبدیلی کے امکانات شمال میں نہ تھے۔

۱۔ کبھی کبھی اس کے طریقے بڑے خراب تھے اور جب آمد و رفت کی ترقی ہوئی تو کچھ حصوں میں اس امر کے سسٹم ختم ہو گیا۔ چھتیس گڈھ کے بڑھئی کے بارے میں ہم یہ دیکھتے ہیں: "کسانوں کے کام میں آنے والے اوزار اتنے معمولی ہوتے کہ وہ عموماً خود تیار کر لیتے یا اگر مجبوری ہوتی تو نزدیک ترین شہر کی راہ لیتے۔ صوبہ متوسط کی مردم شماری کی رپورٹ۔ ۱۸۹۱ء

۲۔ پارچہ بافی ایک حد تک استثنا کی حیثیت رکھتی ہے۔ ملک کے کچھ حصوں میں اس کے ایسے مراکز تھے جو اپنی مخصوص مصنوعات کے لیے جوار میں شہرت رکھتے تھے۔

تھی کیونکہ برما میں جہاں حمل ونقل کی بڑی دشواریاں تھیں، صنعت پاس کے گاؤں کے چھوٹے حلقوں میں کسی حد تک محدود تھی (۱)، لیکن ہندوستان میں یہ بھی گویا بالکل مفقود تھی۔ ایسی صورت میں جب کہ محنت کی تقسیم بہت کم تھی اور مختلف جگہوں میں تیار ہونے والے سامان کی گویا کوئی خصوصی اہمیت نہیں تھی، اس لئے ہندوستان کی دیہی صنعت کا حال بڑا ہی پست تھا۔

اپنی مخصوص تنظیم کے باعث گاؤں کی جماعت ہندوستان کی معاشی زندگی کی اہم ترین اور دلچسپ ترین خصوصیت تھی۔ شہروں کی اہمیت زیادہ نہ تھی وہ گویا ملک کی عام زندگی سے علیحدہ اپنا وجود رکھتے تھے۔ اس ہندوستان کی خصوصیت باہر کی دنیا سے علیحدگی پسندی ہو گئی۔ یہ ملک بالکل خود مکتفی اور خودگیر اکائیوں کے بے شمار افراد پر مشتمل تھا جو ایک دوسرے سے ربط نہیں رکھتے تھے اور نہ جنہیں خارجی دنیا کا عملی طور پر کوئی علم ہی تھا۔

۱۔ ہندوستان کے گاؤں کا موازنہ اکثر روس کے گاؤں سے ہوتا ہے لیکن دونوں کا فرق واضح ہے۔ میور (۲۸۵-۵۷۵) لوہار، تار بنانے والوں کے پورے گاؤں کو بیان کرتا ہے لیکن ہندوستان میں یہ ناممکن ہے وہ یہ بھی کہتا ہے: "گاؤں کے اِن کاریگروں کی مصنوعات بِکری کے لیے ہوتی تھیں۔ گاؤں کی مصنوعات کی خصوصیت کی وجہ سے یہ لازمی تھا اور وسیع مارکیٹ کے ساتھ تجارت کی آسانیوں کی وجہ سے بھی یہ ممکن تھا۔ (ص ۵۳۰)
جے۔ میور: روس کی اقتصادی تاریخ، جلد اول، کتاب نمبر ۳، باب سوم، کسانوں کی ایسی صنعتیں ہندوستان میں نہ تھیں اور نہ ہو سکتی تھیں۔ برما کے لئے دیکھیں برما کی مردم شماری کی رپورٹ (۱۹۱۱ء) بل بھی دیکھیں: لوہا اور فولاد برما میں (۱۹۰۷ء): "[لوہار کی صنعت] کا دوسرا ترقیاتی پہلو منڈان گاؤں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ جہاں ہر گھر کم و بیش لوہار کے کام سے ہی گذر اوقات کرتا تھا۔

دوسرا باب

کاشتکار ۸۰-۱۸۶۰

گرچہ مغرب سے ہندوستان کا ربط وضبط اور تجارت صدیوں سے جاری تھی پھر بھی اس سے ہندوستان کے اقتصادی ڈھانچہ پر انیسویں صدی تک کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔ جب متعدد ایجادات سے مشینی طاقت کا صنعت میں استعمال بڑے پیمانہ پر ہونے لگا تو برطانوی صنعت کاروں نے ہندوستانی کاریگروں پر نمایاں برتری حاصل کرلی۔ یہی زمانہ تھا جب انگلستان نے ہندوستان کے ایک بڑے حصہ پر قبضہ جمالیا اور اس ملک میں نئے انتظامی اور عدالتی طریقے رائج ہوگئے۔ ان آخر الذکر وجوہ سے عوام میں یاس کی لہر پھیل گئی۔ قدیم ادارے مثلاً گاؤں کے ادارے جو مکمل انتظامی اکائی کی حیثیت سے کھوکھلے ہوگئے لیکن انہوں نے ہندوستان کی صنعت اور اس کی صنعتی تنظیم کو جوں کا توں رہنے دیا۔
تاہم اس سے زیادہ اہم بات برطانوی صنعت کاروں کا مقابلہ تھا۔ باوجودیکہ غیر ملکی صنعت کاروں کا مقابلہ تھا۔ انھوں نے اس مقابلہ میں ہندوستانی دستکاروں کو شکست دے دی تھی لیکن ہندوستان کے اندرونی علاقوں میں آمد ورفت کے وسائل کی کمی کی وجہ سے انہیں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا البتہ انیسویں صدی کے نصف اوّل میں بیرونی مقابلہ سے صرف ڈھاکہ کی ململ، بنگال کی ریشم کی صنعت بمبئی اور بنگال کے جہاز رانی کے کارخانے شدید طور پر متاثر ہوئے۔ پھر بھی یہ کہنا مشکل ہوگا کہ بیرونی مقابلہ کس حد تک پہلی دو صنعتوں کے زوال کا ذمہ دار ہے۔ اس ارتباط سے نئی صنعتوں کے قیام اور زراعت کی ترقی کی سمت میں ابھی تک خاطر خواہ نتائج حاصل نہیں ہوئے تھے۔[1]

۱۔ پیلہ پروری یا ریشم کے کیڑوں کی پرورش (Sericulture) بھی ایک صنعت تھی جسے ایسٹ انڈیا کمپنی نے خاص طور پر فروغ دیا تھا لیکن اس کی ترقی فطری طور پر نہیں ہوئی تھی۔ نپولین کی جنگ کے زمانہ میں جب کہ کچے ریشم

(جاری)

اس کے خاص اثرات یہ ہوئے کہ تقریباً ۱۸۳۰ء میں برآمد کے لیے بنگال میں جوٹ کی کھیتی تیزی سے ہونے لگی۔ اسی زمانہ میں روئی کی برآمد شروع ہوتی اور کچھ بدیسی قسمیں داخل ہوئیں لیکن عوام الناس پر عام طور پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ انہوں نے بیرونی حکومت کو محسوس کیا، بھاری لگان کو محسوس کیا، قدیم اداروں کو مٹتے ہوئے محسوس کیا لیکن انہوں نے بیرونی مال کے مقابلہ یا دوسری خارجی قوتوں کو اس حد تک محسوس نہیں کیا کہ وہ اپنے صنعتی طریقوں یا اس کی تنظیم کو بدلنے کی طرف متوجہ ہوں۔

۱۸۵۰ء کے بعد ہی دخانی کشتیوں کی ترقی اور اندرونی علاقوں میں سڑکوں کی توسیع سے ہندوستان کی بیرونی تجارت تیزی سے بڑھنے لگی۔ ریلوے کا آغاز ہندوستان میں پانچویں دہائی میں ہوا۔ اس دہائی کے آخری حصہ میں ہندوستان کے بڑے علاقہ براہ راست انگریزوں کی حکومت کی ماتحتی میں آگئے ایسٹ انڈیا کمپنی کا خاتمہ ہوگیا اور ہندوستان کی حکومت تاج شاہی کے ماتحت آگئی۔ یہ دہائی حقیقت میں بڑی اہم دہائی تھی اور اتنے بڑے واقعات سے پیدا ہونے والی تبدیلیاں ہندوستان کی اقتصادی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت رکھتی ہیں۔

مغربی دنیا کا پہلا واقعہ جس سے ہندوستان اچانک طور پر متاثر ہوا اور جس کا اقتصادی طور پر گہرا اثر پڑا امریکہ کی خانہ جنگی تھی۔ پہلی بار یہ معلوم ہوا کہ ہندوستان کو مغرب کے بازاروں سے کتنا قریب لایا گیا ہے۔ یہ پہلا اہم واقعہ رونما ہوا جس سے ہندوستان کے کسان ان بازاروں کے وجود کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور ہوئے۔

ہندوستان میں کپاس کی کھیتی کی تاریخ لمبی ہے لیکن ہندوستان میں کپاس کی کھیتی گرچہ قدیم زمانہ سے ہو رہی تھی پھر بھی ہندوستان سے خام کپاس کی برآمد نسبتاً ایک نئی چیز تھی۔ انیسویں صدی سے پہلے ہندوستان خاص طور پر "دنیا کی مہذب ترین اقوام کو اپنے شاندار کپڑے کی برآمد کے لیے"[۱] مشہور تھا۔ کاتنے اور بننے کی مشینوں کی ایجادات اور ان کے نتیجہ میں سستی اشیاء کے مقابلہ سے ان "نفیس کپڑوں" کی برآمد بہت گھٹ گئی تھی اور اس کے ساتھ ہی خام کپاس سپلائی کرنے کے امکانات ہندوستان

گذشتہ سے پیوستہ ۔۔ کی باقاعدہ سپلائی اٹلی سے انگلستان میں بند ہوگئی تو کمپنی نے بنگال میں اسے فروغ دیا۔ اس کی ترقی کی غیر فطری صورت کا پتہ اس امر سے چلتا ہے کہ جیسے ہی کمپنی نے اپنی باقاعدہ مدد (۱۸۳۶ء میں) بند کر دی تو یہ صنعت ڈوبنے لگی۔ جے۔ جیوگھاگھن، ہندوستان میں ریشم سے متعلق رپورٹ (۱۸۷۴ء)

۱۔ جے۔ ایف۔ رائل: کلچر اینڈ کامرس آف کاٹن ان انڈیا ص ۲۰ (۱۸۵۱)

میں نمایاں ہوگئے۔ حالاں کہ ۱۷۸۰ء تک امریکہ خام کپاس پیدا کرنے والے ملک کی حیثیت سے کوئی مقام نہیں رکھتا تھا۔ اس کے بعد ہی سے بالخصوص وھائٹنے (Whitney) کی کپاس اوٹنے کی نئی مشین کی دریافت کے بعد اس کی ترقی غیر معمولی طور پر ہوئی اور ۱۸۳۰ء تک وہ برطانیہ کی بڑھتی ہوئی صنعت وحرفت کو کپاس سپلائی کرنے والا سب سے اہم ملک بن گیا۔ اس وقت ہندوستان کی خام کپاس کی برآمد بہت کم تھی۔ ڈاکٹر رائل لکھتے ہیں: "اس ملک (انگلستان) کی درآمد میں اس کی حیثیت معمولی ہے لیکن چین کی درآمد کا یہ ایک زیادہ نمایاں حصہ رکھتی ہے، دونوں مقداریں ایک ساتھ مل کر بھی اس ملک کی پیداوار کے مقابلہ میں کوئی خاص حیثیت نہیں رکھتیں۔ اس کے وسیع علاقوں میں تقریباً ہر جگہ اس کی کاشت ٹکڑوں ٹکڑوں میں دیکھی جاسکتی ہے اور بعض صوبوں میں تو یہ 'خریف' یا برسات کی فصلوں کا چوتھائی حصہ ہوتی ہے اور کاشتکار کی یافت میں لازمی طور پر یہ ایک اہم جنس ہوتی ہے"[۱] تقریباً ۱۸۶۰ء تک یہ برآمدات گرچہ مجموعی طور پر ذرا بہت بڑھ رہی تھیں تاہم یہ عجیب وغریب طور پر کبھی گھٹتی اور کبھی بڑھتی تھیں لیکن اب برطانیہ کے کپاس کے صنعت گر ہندوستان کی طرف خاص طور پر اس لیے متوجہ ہوگئے تھے کہ ان کے کارخانوں کو خام کپاس فراہم کرنے کا یہ ایک ممکن وسیلہ بن سکتا ہے[۲] ۱۸۴۶ء میں جب امریکہ کی کپاس کی فصل خراب ہوگئی تب انہیں معلوم ہوا کہ یہ وسیلہ کتنا غیر یقینی ہے اور وہ اس فکر میں تھے کہ ہنگامی ضرورت کے لیے کوئی بدل مل جائے، ہندوستان کے قدیم صنعت گروں کے بارے میں لکھنے کے بعد رائل کہتا ہے: "آج اس ملک کا ذکر کپاس کی کھیتی کرنے والے کی حیثیت سے ہی سننے میں آتا ہے اس کا کام یہی ہونا چاہئے کہ وہ انگلستان کو اس کی ضرورت کے مطابق کچا مال فراہم کرے اور تیار شدہ سامان اتنی مقدار میں واپس لے لے جتنی مقدار میں صنعت گر بھیجنے کا فیصلہ کرے۔"[۵] لیکن بعض وجوہات کی بنا پر مثلاً ہندوستانی کپاس کے دھاگوں کا چھوٹا ہونا، کپاس کا گرد آلود ہونا، آمد ورفت کی مشکلات اور مستقل برآمدی بازار کا نہ ہونا، ہندوستان کی خام کپاس کی برآمد عظیم بلندیوں کو چھو نہ سکی[۴] اس کے بعد امریکہ کی خانہ جنگی آگئی، دکھن کے سمندری بندرگاہ بند ہوگئے اور لنکاشائر

۱۔ جے۔ ایف۔ رائل: کلچر اینڈ کامرس آف کاٹن اِن انڈیا ص ۱۸

۲۔ ہندوستان کی کپاس کی سپلائی میں بڑھتی ہوئی دلچسپی متعدد کتابوں سے ظاہر ہوتی ہے جو اس موضوع پر اس زمانہ میں شائع ہوئیں چیپ مین جو گریٹ انڈین پینیسولا ریلوے کا بانی ہے، کپاس کی سپلائی کے لیے ہندوستان میں ریلوے کی فوری توسیع پر بہت زور دیتا ہے۔ دیکھئے، جے۔ چیپ مین: کاٹن اینڈ کامرس آف انڈیا (۱۸۵۱ء)

۳۔ رائل۔ ح۔ س، ص ۲۰

۴۔ ایضاً ، ڈبلو۔ آر۔ کیسل، ح۔ س

میں کپاس کا قحط پڑ گیا۔ ظاہر ہے کہ پھر تو انگریز صنعت گر ہندوستان کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور ہوئے۔ اس اچانک مانگ سے ہندوستانی کپاس پر گہرا اثر پڑا۔ گورنمنٹ نے بلاشبہ سڑک اور ریلوے کی تعمیر کی اور دوسرے اقدامات کیے۔ جیسے بمبئی اور صوبہ متوسط (سی۔ پی) کے لیے کاٹن کمشنر مقرر کیے کاشتکاروں نے بھی زیادہ منافع کو دیکھتے ہوئے اس موقع کو جلدی ہاتھ میں لے لیا۔ کپاس کا دام بہت بڑھ گیا۔ کپاس کی کھیتی اچانک نفع بخش بن گئی۔ حسب ذیل اعداد و شمار سے ہندوستانی کپاس کی قیمت میں غیر معمولی اضافہ کا پتہ چلتا ہے۔

ہندوستانی کپاس کی قیمت فی پونڈ آنے اور پائی میں

۱۸۵۹	۱۸۶۰	۱۸۶۱	۱۸۶۲	۱۸۶۳	۱۸۶۴	۱۸۶۵	۱۸۶۶
آنہ - پائی	آنہ - پائی	آنہ - پائی	آنہ - پائی	آنہ - پائی	آنہ - پائی	آنہ - پائی	آنہ - پائی
۷ - ۲	۷ - ۳	۲ - ۴	۵ - ۶	۵ - ۱۰	۵ - ۱۱	۱ - ۷	۲ - ۶

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ چار برسوں کے دوران کپاس کی قیمت تین گنی بڑھ گئی تھی چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کپاس کی تجارت بھی ان بڑھتی ہوئی قیمتوں کی بنا پر غیر معمولی بلندیوں پر پہنچ گئی اور ان چار برسوں میں برطانیہ کے لیے برآمد کی مقدار دوگنی سے زیادہ ہوگئی۔

ہندوستان سے برطانیہ میں خام کپاس کی درآمد (گانٹھوں میں)[۲]

۱۸۵۹	۱۸۶۰	۱۸۶۱	۱۸۶۲	۱۸۶۳	۱۸۶۴	۱۸۶۵
۵۰۹,۶۹۵	۵۶۲,۷۳۸	۹۸۶,۲۸۰	۱,۰۷۱,۷۶۸	۱,۲۹۲,۹۸۴	۱,۳۹۹,۵۱۴	۱,۲۶۶,۵۱۳

مقدار میں اضافہ کے ساتھ ساتھ دام بڑھ جانے سے ان برآمدات کی قیمت بہت بڑھ گئی اور ۱۸۶۴ء کے بعد چند سال کے اندر ان کی قیمت ہندوستان کی مجموعی برآمدات کی قیمت کی نصف سے بھی زیادہ ہوگئی۔ صوبہ متوسط اور برار کے کاٹن کمشنر مسٹر ریوٹ کارنک کی رپورٹ کے کچھ اقتباسات سے امریکہ کی خانہ جنگی کے عظیم الشان اثرات کا پتہ چلتا ہے جو خاص طور پر کپاس پیدا کرنے والے علاقوں پر ہوئے۔ ۱۸۶۰ء سے پہلے

۱۔ ہندوستان میں کپاس کی کاشت سے متعلق مراسلے (۱۸۶۳) (پارلیمانی کاغذات)

۲۔ جی۔ واٹ کی کتاب "ڈکشنری آف اکانومک پروڈکٹس آف انڈیا" کے کپاس سے متعلق مضمون سے یہ اعداد و شمار لیے گئے ہیں۔

کاشتکاروں کی مختلف مشکلات پر روشنی ڈالنے کے بعد وہ لکھتے ہیں: "اچانک گویا جادو کی چھڑی سے یہ ساری دشواریاں بیک وقت مؤثر طور پر دور ہوگئیں اور کپاس کی تجارت جس طرح ۱۸۶۴ء میں مرکزی ہندوستان میں ہوتی تھی مشکل سے اپنے کاروبار سے پہچانی جاسکتی ہے جس طرح آج اس کی تجارت ہمارے بازاروں میں ہورہی ہے۔ جبکہ ریلوے رفتہ رفتہ مگر یقینی طور پر ملک کے درمیان پھیل رہی تھی، کسانوں کی حالت میں نمایاں اور اہم تبدیلی آرہی تھی۔ مالگذاری فیصلہ (Land Revenue Settlement) کے لاگو ہوجانے سے انہیں زمین کی ملکیت کے بارے میں ساری پریشانی دور ہوگئی۔۔ اور بالآخر امریکہ کی خانہ جنگی نے جس سے کپاس کی قیمت بڑھ گئی اور جس سے رعیت کے ہاتھوں میں کثیر دولت آگئی ان تمام لوگوں کو سود خواروں کے چنگل سے آزاد کرادیا جو فضول خرچ اور ناعاقبت اندیش نہ تھے"[1] صوبہ متوسط میں کپاس کی کاشت کی توسیع کے اعداد و شمار کاٹن کمشنر کے مطابق یہ ہیں[2]:

سال	ایکڑ	سال	ایکڑ	
۱۸۶۱ - ۲	۳۷۵۶۲۳	۱۸۶۵ - ۶	۵۸۷,۳۹۸	
۱۸۶۲ - ۳	۴۲۷۱۱۱	۱۸۶۶ - ۷	۵۹۸,۸۰۱	
۱۸۶۳ - ۴	۴۸۸۴۳۶	۱۸۶۷ - ۸	۷۳۵,۶۳۳	تقریباً ...,...۱ زمینداری بھی شامل ہے۔
۱۸۶۴ - ۵	۶۹۱۱۹۸	۱۸۶۸ - ۹	۷۵۰,۸۷۵	

امریکی جنگ کے یہ فائدے کپاس پیدا کرنے والے تمام علاقوں کو مساوی طور پر حاصل ہوئے[3] مدراس کے صرف ایک ضلع بلاری ہی میں "رعیتوں نے کپاس فروخت کرکے امریکی جنگ کے تین برسوں کے اندر اندر پندرہ لاکھ اسٹرلنگ حاصل کیے"[4] بمبئی پریسیڈنسی کے اثرات کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے: "۱۸۶۲ء میں امریکی ناکہ بندی

۱۔ سی۔پی اور برار کے کاٹن کمشنر کی سالانہ رپورٹ ۸ - ۱۸۶۷ء سال کے لیے ص ۱۳۲

۲۔ ایضاً ۹ - ۱۸۶۸ء ص ۳

۳۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ فائدے سارے ہندوستان کو حاصل ہوئے کیونکہ بنگال کے سوا ہندوستان کا تقریباً ہر صوبہ بڑے علاقوں میں کپاس پیدا کررہا تھا۔

۴۔ راگھو آینگر ص ۳۹

کے نتیجہ میں کپاس کی قیمت بڑھ جانے سے غیر معمولی خوشحالی کا دور شروع ہوا۔ اس مدت کے دوران لگاتار پانچ سال تک بارش کی کمی کی وجہ سے رعیتوں کو عام حالات میں بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا مگر کپاس کی قیمت بڑھ جانے سے خشک سالی کی تھوڑی سی فصل بھی اچھے موسم کی اچھی فصل کے برابر ہوگئی۔[1]

لیکن اقتصادی اعتبار سے یہ بات اہم نہ تھی کہ کپاس کے دام بڑھ گئے اور اس طرح خوش حالی کا ایک عارضی دور آگیا بلکہ معاملہ یہ تھا کہ کاشتکاروں کو اس بات کا احساس ہوگیا کہ مقامی ضرورتوں کے علاوہ دوسرے اسباب بھی ان کی کاشت کی نوعیت و حدود پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔ مختصر یہ کہ اس واقعہ سے ہندوستان کی اقتصادی علیحدگی واضح اور ڈرامائی طور پر ختم ہوگئی۔

کپاس کے لیے انگلستان کی بڑھتی ہوئی مانگ کو ہندوستان نے مختلف ترقیاتی تدابیر کو کام میں لاکر گذشتہ دہائی میں پورا کیا۔ سڑک اور ریلوے کی توسیع کا کام خاص طور پر ہوا۔ یہ تو پہلے ہی بیان کیا جا چکا ہے کہ ۱۸۵۰ء کے پہلے مواصلات کی حالت کتنی ناگفتہ بہ تھی۔ تقریباً ۱۸۴۵ء تک ہندوستان میں سڑکوں کی تعمیر کا کام کچھ نہیں ہوا تھا۔ اس کے بعد مدراس پریسیڈنسی میں سڑکوں کی تعمیر پر کچھ اخراجات منظور کیے گیے حالانکہ یہ رقم تو خرچ ہوگئی لیکن سڑک کی تعمیر کا کام کمشنروں کی رپورٹ (۱۸۵۲ء) کے بعد تک بہت تھوڑا ہوا۔ ۱۸۴۰ء میں بمبئی سے آگرہ تک ایک سڑک کی تعمیر شروع ہوئی جبکہ پریسیڈنسی میں بھور گھاٹ سے پونا تک کی سڑک کے علاوہ کچھ کام نہ ہوا تھا۔ شمال میں صرف ٹرنک روڈ کلکتہ سے بنارس تک تھی اور اس کی حالت بھی بہت بری تھی۔ ۱۸۵۰ء کے قریب دہلی تک اس سڑک کی توسیع کا کام شروع ہوا اور ۱۸۵۳ء تک ختم ہوگیا لیکن سڑک کی تعمیر میں صحیح معنوں میں ترقی تو مستعد گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی کے زمانہ میں محکمہ تعمیرات عامّہ کے ذریعہ شروع ہوئی۔ دہلی تک ٹرنک روڈ مکمل ہوگئی۔ اور پھر پشاور تک اس کی توسیع کا کام زوروں سے شروع ہوگیا۔[2] اس طرح سڑک کی تعمیر کا کام صحیح معنوں میں پانچویں دہائی میں شروع ہوا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد فوجی مقاصد اور ریلوے ٹرنک کی لائنوں تک پہنچنے کے لیے معاون کی ضرورت کا احساس بھی ہوا۔ اور اگلے دہائی میں سڑک کی توسیع کا کام ہندوستان میں تیزی سے ہوا۔

لیکن یہ کام ریلوے کی توسیع جیسے اہم کام کے سامنے ماند پڑ گیا۔ ہندوستان میں ریلوے کی تعمیر کا سوال ۱۸۴۵ء ہی میں زیر بحث آیا لیکن جب پرائیویٹ کمپنیاں قائم ہوئیں تو سرمایہ اکٹھا نہ ہو سکا تب کمپنیوں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے درمیان ریاستی گارنٹی کے مسئلہ پر گفت و شنید کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا۔

۱۔ دکن میں فسادات سے متعلق کمیٹی کی رپورٹ وغیرہ۔ ص ۲۱

۲۔ جے۔ برگس: انڈیا اینڈ یورپ کمپرڈیہ باب اوّل حصہ سوم (۱۸۵۷ء)

لارڈ ڈلہوزی کی گورنر جنرلی سے پہلے اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا ۱۸۵۳ء لارڈ ڈلہوزی نے ہندوستان میں ریل کی توسیع کے کام میں بڑی دلچسپی لی اور اس موضوع پر دو پُرمغز رسالے لکھے جن میں سے ایک میں اس نے راستوں کے نقشے کھینچے جو ٹرنک لائنیں ہندوستان میں اختیار کریں گی۔[۱] ۱۸۴۹ء میں کلکتہ کے قریب ایک لائن تجربہ کے طور پر شروع ہوئی اور ۱۸۵۴ء میں پہلی لائن ہندوستان میں بمبئی سے تھانا تک آمدورفت کے لیے کھل گئی۔ اس وقت سے لے کر ۱۸۵۷ء تک بڑے زوروں پر کام ہوتا رہا اور پھر عارضی طور پر یہ کام رک گیا۔ اگلے دس برس کے دوران ہندوستان میں ریلوے کی غیر معمولی ترقی ہوئی۔ یہ کام مسلسل ہوتا رہا اور آمدورفت کے لیے ریلوے لائن ۱۸۵۹ء کی ۴۳۲ میل سے بڑھ کر ۱۸۶۹ء میں ۵۰۱۵ میل ہوگئی۔

یہاں پر گارنٹی اور کنٹرول کے اُن طریقوں کا ذکر مناسب نہیں ہوگا جن کے ذریعہ ہندوستان میں ریلوے کی تعمیر کا افتتاح ہوا۔ ریلوے کا سب سے پہلا واضح اثر یہ ہوا کہ آمدورفت تیز تر ہوگئی اور طویل سفر کے لیے یہ ارزاں ثابت ہوئی۔ یہ بڑی اہمیت کی حامل ہے کیونکہ ریل اور سڑک کی توسیع ہی سے یہ ممکن ہوسکا کہ کھیتوں سے سمندری بندرگاہوں تک کپاس کافی مقدار میں منتقل ہو لیکن ۷۰-۱۸۶۰ کی دہائی کے دوران اس کا ایک اور اہم اثر پڑا۔ اس سے پہلے ہندوستان میں ایسے مزدوروں کا کسی کو علم نہ تھا جو بس موقع ملنے پر ہی کام کرتے ہیں۔ مزدوروں کی ایسی کوئی جماعت نہیں تھی۔ کیونکہ اس کی کوئی ضرورت بھی تو نہ تھی۔ پرانے زمانہ میں فلاح کے چھوٹے چھوٹے کام مثلاً چھوٹی نہریں وغیرہ اس علاقہ کے لوگوں کی ملی جُلی محنت سے پوری ہوتی تھیں، بڑے کام اور ایسے کام جیسے مندر اور یادگار کی تعمیر وغیرہ قرب وجوار کے کاشتکاروں کے بیگار ہوتی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ میں اہم تعمیرات عامّہ کی تعداد نسبتاً کم تھی لیکن لارڈ ڈلہوزی کے محکمہ تعمیرات عامّہ قائم ہونے کے بعد خصوصاً ۱۸۵۹ء کے بعد ایسے شروع کیے جانے والے کاموں کی تعداد میں خاصا اضافہ ہوا۔[۲][۳] اس سے قدرتی طور پر پورے ہندوستان میں عام غیر تربیت یافتہ مزدوروں کی کثیر تعداد کو روزگار مل گیا۔ جن مزدوروں کی بھرتی ہوئی وہ زراعتی مزدور اور غریب کاشتکاروں کے طبقوں ہی سے تعلق رکھتے تھے اور وہ بہت خوش تھے کہ کھیتی باڑی میں جو فالتو وقت بچتا تھا اس میں انہیں اپنی آمدنی بڑھانے کا موقع مل گیا۔ ان کے علاوہ گاؤں کے کچھ کاریگر خاص طور پر بنکر بھی بیرونی مقابلہ کے اثرات محسوس کررہے تھے۔ غیر تربیت یافتہ مزدوروں کی اس اچانک مانگ کا فطری نتیجہ یہ ہوا کہ اُجرت کی شرح میں عام طور پر اضافہ

۱۔ ایچ۔ بل: ہندوستان میں ریلوے پالیسی، باب اوّل

۲۔ ڈبلو۔ڈبلو۔ہنٹر: دی مارکوئس آف ڈلہوزی باب ہفتم (۱۸۹۰ء)

۳۔ ان کی مختلف نوعیتیں تھیں مثلاً ریلوے، سڑک، آبپاشی کے کام، سرکاری عمارات، فوجی بیرک وغیرہ۔

ہوگیا۔ اچھی خاصی اجرت بڑھ گئی۔ دکن کے فسادات کی کمیٹی اپنے رپورٹ میں لکھتی ہے: "مزدوروں کے مقابلہ کا اثر یہ ہوا کہ ۱۵ روز کام کر کے رعیت ایک معمولی کھیت کے لگان کے برابر اُجرت حاصل کر سکتی ہے"[1] اور پھر واضح لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مزدوروں کے مقابلہ کی وجہ سے وہ کچھ دنوں کے لیے پونا یا بمبئی چلے جاتے اور وہاں غیر معمولی حساب سے مزدوری ملتی کیونکہ بمبئی میں معمولی قلی کی ماہانہ اجرت ۶۲-۱۸۶۰ء میں ۷ روپیہ ۱۲ آنہ تھی جو ۱۸۶۳ء میں بڑھ کر ۱۳ روپیہ ۸ آنہ ہوگئی۔ ریلوے کی تعمیر میں تقریباً ۲۵ لاکھ روپیہ ان فساد زدہ گاؤں کے علاقہ میں خرچ ہوا اور یہ رقم اُجرت کی شکل میں اسی ضلع میں رہ گئی[2] اس ضلع کے باہر محض ۶۰ میل کے فاصلہ پر بھور گھاٹ کے کاموں میں ہزاروں آدمی بحال ہوئے۔ ایک ٹھیکہ دار نے ۱۴ میل کی لائن میں ...۴۰۰ مزدوروں کو کام پر لگایا اسی کے چند روز بعد تعمیرات عامّہ پر کثیر رقم خرچ کی گئی۔ صرف پونا میں ہی تعمیرات عامّہ اور آبپاشی پر یہ رقم ۶۹-۱۸۶۸ء میں بڑھ کر ۳۱ لاکھ ہوگئی"[3] ان سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہر ضلع میں جہاں ریلوے یا دوسری تعمیراتِ عامّہ شروع ہوئیں اجرت پر کیا اثر پڑا۔ اس دہائی میں سرکاری خرچ سے کتنی عظیم الشان ترقی ہوئی، یہ بھی ظاہر ہوتا ہے۔ مدراس پریسیڈنسی میں "غیر زرعی مزدوروں کے حالات بھی بہتر ہوئے کیونکہ کئی ریلوے اور دوسری تعمیرات عامّہ کی وجہ سے مزدوروں کی مانگ میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا اور اُجرت بھی اناج کی قیمت کے ساتھ ساتھ بڑھتی رہی"[4]

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قیمتوں کے بڑھ جانے کا رجحان اس زمانہ میں تھا۔ انیسویں صدی کے پہلے پچاس برسوں میں ملک کے تمام حصّوں میں غلّوں اور دوسری اشیا کے دام بہت زیادہ گھٹتے بڑھتے رہے۔ لیکن اتار چڑھاؤ کی ان تمام صورتوں میں قیمتوں کے گھٹنے کا ایک عام رجحان تھا۔ اس صورت کی سادہ اور واضح وجہ یہ تھی کہ ملک میں روپیہ کی معیشت آگئی خاص طور پر سرکاری لگان کی نقد ادائیگی ہونے لگی۔ ہندوستان میں قیمتی دھاتوں کی کافی پیداوار کبھی نہیں تھی اس لیے انیسویں صدی کے آغاز میں سکّوں کی شکل میں قیمتی دھات کی مقدار بہت کم تھی لیکن تجارت کے مقاصد کے لیے یہ مختصر مقدار بھی کافی تھی کیونکہ زیادہ لین دین اشیا کی ادلا بدلی کے ذریعہ ہوتا تھا اور دھات کے سکّوں کے ذریعہ جو تجارت ہوتی تھی

۱۔ ح۔ س، ص ۲۱

۲۔ وہ علاقہ جہاں بعد میں فسادات ہوئے۔

۳۔ ایضاً ص ص، ۸ - ۴۷

۴۔ راگھو آینگر، ح۔ س۔ ص ۳۹

اس کا حجم بہت ہی کم تھا۔ جب سرکاری لگان کی ادائیگی کا آغاز نقد صورت میں ہوا تو روپیہ کی مانگ خاص طور پر کٹائی کے بعد بہت بڑھ گئی اس طرح ملک میں روپیہ کی جو مقدار تھی اس کے 'فرائض' بہت بڑھ گئے اور چیزوں کے دام گھٹنے لگے قیمتیں اس صدی کے تقریباً وسط تک عموماً گرتی رہیں اس کے بعد مخالف رجحان شروع ہوا۔ ٹھیک اسی زمانہ میں آسٹریلیا اور کیلوفورنیا میں سونے اور میکسیکو میں چاندی کی کانیں دریافت ہونے سے دنیا کی قیمتی دھاتوں کی سپلائی میں ایک دم سے اضافہ ہوگیا اور اسی زمانہ میں ہندوستان کی بیرونی تجارت بہت تیزی سے بڑھ رہی تھی اس لیے قیمتی دھاتیں بڑی مقداروں میں ہندوستان میں آئیں اور اس سے قیمتوں کے بڑھانے کا سلسلہ چل پڑا [۱]' اس رجحان کے حدود کا پتہ حسب ذیل صوبائی اوسطوں [۲] سے چلتا ہے :

اناج کی قیمت (فی روپیہ سیر)

سال	چاول بنگال	گیہوں شمالی مغربی صوبہ	گیہوں پنجاب	جوار مدراس	باجرا بمبئی
۱۸۶۱	۲۷٫۰۷	۱۸٫۴۵	۱۹٫۲۳	۲۵٫۵۴	۲۱٫۵۵
۱۸۷۰	۲۲٫۷۴	۱۵٫۵	۱۵٫۱۳	۲۲٫۶۸	۱۳٫۲

ایک دوسرا قابل غور رجحان یہ تھا کہ مختلف صوبوں میں قیمتیں یکساں تھیں اور ملک کے ایک حصّہ میں قیمت کی تبدیلی دوسرے حصّہ پر اثر انداز ہوتی تھی۔ خاص طور پر یہ رجحان قحط کے زمانہ میں دیکھا جاتا تھا۔ ۶۹-۱۸۶۸ء میں جس آسانی کے ساتھ اناج قحط زدہ علاقہ میں ملک کے دوسرے حصوں سے پہنچایا گیا اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مسٹر ہنوے لکھتے ہیں: "یہ بھولنا نہیں چاہئے کہ ریل، سڑک آمد و رفت کے دوسرے وسائل سے ایک طرف علاقائی قحط کا خطرہ کم ہوگیا ہے اور دوسری طرف اس سے اس علاقہ میں تو بلیع ہوئی ہے جہاں اونچی قیمتیں رائج ہیں" [۳] اس سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کس طرح قحط کے زمانہ میں قیمتوں میں توازن کا رجحان کارفرما ہوتا ہے۔

۱۔ پیدر، میمورنڈم آن پرائسز، ح۔س

۲۔ جے۔ای۔ اوکونور : ریویو آف دی پرائسز اینڈ ویجز ان انڈیا (۱۸۸۶)

۳۔ ایف۔ ہنوے : شمالی مغربی صوبہ میں خشک سالی اور قحط کا جائزہ، ۱۸۶۸، ۶۹ اور ۷۰،

خوش قسمتی سے یہ دہائی قحط سے نسبتاً پاک تھی۔ ہندوستان میں قحط کی نوعیت بڑی اہمیت رکھتی ہے کیونکہ اس زمانہ میں یہ ہندوستان کی اقتصادی زندگی کی نمایاں خصوصیت تھی اور یہ آج بھی بدلی ہوئی شکل میں موجود ہے۔ ہندوستانی قحط سے متعلق تمام مصنفوں نے پُر زور طور پر یہ لکھا ہے کہ قحط کے معنی غذا کی کمی سے زیادہ روزگار کی کمی کے ہوتے ہیں، لیکن یہ ایک ایسا بیان ہے جو حمل و نقل کے وسائل ترقی پانے سے پہلے ہندوستان کے قحط پر صادق نہیں آتا ہے۔ اس وقت قحط کے معنی غذا کی کمی کے ساتھ ساتھ روزگار کی کمی کے بھی ہوتے تھے کیونکہ ۱۸۶۸ء کے راجپوتانہ قحط میں سپلائی کی قطعی کمی کی وجہ سے لوگوں کو فاقہ کشی کرنا پڑی۔ حالانکہ ان کے پاس خریدنے کے وسائل موجود تھے۔ قحط سے متاثر ضلع سے غذا سے بھرپور دوسرے ضلع میں لوگوں کی کثیر ہجرت سے بھی یہ حقیقت نمایاں ہوتی ہے جو انیسویں صدی کے اوائل کے قحط میں یکساں طور پر ظاہر ہوئی چونکہ ان کے ضلع میں غذا نہیں ملتی تھی اس لیے وہ ایسے ضلعوں میں ہجرت کرتے جہاں غذا کی سپلائی کافی ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ ۶۱-۱۸۶۰ء میں شمالی مغربی صوبہ کے قحط میں جب کہ آمد و رفت کے وسائل پہلے سے بہت زیادہ بہتر ہو گئے تھے، بڑے پیمانہ پر ہجرت عمل میں آئی اور حالانکہ اس خطہ میں مجموعی طور پر سپلائی لوگوں کے لیے کافی تھی، قحط سے زیادہ متاثر ضلعوں میں ایسی صورت نہ تھی اس لیے اصل سوال "غذا حاصل کرنا نہ تھا بلکہ یہ تھا کہ کس طرح فاقہ کشوں کو غذا تک پہنچایا جائے یا غذا، جہاں تک ممکن ہو، مناسب اور سستے طریقوں سے ان تک پہنچائی جائے"[۱] اس طرح ملک کی نوعیت اور حمل و نقل کے اچھے وسائل کی وجہ سے غذا عوام تک پہنچائی جا سکی۔ لیکن "ان معاملوں میں جیسے راجپوتانہ کا قحط جہاں یہ مصیبت زیادہ پھیلی ہوئی ہے اور جہاں دور دراز ملکوں سے اناج کو ہر آدمی کے دروازہ تک لانے کے لئے نہ تو کوئی ریل کا راستہ ہی ہے اور نہ کوئی آبی راستہ موجود ہے۔ انسانی کوششوں سے جن لوگوں کو بچایا جا سکا ان کے مقابلہ میں مرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ تھی"[۲] ۱۸۶۸ء میں راجپوتانہ کی جو حالت تھی وہی حالت ۱۸۵۰ء کے قبل سارے ہندوستان کی تھی۔

۷۰-۱۸۶۰ء کی دہائی میں جبکہ ہندوستان کے اقتصادی میدان میں بہت سی تبدیلیاں ہوئیں ہندوستانی قحط کی نوعیت بھی بدل گئی۔ اب ہندوستانی قحط کے معنی غذا کی وحشت ناک کمی کے نہ تھے بلکہ صرف قلت کی قیمتیں اور روزگار کی عالمگیر کمی کے تھے۔ اس دہائی میں جو قحط پڑے وہ نہ تو زیادہ وسیع علاقے میں پھیلے اور نہ

۱۔ آر۔ بیرڈ۔ اسمتھ، ح۔ س، سیکشن (۱)، ص ۱۳

۲۔ ہنوے، ح۔ س، ص ۹۷

شدید تھے لیکن شرح اموات میں خاصا اضافہ ہوا، خاص طور پر ۶۹-۱۸۶۸ء میں۔ موت کی تعداد میں اور بھی کمی ہوجاتی اگر سرکاری حکام کے سامنے قحط کے سلسلہ میں امدادی کاموں کا ایک منظم ڈھانچہ ہوتا جو اسی صدی میں بعد میں بنایا گیا۔

امریکہ کی خانہ جنگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ کپاس کی قیمت بڑھ گئی چنانچہ کپاس پیدا کرنے والے تمام خطوں کے سبھی کسانوں کو نفع حاصل کرنے کا وسیلہ ہاتھ آگیا اور اس طرح دوسرے تمام علاقوں کے کسانوں کو بھی تھوڑا فائدہ ہوا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ تعمیرات عامّہ پر خرچ ہونے سے مزدوروں کی اُجرت بڑھ رہی تھی لیکن اشیا کی شکل میں اُجرت میں اضافہ سے بہت زیادہ اثر نہیں پڑا۔

اس خوشحالی کے دور کا ردِّعمل ۱۸۶۵ء ہی میں مدراس پریسیڈنسی میں شروع ہو چکا تھا۔ ایک معمولی سا قحط خصوصاً گنجام ضلع میں محسوس کیا گیا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان شامل شدہ ضلعوں نے جہاں کپاس کی کھیتی ہوتی تھی، خشک سالی محسوس نہیں کی کیونکہ کپاس کی گرم بازاری ابھی تک ختم نہیں ہوئی تھی گرچہ عام حالات میں وہ یقیناً اس میں شدید طور پر مبتلا ہوتے۔ مدراس کے قحط کے بعد راجپوتانہ میں قحط (۶۹-۱۸۶۸ء) پڑا اس قحط میں دورِ حاضر کے دوسرے تمام قحط سے نسبتاً بڑی تعداد میں لوگ مرے۔ ۱۸۶۸ء میں خریف کی فصل پوری کی پوری خراب ہوئی اور پھر دوسرے سال ٹڈیوں کی وبا سے حالات اور خراب ہوگئے۔ خوش قسمتی سے یہ قحط بہت بڑے علاقہ میں نہ پڑا۔ یہ راجپوتانہ اور شمالی مغربی صوبہ کے آس پاس کے ضلعوں تک محدود رہا اور صورت حال اور زیادہ خراب ہوگئی کیونکہ راجپوتانہ کے اندرونی حصہ میں آمد و رفت کے وسائل گویا مفقود تھے۔ یہ شاید ہندوستان کا آخری قحط تھا جس میں اناج کی قلت شدید طور محسوس کی گئی۔ ہندوستان کے قدیم قحط کی تمام خصوصیات اس صورت حال میں واضح ہوگئیں۔ لوگ بڑی تعداد میں غذا، روزگار اور اپنے مویشیوں کے لیے چارہ کی تلاش میں راجپوتانہ سے باہر یونہی نکل پڑے شمالی مغربی صوبہ کے نزدیک ترین شہر، جیسے آگرہ اور دہلی ان قحط زدہ لوگوں سے بھرے پڑے تھے جو راجپوتانہ سے باہر نکل بھاگے تھے۔ غذا کی تلاش میں اس طرح بے معنی گشت لگانے سے لوگ اللہ کو پیارے ہوگئے، جانوروں میں موت کی تعداد اور زیادہ تھی اندازہ لگایا گیا ہے کہ راجپوتانہ کے زیادہ تر مویشی ختم ہوگئے [۱]!

پھر تو قحط متواتر پڑنے لگے۔ بنگال اور بہار میں پہلا قحط (۷۴-۱۸۷۳ء) میں پڑا۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس

۱۔ ہندوستانی قحط کمیشن کی رپورٹ (۱۸۸۰ء) حصہ دوم "گذشتہ قحطوں کی تاریخ"

قحط میں پہلی بار ریلیف کے جدید طریقے بڑے پیمانہ پر کام میں لائے گئے پورے ضلع میں قحط کے سلسلہ میں کام شروع کیے گئے اور کھل کر امداد دی گئی۔ راجپوتانہ میں آدمی اور مویشی کے سخت نقصانات سے حکام اتنے زیادہ متاثر ہوئے کہ انہوں نے عہد کر لیا کہ ریلیف کی کمی کی وجہ سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امداد بید ریغ دی گئی۔ قحط زدہ ضلعوں کی کل آبادی میں سے اوسطاً ۲۶ فیصد کو امداد ملی اور کچھ ضلعوں میں تو ۵۰ یا ۷۰ فیصد فیضیاب ہوئے۔ گورنمنٹ نے اس علاقہ سے اناج باہر بھیجنے پر پابندی لگادی اور جب یہ پتہ چلا کہ تاجر لوگ پورے طور پر مستعد نہیں تو سرکار نے اپنے طور پر کافی اناج منگایا۔ قحط کی امداد پر بہت بڑی رقم خرچ ہوئی لیکن یہ گورنمنٹ کا کمال تھا کہ فاقہ کشی سے ایک موت بھی نہ ہوئی!

اس دہائی کے آخری حصہ ہی میں تقریباً پورے ہندوستان میں قحط کا سلسلہ شروع ہوا جنوبی ہند یعنی بمبئی اور مدراس پریسیڈنسی کے بیشتر حصے، مملکت نظام اور میسور میں قحط کا اثر سب سے زیادہ سنگین تھا اور یہ سلسلہ ۱۸۷۶ء سے ۱۸۷۸ء تک چلتا رہا۔ اسی وقت شمالی مغربی صوبہ اور اودھ میں قحط ہلکے طور پر محسوس کیا گیا۔ جیسا کہ ہندوستان کے قحط میں ہوتا ہے خشک سالی شروع ہونے سے پہلے ان علاقوں میں کئی برسوں سے بارش تھوڑی اور بے قاعدہ ہوئی تھی۔ اس لیے اناج کے اسٹاک کا ذخیرہ بہت کم ہو گیا تھا۔ شمالی مغربی صوبہ میں جہاں پہلے موسم موافق تھے، وہاں سے گیہوں یورپ بھیج دیا گیا تھا اس لیے اس کا اسٹاک بہت زیادہ کم ہو گیا تھا اور ریل کھل جانے سے گیہوں کی تجارت اب تیزی سے فروغ پا رہی تھی۔ جب قحط پڑا تو ملک اس کے لیے بالکل تیار نہ تھا۔ لوگوں کی مصیبتیں اس بات سے اور بڑھ گئیں کہ ہندوستان کے قحط کی عام خصوصیت چارے کا مکمل فقدان رہی ہے۔ اس کا مطلب عوام کے لیے کیا ہوتا ہے، اس کا اندازہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب ہم یہ غور کریں کہ کسان کی پونجی کا کتنا بڑا حصہ عموماً اس کے مویشیوں میں لگا ہوتا ہے۔ پورے ملک میں ریلیف کا کام بڑے پیمانہ پر شروع ہوا لیکن پھر بھی عوام کی ایک بڑی رو جنوبی ہندوستان کے تمام حصوں سے ترک وطن کر کے پچھمی گھاٹ کے علاقوں میں آگئی۔ یہ ہجرت اس ہجرت سے مختلف تھی جو راجپوتانہ کے قحط میں ہوئی تھی کیونکہ یہ ہجرت پچھمی گھاٹ کے جنگلوں میں چارے کی تلاش کے لیے تھی نہ کہ اپنی غذا کے لیے۔ غذا کی صحیح معنوں میں کوئی کمی نہ تھی۔ غلے کے تاجروں کی سرگرمیوں کی بدولت جو کچھ غلے کا اسٹاک تھا وہ پورے ملک میں تیزی سے تقسیم ہو گیا۔ بمبئی کے کرناٹک علاقہ کے صرف کچھ ہی حصوں میں جہاں ریلوے سسٹم ابھی تک ممکن نہیں ہو سکا تھا غذا کی واقعی کمی محسوس کی گئی۔ یہ قحط ہمہ گیر اور سنگین تھا ۱۸۸۰ء کے قحط کمیشن کا یہ خیال تھا کہ انگریزی سلطنت

۱۔ ہندوستانی قحط کمیشن کی رپورٹ (۱۸۸۰ء) حصہ دوم "گذشتہ قحطوں کی تاریخ"

کے قیام کے بعد ایسا سنگین قحط ہندوستان میں کبھی نہیں پڑا [1]۔ ۸۰-۱۸۷۰ء کی دہائی میں قحط کے سلسلہ کا تذکرہ مختصر طور پر پہلے کیا گیا ہے۔ کیونکہ قحط کے نتائج ہندوستان کے لیے اقتصادی اعتبار سے بہت اہم تھے اس دہائی میں خاص طور پر ایسا ہی تھا۔ ۱۸۵۰ء کے بعد سے ہندوستان کو کافی لمبے عرصہ تک قحط سے نجات مل گئی اور جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے ایسے حالات پیدا ہو گئے تھے جن سے تجارت و زراعت کے فروغ کا پتہ چلتا ہے۔

اس قحط کا ملک پر پہلا اور سب سے نمایاں اثر آبادی کی شرح اضافہ پر پڑا۔ ۸۱-۱۸۷۲ء کی دہائی میں ہندوستان کی آبادی مجموعی طور پر ۰ر۸۵ فیصد بڑھی [2] لیکن یہ اضافہ انتہائی بے قاعدہ تھا چونکہ ۱۸۷۲ء سے پہلے کوئی باضابطہ مردم شماری نہیں ہوئی تھی اس لیے مختلف صوبوں میں اضافہ کی شرح کا ٹھیک پتہ لگانا ناممکن تھا لیکن قحط زدہ صوبوں میں اضافہ کے اعداد و شمار قحط کے اثرات کا واضح ثبوت فراہم کرتے ہیں۔

بمبئی (برطانوی)	۹ برسوں میں	۲ر۰۵	فیصد کا اضافہ
مدراس پریسیڈنسی	۹ برسوں میں	۱ر۳۵	فیصد کی کمی
میسور	۱۰ برسوں میں	۱۷ر۱۹	فیصد کی کمی
کوچین ریاست	۶ برسوں میں	۱۴ر۰	فیصد کی کمی

چونکہ مملکت نظام کے اندر ۱۸۷۲ء میں کوئی مردم شماری نہیں ہوئی تھی اس لیے اس خطہ کے اعداد و شمار موجود نہیں۔ بمبئی پریسیڈنسی میں واقعی اضافہ ہوا ہے کیونکہ اس پریسیڈنسی کا پورا شمالی حصہ قحط سے محفوظ رہا تھا۔ لیکن ان تمام اعداد و شمار سے بھی نتائج کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا مثلاً مدراس پریسیڈنسی میں ہر طرح سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۶ء اور ۱۸۷۶ء کے درمیان بڑی خوشحالی کے سال تھے اور اس مدت میں عظیم اضافہ ہوا۔ ڈاکٹر کورنش کے مطابق ان بیس برسوں میں اس پریسیڈنسی کی آبادی دو کروڑ تیس لاکھ سے بڑھ کر تین کروڑ پندرہ لاکھ ہو گئی [3]۔ ۱۸۷۱ء کے اعداد و شمار میں فروگذاشت ہو گئی تھی اس لیے آبادی کا اصلی سدباب اس سے زیادہ تھا جس کا بیان اوپر کے اعداد میں ہوا ہے۔ دوسری بات جس سے اس کا پتہ چلتا تھا، یہ تھی

۱۔ ریلیف کے کاموں اور گوناگوں اختلافات خصوصاً کم شدہ یا ٹمپل وتج (Temple Vage) کے مفصل بیان کے لیے دیکھیں ڈبلو۔ ڈگبی:

۲۔ ڈبلو۔ سی۔ پلاؤڈن: ہندوستان کی مردم شماری سے متعلق رپورٹ (۱۸۸۱ء)

۳۔ ایل۔ میکاور: مدراس پریسیڈنسی کی مردم شماری سے متعلق رپورٹ (۱۸۸۱ء)

کہ آبادی کی تعداد گھٹ گئی تھی اور آباد مکانات کی فیصد شرح میں کمی ہوگئی تھی۔ مدراس پریسیڈنسی میں غیر آباد مکانات کی فیصد شرح ۱۸۷۲ء کی ۱۱٫۶ فیصد سے بڑھ کر ۱۸۸۱ء میں ۱۷٫۱ فیصد ہوگئی۔ آبادی کے اعداد گھٹ جانے کا سبب یہ نہیں ہے کہ اتنے بہت سے آدمی فاقہ کشی کی موت مرے تھے۔ ۱۸۷۶-۷۸ء کے قحط میں صرف فاقہ کشی سے اموات نسبتاً تھوڑی ہوئی تھیں لیکن قحط کے زمانہ میں لوگوں کو قلیل غذا پر بسر وقات کرنا پڑا تھا جس کے دو خاص اثرات آبادی کے لیے رکاوٹ بن گئے۔ کافی غذا کی کمی سے قلت کے زمانہ میں پیدائش کی شرح کم ہوگئی پھر اشیا کی کمیابی سے لوگ بدحال ہوکر بخار اور ہیضہ وغیرہ وباؤں کے بری طرح شکار ہوتے جو ہندوستان کے قحط کے مستقل ساتھی ہیں۔

قحط کا دوسرا برا اثر زرعی ترقی پر پڑا جو ہندوستان کی خوشحالی کے لیے زیادہ خطرناک ثابت ہوا۔ ایک بڑے قحط کے ہمیشہ یہی معنی ہوتے ہیں۔ اس امر کا عجیب و غریب ثبوت یہ ہے کہ ہندوستان کے ان علاقوں میں جہاں بارش وقت پر نہیں ہوتی کاشتکاری کے بدترین طریقے رائج ہیں۔ یہ خیال کہ اتنے برسوں میں قحط پڑنا لازمی ہے کسانوں کی زمین کو بہتر بنانے یا مویشیوں کو فروغ دینے کی خواہش کے لئے رکاوٹ بنا رہا۔ مویشی کا سوال بہت اہمیت رکھتا تھا۔ ہندوستان کے زیادہ تر حصوں میں کسانوں کی پونجی کا بڑا حصہ مویشی کی شکل میں ہوتا تھا لیکن یہ ایسی شکل میں لگایا ہوا تھا جس کا قحط کے زمانہ میں تباہ ہونا گویا یقینی تھا۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ ۱۸۷۶-۷۸ء کے عرصہ میں لوگ چارے کی تلاش میں ہجرت کرکے پچھمی گھاٹ چلے گئے تھے حکومت نے محفوظ جنگلوں (Reserve Forests) کو عام چراگاہ کے لیے دیدیا، پچھمی گھاٹ کے اہم راستوں پر چارے کے گودام قائم کیے اس طرح حکومت نے ملک کی مویشی بچانے کے لیے بڑا کام کیا لیکن عوام اور حکومت کی ان تمام کوششوں کے باوجود مویشیوں کی بڑی تعداد قحط کے دوران ختم ہوگئی۔

ہندوستان میں قحط نے واقعی اس دہائی میں بہت اہم رول ادا کیا ہے اس سے سچ مچ بڑی مصیبت آئی لیکن اس زمانہ میں اور دوسرے بہت سے اسباب بھی تھے جن سے کاشتکاروں کی حالت اور ابتر ہوگئی۔ ان گوناگوں حالات کا ذکر پہلے ہوچکا ہے جن سے اس دہائی کی پُرفریب خوشحالی کا پتہ چلتا تھا لیکن حقیقت کہ خوشحالی کم از کم مدراس اور بمبئی کے صوبوں میں کپاس کی قیمت میں اضافہ ہونے سے آئی تھی اس اچانک ردِعمل سے ظاہر ہوجاتی ہے جو خانہ جنگی ختم ہونے پر کپاس کی قیمت گھٹ جانے سے رونما ہوا جیسے ہی امریکہ نے کپاس کی برآمد شروع کی ہندوستانی کپاس کی مانگ تیزی سے گر گئی اور اس وقت بمبئی میں تجارت کا سلسلہ درہم برہم ہوگیا اور بہت سے ممتاز تاجر اکھڑ گئے۔ خوشحالی کی یہ رو کسانوں کے لیے بھی سودمند ثابت نہیں ہوئی جس سے وہ لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اس نے جو روپیہ حاصل کیا اسے بیدریغ خرچ

کیا! کچھ حالتوں میں تو کسانوں نے ساکھ بڑھ جانے کی وجہ سے اپنی اور ذمہ داریاں بڑھالیں۔ اس لئے کپاس کے بازار میں جیسے ہی گراوٹ آئی کاشتکاروں کی حالت اچانک بدتر ہوگئی۔

اسی زمانہ میں لگان کا بوجھ خاص طور پر جنوبی ہند میں کسانوں پر پڑنے لگا۔ بات یہ ہوئی کہ لگان میں اضافہ کا زمانہ چھٹی دہائی میں کسانوں کی اس عارضی خوشحالی کے زمانہ سے مل گیا جس سے وہ مستفید ہو رہے تھے۔ مالیات کے حاکموں نے کاشتکاری کے اس نفع کو معیار سمجھ کر لگان کو یکدم سے کافی بڑھا دیا لیکن جب خوشحالی کا دور گذر گیا تو کسانوں کے لیے لگان ادا کرنا قدرتی طور پر بہت مشکل ہو گیا اور تب وہ اچھا خاصا قرض لینے پر مجبور ہو گئے [۲]

پھر پورے ملک میں تجارت ماند پڑ گئی اور کچھ صنعتوں نے فرانس اور جرمنی کی جنگ سے خاص طور سے اثرات محسوس کیے۔ اناج کے دام جو اگلے دہائی میں مستقل طور پر بڑھتے جا رہے تھے یا تو ٹھہر گئے یا قحط کے زمانہ کو چھوڑ کر کچھ گرنے لگے۔ حکومت ابھی تک تعمیرات عامہ پر کثیر رقم خرچ کر رہی تھی لیکن روپیہ صرف کرنے کا صرف یہی مقصد نہ تھا۔ ۱۸۷۵ء میں لارڈ نارتھ بروک کے مستعفی ہونے پر حکومت ہند نے ایسی پالیسی اختیار کی جس کے نتیجہ میں فوجی مہموں اور دفتروں پر زیادہ خرچ کرنا لازمی ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام کے کندھوں پر ٹیکس کا بوجھ اور بڑھنے لگا۔

یہ تمام اسباب تو تھے ہی لیکن سخت قحط کے بار بار آنے سے ایسی مصیبت آئی جس کا احساس لوگوں کو برسوں نہیں ہوا تھا ان پریشانیوں کا ایک خاص نتیجہ یہ ہوا کہ دکن کے کچھ ضلعوں میں کسانوں کا فساد رونما ہوا۔ بمبئی پریسیڈنسی کے پونا اور احمد نگر ضلعوں میں بہت سی جگہوں پر کسان اکدم سے اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے مہاجنوں کے گھروں کی خوب لوٹ مار کی۔ کچھ معاملوں میں تو اور بھی تشدد کے واقعات ہوئے۔ زیادہ تر جگہوں میں کسانوں نے قرض کی دستاویزوں کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ کچھ عجیب اسباب سے یہ ہنگامہ پھوٹ پڑا۔ ان ضلعوں میں ۷۰-۱۸۶۰ کے دوران تعمیرات عامہ پر بے حد روپیہ خرچ کیا گیا تھا مگر اب وہ سارے کام پورے ہو چکے تھے۔ یہ حصہ ان علاقوں میں سے تھا جہاں کسانوں نے کپاس کی قیمتوں میں چڑھاؤ (Boom) آجانے سے یہ محسوس کیا تھا کہ اب ان کی ساکھ بڑھ گئی ہے اور اس وجہ سے انہوں نے اپنے قرض کی ذمہ داریاں بھی بڑھا لیں۔ اس کے علاوہ ان علاقوں میں سود پر روپیہ دینے کا کاروبار مارواڑیوں

۱۔ ایسٹ انڈین فینانس کمیٹی، ۱۸۷۲ء کے سامنے مسٹر نوروجی فردونجی کی گواہی۔

۲۔ دکن میں فسادات سے متعلق کمیٹی کی رپورٹ (۱۸۷۶ء)

کے ہاتھ میں تھا یہ ساہوکار بے ایمان تھے اور اس صوبہ کے لیے اجنبی بھی۔ یہ شورش آسانی سے دبا دی گئی لیکن اس کے اسباب کی جانچ کرنے والی کمیٹی نے بتایا کہ یہ شورش بعض بنیادی برائیوں کا نتیجہ تھا جن کی جڑیں بہت گہری تھیں۔ یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ دنیا بھر کے کاشتکار بڑی آسانی سے قرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ خاص طور پر ہندوستان میں اعلیٰ پیمانہ پر کھیتی بڑی حد تک عنقا ہے لیکن انگریزوں کی آمد سے پہلے زمین کی منتقلی پر عائد متعدد پابندیوں کی وجہ سے یہ عمل بڑی حد تک رکا رہا اور کچھ علاقوں میں حکومت نے بھی مہاجنوں کے قرض دلانے کے لیے امداد دینے سے انکار کر کے اس کی روک تھام کی [1]

انگریزوں نے کسانوں کو تبادلہ اور ملکیت کا مطلق حق خصوصاً "رعیت داری" خطوں میں دیدیا تھا جو انہیں اس سے پہلے کبھی حاصل نہ تھا پھر عدالتی نظام کے بروئے کار آجانے سے مہاجنوں کو اپنے قرض داروں پر بڑا اختیار حاصل ہو گیا اور پھر حد بندی قانون (Limitation Act) سے قرض داروں کی حالت ابتر ہو گئی جس کے مطابق قرض کی دستاویزوں کا مختصر مدت میں تجدید کرنا لازمی ہو گیا [2] اس طرح کسانوں کا قرض دار ہونا گرچہ کوئی پریشانی کی بات نہ تھی تاہم دوسرے اسباب کی وجہ سے قرض داروں کی حالت زیادہ تر صوبوں میں واقعی غلام کی سی ہو گئی تجارت کی عام توسیع اور کسانوں کی فصلوں کی پورے ملک میں خاص بازاری اہمیت ہو جانے کی وجہ سے کاشتکاروں کی ساکھ بڑھ گئی۔ چونکہ عدالت کے ذریعہ روپیہ وصول کر لینا آسان ہو گیا اس لیے مہاجنوں نے اور روپیہ قرض دینا شروع کر دیا۔ خوشحالی کے زمانہ میں یہ عمل کارفرما رہا اور کسان بھول گئے کہ وہ کدھر جا رہے ہیں لیکن جیسے ہی ردعمل شروع ہوا اور مہاجنوں نے کاشتکاروں کی زمین پر اپنی گرفت مضبوط کرنا شروع کی تو کاشتکاروں کو ان کی اصلی اہمیت اچانک معلوم ہوئی۔

کم و بیش یہ بات بڑی حد تک ہندوستان کے تمام حصوں پر صادق آتی ہے [3] متذکرہ بالا اسباب اور ان کے نتائج بڑے اہم ہیں کیونکہ اس دہائی میں زمین اصلی کاشتکاروں کے ہاتھوں سے بتدریج منتقل ہو کر

۱۔ دکن میں فسادات سے متعلق کمیٹی کی رپورٹ (۱۸۷۶ء)

۲۔ ایضاً باب پنجم

۳۔ دیکھیں ایضاً ضمیمہ اے: بمبئی اور ہندوستان کے دوسرے حصوں میں زرعی طبقات کی قرض داری سے متعلق کاغذات (۱۸۷۵ء) پنجاب میں اس طرح کی مثال کے لیے دیکھیں۔ ایس۔ ایس۔ تھوربرن کی کتاب مسلمان اور مہاجن (۱۸۸۶ء) اور ہندوستان میں زمین کے تبادلہ اور زرعی قرض داری سے متعلق نوٹ (۱۸۹۵ء) اس کے علاوہ "زرعی مقروضیت متعلق شہادت" ہندوستان قحط کمیشن کی رپورٹ (۱۸۸۰ء) دیکھیں۔

زیادہ تر مہاجنوں کے ہاتھ آنے لگی۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ سلسلہ ایک حد تک مفید ثابت ہوا کیونکہ زمین اب منتقل ہو کر زمین رکھنے والے طبقہ یا ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آئی جو ہوشیار کاشتکار تھے لیکن ملک کے زیادہ تر حصوں میں یہ صورت حال نہ تھی۔ مثلاً دکن میں مارواڑی کبھی یہ نہیں چاہتے تھے کہ زمین پر قبضہ کرلیں۔ بہت سے معاملات میں تو وہ زمین اپنے نام قانونی طور پر منتقل نہیں کراتے تھے، بلکہ پرانے کاشتکاروں کا ہی نام رہنے دیتے۔ مارواڑی تو بس یہ کرتا کہ وہ قرض کی متعدد دستاویزوں کی بنا پر کھیتی باڑی کا سارا منافع وصول کرلیتا۔ کاشتکار سال بھر محنت مشقت کرتے مگر سال کے آخر میں ان کا رزق مارواڑی کی مہربانی اور معقولیت پر منحصر ہوتا تھا۔ اس طرح دکن کے کسانوں کا ایک بڑا حصہ محض غلام بن کر رہ گیا۔ اس رجحان کو روکنے کے لیے سرکار نے قانون بنائے جن سے زمین منتقل کرنے پر پابندی لگ گئی۔ ان قوانین میں پہلا دکن کے کاشتکاروں کا رلیف ایکٹ (۱۸۷۹ء، ۱۸۷۹ء) ہے۔

اس ایکٹ کی خاص دفعات کا یہاں پر ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا اول یہ کہ قرض کے سلسلہ میں گرفتاری یا قید اٹھادی گئی۔ یہ ایک مفید اقدام تھا کیونکہ قانون کا یہ ایک ایسا حربہ تھا جس سے ڈرا دھمکا کر مہاجن کاشتکاروں پر اپنا اختیار جمائے ہوئے تھے۔ کچھ شرطوں کو پورا کرکے قرض دار دیوالیہ قرار دے دیا جاتا اس طرح وہ آئندہ تمام ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو جاتا۔ کسانوں کی ایمانداری کا یہ بین ثبوت ہے کہ انہوں نے اس دفعہ کا شاذ و نادر ہی کبھی سہارا لیا۔ چھوٹی رقم کے مقدمات دیکھنے اور ممکن حد تک رقم کے منصفانہ اور معقول حل کی خاطر گاؤں کے لیے منصف اور مصالحتی بورڈ کا تقرر ہوا۔ اگر کسی کاشتکار کا معاملہ ہوتا تو عدالت کے لیے قرض کی سابق تاریخ کی جانچ پڑتال کرنا ضروری ہو جاتا۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۸۷۰-۸۰ء کی دہائی میں کاشتکاروں نے جو کچھ ترقی کی تھی وہ زیادہ تر ضائع ہوگئی۔ ایک لمبے عرصہ سے ان کی حالت کچھ علاقوں میں سچ مچ بہت خراب تھی[۱]۔ لیکن ایک عام تقابلی گوشوارہ پیش کرنا ناممکن ہے۔ قحط کے حالات سے کاشت کے رقبہ اور پیدا ہونے والے اناج کی نوعیت پر قدرتی طور پر اثر پڑا لیکن زرعی اعداد و شمار نہ ہونے کی وجہ سے یہ کہنا ناممکن ہے کہ کاشت کے رقبہ میں اضافہ ہوا یا فصلوں میں کوئی اہم تبدیلی ہوئی[۲] لیکن ایسی تبدیلیوں کے فرض کرنے کا کوئی خارجی ثبوت نہیں۔ صرف ایک چیز مسلم ہے: مالیاتی کمیٹی اور قحط کمیشن کے سامنے جو شہادتیں پیش کی گئیں ان سے اور دوسرے ماخذ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس دور کے آخر میں کاشتکار انتہائی مفلسی سے ہمکنار تھے۔

۱۔ جھانسی کے کسانوں کی حالت سے متعلق تبصرے دیکھیں "زرعی مقروضیت سے متعلق شہادت" ہندوستانی قحط کمیشن کی رپورٹ (۱۸۸۰ء)

۲۔ سی۔ اے۔ ایلیٹ: "ہندوستان میں زرعی اعداد و شمار سے متعلق تبصرہ" ایضاً ضمیمہ دوم

تیسرا باب

دستی صنعتوں کا انحطاط

انیسویں صدی کے آغاز میں ہندوستان کی شہری صنعت خاص طور پر دستکاری کی شکل میں تھی جو شرفا کے لیے عمدہ سوتی کپڑے یا تعیشیاتی اشیا تیار کرتی تھی۔ شہری صنعت گرچہ اپنی نوعیت و وسعت کے اعتبار سے محدود تھی تاہم یہ ایک لحاظ سے بڑی اہم صنعت تھی کیونکہ یہ ہندوستان کی سب سے زیادہ منظم صنعت تھی اور اپنی حیثیت کی وجہ سے اس نے سب سے پہلے خارجی مقابلہ کے اثرات کو محسوس کیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان کی شہری صنعت نے ان دستکاریوں میں نفاست کا اعلیٰ معیار حاصل کیا تھا۔ ہندوستانی مصنوعات کو عالمگیر شہرت مل گئی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے تجارتی دور میں بنگال کی کالیکو اور کورا ہندوستان کی تجارتی اشیا میں خاص حیثیت رکھتی تھیں۔ ان نفیس مصنوعات کے اعلیٰ معیار پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ ان کی بڑی خوبی یہ تھی کہ نفاست کے اعلیٰ معیار کے ساتھ ساتھ افادیت کا پہلو بھی ہوتا تھا! ڈاکٹر واٹسن کا یہ خیال ہے: "تزئین و آرائش کا ہندوستانی ذوق نہایت پاکیزہ ہے، بیجا آرائش نہیں ہوتی ... اور نہ اس آرائش کا غیر ضروری استعمال ہوتا ہے۔ جو عموماً آرام و آسائش کے پہلو کو قربان کر کے محض نمائش کو اپناتی ہے"[2] ۱۸۵۱ء کی عظیم الشان نمائش کے ہندوستانی گوشہ کو دیکھ کر ایک فرانسیسی ایم بلانکی (M. Blanqui) نے ہندوستانی کاریگروں کی بڑی تعریف کی اور اس نے یہ کہا تھا:

۱۔ جے۔ ایف۔ رائل: ہندوستان کے فنون اور صنعت گر، ۱۸۵۱ء کی عظیم الشان نمائش کے نتیجہ سے متعلق خطبات، پہلا سیریز

۲۔ جے۔ ایف۔ واٹسن: ٹیکسٹائل صنعت گر اور ہندوستانیوں کے لباس، ص ۵ (۱۸۶۷ء)

۳۔ رائل، ج۔ س۔ ص ۵۳۴

واقعی ہندوستان کی خاص صنعت ٹکسٹائل کی دستی صنعت تھی۔ یہ ظاہر ہے کہ سوتی کپڑے کی صنعت پہلے آتی تھی، یہ صنعت پورے ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھی ! ڈھاکہ کی ململ ان میں سب سے زیادہ نفیس تھی اور جانی پہچانی تھی۔ مانچسٹر کے ایک صنعت گر نے جب اس کی نفاست کا مقابلہ نہ کر سکا تو اس نے اس سے متعلق کہا تھا کہ یہ گویا "ایک شئے کا سایہ" ہے ڈھاکہ میں ململ ۱۸۸۰ء میں بھی تیار ہوتی تھی لیکن اس کے معیار میں بڑا ہی انحطاط آگیا تھا اور یہ صنعت تیزی سے ختم ہو رہی تھی۔ یہ ایک صنعت تھی جس کی بقاء کا انحصار پورے طور پر خوشحال اور تعیش پسند دربار پر تھا۔ ململ کا ۲۰ گز لمبا اور ایک گز چوڑا ٹکڑا (مسٹر مکرجی کا قول ہے) ایک انگوٹھی سے گذر سکتا تھا اور یہ چھ مہینوں میں تیار ہوتا تھا[۲] دربار کی وجہ سے باقاعدہ مانگ برابر ہوتی رہتی تھی لیکن اس کے خاتمہ پر یہ صنعت بھی ختم ہوگئی۔ ڈھاکہ کے علاوہ کرشنا نگر، چندری اور دوسری چند جگہوں میں ململ تیار ہوتی تھی۔

ململ کے بعد دوسری اہم مصنوعات میں ہر طرح کے عمدہ سوتی کپڑے آتے ہیں جو سارے ہندوستان میں تیار ہوتے تھے۔ شمالی مغربی صوبہ میں لکھنؤ اپنے چھینٹ کے لیے اور احمد آباد دھوتی اور دوپٹہ بنانے میں مشہور تھا۔ صوبہ متوسط میں ناگپور، اُمریہ اور پاونی اپنی ریشمی کناری والے کپڑوں کے لیے معروف تھے۔ مدراس پریسیڈنسی کی خاص صنعت پلمپور (Palampore) کی تھی[۳] مدورا اور دوسری بہت سی جگہوں کے سوتی کپڑے بھی مشہور تھے۔

سوت کے صنعت گر واقعی سب سے زیادہ پھیلے ہوئے تھے۔ اس کے بعد ریشمی کپڑوں کے بنکروں کا درجہ تھا ان میں مرشد آباد، مالدہ اور بنگال کے دوسرے شہروں کے چوپے، بندنا اور کوراسب سے زیادہ مشہور تھے جن کی مانگ برآمد کے لیے ہمیشہ زیادہ ہوتی تھی[۴] بنارس اور احمد آباد کے خوبصورت گلکاری سے مزین کپڑے اور پونا، یولا اور دوسری جگہوں میں تیار ہونے والے ایسے کپڑے بھی شامل تھے جن کے رنگوں کی دہری بنائی ہوتی تھی۔

۱۔ دستکاریوں کی عمومی تعریف و تقسیم کے لیے دیکھیں رائل کی کتاب مذکورہ، سرجی برڈووڈ، ہندوستان کے صنعتی فنون (۱۸۸۰ء) اور ٹی۔ این۔ مکھرجی، آرٹ مینوفیکچرس آف انڈیا۔

۲۔ ٹی۔ این۔ مکھرجی : ہندوستانی مصنوعات کا رسالہ (۱۸۸۳ء)

۳۔ ہندوستانی آرٹ کے جریدہ (۹۰-۱۸۸۹ء) میں پنڈت تیسا شاستری کا مضمون "جنوبی ہندوستان کے فنون کا انحطاط" دیکھیں

۴۔ جے۔ جیوگھاگن : ہندوستان میں ریشم سے متعلق رپورٹ (۱۸۷۲ء)

اونی کپڑوں میں سب سے مشہور اور نفیس شال تھی جو خاص طور پر کشمیر، امرتسر، لدھیانہ اور پنجاب کے کئی شہروں میں تیار ہوتی تھی۔ ۱۸۸۰ء تک یہ صنعت تیزی سے ختم ہو رہی تھی اور یہ زوال اتنا فوری ہوا کہ ۱۸۹۵ء تک یہ صنعت صرف روایت بن کر رہ گئی، ماضی کی صرف ایک یاد۔ اس صنعت کی تاریخ بڑی دلچسپ ہے کیونکہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تھوڑی مدت میں دوسری دستکاریاں نئے حالات میں آ کر مختلف مراحل سے گذریں۔ یہ صنعت پہلے کشمیر میں محدود تھی لیکن کشمیر کی شال کی شہرت پورے ہندوستان میں پھیل گئی اور ہر جگہ درباروں میں شال کی مانگ تھی۔ ۱۸۳۰ء کے قریب کشمیر میں بڑا قحط آیا جس سے شال کے بہت سے کاریگر پنجاب آگئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے اور پھر یہاں اپنا کام شروع کیا۔ اب تو امرتسر شال کی تجارت کی ایک خاص منڈی ہو گئی لیکن اس زمانہ میں یعنی اس صدی کے وسط میں اس صنعت میں ایک بڑی تبدیلی آ رہی تھی۔ شال یورپ میں خصوصاً فرانس میں بڑی مقبول ہو رہی تھی اور فرانسیسی تاجر رفتہ رفتہ اس صنعت پر اپنا قبضہ جما رہے تھے چھٹی دہائی کے دوران اس صنعت پر ان کا گویا مکمل قبضہ ہو گیا تھا وہ بنکروں کو روپیہ پیشگی دیدیتے اور ان سے تیار شدہ مال خرید لیا کرتے تھے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ان کا ہی کمال تھا کہ انہوں نے ملاوٹ کی برائی کو روکا اور اس صنعت میں انیلین (Anniline) رنگ کو داخل ہونے نہ دیا۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہے جسے اس موضوع کے تمام ماہرین نے ہندوستان کے سوتی کپڑوں کی دستکاری کے زوال کا ایک سبب بتایا ہے[۲] لیکن فرانس اور جرمنی کی جنگ نے اس صنعت پر بڑی ضرب لگائی جس سے وہ کبھی جانبر نہ ہو سکی۔ اس جنگ نے فرانس کی مانگ کو یکدم ختم کر دیا۔ جنگ ختم ہونے کے بعد بھی فرانس میں فیشن کے بدل جانے اور دوسرے اسباب کی بنا پر وہ مانگ پھر پیدا نہ ہو سکی۔ چھٹی دہائی کے عرصہ میں شال کی صنعت پنجاب کی شاید سب سے زیادہ ترقی یافتہ صنعت تھی لیکن اگلی دہائی میں اس کا زوال تیزی سے ہوا ملاوٹ کی برائیاں اور نقصان دہ انیلین رنگ تیزی سے داخل ہو گئے۔ سب سے سستے اور گھٹیا درجہ کے سامان مارکٹ میں پیش کرنے کی کوشش نے اس صنعت کی شہرت کو خاک میں ملا دیا اور بنکر کا حال روز بروز خراب ہونے لگا۔ شال کی صنعت ایک نیم بیگار صنعت بن گئی۔ اسی زمانہ میں پیسلے (Paisley) شال کی سستی نقل نکال

۱۔ سر ڈبلو۔ آر۔ لارنس: کشمیر کی وادی ص ۳۷۵ الخ

۲۔ لیکن سر جی برڈ ووڈ کا خیال ہے کہ فرانسیسی تاجروں نے ان تمام قسموں کا یورپی پیٹرن رائج کر دیا جو اس زمانہ میں مقبول تھیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس صنعت کی فنی خوبی میں انحطاط تیزی سے شروع ہو گیا۔ برڈ ووڈ کی کتاب مذکورہ دیکھیں۔

رہا تھا۔ یہ آخری اور کاری ضرب تھی۔ اس کے بوجھ تلے یہ صنعت ختم ہوگئی اور جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ نویں دہائی میں یہ صرف ایک روایت بن رہ گئی !

ٹکسٹائل اور بنے ہوئے کپڑوں کے علاوہ دھات کے کام ہوتے تھے۔ پورے ہندوستان میں بنارس پیتل، تانبے اور گھنٹے والی دھات کے سامان کے لیے مشہور تھا۔ اس کام کے دوسرے اہم مراکز بمبئی پریسیڈنسی ناسک، پونا اور جنوب میں حیدرآباد، وزیگاپٹم اور تنجور تھے۔ اُس صنعت کے یہ صرف چند اہم مراکز تھے جو سارے ہندوستان میں پھیلے ہوئے تھے دوسرے بہت سے دھات کے کام جیسے قلعی گری، ملمع سازی اور بدری نے اعلیٰ معیار حاصل کرلیا تھا۔ دھات پر سونے یا چاندی کے کام خاص طور پر ہتھیار اور ڈھال وغیرہ کو زینت بخشنے کے لیے مروّج تھے۔ یہ کام خاص طور پر کچھ، سندھ اور پنجاب کے شہر جیسے سیالکوٹ، کوٹلی، لاہو وغیرہ میں ہوتا تھا

راجپوتانہ کے شہر بھی ہر طرح کی نفیس کاریگری خصوصاً قلعی شدہ زیورات، پتھر پر نقاشی وغیرہ کے لئے شہرت رکھتے تھے۔ ایسی دستکاریوں کی تعداد پورے ہندوستان میں بہت زیادہ تھی اور نفیس دستکاریوں کی زیادہ تر شکلیں کسی نہ کسی جگہ رائج تھیں۔ ان دستکاریوں میں محنت کی کافی تقسیم ہوتی تھی۔

محنت کی یہ تقسیم قدرتی طور پر اتنی نازک اور مکمل نہیں ہوتی تھی جتنی ترقی یافتہ مشینی آلات کے جدید دور میں ممکن ہے لیکن جہاں تک استعمال ہونے والے مختلف آلات اجازت دیتے، ان نفیس صنعتوں میں محنت کی تقسیم بلاشبہ ہوتی تھی۔ کسی شعبہ میں مہارت اور کمال حاصل کرنے کے لیے ظاہر ہے، ایسی تقسیم ضروری تھی مثلاً سونے چاندی کا دھاگہ تیار کرنے میں اشیا کو مختلف درجہ کے کاریگروں سے گذرنا پڑتا تھا۔ محنت کی ایسی تقسیم کے ساتھ ساتھ صنعت ایک حد تک خاص خاص مقام میں محدود ہوتی تھی لیکن علاقائی طور پر محدود ہونے کا عمل بہت ناقص تھا۔

اس طرح ہر شہر میں مختلف دستکاریوں کو تکمیل دینے والی صنعتیں تھیں بے شک قدرتی اسباب کی بنا پر جن سے خام اشیا کی سپلائی متعیّن ہوتی ہے یا دوسرے اسباب سے کچھ دستی صنعتیں ملک کے مختلف حصوں میں محدود تھیں جیسے شال کی صنعت یا کچلے ہوئے کاغذ کا کام کشمیر میں [۲] یہ بھی سچ ہے کہ کچھ صنعتیں طویل روایات اور دوسرے ایسے اسباب کی وجہ سے خاص خاص شہروں کی گویا اجارہ ہوگئیں۔ جیسے آگرہ میں سنگِ مرمر پر نقاشی [۳] اس کے علاوہ خاص خاص علاقے اپنی مخصوص مصنوعات کے لیے مشہور ہو گئے تھے

۱۔ لارنس: کتاب مذکور اور ڈی۔سی۔جان سٹون: مونوگراف، پنجاب کے اون کے صنعت گر (۱۸۸۶ء)

۲۔ دوسری اچھی مثال میسور اور دکھنی کناڑا کی صندل لکڑی پر نقاشی کی ہے۔ (آگے صفحے پر)

اس کی مثال اس طرح دی جا سکتی ہے: یولا کی پیتھانی (Paithani) جو سارے مرہٹہ علاقہ میں مشہور تھی، ہندوستان کے کونے کونے میں لوگ کمخواب سے واقف تھے یا شمالی ہندوستان کے خاص شہروں کی پھول کاری معروف تھی، لیکن ان مستثنیات کے باوجود متذکرہ بالا نکتے اپنی جگہ پر اٹل ہیں۔ قابل لحاظ اہم خصوصیت یہ ہے کہ دستی صنعتوں سے تیار شدہ مال کی مانگ زیادہ تر اسی علاقہ میں محدود ہوتی تھی جہاں یہ تیار ہوتا تھا چند نادر چیزوں کے علاوہ باہر کی مانگ نہ ہونے کے برابر تھی۔ ہندوستان کی دستکاری کی صنعت پر سب سے بڑی پابندی یہی تھی کہ اس کی کھپت کا علاقہ محدود تھا کیونکہ اس نے اس کے سائز اور اس کی اندرونی تنظیم کی ترقی کو بری طرح متاثر کیا تھا۔

پھر بھی ہندوستان میں موجود دوسری صنعتوں کے مقابلہ میں شہری صنعت یقیناً سب سے زیادہ منظم تھی۔ ہندوستان کی صنعتی آبادی کی زیادہ اکثریت گاؤں میں آباد تھی لیکن وہ زیادہ تر معمولی کاریگر ہوتے تھے جن میں سے بیشتر گاؤں کے ملازم ہوتے جو خارجی دنیا سے اثر قبول کیے بغیر اپنے روایتی مشاغل کو برقرار رکھتے۔ یہاں کسی خاص صنعت میں مہارت حاصل کرنے کا جذبہ نہ تھا۔ اقتصادی تنظیم بہت ہی پرانے طرز کی تھی لیکن بڑے شہروں میں ہر صنعت سے وابستہ ایک انجمن تھی جو اس کے ارکان کی فلاح و بہبود اور ان کے کاموں کے معیار کی نگراں ہوتی کبھی کبھی جیسے احمد آباد میں شہر کا معروف ترین شخص انجمنوں کا برائے نام صدر ہوتا تھا جو نگر سیٹھ یا امیر شہر کہلاتا تھا۔ سر جارج برڈوڈ ان انجمنوں کے عام دستور کے بارے میں کہتے ہیں:

"ہر ایک علیحدہ انجمن کی تنظیمی ذمہ داری سرداریا مہاجنوں کے علیحدہ دفتر پر ہوتی ہے جن کے معنی 'ناموَر شرفا' کے ہوتے ہیں۔ ویسے عام طور پر یہ انجمن ایک ذات کے تمام آزاد اشخاص پر مشتمل ہوتی ہے لیکن اس کے صدر سیٹھ یا اُمرا ہوتے ہیں جن کی تعداد دو ہوتی ہے۔ یہ لوگ موروثی حقوق رکھتے ہیں۔ دوسرا عہدہ دار کارندہ یا گماشتہ باقاعدہ تنخواہ پر کام کرتا ہے[1] دستکاریوں سے وابستہ کاریگر عموماً بڑا سرمایہ دار نہیں ہوتا تھا وہ عام طور پر گاہکوں سے سامان لے کر ان کے آرڈر حاصل کرتا اور انھیں تیار کر کے سپلائی کرتا لیکن جہاں تک حالات اجازت دیتے، ہندوستان کی شہری صنعتیں بڑی منظم تھیں اور جب تک ان کے تیار شدہ مال کے لیے مانگ آتی رہتی اس وقت تک ان کی حالت روبہ ترقی ہوتی۔ مختصر یہ کہ انیسویں صدی کے آغاز میں

(پچھلے صفحہ سے آگے)

۴۔ اس صنعت کے آگرہ میں محدود ہونے کا خاص سبب یہ تھا کہ راجپوتانہ کی سنگ مرمر کی کانیں اس کے قریب تھیں۔

۱۔ برڈوڈ: ج۔س۔ ج اول ص ۱۳۹

کی حیثیت ہندوستان کی اقتصادی سرگرمیوں میں بڑی اہم اور مناسب تھی۔ اس کے باوجود ہم ان دستکاریوں کی فنی نفاست اور اقتصادی اہمیت میں تیزی سے آنے والے انحطاط کے مسئلہ سے دوچار ہوتے ہیں۔ یہ انحطاط کے مسئلہ سے دوچار ہوتے ہیں۔ یہ انحطاط انیسویں صدی کے وسط میں بہت نمایاں ہو گیا گرچہ یہ بعض صورتوں میں اٹھارہویں صدی کے آخر میں شروع ہو چکا تھا۔

اس صورت حال کے بہت سے اسباب تھے لیکن ان میں سب سے زیادہ اہم یہ تھے (۱) ہندوستان کے مقامی درباروں کا خاتمہ (۲) بیرونی حکومت کا قیام اور اس کے ساتھ بہت سے بیرونی اثرات کا داخل ہونا جو حکومت کی تبدیلی کا لازمی نتیجہ تھے۔ (۳) صنعت کی زیادہ ترقی یافتہ شکل کا مقابلہ۔

ان میں پہلی صورت کے معنی یہ ہوئے کہ ان دستکاریوں سے تیار شدہ مال کی خاص مانگ یا پوری مانگ کا خاتمہ ہو گیا۔ ہم نے مسٹر ہوئے (Mr. Hoey) کا حوالہ یہ بتانے کے لیے قبل دیا ہے کہ لکھنؤ کی دستکاریوں پر اس کے کیا اثرات ہوئے۔ نواب کے دربار ختم ہو جانے سے یہ معلوم ہوا کہ ان نفیس اشیاء کی اب کوئی حاجت نہیں رہی جن کی ضرورت امراء ریاستی مواقع پر دربار میں نمود کے لیے اور دوسرے جشن کے وقت محسوس کرتے تھے!¹ جہاں دربار ختم ہوا دستکاریوں اور فنون لطیفہ پر زوال آ گیا۔ شروع میں یہ عمل تیز نہ تھا۔ دربار گرچہ ختم ہو گیا تھا پھر بھی امراء کا طبقہ تو باقی تھا۔ جگہ کی شہرت یکایک ختم نہیں ہوئی، پورے طبقہ کی طرز آرائش اکدم سے بدل نہیں سکتی تھی۔ اسی طرح دربار کے ختم ہونے کے بعد بھی تعیشاتی اشیاء کی مانگ بیشتر جگہوں میں باقی رہی لیکن یہ مانگ رفتہ رفتہ گھٹ رہی تھی۔ نئی نسل کی پرورش ایسے ماحول میں ہوئی تھی جو پرانے دربار کی شان و شوکت سے ناواقف تھی یہ اور بات ہے کہ اس نے اس کے بارے میں کچھ سن رکھا تھا۔ فنون لطیفہ اور دستکاریوں کی حوصلہ افزائی کے لیے ان کے پاس وہ وسائل بھی نہ تھے جو پرانے دور میں میسر تھے۔ یہ بات دوسری حقیقت سے بھی اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے؛ انگریزی سلطنت گرچہ پورے ہندوستان میں آہستہ آہستہ پھیل رہی تھی پھر بھی بہت سے مقامات براہ راست اس کے زیر اثر نہیں آئے تھے۔ مقامی بادشاہ ابھی تک بہت سی جگہوں میں باقی رہ گئے تھے حالانکہ ان کی شان و دولت بڑی حد تک چھن گئی تھی یہ حقیقت معنی خیز ہے کہ ان ریاستوں کے بہت سے دارالسلطنت والے شہروں میں دستکاریاں ابھی تک ترقی کر رہی تھیں جبکہ

۱۔ اودھ کے نوابوں نے لکھنؤ میں رنگ ریزی کی صنعت کو اس شرط پر فروغ دیا تھا کہ امراء سال کے مختلف تیوہاروں میں مختلف رنگوں کے لباس میں حاضر ہوں۔ ۱۸۶۵ء کے بعد لکھنؤ میں رنگ ریزی کی صنعت کا انحطاط بہت تیزی سے ہوا۔ ایس۔ ایم۔ ہادی؛ مونوگراف، رنگ اور رنگ ریزی، شمالی و مغربی صوبہ (۱۸۹۶ء)

انگریزی سلطنت کے علاقوں میں یہ تیزی سے دم توڑ رہی تھیں۔ ایسی مثالیں کشمیر، راجپوتانہ، کاٹھیاوار کی کچھ ریاستوں اور نظام کی سلطنت میں مل سکتی تھیں لیکن ایک دوسری قابلِ غور بات یہ ہے کہ ان سلاطین کی بدولت نہ صرف یہ کہ ان اشیاء کی مانگ تھی بلکہ وہ بعض بہترین کاریگروں کو مستقل تنخواہ دے کر اپنے پاس رکھتے تھے[1]۔ اس طرح کاریگر اپنی رزق سے مطمئن ہو کر سامان تیار کرتے اور فرصت کے اوقات میں اپنے سامان کو منڈی میں بھیجنے کی عجلت نہیں ہوتی۔ اس بات کو طول دینا مناسب نہیں لیکن اتنا تو صاف ظاہر ہے دربار کے زوال سے ہندوستانی دستکاریوں پر شدید ضرب لگی اس لیے کہ ان کے تیار شدہ سامان کی مانگ رفتہ رفتہ گھٹنے لگی۔ اس کا فوری اثر یہ ہوا کہ اعلیٰ درجہ کی اشیاء کی تیاری رُک گئی جن کی ضرورت سلاطین کو اہم شاہی تقریب کے موقع پر ہوتی تھی۔ دربار ختم ہونے پر بھی عام مانگ تو برقرار رہی لیکن یہ برابر گھٹنے لگی۔

تاہم صرف درباروں کے زوال سے دستکاریوں کے انحطاط کا پورا پتہ نہیں کیونکہ جہاں دربار قائم تھے وہاں بھی زوال گرچہ آہستہ آہستہ آرہا تھا پھر بھی اتنا ہی ناگزیر تھا جتنا کہ انگریزی سلطنت میں۔ ایک حد تک دوسرے سبب سے اس کی وضاحت ہوتی ہے کیونکہ ایک بیرونی حکومت کے قیام کے ساتھ ساتھ خارجی اثرات ان فیوڈل صوبوں میں بھی داخل ہو گئے جو ان دستکاریوں کے وجود کے لیے ناسازگار تھے۔

اوپر یہ بتایا جا چکا ہے کہ کس طرح صنعت کی وہ مانگ ختم ہو گئی جو درباروں کے وجود سے قائم تھی۔ یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ مانگ کے نئے سرچشمے کیا تھے۔ دستی صنعتوں کے کاریگروں کے ذریعہ تیار شدہ مال کی مانگ صرف شہر کے امیر طبقہ میں ہو سکتی تھی اس لیے ہم قدرتی طور پر اس طبقہ کی طرف رجوع ہوتے ہیں جس نے انگریزی سلطنت کے زمانہ میں وہی رتبہ حاصل کر لیا تھا جو امراء کو پرانے زمانہ میں معاشی اعتبار سے حاصل تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پرانے امراء خاندان کے بہت سے ورثاء ابھی تک کافی دولت مند تھے لیکن چونکہ ان میں سے زیادہ تر زمین کے مالک تھے اور ان کے لیے شہروں میں رہائش کے لیے اب کوئی کشش باقی نہ رہ گئی تھی اس لیے وہ قدرتی طور پر اپنی زمین کی طرف لوٹ گئے۔ شہروں میں اس منصب پر دو طبقوں نے قبضہ کر لیا تھا (۱) فرنگی حکام (۲) نیا تعلیم یافتہ پیشہ ورانہ طبقہ۔

ہندوستانی سامان کے لیے طبقۂ حکام کی مانگ کے ساتھ یورپی سیاحوں کی مانگ کو بھی شامل کر سکتے ہیں۔ ہندوستانی دستکاریوں پر اس کی مانگ کے دو اثرات ہوئے۔ پہلا یہ کہ اس نے یقینی طور پر ان دستکاریوں

۱۔ کبھی کبھی ریاست خود بڑی بڑی کارگاہ چلاتی تھی۔ دیکھیں پروفیسر جے۔ سرکار کا مضمون: مغلیہ سلطنت میں ریاستی صنعتیں، موڈرن ریویو (نومبر ۱۹۲۲ء)

کے انحطاط کو روکے رکھا۔ ان کے ذریعہ جو مانگ بڑھی تھی وہ اس مانگ کے مقابلہ میں بہت کم تھی جو ایک ہندوستانی دربار کی وجہ سے ہوتی تھی لیکن یہ تیزی سے بڑھتے ہوئے زوال کو روکے رکھنے کے لیے ایک سہارا تھی۔ یورپی مانگ کا دوسرا اثر جو ہوا وہ ذرا مشکوک ہے۔ اس مانگ سے تیار ہونے والے سامان کی فنی قدر واقعی گرنے لگی۔ اس کی بین مثال کشمیر کی شال کی صنعت میں ملتی ہے جب فرانسیسی ایجنٹ یورپ کے پیٹرن کو اس صنعت میں داخل کرنے لگے لیکن یہ قصہ ہر جگہ رہا۔ یورپ والوں نے نئے فارم اور ایسے پیٹرن داخل کیے جو یہاں کے کاریگروں کی سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ انہوں نے اپنے گاہکوں کو خوش کرنے کی کوشش کی اور بڑی مستقل مزاجی سے ان شکلوں کی نقل پیش کی۔ یہ مصنوعات کبھی کبھی اصل کی بڑی خراب نقالی ہوتی تھیں! لیکن جب یہ اچھی نقل بھی ہوتیں تب بھی ان میں مقامی اشیار کی زندگی اور توانائی مفقود ہوتی۔ بہرحال مقامی فنون کے لیے یہ مہلک ثابت ہوا۔ کوٹلی کی لفت گری صنعت کے بارے میں مسٹر میکلگن بڑے اختصار سے لکھتے ہیں: "ہنرمندی یہاں ختم ہو رہی ہے اور قیمتیں بڑھ رہی ہیں۔ یہ غیر دانشمندانہ یورپی سرپرستی کا نتیجہ ہے۔"[۲] اور ہر جگہ ایک ہی قسم کے جذبہ کا اظہار نظر آتا ہے۔ غیر منصفانہ یورپی سرپرستی سے معیار ہر جگہ گر رہا تھا لیکن یہ نتیجہ نئے پیٹرن کے داخل ہونے اور پرانے پیٹرن کی تمیز کی کمی سے پیدا نہیں ہوا۔ یورپی سیاحوں کی مانگ صرف سستی اشیاء کی مانگ تھی جس سے ان دستکاریوں کو تقویت ملی وہ چھوٹی موٹی آرائشی چیزیں، کھلونے وغیرہ ممکن حد تک سستے چاہتے اور وہ ایسے سامان حاصل کر لیتے لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ استعمال شدہ کچے مال میں بڑی ملاوٹ ہوتی اور کاریگر کام بھی جلدی جلدی کرتے۔

دوسرا طبقہ نئے تعلیم یافتہ طبقہ کا تھا جو امرا طبقہ کے رتبہ کا صحیح معنوں میں وارث تھا۔ یہ زیادہ تر شہری اور پیشہ ورانہ طبقہ تھا جو مغرب کی 'بورژوا' پیشہ ورانہ جماعت سے کسی حد تک ملتا جلتا تھا۔[۳] اس نئے طبقہ سے امید کی جاتی تھی کہ وہ دستکاریوں کی ہمت افزائی کرے گا لیکن یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس طبقہ کی مانگ فرنگیوں کی مانگ کے برابر بھی نہ تھی۔ چند مستثنات کو چھوڑ کر انہوں نے واقعی مقامی فنون سے یکدم

۱۔ "یورپ کی تماشوں کی بھی نقالی ہو رہی ہے اور بری طرح نقالی ہو رہی ہے"۔ دیکھیں سی۔ جے ہلیفیکس، مونوگراف پوٹری اینڈ گلاس، پنجاب (۱۸۹۲ء)

۲۔ ای۔ ڈی۔ میکلگن، مونوگراف، سونے اور چاندی کے کام: پنجاب (۱۸۹۰ء)

۳۔ ہندوستان میں 'بورژوا' کے عروج کے دلچسپ بیان کے لیے ایم۔ این۔ رائے کی کتاب "ہندوستان کا عبوری دور" باب اول (۱۹۲۲ء)

منہ پھیر لیا۔ بیرونی حکومت کے مضر اثرات میں سے ایک اثر یہ ہوا کہ مفتوح قوموں پر فاتح قوم کے تصورات تھوپے گئے اور گذشتہ صدی کے نصف آخر میں نئے ہندوستانی بورژوا نے یہ بتا دیا کہ وہ مغربی معیار ماننے اور ہر ہندوستانی چیز پر حقارت کی نظر ڈالنے کے لیے بالکل تیار ہو گئے ہیں۔ خاص طور پر فنون کے ساتھ یہی معاملہ تھا۔ یورپ کے فیشن کی تقلید کرنا روشن خیالی کی علامت سمجھی جاتی تھی اس کا اثر یہ ہوا کہ دیسی صنعتوں کی تیار شدہ اشیاء کو سخت نقصان اٹھانا پڑا۔ پنجاب کی ریشم کی صنعت سے متعلق مقالہ میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ "ریشمی کپڑے پہننا اب فیشن نہیں جیسا کہ سکھوں کے زمانہ میں تھا یا جیسا کہ آج بھی دیسی ریاستوں میں ہے یورپ کے سوتی کپڑے، چھاپے والے کالیکو اور سستے لٹھوں نے ریشمی لباسوں کو میدان سے خارج کر دیا ہے"۔[۱] شمالی مغربی صوبہ کے بارے میں بھی یوں لکھا گیا ہے: "مٹی کے برتنوں کے خوبصورت نمونے جب مشرقی انداز کے ہوتے ہیں تو ان کی تجارت کو فروغ دینے کی کوئی کوشش نہیں ہوتی"۔[۲] ان صنعتوں سے متعلق رسالوں میں ہم ایسے بیان سے اکثر دوچار ہوتے ہیں: "یہ مانگ خالص یورپ والوں کی ہے"۔

اس طبقہ کے لیے ایسا عمل اختیار کرنا شاید فطری تھا کیونکہ یہ خود انگریزی حکومت کی پیداوار تھا، لیکن بہت سے معاملات میں ان کی پسند کسی احمقانہ اصول یا مغربی حکام کی تقلید یا ان کی ناراضگی کے ڈر سے ان کے لیے گویا زبردستی تھوپی جاتی تھی۔ اس طرح مسٹر کپلنگ کام بنے ہوئے جوتے کی صنعت کے زوال کا سبب بتاتے ہیں: "زری کے جوتوں میں فضول خرچی روکنے اور سیاہ چمڑے والے سادہ جوتے کے استعمال کا قانون اتنا سخت نہیں ہو سکتا تھا جتنا کہ یہ غیر تحریری حکم کہ ایک ہندوستانی موزہ اور پیٹنٹ چمڑے والے جوتے پہنے اور حاکم کے سامنے آنے پر دیسی جوتے اتار کر پھینک دے"۔[۳] لیکن صرف یہی سارے ناموافق اسباب نہ تھے۔ ایک خاص معاملہ میں تو انگریزی حکومت نے ایک دستی صنعت کو موثر طور پر ختم کر دیا۔ یہ معاملہ ہتھیار اور ڈھال ملمع اور مرصع کرنے والی صنعت کا تھا جو ڈاکٹر رائل کے مطابق ۱۸۵۰ء تک ہندوستان کے تمام شمالی مغربی علاقوں یعنی کچھ، سندھ اور پنجاب میں عام تھی۔ اسلحہ جات کی ضرورت ختم کر دی اور انہیں رکھنے اور استعمال کرنے کی یکدم ممانعت کر کے انگریزوں نے اس صنعت کو اس کام کے

۱۔ ایچ۔ سی۔ کوکسن، مونوگراف، ریشم کی صنعت (۱۸۹۲ء)

۲۔ ڈوبس، مونوگراف، پوٹری اینڈ گلاس: شمال مغربی صوبہ (۱۸۹۵ء)

۳۔ کپلنگ: پنجاب کی صنعتیں، جرنل آف انڈین آرٹ، نمبر ۱۱ (۱۸۸۸ء)

۴۔ رائل، ح۔ س

لیے رکھ چھوڑا کہ وہ صرف انگریز سیاح اور دوسروں کے لیے نمائشی سامان تیار کریں! [1]

انگریزی سلطنت کے قیام نے دستی صنعتوں کو ایک اور طریقہ سے بھی متاثر کیا، اس نے انجمنوں اور مجلسوں کی قوت کمزور کر دی انہی مجلسوں سے تجارت ہوا کرتی تھی اور وہ استعمال شدہ اشیا کا معیار پرکھتی تھیں جیسے یہ نگرانی کرنے والی انجمنیں ختم ہوئیں ان میں بہت سی خامیاں پیدا ہونے لگیں مثلاً خام اشیا میں ملاوٹ آگئی اور صناعی میں پھوہڑ پن آگیا۔ ان وجوہ سے مصنوعات کی فنی اور تجارتی قدر و قیمت اچانک تنزل آگیا [2]

یہ صحیح ہے کہ دربار کے خاتمہ اور بیرونی حکومت کے قیام سے ہی ہندوستان کی دستی صنعتیں رو بہ زوال ہوئیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ یورپی صنعت گروں کا مقابلہ بھی اس صورت حال کا جزوی طور پر ذمہ دار ہے۔ یہ بات بالخصوص ٹکسٹائل کے ساتھ تھی اور اس صنعت کے اعلیٰ شعبے فوری زد میں آئے کیونکہ معمولی کسان ایسا کپڑا چاہتا تھا جو سستا ہو اور دیرپا چاہے وہ موٹا ہی کیوں نہ ہو۔ یورپ کے صنعت گر اس قیمت پر مال تیار نہیں کر سکتے تھے اس لیے گاؤں میں کام کرنے والے بنکروں پر یورپی مقابلہ کا کوئی اثر نہیں ہوا لیکن بہتر قسم کے مال تیار کرنے والے شہری بنکروں کو پوری شدت کے ساتھ اس مقابلہ کو سہنا پڑا۔ معیار کے لحاظ سے ہندوستانی بنکر اپنا مقام آسانی سے برقرار رکھ سکتے تھے لیکن قیمت کے معاملہ میں وہ مشینوں سے تیار ہونے والے سامان سے بری طرح پٹ گئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر بدیسی مال کے لیے ہندوستان کے متوسط طبقہ کی خوش فہمی سے دیسی مال کے مقابلہ میں بدیسی مال کو بڑی تقویت ملی۔ یہاں اس بات پر زور دینا ضروری ہے کہ باہری مقابلہ اس سے بڑا اہم نہ تھا مثلاً ریشمی کپڑے کے بدلہ سوتی کپڑے کی عام مقبولیت اس کا نتیجہ نہیں ہو سکتی تھی جو دیسی ریشم کی صنعت کے ساتھ بدیسی سوتی

۱۔ اوپر دیکھیں، مکرجی: اے ہینڈ بک، وغیرہ

۲۔ بہت سی تجارتی مجلسیں حال تک قائم رہیں جو تیار کردہ اشیاء کے معیار وغیرہ پر نگرانی رکھتی تھیں خاص طور پر تار اور رباعونا جیسی صنعتوں میں یہ خیال رکھا جاتا تھا کیونکہ استعمال میں آنے والی اشیاء کے خالص ہونے کی ضمانت سے ہی اس جگہ کی شہرت برقرار رہ سکتی تھی۔ دیکھیں ای۔ برڈن کا رسالہ تار اور گوٹہ کناری: پنجاب (۱۹۰۹) بہت سی جگہوں میں جیسے لکھنؤ اور دہلی کی نگراں مجلسیں ختم ہوتے ہی صنعت تیزی سے ختم ہونے لگی، دیکھیں مُوہاے، کتاب مذکورہ کشمیر کی صنعتوں پر ایسے اثرات کیسے دیکھیں لارنس کی کتاب مذکورہ ص ص ۴ - ۳۷۳

کپڑے کی تھی بلکہ اس سے مذاق اور فیشن کی تبدیلی ظاہر ہوتی ہے! ہندوستان کی شہری صنعت کی تیار کردہ اشیاء کے ساتھ یورپ کی سستی تعیشاتی کا مقابلہ ابھی تک تو شروع بھی نہیں ہوا تھا مگر دیسی صنعت تیزی سے ختم ہو رہی تھی بعض صورتوں میں جیسے رنگ ریزی کی صنعت کا زوال براہِ راست خارجی مقابلہ کا نتیجہ تھا لیکن یہ استثناء کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس زوال کی خاص وجہ یہ ہے کہ مانگ کا اصل سرچشمہ سوکھ گیا اور لوگوں کے مذاق بدل گئے[2] لیکن دوسرے اسباب سے بھی تنزل کی رفتار بہت تیز ہو گئی۔ رفتار کتنی تیز تھی، یہ اس امر سے ظاہر ہے کہ مسٹر جارج برڈووڈ نے ۱۸۷۸ء میں لاہور کی جن چند صنعتوں کا ذکر کیا تھا وہ ۱۸۸۸ء میں ناپید ہو گئیں[3]۔ یہ انحطاط فنی اور تجارتی دونوں لحاظ سے تھا۔ قدیم وجدید کی فنی خوبیوں کے درمیان واضح فرق کا پتہ ۱۹۰۲ء کی دہلی نمائش سے چلتا تھا[4]۔ یہ نکتہ بڑا ہی آموز ہے کہ ۱۹۰۲ء کی دہلی نمائش میں بھاؤنگر محل جس کی بہت تعریف کی گئی تھی اسے ایسے کاریگروں نے مہاراجہ کے حکم پر خاص طور پر تیار کیا تھا جنہوں نے قدیم اصولوں کی سختی سے پابندی کی تھی[5] لیکن ایسے نمونوں کے لیے دو لازمی چیزیں یعنی فرصت اور یقینی مانگ کی ضرورت تھی اور اب ایسے حالات موجود نہ تھے فنون وصنعت کو زندہ کرنے کی کوششیں پچھلے برسوں میں متعدد ہوئیں۔ دبستان فنون وغیرہ کے ذریعہ انہیں تھوڑی بہت مدد بھی پہنچائی گئی اور اس طرح کی تحریک ہاول اور کمار سوامی جیسے لوگوں کے ہاتھوں چلتی رہی۔ یہ کوششیں کچھ بار آور بھی ہوئیں۔ بنگال میں مصوّری کے نئے دبستان کی مثال سامنے ہے جو قدیم ہندوستان کی

۱۔ برما میں ریشم کی صورت حال نہیں بدلی جہاں اس معاملہ میں عام مذاق نہیں بدلا تھا حالانکہ دیسی ریشم کی صنعت چین اور جاپان کی سستی ریشمی مصنوعات کے شدید مقابلہ کی زد میں آ گئی تھی۔

۲۔ مذاق میں تبدیلی انہی اثرات کے ساتھ دیسی ریاستوں میں ہوئی گرچہ یہ تبدیلی بعد میں آئی۔ مسٹر کولن ۱۸۹۰ء میں لکھتے ہیں: "بنگال میں فنون کی کمی ہے۔ پہلے یہ مقامی نوابوں کے دربار کے سایہ میں ترقی پا رہے تھے مگر ان کے ساتھ ہی ختم ہو گئے۔ موجودہ راجہ ملک کے فنون کی نسبت بدیسی مصنوعات کی سرپرستی کے لیے زیادہ مائل نظر آتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ دیسی کاریگر زمانہ کے موافق نہیں ڈھل سکے ہیں۔ ای ڈبلو۔ کولن: بنگال کے موجودہ فنون اور صنعتوں کی رپورٹ، ص ۱۲ (۱۸۹۰ء)

۳۔ دیکھیں کپلنگ کی کتاب "پنجاب کی صنعتیں"، ج۔ س

۴۔ سر۔ جی۔ واٹ: دہلی میں آرٹ، (۱۹۰۳ء)

۵۔ ایضاً ص ۱۸

مصوری سے اپنا انسپریشن حاصل کرتا ہے لیکن یہ کوششیں لازماً فن کے ضمن میں آتی ہیں، صنعتی آرٹ یا فنی دستکاریوں میں نہیں۔ ان میں سے کچھ میں نئے پیٹرن داخل ہوئے اور نئے طرز کے تجربے کیے گئے لیکن لوگوں کا مذاق ابھی تک ستھرا نہیں ہوا ہے اور آج کل بدیس کے سستے تعیشاتی سامان کا مقابلہ تجدید کاروں کے جذبات کو سرد کر دیتا ہے۔ بدیسی مال کے مقابلہ سے انحطاط کا وہ عمل پورا ہو گیا جو بدیسی حکومت سے شروع ہوا تھا اور جس نے خارجی اثرات سے قوت حاصل کی تھی۔ گذشتہ صدی کے آخر میں ہندوستان کی شہری صنعت کے سامنے صرف دو ہی راستے رہ گئے تھے جنہیں وہ اختیار کرتے، یا وہ اپنے طریقہ کو بدل کر سستے فنی سامان تیار کرے یعنی نیم بیکار صنعت کی اشیا رجو مشکوک فنی قدر کی حامل ہوں مگر جاپان کی آرٹ والی صنعتوں کی طرح تجارتی لحاظ سے نفع بخش ہوں یا وہ اپنے پرانے معیار کو قائم رکھے اور زوال کی زد میں آئے خواہ اسی زوال کا عمل سست ہو یا تیز۔

یہ ہندوستان کی قدیم ترین صنعت کی تاریخ تھی جو ہندوستان کی منظم صنعت کی سب سے اہم شکل تھی ذرا سی دیر کے لیے سنبھالا بھی لیا مگر یہ پیچھے کی طرف اقدام تھا ہندوستان آٹھویں دہائی کے سالوں میں ڈوبتی ہوئی دستی صنعتوں کا عظیم الشان ملک نظر آتا تھا جب کہ منظم صنعت کی دوسری شکل گویا مفقود تھی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے پھر زمین کا سہارا لیا۔ شہری صنعت کے زوال سے زمین پر واقعی دباؤ بڑھ گیا لیکن یہ اتنا زیادہ شہروں سے ہجرت اختیار کرنے کی وجہ سے نہیں ہوا ریہ نہیں کہ ایسا بالکل نہیں ہوا) بلکہ لوگوں کے زمین پر جم جانے سے ہوا جو بعد میں وقت آنے پر شہری صنعتوں میں کھپ جاتے۔ اس آبادی کے لیے راستہ نکالنا ضروری تھا اور تب ہم صنعت کی ان نئی شکلوں کے مسئلہ کی طرف آتے ہیں جو اس زمانہ میں ہندوستان کے اندر لائی جا رہی تھیں۔

نوٹ :۔ یہ یاد رکھیں کہ اوپر کے پورے باب میں دستی صنعت کا لفظ ایک خاص اور محدود معنی میں استعمال کیا گیا ہے، یہ تعیشاتی یا نیم تعیشاتی صنعت کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے جو ہندوستان کی خاص شہری صنعتیں تھیں۔ یہ بات بھی معلوم ہو گی کہ ہندوستان کی قدیم صنعت کو ہم دو حصوں میں بانٹ چکے ہیں۔ ایک طرف گاؤں کی صنعتیں ہیں جن میں گاؤں کے ملازم کاریگروں کا طبقہ دیہات کے بنکر اور سنار وغیرہ بھی شامل ہیں اس جماعت کی خصوصیت یہ تھی کہ یہ پورے ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس قسم کی صنعت کم و بیش انسان کی ابتدائی ضرورتوں تک محدود تھی اور اس صنعت کی تنظیم بہت ہی بھونڈی تھی۔ دوسری جماعت شہری صنعت کی تھی جو زیادہ اچھے طور پر منظم تھی، اور مصنوعات کی بہتر اقسام تک محدود تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ تقسیم کام چلاؤ قسم کی تھی۔ گاؤں میں تعیشاتی

صنعت شاذ و نادر ہی نظر آتی تھی لیکن شہروں میں کچھ ایسی صنعتیں ہمیشہ رہی تھیں جو اپنی مصنوعات کے لحاظ سے گاؤں کے صنعتی گروپ سے ملتی جلتی تھیں جیسے یہ کہ موٹے کپڑے کی بُنائی، مٹی کے برتن بنانے کا کام اور اس قسم کی تھوڑی بہت صنعت شہروں میں ہمیشہ موجود رہتی تھی (لیکن اس میں بھی شہری کاریگر عموماً زیادہ منظم تھے) پھر اسی کاریگر کی دوگانہ تقسیم کسی حد تک تضاد کی صورت پیش کرتی ہے کیونکہ پیتل اور تانبے کا کام کرنے والا جو خوبصورت سامان تیار کرتا تھا وہ معمولی برتن بھی بنا سکتا تھا۔ ان سب خامیوں کے باوجود یہ دوگانہ تقسیم بڑی حد تک صحیح ہے کیونکہ شہروں میں گرچہ عام کاریگر کی صنعت تھی پھر بھی دستی صنعتیں ہندوستان کی شہری اقتصادی سرگرمیوں کا سب سے نمایاں اور اہم جزو تھیں۔

ہندوستان میں کچھ دوسری صنعتیں بھی تھیں جو متذکرہ بالا قسموں میں نہیں آسکتی ہیں۔ صنعتوں کی یہ جماعت مجموعی اعتبار سے بہت اہم نہ تھی لیکن اس میں بعض اہم صنعتیں شامل تھیں اس جماعت میں میسور، چھوٹا ناگپور، صوبہ متوسط اور دوسری جگہوں کے لوہا ڈھالنے والے، شورا کا کام کرنے والے، چوڑی بنانے والے، شیشہ سازی کے عام کاریگر کاغذ ساز وغیرہ بھی شامل تھے۔ یہ ساری جماعتیں متذکرہ بالا جماعتوں میں سے کسی میں بھی نہیں آسکتی ہیں۔ یہ زیادہ تر علاقہ میں محدود صنعتیں تھیں یعنی یہ کہ وہ ہندوستان کے کچھ حصوں میں چلائی جا رہی تھیں۔ ان میں بہت سی صنعتوں کے لیے کاریگروں میں خاص صلاحیت درکار ہوتی تھی۔ بہتوں میں طریق کار کی خصوصیات اور دوسرے اسباب کی خاطر باقاعدہ تنظیم کی ضرورت ہوتی تھی۔ ان صنعتوں کی خصوصی اہمیت خاص خاص حلقوں میں خام اشیاء کی سپلائی کی نوعیت کی وجہ سے تھی۔ یہی سبب ہے کہ شورا اور شیشہ کی صنعتیں مخصوص علاقہ میں تھیں۔ کچھ صنعتیں جیسے لوہا پگھلانا صنعتی نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت رکھتی تھیں، اور ان مصنوعات کا پورے ملک میں چلن تھا۔ کام میں آنے والے طریقے عموماً بھونڈے اور خرچیلے تھے لیکن مصنوعات جیسے میسور کی فولاد کی چیزیں کبھی بہت اعلیٰ درجہ کی ہوتی تھیں لیکن یہ تمام متفرق صنعتیں مر رہی تھیں۔ غیر دانشمندانہ محصول اور چیلی میں شورہ کی دریافت نے شورہ کی صنعت کو زبردست دھکا پہنچایا تھا۔ لوہا پگھلانے والی صنعت درآمد شدہ ڈھالے لوہے کے مقابلہ اور لکڑی کے کوئلہ کا دام بڑھ جانے سے کمزور ہو رہی تھی۔ لکڑی کوئلہ کا دام جنگلات ریزرو ہو جانے اور ریلوے کی توسیع سے بڑھ گیا تھا۔ درآمد شدہ سامان کے دباؤ سے شیشہ اور کاغذ کی صنعتیں بھی ختم ہو رہی تھیں۔ اس طرح ملک کے کھُل جانے سے تمام دیسی صنعتیں دم توڑ رہی تھیں۔

چوتھا باب

جدید صنعت کا آغاز

ا۔ نخل کاریاں

ہم اب صنعت کی ان نئی شکلوں کا جائزہ لیں گے جو اس زمانہ میں ہندوستان میں رائج کی جارہی تھیں۔ ہم یہ دیکھیں گے کہ جو صنعتی سرگرمی ہورہی تھی اس کی دو شکلیں تھیں۔ پہلی شکل نخل کاری کی تھی جو یورپی ممالک کے زیادہ ترگرم سیر مقبوضات میں پھیلی ہوئی تھی اور دوسری قسم کارخانہ والی صنعت کی تھی جو یورپ کے جدید معاشی تغیر کا عجیب و غریب نتیجہ تھی۔

ہندوستان میں سب سے پہلے نخل کاری ہی رائج کی گئی۔ شروع ہی سے یہ صنعت پورے طور پر یورپی صنعت تھی۔ یورپ والوں کے ہاتھوں ہندوستانی وسائل کے استحصال کا یہ آغاز تھا۔ یہ شاید تعجب کی بات ہے کہ انیسویں صدی کے وسط تک ہندوستان کی صنعتی سرگرمیوں میں یورپ والوں نے بہت ہی کم حصہ لیا تھا لیکن ساری پابندیاں فرنگیوں پر عائد تھیں، وہ ہندوستان میں مستقل طور پر زمین حاصل نہیں کرسکتے تھے (الیسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے مفاد کی خاطر یہ پابندی لگائی تھی) ۱۸۳۳ء تک تجارت کرنے کا اجارہ کمپنی کو حاصل تھا، اندرونی مواصلات کی کمی تھی ہندوستان میں زرخیز مگر تھوڑے گنجان آبادی کے علاقے افسوس ناک حد تک کم تھے۔ ان وجوہ سے صنعتی عمل کی ابتدائی ترقی رکی رہی لیکن جیسے ہی ان میں سے کچھ پابندیاں رفتہ رفتہ ہٹنے لگیں تو ہم فرنگی صنعت کی ہندوستان میں عظیم الشان ترقی خصوصاً ۱۸۶۰ء۔ ۷۰ کے درمیان دیکھتے ہیں جس کا پتہ چائے، قہوہ اور جوٹ کی صنعتی ترقیوں سے چلتا ہے۔

نیل کی صنعت متذکرہ بالا بیان سے مستثنیٰ ہے کیونکہ اٹھارہویں صدی کے آخر سے پہلے ہی ہندوستان میں فرنگی نخل کاروں کے ذریعہ نیل کی صنعت گری شروع ہوگئی تھی۔ قدیم زمانہ سے ہندوستان میں نیل کی کھیتی ہو رہی تھی خاص طور پر اس کی کھیتی، بقول ڈاکٹر واٹ، گجرات اور مغربی ہندوستان میں ہوتی تھی[1] نیل کے رنگ

---

[1] جی۔ واٹ: پمفلٹ آن انڈیگو (۱۸۹۰ء)

کی تجارت ایسٹ انڈیا کمپنی وسیع پیمانہ پر کررہی تھی لیکن اٹھارہویں صدی کے اواخر میں امریکہ کے مقابلہ اور رنگ کے ملاوٹ کی وجہ سے بھی اس کی تجارت بہت گھٹ گئی اور مغربی ہندوستان کی صنعت تو گویا ختم ہی ہوگئی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اسے زندہ کرنے کا فیصلہ لیا اور اس کام کے لیے وہ ویسٹ انڈیز سے نخل کار لائے اور انہیں بنگال کے خاص خاص ضلعوں میں بسایا[1]۔ کمپنی کے حکام کو بھی نیل کی تجارت کرنے کی اجازت مل گئی۔ یہ زمانہ انیسویں صدی کے شروع کا تھا۔ بنگال میں اس صنعت کے قیام سے گجرات کی صنعت دم توڑنے لگی۔ اگلے پچاس برسوں میں اس صنعت کی بڑی ترقی ہوئی اور ۱۸۵۰ء تک تو نیل ہندوستان کی اہم ترین برآمدات میں شمار ہونے لگی لیکن گرچہ اس کی تجارت اور بیرونی نخل کاروں کے منافع اس رفتار سے بڑھ رہے تھے پھر بھی یہ کہنا مشکل ہے کہ کسانوں کی حالت بہتر ہوگئی تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کی حالت ملک کے دوسرے خطوں کی بہ نسبت نیل پیدا کرنے والے علاقوں میں بدتر ہوگئی۔ ۱۸۴۸ء کے لگ بھگ لارڈ میکالے نے لکھا تھا: "یہ میرا اندیشہ ہے مگر پھر بھی یہ بات بالکل سچ ہے کہ بڑی برائیاں موجود ہیں۔ ان کے نتیجہ کے طور پر بڑی ناانصافی سرزد ہورہی ہے۔ کچھ قانون کے نفاذ سے اور کچھ قانون کے خلاف کاروائیوں سے بہت ساری رعیت کو اس حال میں پہنچا دیا گیا جو نیم غلامی سے کچھ بہت زیادہ مختلف نہیں[2]۔" سچ تو یہ ہے کہ نخل کاروں کی ایسی جماعت تھی جو قانون کا ذرا بھی پاس نہ کرتی تھی[3] اور چونکہ وہ حکمراں قوم کے افراد تھے اس لیے کسانوں کے مفاد کا کوئی خیال نہیں کرتے تھے۔

نیل کی کھیتی کا جو طریقہ تھا وہ دراصل نخل کاری کا طریقہ نہ تھا۔ شاذونادر ہی نیل کے صنعت گر مزدوروں کے ذریعہ اپنی کھیتی کراتے تھے۔ عام طور پر طریقہ یہ تھا کہ وہ دیگر زمیندار یا دوسری زمینوں کے مالکوں سے معاہدہ کر لیتے اور تب یہ نخل کار ان میں سے کچھ زمینوں میں نیل کی کھیتی کرنے کا زمینداری یا تعلق داری حق حاصل کر لیتے اور یہ نیل مقررہ قیمت پر نخل کاروں کو فروخت ہوتی تھی[4]۔

---

[1] ایضاً

[2] پمفلٹ آن انڈگوص ۱۴۴ میں حوالہ شدہ

[3] کسی نظام کا لحاظ نہیں رکھا جاتا تھا بہت سے نخل کار قرب وجوار کے نخل کاروں اور زمینداروں سے لڑنے کے لیے اپنے پاس جوان رکھتے تھے "کس طرح ۱۸۳۰ء میں بنگال کے نیل کے کارخانہ پر قبضہ ہوا" اس کے دلچسپ بیان کے لیے ایم۔ ولسن کی کتاب بہار کی تاریخ (۱۹۰۸ء) دیکھیں۔

[4] نجی کھیتی تھوڑی تھی یعنی وہ کھیتی جہاں خود نخل کار اپنی نیل کی کاشت کرتے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نخل کار یہ ترجیح دیتے تھے کہ کسان ان کے لیے نیل پیدا کریں اور وہ ان سے مقررہ قیمت پر خرید لیں۔ منٹ آف دی لفٹننٹ گورنر آف بنگال آن دی رپورٹ انڈگو کمشنرز (۱۸۶۱ء)

گرچہ اس سسٹم کی برائیاں مان لی گئی تھیں پھر بھی کسانوں کی حالت سدھارنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔
زرعی موسم شروع ہوتے وقت عموماً کسانوں کو نیل کی کھیتی کے لیے پیشگی رقم دے دی جاتی تھی اور اکثر انہیں زبردستی دے دی جاتی تھی۔ رعیت نے جہاں یکبار پیشگی لی گویا برباد ہو گئی۔ اپنی رپورٹ میں نیل کے کمشنروں نے لکھا ہے: "یہ کوئی اہم بات نہیں کہ رعیت نے پہلی پیشگی جھجکتے ہوئے لی یا خوشی سے بہر صورت میں نتیجہ یکساں ہوتا ہے وہ اس کے بعد آزاد انسان نہیں رہتے"[1] بنگال و بہار میں نیل کے بڑے علاقوں کے پیش نظر کمشنروں کی رپورٹ کے مندرجہ ذیل اقتباسات اس نظام کی خامیوں کو پورے طور پر واضح کرتے ہیں جس کے تحت نیل کی کھیتی ہوتی تھی ان سے یہ معلوم ہوتا ہے:" موافق مفروضہ کا جانبدارانہ بیان بھی یہی ظاہر کرتا ہے کہ رعیتوں کو نیل سے بہت تھوڑا فائدہ ہوتا تھا ایسا اس کی اعلیٰ قسم کا تو ذکر ہی کیا، چاول کی پیداوار کے بیان سے بھی ظاہر ہے کہ نفع بخش فصل کے لحاظ سے نیل کی حیثیت بہت کمتر تھی: اس سے صرف ایک نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ نیل کی کھیتی ایسے طریقہ سے ہوتی تھی جس کا کسان کی بھلائی سے کوئی تعلق نہ تھا اگرچہ کمیشن کے سامنے براہ راست جبر و تشدد کا بھی ثبوت پیش کیا گیا تھا نیل کی کھیتی کا یہی طریقہ تھا اور یہ جوں کا توں رہا۔ ۱۸۶۰ء میں نیل کی کھیتی نے جو کچھ ترقی کی اگلے بیس برسوں میں اس سے ذرا سا بھی آگے نہ بڑھی اس وقت تک نیل کی صنعت تقریباً پوری حد تک فروغ پا چکی تھی اس لیے اب اس میں ٹھہراؤ پیدا ہو گیا۔

چائے کی صنعت ہندوستان میں نیل کی صنعت کے بہت بعد میں شروع ہوئی۔ چائے کے پودے جنگلی انداز میں اگتے ہوئے سب سے پہلے آسام میں تقریباً ۱۸۲۰ء میں دریافت کیے گئے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی توجہ اس کی طرف مبذول کرائی گئی اور پھر کچھ ابتدائی جانچ پڑتال کے بعد کمپنی نے ۱۸۳۵ء میں چائے کا ایک باغ تجرباتی طور پر لگانا شروع کیا۔ پانچ برسوں تک کام کرنے کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی نے اسے آسام کمپنی کے سپرد کر دیا جو ہندوستان کی پہلی چائے کمپنی تھی۔ اگلے

---

[1] ایضاً ص ۱۰۔ لیکن کمشنر اور لفٹننٹ گورنر کی عام رائے یہ تھی کہ کاشتکاروں کو ذرا سا بھی فائدہ نہ ہوتا تھا۔ نیل کار اس پر اصرار کرتے تھے کہ رعیت اپنی زمین کا سولھواں حصہ نیل کی کھیتی کے لیے مخصوص کر دیں۔ اس سے جو نقصان ہوتا تھا اس کا مقابلہ اس مثال سے ہوتا ہے؟ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ برطانیہ کا ایک کسان لمبے معاہدہ پر ۱۶۰ ایکڑ زمین ۲ پونڈ فی ایکڑ کرایہ کے حساب سے کھیتی کر رہا ہو مگر کسی دباؤ سے مجبور ہو کر اسے ۱۰ ایکڑ میں فلیکس FLAX کی کھیتی کرنا پڑے جسے وہ ۱۴۰ پونڈ سالانہ کے بھاری نقصان پر قرب و جوار کے صنعت گر کے ہاتھوں فروخت کرنے پر مجبور ہو۔

بارہ برسوں میں اس نے کوئی ترقی نہیں کی۔ ۱۸۵۲ء میں ایک پرائیوٹ باغ شروع کیا گیا اور پھر باغات کی تعداد بڑھنے لگی۔" یہ کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ چائے کی صنعت کی بنیاد ۱۸۵۶ء اور ۱۸۵۹ء کے درمیان ڈالی گئی"[1] آخر الذکر سال سے ترقی کی رفتار باغات کے علاقے اور چائے کی پیداوار کے لحاظ سے حیرت انگیز تھی۔ حسب ذیل اعداد آسام کی تفصیل فراہم کرتے ہیں جو اس وقت ہندوستان میں چائے کی کھیتی کا سب سے اہم علاقہ تھا[2]

سال	ملکیت کی تعداد جو معلوم مالکوں کے ماتحت تھی	کھیتی کا رقبہ	چائے کی پیداوار (پونڈ میں)
۱۸۵۰ء	۱	۱۸۷۶	۲۱۶,۰۰۰
۱۸۵۳ء	۱۰	۲,۴۲۵	۳۶۶,۷۰۰
۱۸۵۹ء	۴۸	۷,۵۹۹	۱,۲۰۵,۶۸۹
۱۸۶۹ء	۲۶۰	۲۵,۱۷۴	۴,۷۱۴,۷۶۹
۱۸۷۱ء	۲۹۵	۳۱,۳۰۳	۶,۲۵۱,۱۴۳

۱۸۶۹ء کے اعداد سے ترقی کی اس سرگرمی کا پتہ نہیں چلتا جو اس صنعت میں ۱۸۵۹۔۶۹ء کے دوران ہوئی تھی۔ اس صنعت کے اس دور کو سمجھنے کے لیے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ یہ صنعت اس زمانہ میں کس طرح چلائی جاتی تھی۔ ۱۸۴۵ء کے آسام صفائی قانون کے تحت آسام میں چائے کے کھیتوں کے لیے مالی امداد زیادہ تر پانچویں دہائی کے برسوں میں دی گئی گرچہ یہ ان علاقوں میں رہنے والے قبائلیوں کے حقوق کی حفاظت نہیں کرتے تھے پھر بھی یہ لحاظ رکھا گیا تھا کہ سٹہ بازوں کو بے حساب مالی امداد نہ دی جائے اور تحویل کی شکل میں بہ ضمانت لی جاتی تھی کہ وہ مناسب سروے کا انتظام کریں اور ایک مخصوص مدت میں زمین کا ایک خاص تناسب اور اس کی کھیتی میں لگانے کی ذمہ داری قبول کریں۔ پہلے تو مقامی حکام

---

[1] ایڈگر: "بنگال میں چائے کی صنعت سے متعلق نوٹ" بنگال میں چائے کی صنعت سے متعلق کاغذات ص ۷ (۱۸۷۳ء)۔

[2] آسام میں چائے سے متعلق کیمپبل کا میمورنڈم۔ ایضاً ص ۱۲۸

دیسی قبیلوں کے حقوق کی موافقت میں اپنے اختیارات کا استعمال کرتے تھے اور درخواست منظور کرنے سے پہلے یہ دیکھ لیتے تھے کہ امیدوار کے پاس کھیتی کرنے کی معقول صلاحیت ہو لیکن ۱۸۵۹ء میں سٹہ بازوں نے ان پابندیوں کی مخالفت کی اور سرکار پر دباؤ ڈالا۔ اس صنعت کو فروغ دینے کی فکر سرکار کو بہت تھی اور یہ شرط ہٹا دی گئی کہ امیدوار کھیتی کرنے کے ذرائع رکھتا ہے"[1] درخواستوں کا ایک سیلاب آگیا اور سٹہ بازی کا غلبہ ہوگیا۔ ہر شخص کو اندازہ ہوگیا تھا کہ چائے کی صنعت کا مستقبل شاندار ہے اور جب زمین کے گرانٹ کے قوانین نرم ہوگئے تو سٹہ بازوں کے راستے بہت آسان ہوگئے۔ ان تمام گرانٹ کے سروے کے متعلق مسٹر ایڈگر کہتے ہیں "زیادہ تر صورتوں میں کپاس این (سرکاری سرویئر) خیالی خطۂ زمین کا خیالی نقشہ بھیجتے تھے۔ جب اس جگہ کا معائنہ چند سال بعد پیشہ ور سرویئر کرتے تو اس زمین کی اصل گرانٹ سے برائے نام مماثلت نظر آتی۔ کبھی کبھی گرانٹ کا کوئی وجود ہی نہیں ہوتا اور کبھی یہ بہت دور ان قبائلیوں سے آباد جنگلوں میں ہوتا جو برائے نام ہی سرکار کے وفادار ہوتے تھے اور اگر وہ زمین پر قبضہ کرنے کی کوشش کرتا تو گرانٹ پانے والے کا شاید سر ہی کاٹ لیتے"[2] لیکن گرانٹ پانے والے کو قبضہ کرنے کا عموماً کوئی خیال نہیں ہوتا تھا وہ تو صرف ان کمپنیوں کے ہاتھوں گرانٹ بیچ دیتا تھا جنہیں لندن میں چائے کے باغات چلانے کے لیے رقم ملتی تھی اور اگر گرانٹ پانے والا کا قبضہ ہو بھی جاتا تو بھی اسے چائے کی کاشت کا کوئی خاص خیال نہیں ہوتا تھا۔ اصلی نخل کاروں کے عام انداز فکر کا پتہ اس زمانہ میں مشہور اس قول سے چلتا ہے کہ چائے بنانے کے لیے وہ کبھی قیمت ادا کرے گا یا نہیں، یہ مشکوک تھا لیکن یہ بالکل واضح تھا کہ باغات تیار کرنے کے لیے اسے قیمت ادا کرنا ہے"[3] باغات نہ صرف بے توجہی سے لگائے جاتے تھے بلکہ ۳۰ یا ۴۰ ایکڑ کا ایک چھوٹا باغ ۱۵۰ یا ۲۰۰ ایکڑ کا باغ بنا کر کمپنی کو فروخت کر دیا جاتا تھا"[4] ایسے طریق کار کی ایک زندہ مثال مسٹر کیمپ بل نے دی ہے جو نوگاؤں ضلع میں واقع ہوئی جہاں لندن کی کمپنیوں کے فروغ کار نے اپنے ہندوستانی منیجر کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ کسی بنجر علاقہ کو صاف کر کے پودے لگا دے تاکہ وہ اس کمپنی کے حوالہ کر دے جس کے ہاتھوں اس نے اسے ایک باغ کی حیثیت سے فروخت کیا تھا"[5]

---

[1] ایڈگر، ایضاً ص ۱۱

[2] ایضاً ص ۱۱

[3] ایضاً، ص ۸

[4] ایضاً، ص ۹

[5] کیمپ بل، ایضاً ص ۱۲۵

ایسی بے حد سٹہ بازی، ویران علاقہ کو تیزی سے صاف کرنے اور چائے لگانے کی وجہ سے مزدور کا سوال بہت سنگین ہو گیا۔ تقریباً ۱۸۶۰ء تک مقامی مزدوروں کی فراہمی گرچہ کم تھی پھر بھی چائے کے باغات کی ضرورتوں کے لیے کافی تھی بسٹہ بازی کے شوق کے زمانہ میں زیادہ مزدوروں کی مانگ برابر رہی اور مانگ کو پورا کرنے کے لیے بنگال سے مزدور منگانا پڑے۔ یہ سارے قلی اس زمانہ میں عام طور پر کلکتے کے مزدور ٹھیکہ داروں کی ایجنسی کے ذریعہ منگائے جاتے تھے۔ مزدوروں کی اجرت بہت بڑھ گئی تھی اور یہ ٹھیکہ داروں کو معاوضہ ادا کرتی رہی تاکہ وہ ہر قسم اور ہر طرح کے قلی فراہم کر کے آسام روانہ کر دیں۔ حمل ونقل کا طریقہ بہت ہی ناقص تھا اور قلیوں کی بڑی تعداد سفر ہی میں ختم ہو جاتی تھی اور جب[۱] باغوں میں پہنچ بھی جاتے تو ان کی مصیبتیں مالکوں کی بدسلوکی سے بہت سی حالتوں میں دوچند ہو جاتی تھیں[۱]۔ بیشتر صورتوں میں قلی اپنے مستقبل کے امکانات کے نام پر دھوکے کھاتے اور جب وہ آسام پہنچ جاتے تو ان کی حالت معاہدہ کے دوران گویا غلام کی سی ہو جاتی۔ اگر وہ بھاگ جاتے تو وہ گرفتار کر کے واپس لائے جاتے اور کام سے انکار کرنے کی صورت میں انہیں قید کی زندگی بھی بسر کرنی پڑتی[۲]۔ اس قانونی سخت گیری کے علاوہ نخل کاروں کو دوسرے غیر قانونی حربے بھی حاصل تھے جیسے زدو کوب[۳]۔ سٹہ بازی کے ان برسوں کے دوران قلی کی حالت بہت ہی خراب تھی مگر بعد میں کسی قدر سدھر گئی۔

باغات کے سلسلے میں جو غیر معمولی سٹہ بازی ہوئی اس کا اچانک ردعمل ۱۸۶۶ء میں رونما ہوا۔ چائے کی تمام جائداد کی قیمت گھٹ گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بلبلوں کی طرح اٹھنے والے نئے کاروبار ختم ہو گئے۔ ان نوجوانوں پر جو چائے کے باغات کا انتظام کرنے آئے تھے بڑی مصیبت آگئی۔ تجارت میں یہ اُتار آگیا اور یہ ۱۸۶۹ء تک قائم رہا پھر حالت بہتر ہونے لگی اور ۱۸۷۱ء تک تو یہ صنعت مستحکم بنیاد پر کھڑی ہو گئی۔ اس کے بعد اس صنعت کی ترقی تقریباً دو دہائیوں سے زیادہ برقرار رہی۔ چائے کی کھیتی ملک کے دوسرے حصے جیسے پنجاب (کانگڑا) اور نیل گری کی پہاڑیوں میں پھیل گئی اور تب یہ صنعت مضبوط بنیاد

---

[۱] ایڈگر، ایضاً، ص ۲۱

[۲] ۱۸۶۵ء کے ایکٹ کی رُو سے نخل کاروں کو یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ بھاگے ہوئے قلی کو گرفتار کر لیں۔

[۳] مزدوروں کی [illegible] طریقہ بعد میں ٹھیکہ داروں کے ذریعہ ہی رائج تھا یا کسی خاص ملازم کے ذریعہ جو گارڈن سردار کہلاتا تھا، جو اپنے مالک [illegible] باغات کے لیے مزدور لانے کے لیے گھر بھیجا جاتا تھا۔ اس طریقہ کی برائیاں واضح طور پر چائے اور کوئلہ کی صنعت میں مزدور کی فراہمی سے متعلق کمیٹی کی رپورٹ ۱۸۹۶ء میں پیش کی گئی ہیں۔

پکڑی ہوگئی اور اس نے خوب ترقی کی۔

ہندوستان میں سب سے پہلے قہوہ مؤر (عربی وافریقی نسل کے مسلمان جو افریقہ کے شمال مغرب میں رہتے ہیں) تاجروں کے ذریعہ سترہویں صدی میں لایا گیا اور اس کی کھیتی جنوبی ہندوستان کے بہت سے علاقوں میں کی گئی[۱] لیکن اس نے اس وقت تک اہمیت حاصل نہیں کی جب تک فرنگی نخل کاروں نے اس کام کو شروع نہیں کیا۔ قہوہ کا پہلا باغ ایک یورپین نے ۱۸۴۰ء میں لگایا لیکن اس صنعت کی ترقی ۱۸۶۰ء تک رکی رہی پھر دوسرے اسباب جیسے دیگر ممالک میں قہوہ کی کھیتی میں کمی آجانے سے اس صنعت میں تیزی سے توسیع ہونے لگی۔ کادر ضلع میں اس صنعت کی توسیع کا ذکر کرتے ہوئے میسور گیزیٹیر کے مرتب نے لکھا ہے "۱۸۶۰ء سے ان علاقوں میں جائدادیں (ESTATES) اتنی تیزی سے بڑھ گئی ہیں کہ کورگ اور وینار کا ذکر کیا شیموگا کے دکھن پچھم سے لے کر منجرآباد کی دور دکھنی حدوں تک فرنگی نخل کار اپنی جائداد کے سلسلہ وار حلقوں میں آباد ہیں"[۲] ۱۸۶۰ء کے بعد صرف پہلی دہائی کے دوران قہوہ کی برآمد تقریباً دس گنی بڑھ گئی اور ۱۸۷۹ء تک اضافہ کی یہ شرح برقرار رہی۔ ۱۸۶۰ء تک کا دور اس صنعت کے لیے اور مسلسل مستقل ترقی کا دور تھا لیکن ۱۸۷۵ء ہی میں درختوں میں سوراخ کرنے والے کیڑوں کی بیماری BORER DISEASE نے باغات میں تباہی مچادی تھی اور ۱۸۷۹ء میں تو اس نے شدت اختیار کرلی یہ اس شدید رکاوٹ کا آغاز تھا جس سے یہ صنعت اگلی دہائی میں دوچار ہوئی۔

ان باغات میں کام کرنے کے لیے قرب وجوار کے ضلعوں سے مزدور منگائے جاتے تھے۔ ان مزدوروں کی بڑی تعداد غیر مستقل ہوتی تھی اور یہ ایسے کاشتکاروں پر مشتمل ہوتی تھی جو موسم کے زرعی کاموں کے ختم ہونے پر آیا کرتے تھے۔ ایک ایکٹ کی رو سے ان نخل کاروں کو اپنے مزدوروں پر اختیار رکھنے کا مجاز حاصل تھا لیکن یہ قانون بہت سخت نہ تھا اس صنعت میں مزدوروں کی جماعت اپنے گھروں سے بہت دور نہ تھی اور نہ وہ اضلاع ہی غیر صحت مند تھے جہاں یہ صنعت چل رہی تھی اس لیے مزدور کی حالت چائے کی صنعت کے مزدوروں سے بہت زیادہ بہتر تھی۔

ہندوستان میں یورپی سرمایہ کاری سے معاشی ارتقا کا ایک نیا پہلو سامنے آگیا۔ اب تک یورپ والے ہندوستان کی تجارت سے اپنا حصہ پاکر خوش تھے یہی لوگ ہندوستان کی بیرونی تجارت اپنے ہاتھ

---

[۱] واٹ: اقتصادی پیداوار کی ڈکشنری، قہوہ سے متعلق مضمون

[۲] ایل۔ رائس: میسور گیزیٹیر، ج ۲، کادر ضلع، ص ۳۷۵ (۱۸۹۷ء)

میں لیے ہوئے تھے لیکن اب تک انھوں نے ہندوستانی صنعت کی ترقی میں کوئی براہِ راست حصّہ نہیں لیا تھا
اب نیل کاریوں اور جوٹ کی صنعت سے ہندوستانی صنعتوں کے لیے مالیات اور تجارتی تنظیم کا نیا وسیلہ ہاتھ
آگیا۔ یہ وہ پہلو تھا جو انیسویں صدی کے وسط سے ظاہر ہونے لگا اور جس کی تقدیر میں ہندوستان کی صنعتی ترقی
میں بڑا اہم رول ادا کرنا تھا۔

۲۔ کارخانے

کارخانہ والی صنعت۔ صنعت کی وہ قسم جس نے انیسویں صدی میں تمام علاقوں میں دستی صنعتوں کی جگہ
لے لی تھی اور اس کا آغاز بھی ہندوستان میں ہوا۔ ایک زمانہ تک بہت سی صنعتوں میں کارخانہ جاتی نظام
لانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ اس معاملہ میں یورپین پیش پیش تھے۔ اس میں سے کچھ کوششیں کم سے کم
عارضی طور پر بار آور بھی ہوئیں۔ مثلاً ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذریعہ ریشم کے اٹیرن کے لیے لپیٹنے والی مشین
لائی گئی اور اس صنعت کو کچھ عرصہ کے لیے بڑا فروغ ہوا[1] لیکن دوسری بیشتر ابتدائی کوششیں بالکل
ناکام رہیں۔ اس لیے پانچویں دہائی کے سالوں میں اگر ہم نیل کے کارخانوں کو نظر انداز کر دیں تو گویا کارخانہ
والی صنعت کا ہندوستان میں مکمل طور پر فقدان تھا۔ پانچویں دہائی کے برسوں ہی میں یہ دونوں صنعتیں
شروع کی گئیں جو ہندوستان کی جدید صنعتوں میں ہمیشہ پیش پیش رہی ہیں۔

پہلے ہم کپاس کی صنعت کا جائزہ لیں کیوں کہ یہ زیادہ اہم صنعت ہے۔ وہ کمپنی جس نے ہندوستان
میں کپاس کی پہلی مل قائم کی وہ بمبئی اسپننگ اینڈ ویونگ کمپنی تھی جو تقریباً ۱۸۵۱ء میں بنی تھی لیکن یہ مل ۱۸۵۴ء
تک گویا معطل ہی رہی[2] قدرتی طور پر اس صنعت کی ترقی پہلے بڑی سست رفتار تھی اور ۱۸۶۱ء تک صرف
ایک درجن ملیں موجود تھیں۔ پہلی مل حالانکہ بمبئی جزیرہ میں نہ تھی مگر وہ اس سے بہت ہی قریب تھی اور یہ صنعت
بمبئی کے اطراف میں پھیلتی چلی گئی۔ ۱۸۶۰۔۷۰ء کی دہائی مل صنعت کی توسیع کے لیے بہت سازگار نہ تھی۔
ناموافق حالات میں ایک صورت یہ تھی کہ امریکہ کی خانہ جنگی سے خام کپاس کا دام چڑھ گیا۔ کپاس کے اونچے
دام کی زد میں ہندوستان کی ہینڈلوم صنعت بھی آئی اور نئی ملوں کی صنعت بھی۔ دوسرا سبب بمبئی کی سخت
تجارتی کساد بازاری تھی جو کپاس کی نمایاں گرم بازاری کے بعد آئی تھی۔ کپاس کی اس گرم بازاری کا ذکر ہندوستان میں

---

[1] سیرام پور کے کاغذ کے کارخانے جو دوسری دہائی میں قائم ہوئے وہ کئی دہائیوں تک فروغ پاتے رہے۔
[2] واٹ کا مضمون دیکھیں، ح۔س

معاشی دور کے آغاز کی حیثیت سے پہلے آچکا ہے اس کے بعد کا دور بھی ان نئے حالات کی نشان دہی کر رہا تھا جو پیدا ہو رہے تھے۔ وہ تجارتی بحران اپنی قسم کا ہندوستان میں پہلا بحران تھا جو تمام ممکن اور ناممکن مقاصد کے لیے بے سوچے سمجھے کمپنیاں کھولنے اور اس کے نتیجہ کے طور پر تمام ساکھ کے ختم ہو جانے سے پیدا ہوا تھا۔[1] یہ کہا جاسکتا ہے کہ مغربی ہندوستان کی یہ کساد بازاری وقت کے اعتبار سے آسام کی چائے کی تجارت کساد بازاری سے مل جاتی ہے۔ ۱۸۶۵ء میں بمبی کے اندر ساکھ اتنی زیادہ ختم ہوگئی کہ ۱۸۷۱ء تک حالات معمول پر نہ آسکے۔ اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۳-۱۸۷۲ء کے دوران بمبئی پریسیڈنسی میں کپاس کی صرف ۱۸ ملیں تھیں اور بنگال میں دو۔ تاہم اس بحران کا کپاس کی مل صنعت پر ایک خوش گوار اثر پڑا۔ اس نے یہ بتا دیا کہ وہ ساری اسکیمیں ناقابل عمل ہیں جو چڑھاؤ کے زمانہ میں شروع کی گئی تھیں اور اس نے یہ بھی دکھلا دیا کہ صرف کپاس کی صنعت ہی مستحکم اور نفع بخش صنعت ہوسکتی ہے اس لیے جیسے ہی تجارتی اعتماد بحال ہوا ویسے ہی ملوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ ۵-۱۸۷۴ء میں تو خاص طور پر یہ اضافہ نمایاں تھا۔ ۱۸۷۴ء میں بمبئی پریسیڈنسی میں ملوں کی تعداد ۱۹ تھی جو بڑھ کر ۱۸۷۵ء میں ۳۶، ۱۸۷۶ء ۳۹ اور ۱۸۷۸ء میں ۴۲ ہوگئی۔[2] اس دہائی کے دوران اس صنعت میں جو اضافہ ہوا وہ خاص طور پر فرانس اور جرمنی کی جنگ کے اثرات دور ہونے کے بعد ہوا۔ اور یہ بہت ہی زیادہ تھا اور اب اس نے واقعی ہندوستان کی اہم ترین صنعت کی پوزیشن حاصل کرلی۔ ۱۸۷۹ء میں اس صنعت کا پھیلاؤ یہ تھا:

مل	اسپنڈل	لوم	کام میں لگے لوگ
۵۶	۱,۴۵۲,۰۰۰	۱۳۰۰۰	۴۳۰۰۰

ان ملوں کی تقریباً تین چوتھائی بمبئی پریسیڈنسی ہی میں تھی اور اس کی نصف سے زیادہ تعداد خود جزیرہ بمبئی میں تھی۔ تکلوں کی تعداد کے مقابلہ میں 'لوم' کی تعداد بہت کم تھی اور سچ مچ میں زیادہ تر ملیں 'اسپننگ' ملیں تھیں۔ سوت کی پیداوار کی یہ برتری بہت ہی لمبے عرصہ تک اس صنعت کی اہم خصوصیت رہی۔

---

[1] ڈی۔ ای۔ واچ: بمبئی کی تاریخ کا ایک مالیاتی باب (۱۹۱۰ء)

[2] یہ اعداد و شمار بمبئی اینڈ لنکا شائر کاٹن اسپننگ انکوائری (۱۸۸۸ء) کے سامنے پیش کردہ شہادت سے لیے گئے ہیں

کاتنے اور بننے والی صنعت کے علاوہ لوگوں کی خاصی تعداد کپاس کی دوسری صنعت یعنی کپاس سے بیج نکالنے اور گانٹھ بنانے (GINNING AND PRESSING) والے کارخانوں میں لگی ہوئی تھی۔ چھٹی دہائی کے دوران تک ملک کے اندرونی حصوں سے جو روئی بندرگاہوں کو بھیجی جاتی تھی وہ زیادہ تر بغیر گانٹھ بنی ہوتی تھی، گانٹھ بنانے والے کارخانے کچھ مشہور بندرگاہ جیسے بمبئی میں قائم کیے گئے لیکن امریکی جنگ سے کپاس کی کھیتی کو جو تقویت ملی تھی اس کی وجہ سے اور پھر مواصلات کی تیز رفتار ترقی سے اسٹیم پریس STEAMPRESS کام میں لایا جانے لگا اور بعد میں کپاس کے علاقوں ہی میں بھاپ کی روئی اوٹنے والی مشین کا استعمال ہونے لگا۔ یہ اقدام زیادہ تیز نہ تھا مسٹر ربوٹ کارنک کہتے ہیں کہ ۱۸۶۷ء تک صوبہ متوسط میں STEAMPRESS کا گویا استعمال نہیں ہوتا تھا[1] ۱۸۶۷ء کے بعد ہی اُس صوبہ میں اس کی تعداد تیزی سے بڑھنے لگی اس وقت تک زیادہ تر روئی گانٹھ بنائے بغیر بمبئی بھیجی جاتی تھی۔ جب استعمال میں آگئی تو اوٹنے والی اور گانٹھ بنانے والی مشین تیزی سے ترقی کرنے لگی اور ۱۸۸۰ء تک روئی کی تھوڑی مقدار ہی کپاس پیدا کرنے والے علاقوں سے باہر بندرگاہوں کو گانٹھ بنائے بغیر بھیجی جاتی تھی۔ یہ صنعت گرچہ کافی لوگوں کو روزگار دیتی تھی اور ملک کے زرعی مزدور کے ایک طبقہ کو بڑا ہی ضروری کام فراہم کرتی تھی پھر بھی یہ ہندستان کے صنعتی ارتقا میں کوئی بڑی اہمیت کی حامل نہ تھی۔ کیونکہ اول یہ صنعت صرف موسمی تھی اور دوم یہ کہ یہ خام پیداوار کو مصنوعات میں تبدیل نہیں کرتی تھی بلکہ یہ خام مال کو آسانی سے برآمد کرنے کی سہولت دیتی تھی۔

کپاس کی صنعت کے بعد اہمیت کے اعتبار سے جوٹ کا نام آتا ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اوائل سے ہی جوٹ کی تجارت اہم تھی، اس کا خاص استعمال مستول کے رسے اور رسی وغیرہ میں ہوتا تھا۔ تقریباً ۱۸۳۰ء تک بورے اور جوٹ کے کپڑے تیار کرنے کی اجارہ داری بنگال کے ہینڈلوم بنکروں کو حاصل تھی[2] اس تاریخ کے بعد جب ڈنڈی میں مصنوعات تیار کرنے والی صنعت قائم ہوگئی تو ہینڈلوم کے ذریعہ بورے تیار کرنے سے زیادہ نفع بخش خام جوٹ کی برآمد ہوگئی۔ اس لیے ۱۸۳۰ء کے بعد کے سالوں میں بنگال کی ہینڈلوم صنعت میں تیزی سے انحطاط آیا۔ مستول کے رسّے، رسی، بورہ وغیرہ کے لیے جوٹ کی اہمیت تیزی سے بڑھ رہی تھی اور جوٹ کے لیے ہر سال اور زیادہ زمین وقف ہورہی تھی۔ کریمیا کی جنگ کے باعث جوٹ کی اہمیت بہت بڑھ گئی تھی جس کی وجہ سے روسی سَن کا ملنا بند ہوگیا تھا اسی سن سے جوٹ کا زبردست

---

[1] سی۔پی کے کاٹن کمشنر کی سالانہ رپورٹ ۹-۱۸۶۸ء ص ۹۱

[2] واٹ کا جوٹ سے متعلق مضمون، ج۔س

مقابلہ تھا ۱۸۵۴ء تک مشین کی مدد سے جوٹ تیار ہونا شروع نہ ہوا تھا۔ اسی سال آکلینڈ نامی ایک شخص نے سیرام پور میں جوٹ مل قائم کیا تھا۔ ۱۸۵۴ء سے لے کر ۱۸۶۳-۴ء تک صرف ایک اور مل قائم ہوئی۔ لیکن ۱۸۶۳-۴ء کے بعد اس صنعت کی ترقی کافی تیز ہوئی۔ جوٹ ہندوستان کی اجارہ داری تھی اور اس میں بنگال کی صنعت کو برتری حاصل تھی۔ اب تک ڈنڈی جس نے کامیابی کے ساتھ ہینڈلوم صنعت کو ختم کردیا تھا پورے مارکٹ پر قابض تھا لیکن بنگال انڈسٹری نے جلد ہی اپنی جگہ بنالی جس کے متعلق ۱۸۷۶ء میں مسٹر اوکونور اپنا خیال ظاہر کرتے ہیں[1] "جب کہ ڈنڈی کا مقابلہ ہندوستان میں ہاتھ سے تیار ہونے والی جوٹ کی اشیاء سے تھا تو اس شہر کو عالمی سپلائی کی اجارہ داری حاصل تھی لیکن یہاں اسٹیم سے چلنے والی بہترین میکانکی [illegible] سے [illegible] ملوں کو یہ ناگزیر موقع ملا کہ اس نے ڈنڈی کو ایشیا اور آسٹریلیا کے مارکیٹ سے بڑی حد تک دور رکھا بلکہ امریکہ کے ایک حصہ سے بھی خارج کردیا۔"[2] ۱۸۸۲ء میں ہندوستان کے اندر جوٹ کی ملیں تھیں جن میں تقریباً ۲۰ ہزار آدمی کام کرتے تھے ان میں سے ۱۸ بنگال میں اور ۱۷ کلکتہ کے قرب وجوار میں تھیں۔ بمبئی کے گرد کپاس کی صنعت سے زیادہ یہ صنعت کلکتہ کے اطراف میں محدود تھی۔ ایک یورپین نے جوٹ کا پہلا مل قائم کیا تھا اور یہ صنعت خاص طور پر یورپ والوں کے ہاتھوں ہی رہی۔ خام جوٹ کی برآمدی تجارت ترقی پانے سے جوٹ کی گانٹھ بنانے والی صنعت بھی بنگال میں اہمیت اختیار کرنے لگی۔

کارخانہ والی ان صنعتوں کے علاوہ کوئلہ کی کان کنی میں بھی جدید طریقے استعمال ہونے شروع ہو گئے اس زمانہ میں صرف کوئلہ ہی وہ معدنی شئے تھی جو ہندوستان میں کافی تعداد پیدا کی جارہی تھی۔ اس صنعت کا آغاز ۱۸۲۰ء میں ہوا تھا جب کہ بنگال میں رانی گنج کے ضلع میں ایک کان کھودی گئی تھی۔ اس کے بعد بیس سال تک کوئی نئی کان نہیں کھودی گئی اور ۱۸۵۴ء تک صرف تین کانیں کھودی گئیں۔ اس سال ایسٹ انڈین ریلوے بچھانے کا کام شروع ہوا جو دامودر گھاٹی کے کوئلہ پیدا کرنے والے علاقوں سے گذرتی تھی۔ اس سے کان کنی کی صنعت کو بڑا فروغ حاصل ہوا اور بڑی تعداد میں نئے کنویں کھولے گئے"[3] یہ ترقی مستقل رہی اور اس علاقہ میں یعنی رانی گنج اور قرب وجوار کے ضلعوں میں ۱۸۷۹-۸۰ء میں کل ملاکر

---

[1] ایچ۔ سی۔ کر: بنگال میں جوٹ کی کاشت اور تجارت سے متعلق رپورٹ (۱۸۷۴ء)

[2] جے۔ ای۔ اوکونور: میمورنڈم، برٹش انڈیا کی تجارت اور جہاز رانی کا حال، ۱۸۷۵-۶ء، ص ۳۱

[3] اوکونور، ہندوستان کی تجارت کا جائزہ ۱۸۷۸-۹۰، ص ۲۲

۵۶ کانیں کام کر رہی تھیں۔ یہ بالکل فطری تھا کہ ہندوستان میں ریلوے کی تعمیر کے ساتھ کوئلہ کی کان کنی کو تقویت ملے گی محض اس لیے نہیں کہ اس سے پہلے صنعتی مقاصد کے لیے کوئلہ کی کوئی خاص مانگ نہ تھی بلکہ اس لیے بھی کہ ریلوے کی مدد کے بغیر ان اضلاع سے سستے طور پر کوئلے جانا ناممکن تھا خود ریلوے کو ایندھن کی بڑی مقدار درکار تھی اور جب پہلی ریلوے لائنوں کی وجہ سے جنگلات تیزی سے ناپید ہونے لگے تو لکڑی گراں سے گراں تر ہونے لگی اور پھر کوئلہ کی مانگ اور زیادہ ہوتی گئی۔ یہ مانگ برطانیہ سے ہندوستان کی کوئلہ کی بڑھتی ہوئی درآمدی تجارت کا نتیجہ تھی۔

۱۸۷۰ء تک صرف رانی گنج ہی کی کوئلہ کانیں کام میں لائی گئی تھیں۔ یہ ایسٹ انڈین ریلوے کو کوئلہ فراہم کرتی تھیں اور کبھی کبھی ان کانوں سے کوئلہ پنجاب بھیجا جاتا تھا لیکن ہندوستان کے مغرب و جنوب کا ریلوے سلسلہ کچھ ایسا تھا کہ وہاں کوئلہ نہیں بھیجا جا سکتا تھا۔ ۱۸۷۰ء میں صوبہ متوسط میں موہپانی خزینے کھولے گئے لیکن جو مقدار حاصل ہوئی وہ ناقص تھی اور انھیں کوئی اہمیت حاصل نہ ہو سکی۔ اسی سال بنگال کے کارہار باڑی ضلع میں کوئلہ کی کان کھودی گئی اور یہ چند برسوں میں بہت ہی مشہور ہو گئی۔ ۱۸۷۴-۵ میں کوئلہ کی دوسری کان یعنی صوبہ متوسط کی واروراکان کھولی گئی۔ گریٹ انڈین پنینسولا ریلوے کو اس سے ایندھن حاصل کرنے میں کسی قدر مدد ملی لیکن پھر بھی بنگال کی کوئلہ کانوں کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل رہی اور ہندوستان کی تھیمی ریلوے اور صنعتوں کی ضرورتیں ذرا بھی پوری نہ ہوتی تھیں۔ سوئز نہر کے کھل جانے سے عارضی طور پر ہندوستان کی کوئلہ کی صنعت ماند پڑ گئی۔ ۱۸۷۰ء یعنی سوئز نہر کے کھل جانے کے بعد درآمد زیادہ نہیں بڑھی لیکن ہندوستان میں کوئلہ کی پیداوار کو عارضی طور پر دھکا لگا کیونکہ کوئلہ کی پیداوار جو ۱۸۶۹ء میں تقریباً ۴۶۷،۰۰۰ ٹن تھی اگلے تین برسوں میں بہت گھٹ گئی اور ۱۸۷۵-۶ء تک پھر اپنی پرانی سطح پر نہ آئی۔ اس تاریخ کے بعد یہ مستقل ترقی آتی گئی!

لیکن ہندوستانی کوئلہ کی پیداوار میں گرچہ اضافہ ہو رہا تھا پھر بھی باہری کوئلہ کی درآمد بھی برابر بڑھ رہی تھی۔ یہ خاص کر ہندوستان میں ریلوے کی توسیع کا نتیجہ تھا اور اس لیے بھی کہ ریلوے کے بہت سے راستے کوئلہ کی کانوں کے لیے ناموافق تھے۔ ہندوستان میں کوئلہ کی درآمد کا ۷۰ فیصد حصہ بمبئی پریسیڈنسی ہی میں کھپ جاتا تھا۔ اس طرح کوئلہ کی پیداوار گرچہ بڑھ رہی تھی، ہندوستان ۱۸۸۰ء میں سالانہ ۶۰۰،۰۰۰ ٹن کوئلہ درآمد کر رہا تھا جب کہ ہندوستان سے کوئلہ کی برآمد گویا صفر تھی۔ اس صنعت میں مستعمل طریقے ایک

لہ سر وی بال: اکونومک جیولوجی آف انڈیا (۱۸۸۱ء)

دوسرے سے بہت کچھ مختلف تھے کیونکہ اسی زمانہ میں جب کہ بڑی صنعتوں میں مشین کا استعمال کثرت سے ہو رہا تھا، زیادہ چھوٹی کانوں میں بہت کم مشین استعمال ہو رہی تھی۔ آخر الذکر صنعتوں کی تعداد اول الذکر صنعتوں کی تعداد سے بہت زیادہ تھی۔ ۱۸۸۰ء میں کوئلہ کی صنعت میں تقریباً بیس ہزار آدمی کام کر رہے تھے۔

۱۸۸۰ء میں صرف تین صنعتیں یعنی کپاس اور جوٹ تیار کرنے والی اور کوئلہ کی کان کنی کی صنعتیں ہندستان میں اہم تھیں۔ ان صنعتوں میں لگے ہوئے لوگوں کی تعداد سے ہی اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ صنعتیں کتنی چھوٹی تھیں حالانکہ صرف یہی صنعتیں تھیں جو ۱۸۸۰ء تک ترقی پا چکی تھیں تاہم کئی صنعتوں میں فیکٹری سسٹم قائم کرنے کی کوشش ہوئی تھی اور مختلف درجہ کی کامیابی نصیب ہوئی تھی۔ مثال کے طور پر ۱۸۶۹ء میں جدید طریقہ سے چمڑے کی مصنوعات کا کام شروع ہوا تھا جب کہ سرکار نے فوج کو چمڑے کا سامان بھیجنے کے لیے ایک کارخانہ قائم کیا تھا۔ دوسری کی جانے والی متعدد کوششوں کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ ان کا جائزہ لینا غیر ضروری ہے کیونکہ ان میں سے زیادہ تر کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔

اس زمانہ میں ہندوستان میں ایک دوسری دلچسپ صنعت تھی جو جدید صنعت کہلانے کی مستحق تھی۔ یہ مدراس کی چرم سازی TANNING کی صنعت تھی۔ یہ صنعت ایک شخص چارلس ڈی سوزا کی مرہون منت ہے جو ۱۸۴۵ء میں ہندوستان کی چرم سازی کے مستعمل طریقوں میں کچھ سدھار لایا تھا۔ یہ صنعت مدراس شہر میں تھی اور رفتہ رفتہ مدراس پریسیڈنسی کے دیگر مشہور شہروں میں سدھار کے یہ طریقے پھیل گئے لیکن یہ ترقی اس پریسیڈنسی سے باہر کبھی نہ ہو سکی۔ بہت سے چرم سازوں نے ان طریقوں کو اختیار کیا اور ہندوستانی چمڑے اور چرسے کی برآمدی تجارت بڑھ گئی پہلے صرف برطانیہ سے تجارت ہوتی تھی لیکن فرانس اور جرمنی کی جنگ کے بعد جرمنی اس تجارت میں بہت بڑھ گیا اور اس سے اور ساتھ ہی ساتھ ۱۸۷۵ء میں ان برآمدات پر سے ۳ فیصد ڈیوٹی اٹھ جانے اور ریلوے کی توسیع سے جس سے مدراس کے چرم سازوں کے لیے ملک کی چمڑے اور چرسے کی سپلائی کھل گئی، اس صنعت کو کافی فروغ حاصل ہوا اور ۱۸۸۰ء تک پہنچتے پہنچتے مدراس بیرونی ممالک کو پختہ اور نیم پختہ چمڑے اور چرسے برآمد کرنے لگا۔ مدراس کی یہ چرم ساز صنعت ہندستانی صنعت کے ارتقا کا درمیانی مرحلہ نظر آتا ہے کیونکہ صنعت میں سستے خام مال اور سستے مزدور کے ساتھ ساتھ سدھار کے طریقوں کی مطابقت بھی ظاہر ہوتی ہے[1] اس تجارت کے اس شعبہ سے خود مختار دستکار نکل جاتا ہے اور بیشتر صورتوں میں برآمد کرنے والا تاجر ایک چھوٹا سرمایہ دار بن کر اس کی جگہ لے لیتا ہے

---

[1] اے چیٹرٹن: مونوگراف، ٹیننگ اینڈ ورکنگ ان لیدر ان دی مدراس پریسیڈنسی (۱۹۰۴ء)

اس صنعت کی اکائی بڑھ گئی۔ تقریباً ۵ سے ، کی تعداد میں اوسطاً کام کرنے والوں پر مشتمل یہ ایک چھوٹا سا ورکشاپ بن گیا۔ یہ صنعت مکمل طور پر برآمدی صنعت بن گئی کیونکہ گاؤں کا چمڑے کا مزدور جو چمڑا تیار کرتا تھا وہ خود چاہتا تھا کہ اسے گاؤں کے چرم ساز تیار کرائے اور چمڑے کے سامان کے لیے شہری مانگ اتنی زیادہ نہ تھی کہ اس قسم کی صنعت کو سہارا دے سکے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ ان صنعتوں میں بہت تھوڑا سدھار ہوا۔ وہ اسی حد تک ہوا کہ ہندستان کے گاؤں میں تیار ہونے والے چمڑے سے تھوڑا بہت بہتر تھا اور برآمد کیا جاسکتا تھا۔ اس صنعت کی ترقی اس وجہ سے ہوئی کہ اسے سستے مزدور اور سستی خام اشیاء کے دو واضح فائدے حاصل تھے اور ان میں سے کسی ایک کے ختم ہونے سے اس کی ترقی رک سکتی تھی۔ اس صنعت میں کتنے لوگ لگے تھے اس کا اندازہ کرنا ناممکن ہے لیکن ان کی تعداد زیادہ نہیں ہو سکتی ہے۔

ہندستان کی ان چند نئی صنعتوں کا مذکورہ بالا بیان آخرکار واضح کردے گا کہ ۱۸۸۰ء میں ان کی وسعت بہت ہی مختصر تھی اور جب کہ پرانی دستکاری سے لوگوں کے اخراج کا عمل تیزی سے جاری تھا، خارج شدہ لوگوں کو کھپانے کے لیے نئی صنعتوں کی ترقی کسی اعتبار سے ہم پلہ نہ تھی۔

پانچواں باب

کاشتکار، ۹۵-۱۸۸۰ء

ہندوستان میں گاؤں زراعت کی اکائی ہے اس لیے گاؤں کی عام تنظیم ہمارے لیے اہمیت رکھتی ہے ہندوستان ہمیشہ مختصر آراضیوں کا ملک رہا ہے خواہ یہ کھیتی کسان مالک کے ذریعہ ہوتی ہو یا کاشتکار آسامی کے ذریعہ۔ کسانوں کے زمین پر حقوق کا انحصار اس کی حقیقت آراضی کی نوعیت پر تھا۔ ہندوستان میں حقیقت اراضی کی قسمیں گویا پیچیدہ ہیں لیکن ان کی دو واضح قسمیں ہیں یعنی 'رعیت واری' اور 'زمینداری حقیقت'۔ ہندوستان کے زیادہ تر گاؤں ان دو قسموں میں سے کسی ایک میں آتے تھے[1] رعیت داری کے حلقوں میں پورے گاؤں پر کسی کی واحد ملکیت نہ تھی۔ گاؤں کئی خود مختار کسان مالکوں پر مشتمل تھا اس کے برعکس زمینداری گاؤں میں ایک زمیندار یا شریک دار زمینداروں کی جماعت مالک ہوا کرتی تھی جہاں ایک زمیندار گاؤں کا مالک ہوتا تھا وہاں بھی کاشت کار اس کی رعایا ہوتے تھے۔ شریک دار زمینداروں کے گاؤں میں طریقے مختلف تھے۔ کچھ گاؤں میں مشترکہ کھیتی ہوتی تھی اور مختلف شریک داروں کے مختلف کھیتوں میں کوئی ایسی تقسیم نہیں ہوتی تھی جس سے نشاندہی ہو سکے اور کچھ دوسرے گاؤں میں کھیت باقاعدہ بٹے ہوئے ہوتے تھے۔ کبھی کبھی مشترکہ کھیتی کرنے والے زمیندار اپنے خاندان کے ساتھ پورے گاؤں کو چلاتے تھے لیکن کبھی کبھی وہ اپنے گاؤں میں کھیت جوتنے والی رعایا کو بھی داخل کرتے تھے۔ ان مختلف طریقوں میں سے رعیت داری طریقہ کار دکھن میں چھایا ہوا تھا بنگال میں واحد زمیندار کا سسٹم تھا اور شمالی مغربی صوبہ و پنجاب میں زیادہ تر مشترکہ کھیتی کرنے والے پائے جاتے تھے[2]

ان مختلف حقیقتوں نے گاؤں کی اندرونی ہیئت میں کوئی بڑا فرق پیدا نہیں کیا تھا جہاں تک زمینداری

---

[1] ان کے علاوہ اہم ترین گروپ میں صوبہ متوسط کی 'مالگذاری' حقیقت اراضی (TENURE) آتی تھی۔

[2] بی۔ ایچ۔ بادن پویل: برٹش انڈیا میں مالگذاری اور اس کے انتظام کا مختصر حال (۱۹۱۳ء)

گاؤں میں دیہی کاری گروں کا سوال آتا ہے، ان پر زمینداروں کے خاص حقوق عاید ہوتے تھے لیکن دوسری صورت میں ان کی پوزیشن رعیت داری گاؤں کے متقابل طبقہ سے بہت زیادہ مختلف نہ تھی۔ رعیت داری گاؤں کے رشتوں کو سردار کی طاقت اور مشترک کاریگر ہی متحد رکھتے تھے جن کی اجرت پورے گاؤں سے ملتی تھی لیکن زمینداری گاؤں میں واحد یا اجتماعی ملکیت تھی۔ یہ دیکھنا ہے کہ گاؤں کے زراعتی علاقہ میں کوئی جماعتی جائداد نہ تھی ہر کسان کے پاس اپنی اراضی ہوتی تھی اور اسے اپنے طور پر انتظام کرنے کی آزادی حاصل تھی۔[1]

درحقیقت انیسویں صدی کے نصف اول میں کاشتکاری کی نوعیت گاؤں کے خود کفیل کردار سے متعین ہوتی تھی۔ پیداوار کا زیادہ تر حصہ اناج ہوا کرتا تھا جس کی کھپت گاؤں میں ہوتی تھی اور مقامی ضرورتوں کے لیے تلہن، کپاس وغیرہ جیسی فصلیں لگائی جاتی تھیں۔ زرعی پیداوار کی صرف دو اہم قسمیں تھیں جو اپنی نوعیت کے باعث پورے ہندوستان میں عموماً پیدا نہیں کی جا سکتی تھیں اس لیے یہ گاؤں میں باہر بھیجنے کے لیے پیدا کی جاتی تھیں۔ یہ کپاس اور گنے کی فصلیں تھیں ان کی تجارت بھی محدود تھی اور وہ علاقے بھی محدود تھے جہاں یہ بھیجے جاتے تھے۔ اس طرح پورے ہندوستان میں گاؤں کے گرد چھوٹے چھوٹے حلقوں میں کپاس کی کھیتی ہوتی تھی اور اس شئے کی تجارت کی واحد باقاعدہ رو کپاس کی اس سپلائی سے جاری تھی جو ناگپور اور برار سے مرزاپور ہوتے ہوئے بنگال کو کی جاتی تھی۔ بنگال میں بھی اچھے قسم کا کپاس ہوتا تھا کیونکہ یہ بات ہر ایک کو اچھی طرح معلوم ہے کہ ڈھاکہ کی ململ اسی کپاس سے تیار ہوتی تھی جو خود ڈھاکہ کے گرد ہوتا تھا۔ گنا ایسی فصل تھی جس کے لیے گہری کاشت، پانی کی باقاعدہ اور وافر سپلائی درکار تھی جو ہر جگہ موجود نہ تھی اس لیے گنے کی کاشت بڑی حد تک خاص علاقہ میں محدود رہی۔ چونکہ یہ بہت اہم شئے تھی اس لیے گڑ (ہندوستان کی خام چینی) کا درجہ کپاس کے بعد آتا تھا اور شاید یہ ہندوستان کی زرعی پیداوار میں سب سے اہم تجارتی شئے تھی لیکن اس کی کاشت محدود تھی۔ رتہ آئل کا حوالہ یہ بتانے کے لئے اوپر[2] دیا گیا ہے کہ کپاس کے موافق ترین خطوں میں کاشت والی زمین کا زیادہ سے زیادہ چوتھائی حصہ کپاس پیدا کرتا تھا لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ اندازہ

---

[1] بادن پوویل مشکوک ہیں کہ غیر منقسم مشترکہ گاؤں میں بھی کوئی مشترکہ کاشت کا رواج پنچایت کے ماتحت تھا۔ ان کا خیال ہے کہ ایسے گاؤں میں بھی زمین کی عملی طور پر تقسیم موجود تھی اور مختلف شریک داروں کے ذریعہ علیحدہ طور پر کھیتی ہوتی تھی۔
بادن پوویل۔ ہندوستان کی دیہی جماعت ص ۲۵ (۱۸۹۸ء)

[2] اوپر دیکھیں، باب دوم ص ۱۴

کس حد تک صحیح ہے۔ ۱۸۶۱ء میں ریونٹ کارنک کے اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ برار میں جو ہندوستان میں کپاس کے لیے موافق ترین خطہ تھا، کاشت والی زمین کا صرف ۲۰ فیصد حصّہ کپاس پیدا کرتا تھا اور یہ حال کپاس کی کھیتی میں عظیم توسیع کے وقت کا تھا۔ ایک مخصوص فصل کے لیے چوتھائی حصّہ بھی زیادہ نہیں جب ہم خاص طور پر یہ دیکھتے ہیں کہ اس فصل کا بیشتر حصّہ گاؤں سے دور باہر نہیں جاتا تھا۔ اس قسم کی کھیتی پر پابندی گاؤں کے خود کفیل کردار کا قدرتی نتیجہ تھی۔

مواصلات کی توسیع اور نئے بازار کے وجود سے جو نتائج چھٹی دہائی کے دوران ہندوستان کی کپاس کی کاشت پر ہوئے ان میں سے کچھ قابل لحاظ نتیجوں کا ذکر ہم نے کیا ہے لیکن یہ سارے اثرات بالخصوص زیر نظر دور کے دوران نمایاں طور پر پیش کیے گئے ہیں۔ لنکا شائر میں کپاس کا قحط عارضی تھا۔ سوئز نہر جو ہندوستان کی برآمدی تجارت میں اضافہ کا اہم سبب رہی تھی وہ ۱۸۶۹ء میں کھلی تھی۔ اس کے تھوڑے ہی دن بعد فرانس اور جرمنی کی جنگ رونما ہوئی اور پھر قحط کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ۸۰-۱۸۷۰ء کی دہائی اس طرح نارمل دہائی نہ تھی کہ نئے حالات کے اثرات پورے طور پر واضح ہوں۔ لیکن اس دہائی میں بھی گیہوں کی برآمد کے اضافہ سے عام رجحان کا پتہ چلتا ہے۔ قحط سے اس تجارت کی ترقی میں عارضی طور پر رکاوٹ آگئی اور ۹۵-۱۸۸۰ء کے دوران ہندوستان کی خام اشیا کی برآمد میں عظیم الشان توسیع ہوئی۔ یہ صرف اس لیے ممکن ہوسکا کہ اس مدت کے دوران ہندوستان سنگین قسم کے قحط سے حیرت انگیز طور پر محفوظ تھا۔ کہیں کہیں اشیاء کی قلت ضرور تھی اور بارش نہ ہوئی تھی لیکن ۷۸-۱۸۷۶ء جیسا بڑا قحط یا اس کے بعد ۱۸۹۵ء میں ہونے والے قحط کی طرح کوئی قحط نہیں پڑا۔

سنگین قحط سے محفوظ رہنے کے گرچہ یہ معنی بھی نہیں کہ یہ دور خوشحالی کا دور تھا پھر بھی یہ دور عوام کے لیے بڑی مصیبتوں سے نجات کا دور تھا۔ مجموعی طور پر یہ پندرہ سال کا زمانہ کاشتکاروں کے لیے نسبتاً خوشحالی کا زمانہ تھا کچھ علاقوں میں خوشحالی کا سلسلہ کبھی کبھی مقامی قلتوں کی وجہ سے ٹوٹ گیا تھا مثلاً ۸۵-۱۸۸۴ء میں بنگال میں قلت تھی، ۱۸۸۶ء میں چھتیس گڑھ کی دھان کی فصل گویا بالکل خراب ہوگئی تھی اور پھر ۱۸۸۹ء میں اڑیسہ کا بھی حال یہی ہوا۔ ۱۸۹۰ء اور ۱۸۹۵ء کے درمیان مدراس پریسیڈنسی اور صوبہ متوسط کے کچھ علاقوں میں بارش بے قاعدہ ہوئی تھی لیکن ان حالات کے باوجود یہ دور عمومی نقطہ نظر سے کاشتکار کے لیے سازگار رہا۔

یہاں پر کاشت کار سے ہماری مراد ایسے کاشتکار سے ہے جس کی اپنی زمین ہے، جو مسلسل اچھی فصل اور اپنی پیداوار کے دام بڑھ جانے سے خوب منافع حاصل کر رہا تھا۔ ایسے کاشتکار کے لیے جو بری

طرح قرض میں مبتلا ہوں یا جن کی کاشت صرف اتنی ہو کہ اس کا گذارہ مشکل سے ہو سکے۔ اس کے لیے یہ تمام عناصر کوئی فرق پیدا نہ کر سکے۔ اسی طرح روز کی مزدوری کرنے والے بے زمین مزدوروں کے لیے بھی یہ دور ایسا تھا کہ انہیں بس یہ یقین تھا کہ ان کو برابر مزدوری ملتی رہے گی۔ لیکن ایسے کاشتکار کے لیے جو قرض میں مبتلا نہ تھے قحط سے محفوظ ہونے کے معنی بڑی مدد کے ہونے تھے اور انہیں اپنی حالت کو کسی قدر بہتر بنانے کا موقع مل گیا۔

ہندوستان کی زرعی پیداوار کی بڑھتی ہوئی مانگ بھی ایک اہم پہلو رکھتی ہے کیونکہ اس سے بہت سی صورتوں میں صنعتی فصلوں کے دام میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ صرف برآمدی تجارت ہی نہیں بڑھ رہی تھی بلکہ زرعی پیداوار کی اندرونی تجارت میں بھی تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خاص خاص فصل کو اب بہتر طور پر لگانے کا موقع ملا۔ اس کا اظہار ان تحریکوں سے ہوتا ہے جو برار نے زیادہ سے زیادہ کپاس کی کاشت کے لیے کی تھیں یہاں تک کہ بالآخر اسے اپنی غذا کی فراہمی کے لیے بڑا حصہ درآمد کرنا پڑا۔ گنا اس زمانہ میں مقبول ترین فصلوں میں سے تھا حالانکہ چینی کی برآمدی تجارت گویا صفر تھی[1]

---

[1] برآمدی قیمت میں اضافہ عمومی نہ تھا۔ کپاس اور گیہوں جیسی کچھ اشیاء کی قیمت گھٹ گئی جب کہ جوٹ، چاول اور پتی کی قیمت کافی بڑھ گئی۔ یہ معلوم ہوگا کہ اول الذکر میں ہندوستان دنیا کے مارکیٹ میں اہم مقام نہیں رکھتا تھا اور یہاں قیمت گر گئی لیکن موخر الذکر میں ہندوستان عالمی بازار میں ہر شئے کو برآمد کرنے کے لحاظ سے اہم ترین مقام رکھتا تھا۔ اس گروپ کی قیمتوں میں واضح اضافہ ہوا تھا۔

قیمتوں کے اعداد و شمار۔ برآمدی تھوک تجارت

۱۸۷۳ کی قیمتیں ۱۰۰ رکھی گئی ہیں

سال	کپاس (بھڑوچ)	چاول (بالم)	چاول (رنگاسٹین)	گیہوں (دہلی)	جوٹ PICKED	پتی (برآوانہ)
۱۸۸۳ء	۷۸	۱۰۹	۱۲۹	۸۷	۹۲	۸۵
۱۸۸۹ء	۹۳	۱۴۴	۱۴۲	۹۵	۱۹۲	۱۰۴
۱۸۹۵ء	۷۰	۱۴۷	۱۲۲	۸۲	۱۷۵	۱۳۱

زرعی خوشحالی کے بہترین معیار کاشت کا رقبہ، پیدا ہونے والے غلوں کی نوعیت اور ملک میں مویشیوں کی تعداد میں ہندوستان کے معاملے میں ان معیاروں میں سے کسی ایک سے اندازہ لگانا خواہ وہ لگ بھگ ہی کیوں نہ ہو، ناممکن ہے۔ زرعی اعداد و شمار بڑے ہی ناقص ہیں۔ ۱۸۸۰ء کے قحط کمیشن کے لیے پہلی بار باقاعدہ طور پر یہ اعداد و شمار مرتب کیے گئے اور بعد میں اس کو باقاعدہ طور پر جاری رکھا گیا۔ لیکن مسٹر بینس کے نوٹ سے صاف ظاہر ہے کہ یہ کتنے ناقص تھے[۱]۔ ۱۹۰۰-۱۸۹۰ء کے قبل اہم صوبہ بنگال کے ایسے اعداد و شمار شائع نہ ہو سکے جن پر بھروسہ کیا جا سکے۔

ایسے اشارے عموماً مل رہے تھے کہ کاشت کا رقبہ برابر بڑھ رہا تھا۔ یہ اضافہ آب پاشی کی سہولتوں کے بڑھ جانے اور نئی زمین کے کاشت میں آجانے سے ہوا۔ اس زمانہ میں ہندوستان میں زمین کا کوئی ایسا علاقہ نہ تھا جو اچھوتا اور غیر کاشت شدہ ہو، کاشت میں آنے والے زیادہ تر علاقے بنجر تھے یا چراگاہ یا دہ جنگلی علاقے تھے جو صاف کیے گئے تھے۔ یہ عموماً ان علاقوں سے کمتر درجہ رکھتے تھے جو کاشت میں پہلے سے موجود تھے اور اس تحریک کو ہم ہندوستان کی بڑھتی ہوئی آبادی کا نتیجہ قرار دے سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہمارے پاس ایسا کوئی ثبوت نہیں کہ ہندوستان میں کاشت کی پیداوار فی ایکڑ بڑھ رہی تھی۔

پھر ایسے اشارے بھی نہیں جن سے معلوم ہو کہ اجناس کی نوعیت میں نمایاں تبدیلی ہو رہی تھی۔ مجموعی اجناس میں غلہ کا تناسب بہت زیادہ تھا۔ کمتر درجہ کے بدلے بہتر قسم کے غلّے پیدا کیے جا رہے تھے۔ اس رجحان کا پتہ پنجاب میں گیہوں کی کاشت کی توسیع سے چلتا ہے ورنہ غلوں کے زمرہ میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آتی لیکن کاشت کے رقبہ میں اضافہ ہونے کے ساتھ ساتھ صنعتی فصل کے علاقہ میں بھی تناسب اضافہ ہوا۔ جوٹ، گنا، تلہن اور کپاس کی فصلوں میں سب سے زیادہ اضافہ ہوا۔ یہ ظاہر ہے کہ صنعتی فصلوں کی توسیع آبپاشی کی توسیع کے ساتھ بڑھی اور جیسے ہی آب پاشی کی کوئی شکل کسی علاقہ میں پیدا ہوئی ویسے ہی زیادہ منافع بخش فصلیں آگئیں اور گہری کاشت ہونے لگی۔ مختلف صنعتی فصلوں کی ترقی بہت ہی مستقل تھی اور اس کی اہمیت کا اظہار مواصلات میں ترقی کے ان اثرات سے ہوتا ہے جو ہندوستان کی زراعت پر ہو رہے تھے زمانہ قدیم سے ہندوستان میں یہ تمام فصلیں غلہ کے ساتھ گھریلو مقامی استعمال کے لیے ہر گاؤں کے گرد چھوٹے چھوٹے قطعوں میں پیدا کی جاتی تھیں۔ ہندوستان میں اب جو تبدیلی پیدا ہو رہی تھی وہ صنعتی فصلوں کے رقبہ کے اضافہ میں اتنی زیادہ نہ تھی۔ یہ ممکن نہ تھا کیونکہ ہندوستان کو غذا کی فراہمی کا خیال رکھنا لازم تھا

---

[۱] "زراعت سے متعلق بیان" از جے اے بینس، ضمیمہ: ہندوستان کی اخلاقی اور مادی ترقی (۱۸۸۲-۸۳ء)

اور بڑھتی ہوئی آبادی کے ساتھ غذا پیدا کرنے والے علاقے بھی بڑھتے گئے لیکن یہ تحریک نمایاں تھی کہ فصل کسی حد تک مقامی رہے۔ اس طرح برار میں کپاس کی کھیتی بڑھنے لگی، دکن میں منیرا اور موتھا کے سیراب علاقوں میں گنے کی کاشت ہونے لگی اور اس کے ساتھ باغاتی فصل بھی پوری طرح ہونے لگی۔ ایسی تحریک حمل ونقل کی آسانیوں سے ہی ممکن ہوسکی اس سے صنعتی فصلوں کے لیے وسیع مارکٹ کھل گیا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ قرب وجوار کے ضلعوں سے غلوں کی فراہمی ممکن ہوگئی[1]۔

ہندوستان میں ایک لمبے عرصہ تک زراعتی خوشحالی کے یہ معنی بھی تھے کہ زراعتی ترقی کو تقویت ملے گی عام طور سے کنویں کھودے گئے اور بہتر مویشیوں پر روپیہ لگایا گیا۔ یہ وقت فطری طور پر فصل کے بہتر اقسام اور کاشتکاری کے بہتر طریقوں کے لیے نہایت موزوں تھا۔ ہندوستان میں کاشتکاروں کے طریقے ایک ضلع سے دوسرے ضلع، ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں اور خود ایک گاؤں میں کاشتکار کے ایک طبقہ سے دوسرے طبقہ میں بہت مختلف ہوتے تھے ان علاقوں میں جہاں بہت اچھی کھیتی ہوتی تھی جس کی مثال ڈاکٹر وایلکر نے کمبوتور، ماہم اور شمالی گجرات سے دی ہے معیار واقعی بہت ہی بلند تھا۔ لیکن ان علاقوں میں بھی جہاں طریقہ کار بہتر نہ تھا یہ نتیجہ نکالنا عام طور سے ممکن نہیں کہ وہاں کے کاشتکار کھیتی کے مناسب طریقوں سے ناواقف تھے۔ زیادہ تر حصوں میں زمین کو کچھ دنوں کے لیے چھوڑ دینے، باری باری فصلوں کو لگانا اور کھاد کی اہمیت اچھی طرح تسلیم کی گئی اور شاید بیجوں کے انتخاب کے سوا بہترین کاشت کے لیے تمام طریقے کام میں لائے گئے لیکن ان تمام طریقوں کا استعمال کاشتکار کے حالات پر منحصر تھا۔ جب جلاؤ لکڑی کی قلت ہوجاتی تو وہ اپنا سب سے قیمتی کھاد جلانے پر مجبور ہوجاتے۔ زمین پر دباؤ بڑھ جانے سے زمین کو بغیر استعمال چھوڑ دینا ممکن نہیں ہوتا اور اپنی مفلسی کی وجہ سے کٹائی کے وقت ہی وہ اپنا سارا غلہ مہاجنوں کا سود اور سرکار کا لگان ادا کرنے کے لیے بیچ دیتے اور پھر وہ مہاجنوں سے ہر سال بیج خریدتے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ بیج کا مناسب انتخاب نہیں کرپاتے لیکن ہر جگہ حالات ایسے خراب

---

[1] صوبہ متوسط اور برار میں ہمیں اس رجحان کے دو نشانات ملتے ہیں؛ برار میں کپاس کی کاشت ۱۸۶۷ء میں مجموعی کاشت کی ۲۷ فیصد سے بڑھ کر ۴۵ فیصد ۱۹۱۳ء میں ہوگئی اس کے برعکس گنے کی کاشت کا رقبہ جو مواصلات میں ترقی پانے کے قبل صوبہ متوسط میں ۴۶ ہزار ایکڑ تھا اس صدی کی پہلی دہائی میں گھٹ کر ۲۱۰۰۰ رہ گیا جب کہ اکال کے سال نہ تھے۔ آخرالذکر صورت حال گنے کی کاشت کے مناسب علاقے میں محدود ہوجانے کی وجہ سے پیدا ہوئی مثلاً صوبہ متحدہ اور بنگال۔ دیکھیں سی۔ ای۔ لو؛ صوبہ متوسط اور برار کی زرعی معیشت سے متعلق اشارے ۱۹۱۴ء)

نہ تھے اور یہ درست ہے کہ سب سے ترقی یافتہ زرعی طریقہ کار کے ساتھ ہی ساتھ وہ طریقے بھی رائج تھے جو دقیانوسی اور بیکار تھے۔

اس لیے کاشتکار کی حالت کو بہتر بنانے کا ایک واضح طریقہ یہ تھا کہ زرعی طریقہ کار میں ترقی ہو اس لیے ملک کی زراعت سے متعلق حکومت ہند کی پالیسی کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ ہندوستان میں حکومت کی پالیسی ہمیشہ ایک اہم سبب رہی ہے۔ ۱۸۶۰ء تک ہندوستان کی حکومت کا نظام ایک لمبے عرصہ کے لیے بیرونی طاقت کے ماتحت تھا اور حکومت کی پوزیشن ایسی تھی کہ کسی بھی اصلاح کو شروع کرنے کے لیے لوگوں نے ہمیشہ حکومت کی طرف دیکھنے کی عادت ڈال لی تھی حکومت کی اس عجیب و غریب ساکھ سے خصوصاً انیسویں صدی کے نصف آخر میں اسے ایک ایسی غیر معمولی قوت مل گئی تھی جو ہندوستان کی ہمہ گیر ترقی پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ حکومت کو یہ مقام دو وجوہات کی بنا پر ملا۔ اوّل تو یہ کہ لوگ جاہل تھے۔ ہندوستان کے کسان گرچہ نئی ترقی کے فوائد کو بہت جلد سمجھ لیتے تھے پھر بھی وہ ایسی پوزیشن میں نہ تھے کہ اپنے طور پر کوئی نئی اصلاح کر سکیں۔ دوسری بات یہ تھی کہ اعلیٰ طبقہ اس زمانہ میں عبوری دور کے مرحلہ سے گذر رہا تھا، خیال اور طریقۂ فکر میں تنظیم نو ہو رہی تھی جس سے معاشرہ کا کوئی نامی رہنما تھوڑے وقت کے لیے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ مختصر یہ کہ پورے ہندوستان کا سماج ڈھل رہا تھا اور صرف حکومت ہی کوئی نئی تحریک شروع کرنے کی پوری طاقت رکھتی تھی اور وہ اپنے ساتھ چلنے والی بڑی جماعت پر بھروسہ رکھ سکتی تھی [۱]

یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ صنعتی تغیرات صرف اقتصادی حالات کے دباؤ سے ہی رونما ہوئے، ان کا حکومت کے اقدام سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ مفروضہ واقعی بڑی حد تک صحیح ہے اور آخرکار اقتصادی دنیا کی حقیقتوں نے صنعتی تغیرات کی نوعیت پر پورا غلبہ حاصل کر لیا۔ لیکن افراد اور حکومت بھی ان تبدیلیوں کی راہ و رفتار یا اس کی مخالف صورتوں کو متاثر کر سکتی ہے اس طرح رابرٹ بیک ول اور نارفوک کے شرفا کا انگلینڈ کی زرعی ترقی کو تیز کرنے میں واقعی بڑا ہاتھ تھا اور انکلوزر ایکٹ، زرعی انقلاب کی رو پر اثر انداز ہوا۔ یہاں پر محض اشارہ کیا جا رہا ہے کہ انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہندوستان کے عجیب و غریب سماجی حالات کی وجہ سے اس ملک کے ایک بڑے حصہ میں با اثر سماجی طبقہ موجود نہ تھا اور اس

---

[۱] زرعی معاملوں میں اس نے اس امر سے قوت حاصل کر لی کہ نیا تعلیم یافتہ متوسط طبقہ جو مغرب کے سائنٹیفک خیالات سے قریب تھا بالکل شہری یا پیشہ ورانہ طبقہ تھا اور دیہی ہندوستان پر ان کا کوئی اثر نہ تھا اور زمین رکھنے والے شرفا جن کا اثر زراعت پر ہو سکتا تھا وہ سائنٹیفک خیالات سے بے بہرہ تھے۔

ہم آہنگی ویکسانیت کی کمی تھی جو ایک ہمہ گیر مفاد کی تحریک کے لیے ضرور ہوتی ہے اس صورت حال میں حکومت ہند کی پالیسی کی خاص اہمیت ہو جاتی ہے۔

زراعت سے متعلق حکومت کی پالیسی کے واضح اعلانات نہیں ملتے لیکن جہاں تک متعین پالیسی کا سوال ہے اس کا پتہ متعدد سرکاری مطبوعات سے چل سکتا ہے۔ ڈاکٹر (بعد میں سر جارج) برڈ وڈ کے مندرجہ ذیل الفاظ اس سوال سے متعلق حکومت ہند کے رویہ کو بڑی وضاحت سے پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

ہندستانی صنعت گروں کے تیزی سے مٹ جانے کی وجہ سے لین دین میں آنے والے سامان کی پیداوار کی اہمیت بہت بڑھ گئی۔ اس لیے ہماری پوری کوشش ہونی چاہیے تاکہ ملک کی زرعی دولت میں متناسب ترقی کے ذریعہ مصنوعات کی کمی سے جو خلا ہو گیا ہے اسے ہم پُر کریں۔ مصنوعات جیسے ہی ختم ہوں ان کی جگہ لین دین میں آنے والے نئے خام سامان ضرور ہی لے لیں تاکہ ہندوستان کی خوشحالی مغربی تہذیب کے ساتھ ربط و ضبط کے نتیجہ میں بھی برقرار رہ سکے۔"[1]

ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ میں زرعی ترقی کے سوال پر کچھ توجہ دی گئی تھی لیکن اس ضمن میں دلچسپی لینے والی پہلی باقاعدہ جماعتیں سرکاری نہیں تھیں گرچہ فرنگیوں کے ہاتھوں یہ جماعتیں شروع ہوئی تھیں۔ یہ انجمنیں زرعی و باغاتی انجمنیں تھیں۔ یہ انجمنیں پہلے ڈاکٹر کارے نے کلکتہ میں چلائی تھیں۔ بعد میں دوسری انجمنیں بمبئی، مدراس اور دیگر جگہوں میں قائم ہوئیں۔ حکومت ان انجمنوں کو عام طور پر قلیل سالانہ مالی امداد فراہم کرتی تھی یا انہیں تجرباتی مقاصد کے لیے مفت زمین دیتی تھی۔ حکومت کے براہ راست ادارے جو سب سے پہلے قائم ہوئے وہ "بوٹینیکل گارڈنز" تھے۔ ان کا کام ایک ماہر کی نگرانی میں چلتا تھا اور کبھی کبھی ان سے ملحق تجرباتی فارم بھی ہوتے تھے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۸۶۶ء تک یہی دو خاص ادارے زرعی ترقی لانے کے لیے چل رہے تھے۔ ان پہلے برسوں میں ہر شخص کا مقصد یہ تھا کہ نئے پودے اور آرائشی درخت لگائے جائیں۔ کچھ سمتوں میں وہ واقعی بہت کامیاب رہے۔ چائے کی صنعت کی مثال لیں۔ واٹ کی رائے میں ہندستان اور سیلون کی چائے لگانے کی ترقی یافتہ صنعت کا سبب گویا کلکتہ کا بوٹینیکل گارڈن ہی ہوا اور یہ حکومت سے براہ راست امداد پاتی رہی تاوقتیکہ پرائیوٹ ادارہ نے اس کو مزید فروغ دینے کی ذمہ داری نہیں لی۔"[2] اس طرح آلو اور سنکونا کی کامیاب مثالیں بھی پیش کی جا سکتی ہیں۔ بلاشبہ اس مدت میں

---

[1] ہندوستان کی اخلاقی اور مادی ترقی (۷۲-۱۸۷۱ء) ص ۲۷

[2] جی۔ واٹ: میمورنڈم، برٹش انڈیا کے وسائل سے متعلق (۱۸۹۶ء) ص ۸

مفید درخت، زینت بخش جھاڑیاں اور قیمتی پودے، لگائے گئے۔ خاص فصلیں جیسے کپاس اور نیل کو فروغ دینے کی بھی کوششیں ہوئیں۔ کپاس کو بہتر بنانے کی متعدد کوششیں ہوئیں لیکن بڑی حد تک کامیاب کوشش اس وقت ہوئی جب کہ دھارواڑ میں امریکی قسم لائی گئی۔

حکومت نے ۱۸۷۰ء تک کوئی واضح قدم نہیں اٹھایا تھا۔ اسی برس امپیریل ڈپارٹمنٹ آف ایگریکلچر قائم ہوا۔ یہ تھوڑے دنوں تک جاری رہا پھر ۱۸۷۸ء میں ختم ہوگیا کیونکہ صوبائی حکومتوں کا تعاون نہیں ملا۔ ۱۸۸۰ء کے قحط کمیشن نے پورے سوال پر غور کیا اور اس نے یہ سفارش کی کہ پہلے زراعت کا شعبہ قائم کیا جائے اور زرعی اعداد و شمار بھی اکٹھے جائیں۔ رپورٹ اور دوسری شہادتوں نے ان ترقیات کا جائزہ لیا جو اس وقت تک ہو چکی تھیں۔ بہت سے شواہد نے یہ تسلیم کیا کہ زرعی ترقی کا کام جس راہ پر ہندوستان میں چل رہا ہے وہ بڑی حد تک غلط ہے۔ کچھ لوگوں نے تو اس حد تک کہا کہ ہندوستان میں زراعت کی ترقی کا امکان ہی نہیں[1]۔

۱۸۰۰-۱۸۹۰ء کی دہائی میں دوسری کوشش تجرباتی فارم قائم کرنے کی سمت میں ہوئی تاکہ بہتر طریقوں اور بہتر سامان کی افادیت کا لوگوں کو یقین ہو جائے اور ساتھ ہی یہ مقصد بھی تھا کہ نئے طریقوں کا تجربہ کیا جائے بدقسمتی سے اس وقت یہ تمام کوششیں ناکام رہیں اس کا خاص سبب یہ تھا کہ "عام طور پر فارم منیجر کی حیثیت سے ایسے لوگوں کا تقرر کیا گیا جنہیں صحیح زرعی تربیت حاصل نہ تھی جیسے مالی، ناکامیاب نخل کار یا دوسرے ایسے کارکن جو اپنے اپنے دعوی رکھتے تھے"[2] لیکن حقیقت صرف یہ نہ تھی کہ وہ سارے لوگ جن کے ماتحت یہ فارم تھے وہ ناتجربہ کار تھے بلکہ یہ بات بھی تھی کہ اگر انگلینڈ سے کوئی ماہر زراعت آتا تو وہ بھی ناکامیاب رہتا کیونکہ وہ ہندوستان کے حالات اور ہندوستانی کاشت کاروں کے طریقوں سے ناواقف ہوتا تھا۔ اس لاعلمی کا اثر بڑا ہی خراب ہوا اور فارم کو گویا مکمل ناکامیابی ہوئی اس حقیقت کا علم ۱۸۸۰ء تک ہوگیا۔ مسٹر تک (بعد میں سر ایڈورڈ) نے قحط کمیشن کے سامنے اپنی شہادت میں یہ کہا "ایک معاملہ میں ہم ہندوستانیوں کو ضرب دے سکتے ہیں مگر وہ تو ہمیں سینکڑوں معاملوں میں چوٹ دے سکتے ہیں" رتناگیری کے کلکٹر نے لکھا تھا! "دکھنی کسان کو ہم سے یا امریکہ سے چاول کی کاشت میں کچھ نہیں سیکھنا ہے" مسٹر تک اپنے میمورنڈم میں اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ کوئی بہتر صورت لانے کے قبل اس کے ہندوستانی حالات میں استعمال کرنے کا پورا مطالعہ کر لینا ضروری

---

[1] "تجرباتی کھیتی اور رعیتوں کو تعلیم دینے کی مزید کوشش نہ کی جائے تو بہتر ہے" قحط کمیشن ۱۸۸۰ء کے سامنے مسٹر ٹوبنی (بنگال) کی شہادت

[2] آر۔ ولیمس، ۱۸۸۷ء کا ہندوستان

ہے وہ اس بات پر بھی زور دیتا ہے کہ ہندوستانی کاشتکاروں کی رائے لی جائے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ بہتر صورت پیدا کرنے کی تمام کوششوں کو برا کہنا فضول ہے۔ اپنے نقطہ نظر کو ثابت کرنے کے لیے وہ مسرز ملنے اور تھومپسن کے بہتر چینی کارخانے کی مثال پیش کرتے ہیں جو بڑے پیمانہ پر استعمال ہو رہے تھے۔ مسرز ملنے اور تھومپسن کو کارخانہ شروع کرنے سے پہلے ہندوستانی کاشتکاروں کی ضرورت اور صلاحیت کا پورا مطالعہ کرنا پڑا لیکن جب یہ مل کام کرنے لگی تو پتہ چلا کہ ہندوستانی کاشتکاروں کی قدامت پسندی کے باوجود اس کا استعمال بہت تیزی سے ہونے لگا۔ یہ تمام باتیں (مسٹر بک کی) مجموعی اعتبار سے قحط کمیشن کے لیے قابل قبول نہیں۔ ان لوگوں نے فوراً ہی شعبہ زراعت کے قیام کیلئے سفارش کی۔ ان کی تحقیقات پر کچھ کام نہیں ہوا۔ ۱۸۸۹ء میں ڈاکٹر وائلکر مقرر ہوئے تاکہ وہ پورے سوال کا جائزہ لیں۔ اس نے پورے سوال کا جائزہ لیں۔ اس نے پورے ہندوستان کا گشت لگایا اور ۱۸۹۳ء میں اپنی گراں قدر رپورٹ پیش کی پھر بھی اس صدی کے اواخر تک کچھ کام نہیں ہوا۔ صرف شعبہ زراعت قائم کر دینے سے مسئلہ کا حل نہیں ہو سکتا تھا۔ ماہروں کی کمی ہر جگہ محسوس ہو رہی تھی۔ تجرباتی فارموں کا کام چلتا رہا اور اس کی اہمیت کا انحصار اس کی ذاتی نگرانی پر تھا۔

اس سمت میں حکومت کے خاص کارنامے یہ تھے کہ اس نے بعض نئی اجناس کو رواج دیا اور کچھ صورتوں میں کسی قدر بہتر مشینری کام میں آنے لگی۔ حکومت نے مویشیوں اور گھوڑوں کی نسل کو بہتر بنانے کی بھی کوشش کی اور اس مقصد کے لیے زرعی نمائش لگائی صرف یہی نہیں بلکہ نسل بڑھانے کے لیے گھوڑوں کے اصطبل قائم کیے۔ یہ تمام کوششیں کامیاب نہ ہو سکیں کیوں کہ یہ صحیح اور مناسب نہ تھیں۔

بہتر طریقوں کا علم پھیلانے اور نئی پیداوار پر تجربہ کرنے کے علاوہ زرعی ترقی کو تقویت دینے کا ایک بہت ہی پرانا طریقہ تھا جس کا استعمال ہندوستان میں تمام حکومتوں نے کیا تھا۔ کسان کی معیشت میں ساکھ کی جو کمی تھی اس کو دور کرنے کے لیے یہ طریقہ استعمال ہوتا تھا اور نرم شرطوں پر قرض دیتی تھی تاکہ وہ اپنی زمین میں سدھار لائیں۔ یہ تقاوی قرض کہلاتا تھا۔ ہندوستان کی برطانوی حکومت زمینی ترقیاتی ایکٹ (۱۸۸۳ء) اور کاشت کار قرض ایکٹ (۱۸۸۴ء) کی شرائط کے بموجب پیشگی رقم دیتی تھی، یہ قرض مختصر ہوتا تھا جو حکومت تخفیف شدہ شرح سود پر دیتی تھی اور جس کی ادائیگی قسطوں میں مالگذاری کے ساتھ ہوتی تھی۔ قحط کمیشن کے سامنے جو شہادتیں آئی تھیں ان سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس اقدام سے وسیع پیمانہ پر استفادہ نہیں کیا جاتا تھا یہ سارے ایکٹ جس طرح عمل میں لائے جاتے تھے وہ بھی قابل اعتراض تھے۔

پہلی بات تو یہ تھی کہ اس سسٹم کی کامیابی محض ایک فرد کی قوت و دلچسپی پر منحصر تھی اور یہ شخص تھا ضلع کا کلکٹر یا ڈپٹی کمشنر۔[1] اس لیے بہت سی صورتوں میں ایکٹ کی شرائط کا بھی علم ضلع کے لوگوں کو نہ ہوتا تھا اس کی کامیابی بہت کچھ پیشگی رقم کے مناسب وقت پر ملنے پر منحصر تھی اور یہ تقاوی قرض کے ساتھ انچارج آفسر کے کیریکٹر پر بھی منحصر تھی اس لیے یہ بات حیرت انگیز نہیں کہ کسان مقامی ساہوکار کے پاس جانا زیادہ مناسب سمجھتے تھے کیونکہ اس سے وہ فوراً قرض لے سکتے تھے اس قسم کی پیشگی رقم لینے میں دوسری خرابی یہ تھی کہ سود تو سود اصل رقم جمع کرنے میں ایکٹ کی دفعات بڑی سخت تھیں[2] قرض کی ادائیگی کی مدت بھی بہت سی صورتوں میں مختصر ہوتی تھی اس لیے گرچہ قرض پر سود کی شرح مہاجنوں کی شرح سے بہت کم تھی لیکن اس کے باوجود یہ کامیاب نہیں ہوئے۔ ان علاقوں میں جہاں مستعد آفسر ایکٹ کی دفعات کو سہل طور پر لاگو کرتا تھا اور حکومت کی دی گئی آسانیوں کی واقفیت بہم پہنچاتا تھا وہاں یہ بہت ہی مقبول رہا اور خاص طور پر کنواں کھودنے کے کاموں میں اس سے بہت زیادہ فائدہ اٹھایا گیا۔

حکومت کے اقدام کی وسعت حقیقی معنوں میں بڑی محدود تھی۔ کسان کو یہ یقین دلانا کہ آہنی ہل بہتر ہے کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا کیونکہ اس کے بیل گویا بھوکے اور کمزور ہوتے اور ان کے اندر اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ لکڑی کے ہل سے زیادہ بھاری کھینچ سکیں۔ کھاد یا پانی پمپ کے استعمال میں لانے کی وہی وقت ہر جگہ تھی۔ کسانوں کی غربت کا اصلی سبب، ان کے چھوٹے چھوٹے کھیتوں کا ہونا محض نمائشی فارموں اور ترقی یافتہ وسائل سے دور نہیں کیے جا سکتے تھے لیکن ایک دوسری بندش تھی۔ یہ تجارت کا عمل۔ ڈاکٹر وائلکر نے بتایا ہے کہ کس طرح لندن میں گیہوں کی تجارت کا اثر صاف گیہوں کے مارکٹ میں آنے پر پڑا۔ ایک دوسری نمایاں مثال یہ ہے کہ ہندوستانی کپاس کے معیار میں بڑی گراوٹ آگئی[3] قحط کمیشن (۱۸۸۰ء) کے سامنے جو شہادت مسٹر جونس (برار) نے پیش کی اس میں سرکاری اقدام کے حدود واضح ہیں۔ وہ کہتے ہیں: "نمونے

---

[1] ڈاکٹر وائلکر: ہندوستان میں زراعت کی ترقی سے متعلق رپورٹ ص ۸۵

[2] ہندوستان کی آبپاشی کمیشن کی رپورٹ، باب ششم (۱۹۰۴ء)

[3] یہ تحریک بہت آگے بڑھ گئی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ معمولی قسم نے اعلیٰ قسم کی جگہ لے لی یعنی خاندیش، صوبہ متوسط اور برار میں۔ یہ اس وجہ سے ہوا کہ معمولی قسم کی کپاس بہت جلد تیار ہو جاتی تھی اور زیادہ سخت ہوتی تھی جب کہ بہتر قسم کے کپاس سے کسانوں کو زیادہ محنت اور خرچ کے باوجود پورا فائدہ نہیں ہوتا تھا۔ ہندوستان کی کپاس ملوں کی صنعت نے گھٹیا سوت اور گھٹیا مال پیدا کرنے کا راستہ اختیار کیا تھا اس لیے کہ بہتر کپاس کے لئے مقامی مانگ نہ تھی اور قیمتوں میں

(جاری)

کے فارموں کے اثرات کے بارے میں پر امید نہیں ہوں۔ کپاس کے پہلے تاجر نے جس نے گندی کپاس کی بہ نسبت صاف کپاس کے لیے ایک آنہ کا ایک چھوٹا سا حصہ زیادہ دیا تھا اس وارڈھا کپاس کے لیے مجھ سے زیادہ کام کیا حالانکہ میرے پاس حکومت کے سارے وسائل موجود تھے" حکومت کے اقدام کی یہ تمام مجبوریاں تھیں۔ بہتر طریق کار، بہتر بیج کے انتخاب وغیرہ میں حکومت بہت زیادہ کام کر سکی لیکن اسے زیادہ مقبول اور کامیاب بنانے کے لیے یہ ضروری تھا کہ کسان کی ضرورتوں اور اس کے وسائل کا مکمل اور صبر آزما مطالعہ کیا جائے۔

(بقیہ صفحہ گزشتہ سے پیوستہ)

کوئی نمایاں فرق بھی نہ تھا۔ اسٹیم جن (اونٹنے کی مشین) کی وجہ سے یہ رجحان اور بڑھتا رہا۔ بیج کے انتخاب کے لیے بھی ہاتھ سے اونٹنے کا استعمال بھی ختم ہو گیا اور کاشت کار اپنے قریب ترین جن (Gin) سے بیج خریدنا زیادہ آسان سمجھتا تھا۔ اونٹنے والی مشین میں ہر قسم اور ہر طرح کے کپاس ایک ساتھ ملا دیے جاتے تھے" صدیوں کے فطری انتخاب کی تخصیص تجارتی پیداوار کے اس نئے دور سے ختم ہو رہی تھی"

جی۔ واٹ: ہندوستان کی تجارتی پیداوار، کپاس سے متعلق مضمون (۱۹۰۸)

ہندوستان میں کپاس کی ترقی، مراسلات وغیرہ (پارلیمانی کاغذات) خصوصاً مسٹر مولیسن کا میمورینڈم بھی دیکھیں؛

چھٹا باب

صنعت کی ترقی ۹۵-۱۸۸۰

۱۸۸۰ء سے لے کر ۱۸۹۵ء تک کے ۱۵ سال مجموعی اعتبار سے کاشتکاروں کے لئے سازگار تھے۔ اس مدت میں دستی صنعتیں ختم ہوتی رہیں اور کارخانہ اور نخل بندی صنعت میں صرف ایسی صنعتیں تھیں جن میں زندگی معلوم ہوتی تھی۔ اول الذکر کی وسعت ۱۸۸۰ء میں بہت ہی مختصر تھی اور اس کی نوعیت محدود۔ ہندوستان کی کارخانہ والی صنعت اس زمانہ میں صرف دو ٹکسٹائل صنعتوں یعنی کپاس اور جوٹ پر مشتمل تھی۔ شروع میں ہی یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان پندرہ برسوں کے دوران کسی نئی صنعت میں کوئی نمایاں ترقی نہیں ہوئی۔ کچھ صنعتیں قائم کی گئیں لیکن کسی نے بھی اہمیت حاصل نہیں کی۔ جو ترقی بھی ہوئی وہ قائم شدہ صنعتوں جیسے کپاس اور جوٹ میں ہی ہوئی۔

کپاس کی صنعت نے ان پندرہ برسوں میں بڑی نمایاں ترقی کی

کاٹن کی ملیں ۹۵-۱۸۸۰ء

	۸۰-۱۸۷۹ء	۸۵-۱۸۸۴ء	۹۰-۱۸۸۹ء	۹۵-۱۸۹۴ء
ملوں کی تعداد	۵۸	۸۱	۱۱۴	۱۴۴
کام میں لگے ہوئے لوگ	۳۹,۵۳۷	۶۱,۵۹۶	۹۹,۲۲۴	۱۳۹,۵۷۸
لوم	۱۳۳۰۷	۱۶,۴۵۵	۲۲,۰۷۸	۳۴,۱۶۱
سپنڈل	۱,۴۰۷,۸۳۰	۲,۰۳۷,۵۵	۲۹۳۴,۶۳۷	۳۷,۱۱,۶۶۹

یہ خاکہ اس صنعت کی ترقی کا کچھ جائزہ پیش کرتا ہے۔ ترقی کی شرح بہت تیز نہ تھی لیکن نمایاں طور پر مستقل اور مسلسل تھی اور اس تمام مدت میں کسی شدید اتار چڑھاؤ کا نشان نہیں ملتا تھا۔

۱۸۸۵ء کے بعد خصوصاً ترقی کی شرح نمایاں ہوگئی۔ اس پوری مدت میں ترقی کے بارے میں مسٹر

گراہم کلارک لکھتے ہیں: "۱۸۸۵ء کا سال عروج کی نشاندہی کرتا ہے اور اسی زمانہ میں ہندوستان کی کپاس مل کی مشینری میں بہتر صورت کے پیدا ہو جانے سے یعنی رنگ اسپننگ RING SPINNING اور گھومنے والے چپٹا سروالے کارڈ TOP FLAT CARD کی وجہ سے ملوں نے بہتر سوت اور زیادہ قسموں کے کپڑے تیار کرنا شروع کر دیئے اور تیار شدہ مال نئی نئی منڈیوں میں جانے لگے۔ ۱۸۸۵ء سے لے کر ۱۸۹۰ء تک کے پانچ برسوں میں پچاس ملوں کا اضافہ ہوا اور یہ سب سے زیادہ توسیع کا زمانہ ہے۔ ۱۸۹۰ء تک بہت ہی اچھا کاروبار چلتا رہا اور صحت مند طریقہ سے اس کی توسیع ہوئی"[1]

اس صنعت میں ہنوز کتائی، بنائی کے مقابلہ میں زیادہ اہم ہے لیکن یہ معلوم ہوگا کہ پہلے دس برسوں کی مدت میں گرچہ اسپنڈل کی تعداد لوم سے زیادہ تیزی سے بڑھی تاہم آخری پانچ برسوں میں اس کے بالکل برعکس صورت کارفرما رہی۔ اب لوم کے تیزی سے بڑھنے کا نمایاں رجحان پیدا ہو گیا۔ ایسا ہونا فطری بھی تھا۔ کیونکہ اس صنعت کے ابتدائی دور میں لنکا شائر سے موٹے سوت کا مقابلہ سب سے زیادہ منافع بخش تھا اور یہ مقابلہ کامیاب بھی رہا اور پھر اس صنعت کا واقعی اہم حصہ کتائی گھر تھا۔ مستقل تیس برسوں تک بمبئی کی صنعت فروغ پاتی رہی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے گویا ہاتھ کتائی کی مقامی صنعت کو اب ختم کر دیا تھا اور موٹے سوت نے پورے ہندوستانی مارکٹ پر قبضہ جما لیا تھا لیکن صرف یہی نہیں بلکہ آٹھویں دہائی کے برسوں میں ہندوستانی بٹے دہرے دھاگے اور سوت کی برآمد میں نمایاں اضافہ ہوا اور یہ برآمد خاص طور پر جاپان اور چین کو ہوتی تھی۔ ہندوستانی بٹے دھاگے اور سوت کو اتنا زیادہ فروغ ہوا کہ مانچسٹر چیمبر آف کامرس نے بمبئی کے کاروبار میں ترقی کے اسباب کی ۱۸۸۸ء میں جانچ پڑتال کرائی۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ کامیابی کا راز خاص طور پر جغرافیائی ہے[2] وجہ کچھ بھی رہی ہو اتنا تو بالکل واضح ہے کہ اس دہائی کے دوران ان برآمدات میں تیزی سے اور مسلسل اضافہ ہوا۔

	۱۸۷۹ء - ۸۰	۱۸۸۵ء - ۶	۱۸۹۰ء - ۹۱
ہندوستانی بٹے ہوئے دھاگے اور سوت کی پونڈ میں برآمد	۲۶،۰۴،۰۱۶	۷۹،۳۲۴،۳۴۱	۱۷۰،۵۱۸،۸۰۴

---

[1] ڈبلو۔ اے۔ گراہم کلارک: برطانوی ہندوستان اور فلپائن میں سوتی کپڑے ص ۱۴ (۱۹۰۷ء)

[2] بمبئی اور لنکا شائر کی کتائی جانچ پڑتال کی رپورٹ (۱۸۸۸ء)

لیکن ترقی کی یہ رفتار قائم نہ رہی۔ ان بازاروں کی صلاحتیں لامحدود نہ تھیں اس کے علاوہ ۱۸۹۰ء کے قریب جاپان کے ساتھ ہندوستان کی تجارت میں تبدیلی رونما ہو رہی تھی۔ جاپان اس عرصہ میں خود اپنی مل کی صنعت کو رفتہ رفتہ بڑھا رہا تھا لیے اس نے ہندوستان کے بٹے ہوئے دھاگے اور سوت خریدنا بند کر دیا۔ اس کے بدلہ میں اس نے ہندوستان کا خام کپاس خریدنا شروع کیا اس لیے ہندوستان کے بٹے ہوئے دھاگے اور سوت کی برآمد ۱۸۹۰ء کے بعد پانچ برسوں کے دوران بڑھنے کے بجائے کسی قدر گھٹ گئی۔ بمبئی کے صنعت کاروں نے مجبور ہو کر اسپنڈل سے توجہ ہٹالی اور وہ کسی دوسری طرف متوجہ ہوئے۔ بٹے ہوئے دھاگہ اور سوت کی برآمدی تجارت گرچہ ماند پڑگئی پھر بھی اس صنعت کی خوشحالی قائم رہی۔ اس صنعت کے علاقائی طور پر محدود ہونے میں بہت ہی تھوڑا تغیر آیا۔ یہ صنعت خاص طور پر بمبئی پریسیڈنسی میں مرکوز تھی اور پریسیڈنسی کے بھی صرف دو شہر بمبئی اور احمد آباد میں لیکن بمبئی اور احمد آباد کے باہر پورے ہندوستان میں یہ پھیلی ہوئی تھی اور اب تک ان دو شہروں سے باہر کپاس کا کوئی دوسرا بڑا صنعتی مرکز نہ تھا۔ ۹۵۔۱۸۹۴ء میں ہندوستان کی ۱۴۴ ملوں میں ۱۰۰ ملیں بمبئی پریسیڈنسی میں تھیں پھر ان میں سے ۷۰ ملیں بمبئی شہر اور جزیرہ میں تھیں۔

دوسری ٹیکسٹائل صنعت یعنی جوٹ میں ترقی تقریباً اسی تیزی سے ہوئی جتنی کہ کپاس کی صنعت میں ہوئی تھی۔ اس پیش رفت کا پتہ ہندوستانی جوٹ کی مصنوعات کی برآمد میں کثیر اضافہ سے چلتا ہے۔ جوٹ کی صنعت گھریلو مارکٹ پر اس حد تک بھروسہ نہیں کرتی تھی جس طرح کپاس کی صنعت کرتی تھی اور اس صنعت کے فروغ اور جوٹ کی مصنوعات کی برآمدی ترقی میں گہرا رشتہ تھا۔ جوٹ کی صنعت میں پیش رفت مسلسل نہ رہی۔ جوٹ کپاس سے بہت زیادہ غیر مستقل فصل ہے اور اس صنعت کے تیار شدہ مال کی مانگ اتنی مستقل نہیں ہے کہ جتنی کہ کپاس کی مصنوعات۔ لیکن جوٹ کے صنعت گروں کی جماعت بڑی منظم تھی اور مانگ کے گرنے یا کم ہونے کی مدت قلیل ہوتی تھی۔ اس صنعت کی ترقی کے سلسلہ میں دوسری قابل غور بات یہ تھی کہ پیداوار یا ملازموں کی تعداد کے مقابلہ میں علیحدہ مل یا کمپنی کی تعداد میں اضافہ نمایاں طور پر کم ہوا تھا۔ کاٹن مل کے جدول کو دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ اس مدت میں ملازم، کرگھ اور اسپنڈل کی تعداد میں تقریباً یکساں طور پر اضافہ ہوا لیکن جوٹ کے کارخانہ کی حالت مختلف تھی اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس صنعت کی توسیع کی شکل ان کی تعداد میں اضافہ ہونے کے بجائے موجودہ اداروں کے پھیلاؤ میں ظاہر ہوئی۔ اس صنعت میں پیداوار کی اوسط اکائی کپاس کی صنعت سے بہت زیادہ بڑھ گئی۔

غور بات یہ تھی کہ چائے کی پیداوار کا تناسب زیر کاشت علاقے کی ترقی کے مقابلہ میں زیادہ تھا اور اس کا سبب یہ تھا کہ کاشت کے بہتر طریقے عمل میں لائے جا رہے تھے اور صنعت کارانہ مدارج میں مشین کا استعمال بڑھ گیا تھا۔ اس صنعت میں مزدوروں کی حالت کسی قدر بہتر ہو گئی تھی لیکن کام پر لگانے کے طریقوں میں خامیاں ابھی تک تھیں۔ چائے اور کوئلہ مزدور کمیشن کے ممبر کمار دکھنیشور رالیا نے ۱۸۹۶ء میں اس طریقہ کی مذمت کرتے ہوئے کہا تھا کہ "یہ سماج کا خراب کیڑا ہے"[۱]

قہوہ کی کاشت مدراس پریسیڈنسی کے میسور، کورگ، نیلگری اور مالا بار ضلعوں میں گویا پورے طور پر محدود تھی۔ تقریباً ۱۸۷۹ء تک یہ صنعت بہت خوشحال تھی لیکن ۱۸۷۹ء تا ۱۸۸۸ء کے دس برسوں کے دوران دام گر جانے اور سوراخ کرنے والے اور پتی والے مرض BORERS LEAF DISEASE کی تباہی سے ہندوستان اور سیلون میں قہوہ کی کاشت بہت کم ہو گئی اور اس صنعت کا مستقبل اتنا تاریک ہو گیا کہ ہندستان اور سیلون دونوں ملکوں میں کافی کے کھیتوں میں چائے کی کاشت ہونے لگی۔"[۲]

قہوہ کے بازار میں برازیل کی نمایاں پوزیشن ہونے کے باعث قیمتیں دبی رہیں۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ سستے برازیلی قہوہ کی پیداوار بڑھ رہی تھی اس لیے حالت اور ابتر ہو گئی کیونکہ ہندستان کے قہوہ کا ۹۶ فیصد برآمد کے لیے کاشت ہوتا تھا اور کوئی گھریلو بازار سہارا کے لیے نہ تھا لیکن ۱۸۸۹ء میں قہوہ کے دام میں براہ راست اضافہ ہوا جو ۱۸۹۶ء تک قائم رہا۔ قیمت میں اضافہ خاص طور پر برازیل کے سیاسی انتشار کا نتیجہ تھا اس لیے یہ صنعت دوبارہ زندہ ہوئی اور ۱۸۸۶ء تا ۱۸۹۹ء کا مختصر زمانہ خوشحالی کا زمانہ رہا۔ سیلون میں چائے نے کافی کی جگہ قطعی طور پر لے لی لیکن ہندستان میں یہ تحریک اس حد تک آگے نہ بڑھی اور اب یہ واقعی رک گئی۔

تیسری نخل کاری والی صنعت نیل کی تھی جو گویا اپنی جگہ ٹھہری ہوئی تھی اور اس کے ارتقاء کا کوئی حال قابل ذکر نہیں۔ نیل کی تجارت کے بارے میں مسٹر اوکونور کہتے ہیں: افیون اور ریشم جیسی ہندوستان کی زمانہ دراز سے قائم تجارتوں میں یہ ایک ایسی تجارت ہے جس کی پیشرفت کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔"[۳] اس صنعت کے بارے میں بھی یہی کہا جا سکتا ہے پھر بھی اس میں کسی قدر اضافہ ہوا کیونکہ ۹۵-۱۸۹۴ء میں ہندوستان سے نیل کی برآمدات میں بلندترین نقطہ تک پہونچ گئیں جہاں تک وہ جا سکتی تھیں۔

بقیہ کے لیے دوسری صنعتیں ایسی تھیں جو کچا مال کو صرف ایک ہی مرحلہ تک لے جاتی تھیں تاکہ

---

[۱] کوئلہ اور چائے کی صنعت کے بارے میں مزدور تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ (۱۸۹۶ء) کمار دکھنیشور رالیا کا نوٹ

[۲] قہوہ کی کاشت کے بارے میں سالانہ رپورٹ (۱۸۹۹ء)

[۳] جے۔ای۔ اوکونور: ہندستان کی تجارت کا جائزہ ۹۰-۱۸۸۹ء ص ۳۶

جوٹ مل ۹۵-۱۸۸۰ء

	۸۰-۱۸۷۹ء	۸۵-۱۸۸۴ء	۹۰-۱۸۸۹ء	۹۵-۱۸۹۴ء
ملوں کی تعداد	۲۲	۲۴	۲۷	۲۹
ملازم	۲۷،۴۹۴	۵۱،۹۰۲	۶۲۷۳۹	۷۵،۱۵۷
لوم کی تعداد	۴،۹۴۶	۶،۹۲۶	۸،۲۰۴	۱۰۰۴۸
اسپنڈل کی تعداد	۷۰،۸۴۰	۱۳۱،۷۴۰	۱۶۴،۲۴۵	۲۰۱،۲۱۷

ان ۲۹ ملوں میں ۲۶ ملیں (اور یہ ساری ملیں بڑی تھیں) بنگال میں تھیں اور کلکتہ کے گرد قائم تھیں۔ اس کے بعد کوئلہ کان کی صنعت آتی ہے ۱۸۸۰ء میں یہ بہت ہی چھوٹی صنعت تھی اور انڈین ریلوے اور صنعت گروں کی ضروریات مشکل تمام سے پوری ہوتی تھیں۔ ۱۸۸۶ء تک اس صنعت کی ترقی بہت معمولی ہوئی تھی لیکن اس کے بعد اس کی ترقی تیزی سے ہونے لگی۔ اس صنعت کی ترقی کا پورا دارومدار ہندوستان میں ریلوے کی توسیع اور کرایہ پر تھا۔

کوئلہ کان۔ ۹۵-۱۸۸۰ء

	۱۸۸۵ء	۱۸۹۰ء	۱۸۹۳ء	۱۸۹۴ء
پیداوار ٹن	۱،۲۹۴،۲۲۱	۲،۱۶۸،۵۲۱	۲،۵۶۲،۰۰۱	۲،۸۰۰،۶۵۲
ملازموں کی تعداد	۲۲،۷۴۵	۳۲،۹۷۱	۳۷،۶۷۹	۴۳،۱۹۷
کانوں کی تعداد	۶۸	۸۲	۹۶	۱۲۳

۴-۱۸۹۳ء کے دوران نمایاں ترقی ہوئی۔ اس سال ہندوستان میں کان کنی کی ترقی کا آغاز ہوا جو اگلے بیس برسوں میں جاری رہی یہاں تک کہ ۱۸۹۳ء تک اپنی تمام تر ترقیوں کے باوجود کوئلہ کی کان کنی کی صنعت

بہت ہی مختصر تھی ہندوستان کی مجموعی معدنی پیداوار میں کولار کی کانوں سے سونے کی یافت کوئلہ کی کل پیداوار کی قیمت سے ابھی تک زیادہ تھی۔

ہندوستان میں کوئلہ کی صنعت کی مناسب توسیع میں جو سب سے بڑی رکاوٹیں تھیں ان میں سے ایک کرایہ کا سوال تھا ریل کا کرایہ بہت زیادہ تھا۔ بنگال کی کوئلہ کانیں جن سے ہندوستان کی مجموعی پیداوار کا تین چوتھائی حصہ حاصل ہوتا تھا وہ بہت دور اندرونی حصہ میں واقع تھیں اور اس زمانہ میں بحری کرایہ بھی زیادہ تھا اس وجہ سے بنگال کی کانوں کے لیے یہ ناممکن ہوگیا کہ وہ ہندوستان کے پچھمی اور دکھنی حصہ میں کوئلہ سپلائی کرسکے اس زمانہ میں ایک خاص ترقی یہ ہوئی کہ اس نے برما کے مارکٹ پر قبضہ کرلیا اور اس نے ہندوستان کے مشرقی حصہ سے بیرونی کوئلہ کو بالکل نکال باہر کردیا۔ بمبئی کے صنعت گروں کی توسیع سے کوئلہ کی درآمد مستقل طور پر بڑھ رہی تھی مجموعی اعتبار سے ترقی گرچہ نمایاں نہ تھی لیکن اس مدت کے اواخر میں یہ واضح نشانات مل رہے تھے کہ ہندوستان کا کوئلہ نہ صرف ریلوے میں زیادہ استعمال ہو رہا تھا بلکہ اس کی کھپت صنعتی کارخانوں میں بڑھ رہی تھی۔ ہندوستان سے کوئلہ کی برآمد اسی زمانہ میں شروع ہوئی۔ یہ ۹۱-۱۸۹۰ کے ۲۰۶ر۳۶ ٹن سے بڑھ کر ۹۴-۱۸۹۵ء میں ۶۶۵ر۵۲ ٹن ہوگئی لیکن یہ تو آغاز تھا اور اصل تعداد سالانہ ۸۰۰۰۰۰ ٹن کی درآمد کے مقابلہ میں غیر اہم تھی حالانکہ ۱۸۹۵ء کوئلہ کی صنعت وسیع نہ تھی لیکن مستقبل میں تیزی سے فروغ پانے کی اُمید تھی۔

کپاس، جوٹ اور کوئلہ کی ہی تین صنعتیں ابھی تک ہندوستان کی اہم صنعتیں تھیں۔ ہندوستان کے مالیاتی اور تجارتی اعداد و شمار میں اون اور کاغذ کی دو صنعتوں کا ذکر علیحدہ علیحدہ طور پر بڑی صنعتوں میں ہوا ہے لیکن ان صنعتوں کا پھیلاؤ بہت ہی تھوڑا تھا کیونکہ ۱۸۹۵ء میں اون کی صرف ۶ ملیں اور ۸ کاغذ کی تھیں جن میں بالترتیب تقریباً ۲۰۰۰ اور ۳۵۰۰ آدمی کام کرتے تھے۔ ہندوستانی صنعت کا حال اس امر سے معلوم ہوسکتا ہے کہ کپاس اور جوٹ کے بعد یہ صنعتیں ہی ہندوستان کی سب سے بڑی کارخانہ والی صنعتیں تھیں۔

نخل بندی والی صنعتوں میں چائے نے بڑی اہمیت حاصل کرلی تھی۔ انیسویں صدی کے گذشتہ تیس برسوں میں یہ صنعت مسلسل خوشحالی اور ترقی کے دور سے گذر رہی تھی لیکن اس کے علاوہ اس مدت میں اس کی ترقی کا کوئی نمایاں پہلو ظاہر نہ ہوا تھا۔ ۱۸۸۵ء میں چائے ۲۸۴۰۰۰ ایکڑ میں ہوتی تھی جو ۱۸۹۶ء میں بڑھ کر ۳۴۴ر۳۳ر۳ ایکڑ ہوگیا۔ آسام یعنی برہمپترا اور سورما کی گھاٹیاں ہنوز اول درجہ رکھتی تھیں اور ۱۸۹۶ء میں مجموعی رقبہ کے ۶۷ر۴ فیصد میں کاشت ہوتی تھی۔ بنگال (خاص طور پر دارجلنگ اور جالپائی گوڑی) ۲۴ر۳ فیصد چائے کی کاشت کر رہا تھا۔ اس صنعت کی ترقی دوسرے علاقوں میں بھی ہو رہی تھی مثلاً شمالی مغربی صوبہ (یعنی آج کا اترپردیش) اور پنجاب کے ہمالیائی ڈھلوان اور جنوب میں نیلگری کی پہاڑیوں میں۔ دوسری قابل

اس کی برآمد میں آسانی ہوسکے یا اس کا صنعت کے اگلے مرحلوں میں استعمال ہو۔ ہندستان میں اس جماعت کے خاص نمائندے کپاس اور جوٹ کی گانٹھ بنانے والی صنعتیں تھیں اور ان کے علاوہ چاول اور لکڑی کی ملیں تھیں۔ یہ صنعتیں اپنے موسم میں لوگوں کو کافی تعداد میں کام فراہم کرتی تھیں۔ خاص خاص علاقہ میں ایسی صنعتوں کی ترقی ایک خاص حد تک ہوسکتی تھی۔ ان میں سب سے زیادہ فوری ترقی چاول اور لکڑی کی ملوں میں ہوئی یہ ایسی صنعت تھی جو ابھی تک صرف برما میں محدود تھی۔ لاکھ والی صنعت کسی قدر اس گروپ کی صنعتوں جیسی تھی اور ان کی تعداد میں نمایاں ترقی ہوئی۔

پھر معاون صنعتوں کی جماعت تھی جو ہندستان میں ریلوے کی توسیع اور مال تیار کرنے والی صنعتوں مثلاً انجیرنگ ورکشاپ اور لوہے اور پیتل فاؤنڈریز کے فروغ سے نمایاں طور پر اہم ہوگئیں۔ یہ جماعت ترقی پذیر تھی لیکن اس کی وسعت ہندستان میں مشینری کے استعمال میں توسیع کی حدوں تک محدود تھی۔

آخر میں نصف فیکٹری SEMI FACTORY والی صنعتوں کی جماعت کا ذکر کیا جاسکتا ہے ان میں سب سے اہم مدراس کی چرم سازی کی صنعت ہے جو بہت فروغ پا رہی تھی مدراس کے مشہور شہروں میں اس صنعت کی توسیع بڑی تیزی سے ہوئی اور اس کے عام فروغ کا پتہ اس کی فوری توسیع سے چلتا ہے جو ہندستان کی برآمد شدہ پختہ اور نیم پختہ چرم کی تعداد میں ہوئی۔ یہ دلچسپی سے خالی نہیں کہ یہ نفع بخش صنعت مدراس پریسیڈنسی میں ہی محدود تھی حالانکہ ہندستان کے دوسرے حصوں سے کچی کھال اور چمڑے کی بڑی برآمد ہوتی تھی۔ اسی طرح کی ایک اور صنعت مالابار ساحلوں کی اینٹ اور کھپڑے والی صنعت تھی جسے سب سے پہلے منگلور کی مشنری آبادی نے قائم کیا تھا اور جب اس کی کامیابی نظر آئی تو وہاں تیزی کیساتھ پھیل گئی۔

مجموعی اعتبار سے ان پندرہ برسوں کے دوران خصوصاً اواخر میں ہندوستان کی صنعتوں میں تیزی سے ترقی ہوئی۔ بڑی اور پہلے سے قائم شدہ صنعتوں کی ترقی کی رفتار بہت تیز ہوگئی اور چھوٹی اور معاون صنعتوں میں بھی نمایاں ترقی ہوئی۔ ہندستان کے صنعتی ارتقا کا مستقبل امید افزا تھا۔ نویں دہائی کے اوائل میں جو ترقی ہوئی اس پر تبصرہ کرتے ہوئے " ہندستانی مصنوعات کا موجودہ حال" سے متعلق اپنی تقریر کے آخر میں جسٹس رانا ڈے کہتے ہیں " میں نے اپنی خوش فہمی کی وجہ آپ کے سامنے رکھ دی ہے کہ ہندوستان بڑی حد تک اسی راہ پر گامزن ہے جس پر چلنے سے صنعتی نجات حاصل ہوسکتی ہے بشرطیکہ وہی جذبہ کارفرما ہو جس سے ہندستان کے سرمایہ کار اب تک سرشار رہے ہیں۔"[1]

---

[1] ایم۔ جی۔ رانا ڈے، ہندستانی اقتصادیات سے متعلق مضامین، ص ۱۱۸ (۱۸۹۸ء)

اس صنعت کی ترقی پر روشنی ڈالنے کے بعد ہم فطری طور پر اس صنعت میں لگے ہوئے مزدوروں کی حالت کی طرف آتے ہیں۔ اوپر میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ ہندوستان کے قدیم معاشی ڈھانچہ میں عام قلی مزدور کا کوئی مقام نہ تھا اس جماعت کے لئے مانگ پیدا کرنے والے اسباب میں سب سے پہلا سبب محکمہ تعمیرات عامہ کی کارگزاری تھی اور یہ مانگ ہندوستان میں فروغ پانے والی فیکٹری والی صنعت سے بڑھ گئی۔ ان جماعتوں کے بارے میں یا ان کے رہائشی حالات پر عمومی تبصرہ کرنا ناممکن ہے جہاں سے یہ مزدور آتے تھے۔ اس سلسلہ میں ہر صنعت کا علحدہ طور پر جائزہ لیا جائے گا۔

بمبئی شہر کی کپاس کی صنعت میں بمبئی پریسیڈنسی کے کوزکان اور دکن کے ضلعوں سے مزدور آتے تھے۔ یہ زیادہ تر بے زمین مزدور تھے۔ یہ طبقہ ہندوستان میں تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ کپاس کی صنعت کا دوسرا مرکز احمد آباد تھا جہاں مزدور مقامی علاقہ یعنی قرب وجوار کے ضلعوں سے آتے تھے۔ کپاس کی جننگ اور گانٹھ بنانے والی صنعت میں مقامی علاقہ سے ہی سارے مزدور آتے تھے اور یہاں مزدوروں میں زیادہ تر بوڑھی عورتیں ہوتی تھیں۔ کلکتہ کی جوٹ کی صنعت میں تقریباً ۱۸۸۵ء تک کام کرنے والے مزدور زیادہ تر مقامی ہوتے تھے لیکن جب اس صنعت میں توسیع ہوئی اور زیادہ مزدور کی ضرورت ہوئی تو شمالی مغربی صوبہ (آج کا اتر پردیش) اور اڑیسہ سے مزدور بلائے جاتے تھے۔ ایسے بیرونی مزدوروں کا تناسب مستقل طور پر بڑھ رہا تھا۔ بنگال کی کوئلہ کان کنی کی صنعت بھی تیزی سے بڑھ رہی تھی لیکن اس مدت کے خاتمہ تک مزدور کی مانگ عام طور سے مقامی قبائلی مزدوروں سے پوری ہوتی تھی۔ زیادہ تر دوسری جگہوں میں جہاں صنعتیں تھیں وہاں رنگون کے سوا مزدور مقامی ہوتا تھا جہاں چاول کوٹنے کے زمانہ میں مدراس سے مزدور منگانا پڑتا تھا۔

جن حالات میں مزدور کام کرتے تھے ان کی باقاعدگی کا سوال پہلی بار بمبئی گورنمنٹ نے ۱۸۷۵ء میں کمیٹی کی تقرری سے اٹھایا تھا کہ بمبئی کے کارخانوں کی صورت حال اور فیکٹری ایکٹ پاس کرنے کی حاجت یا عدم حاجت کی جانچ پڑتال کرے۔ فیکٹری ایکٹ پاس کرنے کی ضرورت سے متعلق اس کمیٹی میں اختلاف رائے تھا۔ صنعت گرانہ مفاد اور ہندوستان کے زیادہ تر لوگ اس قسم کے کسی بھی اقدام کے مخالف تھے۔ متعدد مسودے تیار کرنے کے بعد پہلا ایکٹ آخر کار ۱۸۸۱ء میں پاس ہوا۔ یہ ایکٹ بڑا ہی ابتدائی نوعیت کا تھا۔ اس سے صرف ۱۲ سال سے کم عمر والے لڑکوں کے کام کے اوقات طے ہوئے تھے۔ سات سال سے کم عمر والوں کو کارخانوں میں کام کرنے کی اجازت نہ تھی اور ۷ سے ۱۲ سال کے لڑکوں کے لئے کام کے اوقات ۹ گھنٹے متعین کیے گئے مشینری کی احاطہ بندی کا بھی دفعہ رکھا گیا لیکن صحت

وصفائی سے متعلق کسی دفعہ کا ذکر نہ آیا۔ یہ ایکٹ ایسے ہی کارخانوں پر لاگو ہوتا تھا جہاں ۱۰۰ یا اس سے زیادہ آدمی کام کرتے تھے اور جہاں میکانکی قوت کا استعمال ہوتا تھا۔ اس ایکٹ کی حد سے چائے، کافی اور نیل کے ادارے خارج تھے۔

یہ جلد ہی معلوم ہو گیا کہ اس ایکٹ کی دفعات مزدوروں کے مفاد کی پوری حفاظت کے لیے ناکافی تھیں بمبئی کی حکومت نے دوسری کمیٹی مقرر کی لیکن کمیٹی کی سفارشات پر کوئی ترمیم عمل میں نہ آئی۔ لنکا شائر اور ڈنڈی ان تمام برسوں میں شکایت کرتے رہے کہ فیکٹری ایکٹ کے نہ ہونے سے ہندوستان سے مقابلہ غیر مناسب ہے[ل] ہندوستان میں خاص طور پر بمبئی پریسیڈنسی میں اس سلسلہ میں مزید قانون کے حق میں مانگ بڑھتی جارہی تھی۔ آخرکار ہندوستان کی حکومت نے ۱۸۹۰ء میں ایک فیکٹری کمیشن مقرر کیا۔ اسی کمیشن کی سفارشات پر مبنی ایک ایکٹ ۱۸۹۱ء میں پاس کیا گیا سابق ایکٹ سے زیادہ دفعات شامل کی گئیں جن کی رو سے یہ ایکٹ ان تمام کارخانوں پر لاگو ہو گیا جہاں ۵۰ آدمی کام کرتے تھے۔ ہفتہ میں چھٹی کا ایک دن ہوا۔ کام کرنے والے لڑکوں کی کم از کم عمر ۹ سال مقرر ہوئی اور ۹ اور ۱۴ سال کے درمیان لڑکوں کے لئے زیادہ سے زیادہ کام کرنے کے اوقات، گھنٹے مقرر کئے گئے۔ اس نے عورتوں کے اوقات کار ۱۱ گھنٹے مقرر کئے اور ان کے لیے رات کے کام پر پابندی لگادی گئی (یہ ایک ایسی دفعہ تھی جو اس مستثنیٰ سے بے اثر ہو کر رہ گئی جس کی اجازت کارخانہ جات کے لوکل انسپکٹر نے شفٹ سسٹم کے لئے دے دی تھی) اس میں بعض دفعات صحت و صفائی اور کارخانوں کے معائنہ کے لئے بھی تھیں۔

لیکن قانون چاہے جیسا بھی تھا وہ لاگو ہونے کے لحاظ سے بہت ہی محدود تھا۔ ۱۸۹۱ء کے پہلے جو ایکٹ تھا اس کی اہمیت اس پابندی سے ختم ہو گئی تھی کہ یہ ایکٹ صرف ایسے کارخانوں پر لاگو ہوگا جہاں ۱۰۰ یا اس سے زیادہ آدمی کام کرتے ہیں کیونکہ چھوٹے کارخانوں ہی میں بدترین برائیاں موجود تھیں۔ دوسری پابندی یہ تھی کہ یہ ایکٹ ایسے ہی کارخانوں پر لاگو ہوتا تھا جو سال میں چار مہینوں سے زیادہ چلتے تھے۔ اس دفعہ کی وجہ سے ایسے کارخانوں کی بڑی تعداد جو موسمی صنعتوں کی حیثیت رکھتی تھی جیسے کپاس اوٹنے اور گانٹھ بنانے والی فیکٹری، چاول کوٹنے والی فیکٹری، یہ اس ایکٹ کی گرفت سے نکل گئیں۔

اس کے برعکس کان کنی کی صنعت میں کام کرنے والے مزدوروں کے لئے کوئی قانون نہ تھا۔ تمام کانوں میں خاص طور پر بنگال میں عورتیں کثرت سے کام کرتی تھیں اور یہ خطرہ محسوس کیا گیا کہ "اگر کوئی قانونی

ل کارخانوں کے ایچ۔ ایم۔ انسپکٹر کی سالانہ رپورٹ (۱۸۹۵ء) ہندوستان کی فیکٹری دستور سازی پر نوٹ

مداخلت کی گئی تو اس صنعت کی ترقی رک جائے گی جو ابھی ابتدائی مرحلہ میں ہے ؛ [۱]

اس وقت جہاں تک کہ اس کے عمل درآمد کا معاملہ تھا ہندستان کی موجودہ صنعت کا بڑا حصہ حکومت کی گرفت سے آزاد تھا اور ۱۸۹۱ء کے بعد ہی یہ کہا جا سکتا ہے کہ کارخانہ سے متعلق قانون خاصا موثر ثابت ہوا۔

جس طرح کے ایکٹ پاس کئے گئے ان کی اصل میں اتنی اہمیت نہیں جتنی اس بات کی ہے کہ اس جانچ پڑتال سے مزدوروں کے اصل حالات سامنے آئے۔ صرف بمبئی اور بنگال ہی میں کارخانہ کی صنعت قابل لحاظ تھی۔ دوسرے تمام صوبوں کی رپورٹ عام طور پر اس حقیقت پر زور دیتی ہے کہ یہ صنعت اتنی چھوٹی ہے کہ اس کے لئے کسی علیحدہ قانون کی ضرورت نہیں ہے [۲] لیکن گرچہ یکساں طور پر باقاعدگی کی کمی تھی پھر بھی حالات ایک جگہ سے دوسری جگہ مختلف تھے۔

بمبئی کی ملوں میں ۱۸ سے اوپر عمر والے مرد کے لئے ساڑھے بارہ گھنٹے کام کے اوقات تھے، ۱۸ سے زیادہ عمر والی عورتوں کے لئے ساڑھے گیارہ گھنٹے تھے نوجوانوں کے لئے یعنی ۱۴ سے ۱۸ کی عمر والے کے لئے وہی اوقات تھے جو بالغ مرد کے لئے تھے اور ۷ سے ۱۲ عمر والے لڑکوں کے لئے ۹ گھنٹے تھے [۳] بڑی ملوں میں یہی نارمل گھنٹے تھے لیکن کام بڑھ جانے پر اوقات کار بڑھ جاتے تھے۔ ملوں میں بجلی کی روشنی آنے سے پہلے ان اوقات پر قدرتی روک تھی، گرمی کے مہینوں میں زیادہ سے زیادہ چودہ گھنٹے کام ہو سکتا تھا۔ ۱۸۸۱ء کے قبل لڑکے اتنے ہی گھنٹے کام کرتے تھے جتنے بالغ مرد کرتے تھے لیکن ۱۸۸۱ء کے ایکٹ نے گھٹا کر اسے ۹ کر دیا پھر بھی ان قوانین پر عمل درآمد نہ ہوتا تھا اور قاعدہ سے انحراف کثرت سے ہوتا تھا۔ مثال کے طور پر فیکٹری ایکٹ کی کارکردگی سے متعلق صوبہ متوسط کی رپورٹ ہے کہ جبل پور کی ملوں میں بالغ اور لڑکے سورج نکلنے سے لے کر سورج ڈوبنے تک کام کرتے تھے صرف فرق یہ ہوتا تھا کہ بالغوں کو دوپہر میں نصف گھنٹہ کا آرام ملتا تھا جب کہ لڑکوں کو ایک گھنٹہ کا۔ جہاں تک عورتوں کے کام کے اوقات کا سوال ہے وہ بمبئی کی صنعت میں مردوں کے مقابلہ میں کسی قدر کم تھے لیکن شمالی ہندستان کی ملوں میں اوقات کار عموماً برابر ہوتے تھے۔ حالانکہ مرد ان اوقات کے خلاف زیادہ شکایت نہیں کرتے تھے تاہم وہ ہفتہ میں

---

[۱] کانوں میں عورتوں اور لڑکوں کی فراہمی روزگار، مراسلات وغیرہ (پارلیمانی کاغذات) ۱۸۹۳ء

[۲] ہندستانی کارخانوں کے قوانین کی کارکردگی سے متعلق رپورٹ (پارلیمانی کاغذات) ۱۸۸۹ء

[۳] ۱۸۸۹ء میں اوقات کار یہی تھے۔ لڑکوں کے کام کے اوقات قانون کے ذریعہ پابند ہوتے تھے۔ اوپر کے پارلیمانی کاغذات سے بمبئی کی رپورٹ کی فہرست سے یہ اعداد و شمار لئے گئے ہیں۔

کم ازکم چھٹی کا دن چاہتے تھے۔ بمبئی کی صنعت میں مزدور سال بھر میں صرف پانچ پورے دن فرصت پاتے تھے[1] اوران ملوں میں بھی جہاں باقاعدہ ہفتہ میں چھٹی کا دن ہوتا تھا مزدوروں کو مشینری وغیرہ صاف کرنے کے لئے کم ازکم آدھے دن کے لئے حاضر ہونا پڑتا تھا۔ کپاس اونٹنے اور گانٹھ بنانے والی صنعت میں اتنی زیادہ برائیاں نہ تھیں جتنی کہ کتائی اور بنائی کی ملوں میں تھیں یہاں خاندیش کی صنعت سب سے زیادہ خراب تھی ۱۸۸۴ء کے فیکٹری کمیشن کے سامنے جو شہادت دی گئی وہ بڑی مہیب تھی۔ ایک گواہ نے کہا: "مارچ اور اپریل کے مشغول موسم میں اونٹنے اور گانٹھ بنانے والی مشین دن رات کام کرتی ہے اور دن رات وہی لوگ کام کرتے ہیں جنھیں صرف شام کو آدھ گھنٹہ کا آرام کا وقفہ ملتا ہے وہی جماعت دن رات آٹھ دنوں تک کام کرتی ہے"[2] حالت اور بھی بدتر تھی چونکہ کام کرنے والی زیادہ تر عورتیں تھیں۔
دوسرے گواہ نے کہا: "عورتیں اونٹنے والی مشین کا ہی ایک حصہ سمجھی جاتی ہیں اور وہ کارخانہ سے متعلق ہیں اور ۲۴ گھنٹوں میں دو یا تین گھنٹے ہی غیر حاضر ہو سکتی ہیں اور اس کی طرف کوئی دھیان بھی نہیں دیتا"[3] مسلسل آٹھ دنوں تک کام کرنے کے بعد اس اونٹنے والی مشین میں بمبئی سے دوسرے آدمیوں کے گروپ کا کام کرنا ضروری ہوجاتا"[4] خاندیش کی کپاس اونٹنے والی صنعت کے دوسرے شواہد اسی طرح کے تھے۔

کام کے اوقات کی طرح صفائی اور روشن دانی کے معاملہ میں بھی چھوٹے ادارے بدترین حالت میں تھے۔ بڑے اداروں میں جو ایکٹ کے ماتحت آتے تھے وہاں صفائی، روشن دانی اور مشنری سے حفاظت کا انتظام بڑی حد تک تشفی بخش تھا لیکن بڑی صنعتوں کے علاوہ حالات بدتر تھے۔ اس معاملہ میں سب سے زیادہ قانون شکن بمبئی کے کپاس اور اون صاف کرنے والے ادارے تھے۔ ان میں سے ایک کے بارے میں کرنل میڈ کنگ کہتے ہیں: "میں اس جگہ (جہاں ہوا کے آنے جانے کی سہولت نہیں) کو انسان کے کام کرنے کے لیے بالکل نامناسب سمجھتا تھا"[5] چھوٹی ملوں اور کارخانے کے بارے میں وہ کہتے ہیں "جن کارخانوں کا میں نے معائنہ کیا ہے ان میں

---

[1] ایچ۔ایم۔انسپکٹر آف فیکٹریز کی سالانہ رپورٹ (۱۸۸۶-۸۷ء) "ہندوستان میں فیکٹری کے حالات" سے متعلق مسٹر جونس کا نوٹ بمبئی اور لنکاشائر اسپننگ انکوائری (۱۸۸۷ء) کے سامنے مسٹر کوکر کی شہادت

[2] بمبئی فیکٹری کمیشن کی رپورٹ ص ۱۱ (۱۸۸۵)

[3] ایضاً ص ۱۳

[4] ایضاً

[5] کرنل میٹ کنگ (انسپکٹر آف فیکٹریز) کا بمبئی کی حکومت کا خط، جولائی ۱۸۸۲ء

دو تہائی خطرناک ہیں بعض تو بہت ہی خطرناک ہیں۔ مشینری، مل کا گیئر، قلائی چکے وغیرہ بغیر گھیرا کے ہوتے ہیں اور حیرت تو یہ ہے کہ حادثات اتنے زیادہ نہیں ہوتے جتنے ہو سکتے ہیں[1] لیکن وہ پھر کہتے ہیں؛ میں سمجھتا ہوں کہ مشین و آلات کے گھیرنے سے زیادہ ضروری ہے کہ ہوا کا انتظام ہو اور مضر گرد اور گیس کے خارج کرنے کا معقول ذریعہ ہو[2]۔ بمبئی پریسیڈنسی میں جو برائیاں تھیں وہ خاص طور پر چھوٹی صنعت میں موجود تھیں جہاں قانون کا گذر نہ تھا اس لئے وہاں کے حالات بڑے ہی ہیبت ناک تھے۔

فیکٹری دستور سازی کی سب سے زیادہ مخالفت بنگال چیمبر آف کامرس ہوئی اور بنگال کے گورنر (سر آشلے اِڈن) نے والسرے کی کانسل میں اس بل کی شدت سے مخالفت کی۔ اس رجحان کے بارے میں جو کچھ کہا جائے یہ تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ بنگال میں خصوصاً کلکتہ کی جوٹ ملوں میں کام کرنے کے حالات شاید سب سے بہتر تھے۔ ملوں کے چلانے کے اوقات کلکتہ اور بمبئی کی صنعت میں وہی تھے یعنی سورج نکلنے سے سورج ڈوبنے تک لیکن کلکتہ کی ملوں میں شفٹ سسٹم کا کسی قدر پیچیدہ سلسلہ تھا اور کام کرنے والوں کو الگ الگ اوسطاً دن میں ۹ گھنٹہ اور کبھی ۱۰ گھنٹہ کام کرنا پڑتا۔ اس اصول سے بنکر ہی مستثنیٰ تھے جو عموماً سارا دن کام کرتے تھے۔

بنگال کے مزدور بھی ہر ہفتہ اتوار کو پورے دن کی چھٹی پاتے اور اس کا مزدور طبقہ کی صحت پر بڑا اچھا اثر پڑتا تھا کارخانوں کے اندرونی حالات بھی عموماً صاف اور ہوادار تھے اور مشینری کا گھیرا بھی مکمل ہوتا تھا[3]۔ ایک دوسری بات بھی تھی جس میں بنگال کے مزدور اپنے بمبئی کے مزدور بھائیوں سے بہتر تھے۔ یہ اجرت کی ادائیگی کا سسٹم تھا۔ کلکتہ میں ہفتہ وار تنخواہ ملتی تھی اور زیادہ سے زیادہ تین دنوں سے لے کر ایک ہفتہ کی تنخواہ روک کر رکھی جاتی تھی۔ لیکن بمبئی میں مہینہ میں اجرت دینے کا خراب سسٹم جاری تھا اور تقریباً تین ہفتہ کی اجرت رکھ لی جاتی تھی[4] اس معاملہ میں بمبئی شہر سب سے خراب تھا کیونکہ احمد آباد میں بھی ہفتہ وار اجرت ملتی تھی۔

---

[1] ۔ ایضاً

[2] ایضاً

[3] ۲۴ پرگنہ کے مجسٹریٹ کی رپورٹ، رپورٹ آف دی ورکنگ آف فیکٹری ایکٹس (۱۸۸۹) دیکھیں

[4] یہ طریقہ آج بھی جاری ہے اور بمبئی کے کارخانوں میں کام کرنے والوں کے مقروض ہونے کا یہ بڑی حد تک ذمہ دار ہے۔ انڈین کو آپریٹو اسٹڈیز دیکھیں، مضمون نمبر ۴ "کو آپریشن اِمنگ فیکٹری ورکرس" مصنفہ دیودھر اور جوشی (۱۹۲۰ء)

اس مدت میں بمبئی کے دو کمیشنوں کی طرح بنگال کے مزدوروں کے حالات کی کوئی جانچ پڑتال نہیں کی گئی اس لیے جوٹ کی گانٹھ بنانے والی صنعت اور اوپری ملک کی دوسری صنعتوں میں کیا حالات تھے ان کا ٹھیک ٹھیک حال جاننا آسان نہیں ہے۔ بڑی صنعت کے مقابلہ میں ان کے حالات کسی قدر ضرور بدتر ہوں گے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ وہ خاندیش کی کپاس اوٹنے والی صنعت کی طرح خراب ہوں گے۔ ایسا امکان نظر نہیں آتا کیونکہ بمبئی دکن کے نہایت ہی مفلس صوبہ سے بہت ہی کم مزدوروں کی مقامی سپلائی بنگال میں تھی جس سے آسانی سے ناجائز فائدہ اٹھایا جاتا تھا۔ دوسرے اکا دکا منفرق کارخانوں اور دوسری صنعتوں کے بارے میں زیادہ کہنا ضروری نہیں۔ یہاں کام کرنے کے حالات خاص طور پر کسی ایک منیجر یا مالک اور ضلع کے آس پاس زرعی مزدور کے حالات پر منحصر ہوتے تھے۔ عموماً اوقات اور حالات کم و بیش ویسے ہی تھے جیسے بمبئی کی کپاس کی صنعت میں تھے۔ کچھ جگہوں میں تو صورت حال بدتر تھی۔

آخر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ کوئلہ کی کانوں میں کوئی قاعدہ برتا نہیں جاتا تھا۔ بنگال میں بچوں اور عورتوں سے عام طور پر زمین کے نیچے کام لیا جاتا تھا صوبہ متوسط میں جہاں زیادہ تر مزدور شمالی مغربی صوبہ سے آتے تھے وہاں بہت کم عورتیں کام کرتی تھیں اور لوگوں کا عام رجحان بھی یہ تھا کہ عورتوں سے کام نہ لیا جائے لیکن بنگال میں ایسی مداخلت کی سخت مخالفت ہوئی تھی۔ یہاں کام کا خاندانی سسٹم جاری تھا۔ مزدور زیادہ تر سنتھال اور بوری کے مقامی قبیلوں سے لائے جاتے تھے وہ اپنی عورتوں کے ساتھ کام کرتے تھے، مرد کوئلہ کاٹتے اور عورتیں ڈھوتی تھیں۔ ابھی تک شمالی مغربی صوبہ سے مزدور منگانے کی بہت تھوڑی کوششیں ہوئی تھیں لیکن اس صنعت کی توسیع تیزی سے ہونے کے باعث فالتو مزدور کی مستقل سپلائی کی ضرورت شدت سے محسوس کی جانے لگی لے

لے مزدور تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ، بنگال (۱۸۹۶ء)

ساتواں باب

کاشت کار ۱۸۹۵ء-۱۹۱۴ء

قحط سے نسبتاً نجات کا پندرہ سال کا طویل عرصہ ۱۸۹۵ء میں اچانک ختم ہو گیا اور بعد میں آنے والے برسوں میں ہندوستان وقتاً فوقتاً قحط کا بری طرح شکار ہوتا رہا۔ دو بڑے بھیانک قحط یکے بعد دیگرے آئے جن سے ہندوستان کی زرعی تاریخ میں انیسویں صدی کے آخری سال بدترین دور میں شمار ہونے لگے۔

۱۸۹۶ء-۹۷ کا قحط تقریباً پورے ہندوستان میں پھیل گیا صرف لوربرما اور اس جزیرہ نما کا جنوبی حصہ قحط سے محفوظ رہا۔ ۱۸۸۰ء میں قحط کے کمشنروں نے کہا تھا کہ ۱۸۷۶ء-۷۸ کا قحط ملک کا سب سے زیادہ سنگین تھا لیکن ۱۸۹۶ء-۹۷ کا قحط زیادہ وسیع علاقہ میں پھیل گیا اور یہ اسی طرح سنگین تھا اس قحط کی قابل ذکر خصوصیت یہ تھی کہ اس نے ان علاقوں کو بھی اپنے لپیٹ میں لے لیا تھا جو اب تک اس سے بری سمجھے جاتے تھے۔ برار میں بھی اکال پڑا جو ۶۴ برسوں سے قحط سے آزاد تھا اور پُر سکون طور پر محفوظ رہا تھا اور اس بلا کا مقابلہ کرنے کے لیے یکدم تیار نہ تھا[1] رلیف کے کاموں سے امداد پانے والوں کی تعداد بہت بڑی تھی لیکن رلیف کا معقول انتظام تھا اور سابق قحط ۱۸۷۶ء-۷۸ کے مقابلہ میں اس بار بہت زیادہ باقاعدگی تھی۔ اس بار آفیسروں کی ہدایات کے لیے ۱۸۸۰ء کے کمیشن کی سفارشات بھی سامنے تھیں جو اس قحط میں بڑی کامیابی کے ساتھ عمل میں لائی گئیں اور ۱۸۹۸ء کی کمیشن نے ان میں صرف چند معمولی ترمیمات، خصوصاً رلیف پانے والوں کے ساتھ بہتر سلوک کرنے کے سلسلہ میں کیں۔ ظاہر ہے کہ ہر جگہ ایک ہی بنیاد پر راحت نہیں پہنچائی جا رہی تھی اور کمیشن نے بعض صوبائی حکومتوں کو خصوصاً بمبئی کی حکومت کو

---

[1] ٹی۔ ڈبلو۔ ہولڈرنیس: ۱۸۹۶ء-۹۷ کے قحط کا بیان (پارلیمانی کاغذات)

[2] ۱۸۹۹ء-۹۸ کے قحط میں گجرات کا بھی یہی حال تھا۔ یہ علاقہ ۱۸۱۲ء سے ہی قحط سے بری تھا۔

ریلیف دینے اور مالگذاری وغیرہ معاف کر دینے کے معاملہ میں بہت ہی تنگدلی پایا۔[1]

لیکن ان کمشنروں کی رپورٹ کا دلچسپ ترین حصہ وہ جائزہ ہے جو ۱۸۹۵ء میں زرعی طبقات کے حالات سے متعلق ہے اور وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ ۹۵ - ۱۸۸۰ء کے نہایت خوشحال دور میں انھوں نے کس حد تک ترقی کی ہے۔ ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دام بڑھ جانے سے زمین رکھنے والے اور کاشت کار طبقہ کی آمدنی میں کافی اضافہ ہوا ہے"۔ ان کے آرام کا معیار اور خرچ بڑھ گیا ہے"۔ اس طرح قحط سے مقابلہ کرنے کی ان کی قوت بڑھ گئی ہے لیکن کمشنروں کا خیال ہے کہ کیا یہ اچھی طرح کہا جاسکتا ہے کہ ان میں کفایت شعاری کا مادہ زیادہ بڑھ گیا ہے یعنی سرمایہ اندوزی کی صلاحیت میں اضافہ ہوگیا ہے ؟ یہ مشکوک ہے"۔ حالانکہ قحط کا مقابلہ کرنے کی طاقت بڑھ گئی ہے پھر بھی ایسی آفتوں کے خلاف تحفظ کا پرانا طریقہ اب رائج نہیں تھا"۔ برآمدی تجارت اور مواصلات کی ترقی کے نتیجہ کے طور پر غلہ اندوزی کا رواج کم ہوگیا تھا جو زرعی طبقہ میں بہت ہی عام تھا"۔ ان کی رائے میں اگر کاشتکار اور زمین رکھنے والے طبقہ نے غلہ کا دام بڑھ جانے سے فائدے حاصل کئے تھے تو دن بھر کھیتوں میں کام کرنے والے مزدوروں کا حال مختلف تھا اور یہ جماعت تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ اس جماعت اور کاری گر طبقہ کے نچلے لوگوں کے بارے میں ان کمشنروں کا خیال ہے"؛ ان لوگوں کی اجرت گذشتہ بیس برسوں کی مدت میں زندگی کی ضروریات کی قیمت میں اضافہ کے تناسب سے نہیں بڑھی تھی"۔ پھر وہ کہتے ہیں" یہ طبقہ مشکل سے زندگی بسر کرتا ہے، اسے آرام نصیب نہیں، خراب کٹائی اور موسم کی آفتوں سے غیر معمولی طریقہ پر اثر پذیر ہوتا ہے"۔ حالیہ قحط کے تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس طبقہ کے پاس وسائل کی نمایاں ترقی نہیں ہوئی ہے"۔ اور جہاں تک اس طبقہ کی وسعت کا سوال ہے"؛ یہ کم ہونے کے بجائے یہ رفتہ رفتہ خصوصاً زیادہ گنجان ضلعوں میں پھیل رہا ہے"۔ یہ نتائج اور یقین آفریں ہوجاتے ہیں جب ہمارے سامنے ہندستان کے مختلف طبقوں کے صوبہ بہ صوبہ حالات آتے ہیں بنگال میں ۷۴ - ۱۸۷۳ء کے بعد لوگوں میں مقابلہ کرنے کی قوت عموماً بڑھ گئی تھی لیکن جہاں تک بہار کے چھوٹے کاشتکار اور مزدوروں کا سوال آتا ہے انھیں غلہ کی قیمتوں کے بڑھ جانے سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوا۔ مدراس کے دکنی ضلعوں میں جہاں خشک سالی اکثر واقع ہوتی تھی حالات ۱۸۷۶ء کے قبل بہتر ہو گئے تھے لیکن وہ ۱۸۷۶ء کے قحط سے شدید طور پر متاثر ہوئے اور وہ کنگال ہو کر رہ گئے ان کی ترقی بہت ہی معمولی ہوئی تھی اور مجموعی حیثیت سے ان

---

[1] ہندستانی کمیشن کی رپورٹ، ابواب چہارم و پنجم (۱۸۹۸ء)

نہ کوئی عمومی ترقی ہوئی تھی اور نہ کوئی عمومی انحطاط ۔ بمبئی پریسیڈنسی کے بارے میں صوبائی حکومت کا خیال تھا کہ گذشتہ قحط میں دکن اور جنوبی مرہٹہ علاقہ کے کاشتکاروں نے قوت مدافعت میں نمایاں اضافہ کا اظہار کیا تھا۔ اس کے بارے میں کمشنروں کا خیال ہے :

" ہم اس رائے کے ناقد نہیں اور نہ اس کی صلاحیت رکھتے ہیں لیکن ایسا لگتا ہے کہ صورت حال کا یہ جائزہ بہت زیادہ امید افزا ہے "

شمالی مغربی صوبہ کی حکومت نے بھی یہی نتیجہ اخذ کیا تھا کہ کاشتکار طبقہ یعنی کھیت رکھنے والے اور مالک دونوں نے اپنی حالت بہتر بنالی تھی لیکن مزدور طبقہ اس عمومی خوشحالی میں شریک نہ ہوا تھا۔ قحط کے کمشنروں نے یہ بیان عموماً جمنا کے دکھن کے چھوٹے مالکوں اور کاشتکاروں سے منسوب کر دیا تھا۔ اس علاقہ میں انھیں کوئی ترقی نظر نہیں آئی ۔ صوبہ متوسط میں حکومت کا خیال تھا کہ کاشتکاروں نے اپنی پوزیشن بہت زیادہ بہتر بنالی ہے ۔ لیکن پھر یہاں کمشنروں کے خیال میں اختلاف پایا جاتا ہے ۔ ان کا کہنا ہے :

" اس بات کا ثبوت موجود ہے کہ بہت سے پرانے مالگذار اور پرانی رعیت قرض میں بری طرح پھنس گئے ہیں جب کہ عام خوشحالی کے دنوں میں دوسروں نے اپنی پوزیشن برقرار رکھی ہے ہم سمجھتے ہیں کہ مزدور طبقہ عام برسوں میں کسی قدر آرام سے رہتا ہو لیکن آنے والے برے برسوں کے لئے وہ کچھ بچت نہیں کرتا ہے ۔ اس میں مقابلہ کرنے کی مزید طاقت کا پتہ نہیں چلتا " پنجاب میں حالات کسی قدر بہتر تھے ۔ پہلے کے مقابلہ میں اب صوبہ کا بیشتر حصہ آبپاشی کی وجہ سے محفوظ تھا اور کاشتکار کافی خوشحال تھے ۔ لیکن زیادہ گنجان ضلعوں میں چھوٹے کاشت کاروں کے درمیان زمین بہت زیادہ بٹی ہوئی تھی اور وہ قرض کی لعنت میں مبتلا تھے " اس صوبہ کا مزدور طبقہ بڑا خوشحال ہے اور وہ اپنی آمدنی سے اکثر بچت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے [1]

اس قحط کمیشن نے نتائج تفصیل سے پیش کئے ہیں اس لئے کہ لوگوں کی خوشحالی سے متعلق یہ سب سے بہتر مطالعہ ہے اور اس لئے بھی کہ اس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی آبادی کی بڑی اکثریت کا دارومدار موسموں کے حالات پر مبنی تھا ۔ ۷ ۔ ۱۸۹۶ء کا قحط ہندوستان کے زرعی طبقہ

---

[1] مذکورہ بالا شرح حال کے لئے قحط کمیشن کی رپورٹ (باب اول، دوم اور سوم، ۱۸۹۸ء) دیکھیے

کے لئے ایک بڑا حادثہ تھا لیکن یہ سب کچھ نہ تھا۔ ابھی لوگ اس قحط سے جانبر بھی نہ ہوئے تھے کہ دوسرے موسم نے بھی ہندوستان کے بڑے حصہ میں ساتھ نہیں دیا۔ ۱۹۰۰-۱۸۹۹ء کا قحط اتنا وسیع نہ تھا مگر یہ یقیناً بے حد شدید تھا۔ ان برسوں کے دوران بنگال اور برما میں دھان کی اچھی فصل ہوئی تھی اور یہ پریشانی شمالی مغربی صوبہ، اودھ اور پنجاب میں اتنی شدید نہ تھی۔ ہندوستان کے جنوب میں مدراس پریسیڈنسی نے بہت زیادہ تکلیف اٹھائی لیکن سب سے زیادہ پریشان علاقوں میں پریسیڈنسی، صوبہ متوسط اور برار، سلطنت نظام کا بیشتر حصہ اور وسطی ہندوستان کا بڑا حصہ آتا تھا[1] اور جہاں پریشانی ہوتی اس کی کیفیت اور شدید ہوتی خصوصاً جنوب کے ان علاقوں میں جہاں پہلے ۹۷-۱۸۹۶ء کا قحط زیادہ سنگین تھا۔ اس امر سے یہ معلوم ہوگا کہ ۱۹۰۰-۱۸۹۹ء کا قحط گرچہ پہلے دو قحطوں (۷۸-۱۸۷۶ اور ۹۷-۱۸۹۶ء) کے مقابلہ میں اتنا زیادہ وسیع نہ تھا تاہم قحط کے کاموں میں شریک ہونے والوں کی تعداد اگلے قحط سے بہت زیادہ تھی اور رلیف کے کام میں تقریباً ۱۵ کروڑ روپیہ خرچ ہوا تھا یہ صحیح ہے کہ اس رقم کا ایک حصہ غیر محتاط طور پر رلیف دینے پر خرچ ہوا ہوگا اور رلیف کے مستحق لوگوں کی پوری جانچ نہ کی گئی ہوگی یہ اس حقیقت سے بھی ظاہر ہے کہ رلیف پانے والوں کی فیصد شرح ایک ضلع سے دوسرے ضلع میں مختلف تھی حالانکہ اس آفت کی شدت تمام جگہوں میں یکساں تھی۔ صوبہ متوسط کے بیتول ضلع میں آبادی کا چالیس فیصد حصہ رلیف سے فیض یاب ہوا جب کہ آس پاس کے ضلعوں میں فیصد شرح بہت کم تھی۔ ایک بات اور تھی کہ اس قحط کے اختتام پر لوگوں نے رلیف کے کاموں کو اتنی جلدی سے ترک نہیں کیا جس طرح انھوں نے دوسرے قحط کے زمانہ میں کیا تھا اس کا سبب یہ بتایا جاسکتا ہے کہ وہ لوگ رلیف کے کاموں میں بہت زیادہ اجرت پا رہے ہوں گے۔ لیکن دوسری وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ متواتر دو اکالوں میں مبتلا ہونے سے لوگوں کو پورا اعتماد نہ ہوتا تھا کہ واقعی اب بہتر موسم آگیا ہے۔ دوسرے قحط کے دوران ایک خاص بات یہ ہوئی کہ اس میں مویشی بری طرح مرے پہلے یہ بتایا جاچکا ہے کہ یہ ہندوستانی قحط کی اہم خصوصیات میں سے ہے[2]

---

[1] ہندوستان میں قحط اور رلیف کے کاموں سے متعلق کاغذات ۱۹۰۰-۱۸۹۹ء نمبر ۸۰ اور ۸۱ (پارلیمانی کاغذات)

[2] "چارہ کا قحط ایک بدترین آفت ہے جو لوگوں پر آسکتی ہے جہاں غلہ کا قحط ہو وہاں اس کا واقع ہونا ضروری نہیں کیونکہ ۱۸۹۶ کی طرح ایسا ہوسکتا ہے کہ خریف کی فصل اتنی ہو کہ چارہ کی سپلائی تو حاصل ہو جائے گرچہ اناج کم ہو یا بکلی نہیں "۔ ڈبلو۔ ایچ۔ مورلینڈ: صوبہ متحدہ کی زراعت ص ۱۲۲ (۱۹۱۲ء) "ایم جنسی کا مقابلہ ایک کاشت کار سے بڑی حد تک نہیں ہوسکتا"۔ (ایضاً ص ۱۲۳)

۱۸۹۹-۱۹۰۰ء میں چارہ والی فصل کی قلت نمایاں تھی اور گجرات میں مویشیوں کی اموات خوفناک طور پر ہوئیں۔ یہ بڑی بدنصیبی تھی کیونکہ گجرات کی نسلیں ہندوستان میں بہترین قسم کی تھیں اور سب سے ترقی یافتہ تھیں اور گجرات کے کسانوں کی اچھی کاشتکاری ان کے بہتر مویشیوں پر ہی منحصر کرتی تھی۔ حکومت نے چارہ کے قحط کا مقابلہ کرنے کے لئے خاص اقدام کئے۔ کچھ جنگلات مویشیوں کے لیے کھلے چھوڑ دیئے گئے۔ کچھ جگہوں میں حکومت نے جنگلوں کی گھاس کٹوا کر گانٹھیں بنوائیں اور لوگوں کے ہاتھوں فروخت کیں۔ صوبہ متوسط نے گجرات کو کافی چارہ دیا لیکن ریل کے ڈبوں کے ناکافی ہونے کی وجہ سے پورا فائدہ اٹھایا نہ جا سکا۔[1]

ان دو قحطوں سے واقعی بڑی آفتیں آگئیں۔ ان کے طرح طرح کے اثرات پڑے، لوگوں کی صحت خراب ہوگئی ان کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ لوگ ہیضہ اور پلیگ جیسی وباؤں کے آسانی سے شکار ہونے لگے لیکن جیسا کہ اگلے باب میں بتایا گیا ہے اس کا بدترین اثر یہ پڑا کہ زرعی ترقی کی گھڑی الٹی چلنے لگی۔ ان پانچ مصیبت خیز برسوں کے دوران تقریباً تمام ترقیاں جو ۱۸۸۰ تا ۱۸۹۵ء ہوئی تھیں وہ ہندوستان کے وسیع علاقوں میں گم ہو کر رہ گئیں۔ زراعت کے میدان میں دو اثرات بہت ہی فوری طور پر یہ ہوئے (الف) دوہری فصل کے علاقہ میں کمی (ب) صنعتی اور برآمدی فصل کے عوض غلہ جاتی فصلوں کا زور۔ مثال کے طور پر صوبہ متوسط میں کپاس کے علاقہ کی ترقی کو چھوڑ کر تمام فصلوں کے علاقوں میں عمومی کمی پیدا ہوگئی اور خراب کٹائی کے بار بار جلد آنے سے دوہری فصل کاری کا رواج گویا ختم ہو گیا۔ صوبہ متحدہ میں جہاں ۱۸۹۹-۱۹۰۰ء کا قحط نہ آیا تھا وہاں دوہری فصل کا رقبہ بڑھ گیا تھا لیکن اضافہ کی یہ رفتار بہت ہی سست تھی کیونکہ اس سے پہلے قحط پڑ چکا تھا۔ قحط کا نتیجہ یہ بھی ہوا کہ کاشت کا مجموعی رقبہ گھٹ گیا۔ یہ صورت حال صوبہ متحدہ اور بمبئی پریسیڈنسی میں بھی تھی لیکن اس سلسلہ میں اتنا نمایاں اثر صوبہ متوسط میں موجود نہ تھا دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ برآمدی یا صنعتی فصل کے بدلہ غذائی فصل ہونے لگی بلکہ فائدہ بخش فصل کے عوض گھٹیا غذائی فصل لگائی جانے لگی۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ گھٹیا قسم کی غذائی فصل سخت بھی ہوتی تھی مثلاً صوبہ متحدہ میں نیل اور تلہن کے بدلہ بڑی حد تک غذائی اجناس آگئیں بمبئی پریسیڈنسی میں بھی رجحان خاص طور پر نمایاں تھا اور صوبہ متوسط میں گیہوں، دالتے تیسی او رچاول کی جگہ کم نفع بخش اجناس نے لے لی۔ یہاں یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ یہ آخر الذکر اثر شاید بہت دیرپا ثابت نہ ہوا۔

---

[1] قحط سے متعلق کاغذات ۱۸۹۹-۱۹۰۰ دیکھیں نمبر ۹۰-۸۲

قحط کے چند برسوں بعد جب اچھے موسم آگئے تو مختلف فصلوں کے درمیان پھر توازن پیدا ہوگیا یہی بات اس علاقہ کے لئے نہیں کہی جا سکتی ہے جہاں کاشت نہیں کی جاتی ہے یا جہاں دہری فصل کے علاقہ میں کمی آجاتی ہے قحط کا اصلی مضر اثر یہ ہے کہ اکال سے کاشتکاروں کو نفع بخش مگر نازک فصل لگانے میں رکاوٹ آجاتی ہے اور ان علاقوں کو چھوڑ کر جہاں آبپاشی کا انتظام ہے اور اس طرح موسم کے ردوبدل سے نجات حاصل ہے کسانوں کے لیے زمین میں کھاد وغیرہ کی شکل میں روپیہ لگانے کی ہمت نہیں ہوتی۔

بیسویں صدی کے آغاز سے جنگ عظیم تک کے چودہ سال خوش قسمتی سے فصل کی مکمل خرابی سے بری تھے جس طرح انیسویں صدی کی آخری دہائی میں فصل کی خرابی دوبار ہوئی تھی۔ لیکن یہ موسم بڑے مبارک نہ تھے۔ نئی صدی کے شروع کے سالوں میں اچھی کٹائی نہ ہوئی۔ بنگال اور بہار میں تقریباً پہلے سات موسم ناسازگار رہے اور مدراس پریسیڈنسی میں پوری پہلی دہائی کے دوران موسم معمول سے کم تھے۔ کچھ ایسے سال بھی آئے تھے جب کہ بعض صوبوں میں خشک سالی آئی جیسے ۳-۱۹۰۲ء میں صوبہ متوسط میں اور ۶-۱۹۰۵ء میں صوبہ متحدہ اور پنجاب میں۔ لیکن اس دہائی کا سب سے خراب سال ۸-۱۹۰۷ء میں آیا پورے صوبہ متحدہ میں اس سال بڑی مصیبت آئی اور اس لیے ریلیف کا کام بڑے پیمانہ پر شروع ہوا۔ پنجاب، بنگال، صوبہ متوسط، بمبئی اور اپر برما میں موسم بھی بڑا خراب تھا اور ان تمام صوبوں میں چھوٹے پیمانہ پر ریلیف کے کام کیے گئے لیکن ۱۹۰۹ء کے بعد موسم مجموعی حیثیت سے موافق تھے اور ۱۹۱۴ء میں ہندوستان کسی حد تک خوشحالی کے دور سے گذر رہا تھا اور ہندوستان کے کاشتکار اور زمین دار کے بارے میں یہ واضح طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ان کی اس زمانہ میں حالت اس صدی کے آغاز کے مقابلہ میں بہتر تھی کیونکہ کاشتکار گرچہ ۱۸۸۰-۹۵ء کے دوران اقتصادی لحاظ سے بہتر ہوئے تھے مگر وہ قحط کی وجہ سے بہت ہی بری طرح متاثر ہوئے تھے (زرعی مزدور اس جماعت سے علیحدہ رکھے گئے ہیں کیونکہ وہ گرچہ اس خوشحالی کے زمانہ میں کسی طرح بہتر نہیں ہوئے تھے پھر بھی وہی سب سے زیادہ قحط کی زد میں آئے تھے) کاشتکار طبقے نے اگلے پندرہ برسوں میں جو کچھ حاصل کیا تھا اسے انیسویں صدی کے اواخر میں کھو دیا۔ دوسرے قحط کے بعد ان کی سطح بڑی پست ہوگئی لیکن ملک کے بیشتر حصوں میں ایسے حالات رونما ہوگئے کہ وہ کم وبیش تیزی سے بحال ہوگئے۔ غذائی اجناس کی قیمت میں اضافہ ہونے سے جو بیسویں صدی کی پہلی دہائی کے دوران نمایاں ہوگیا تھا زمین دار طبقہ کو بڑی تقویت ملی۔ مواصلات کی توسیع اور کاشتکار کے بہتر ذرائع سے اصلی

لہ ہندوستان کی اخلاقی اور مادی ترقی کی رپورٹ، ۱۸۹۱-۹۲ء اور ۲-۱۹۰۱ء (زراعت سے متعلق باب میں)

کاشتکار کے لئے زیادہ موافق حالات پیدا ہو گئے گرچہ توسیع کی رفتار سست تھی۔

اس مقام پر یہ مطالعہ کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اس مدت کے دوران کاشت کے رقبہ اور فصل کی نوعیت میں کون کون سی تبدیلیاں آئیں۔ ۱۸۹۵ء تا ۱۹۰۰ء کے پانچ برسوں کی مدت کو نظرانداز کرنا پڑے گا کیونکہ یہ زمانہ بڑا ہی غیر معمولی تھا اور قحط کے زمانہ میں جو رد و بدل ہوتا ہے اس سے عام رجحانات کا کوئی پتہ نہیں چلتا ہے۔

گرچہ موسموں کی نوعیت کے اعتبار سے سال بہ سال مجموعی رقبہ میں بہت فرق ہوتا گیا پھر بھی مجموعی حیثیت سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ کاشت کے کل رقبہ میں واقعی بڑا اضافہ ہوا۔ اس اضافہ کی اہم وجہ خصوصاً پنجاب میں آب پاشی کی توسیع تھی جہاں اس مدت میں آبپاشی کی نئی نئی بستیاں بس گئیں تھیں لیکن اس سے اصلی ترقی کا بھی پتہ چلتا ہے کیونکہ ایسی زمین جو کاشت کاری سے کچھ زیادہ تھیں اب کاشت میں آگئیں۔

کاشت کے علاقہ میں ایسی توسیع ہونے سے پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پوری زمین کے کتنے حصہ میں غذائی اجناس پیدا ہوتی تھیں۔ ۱۹۰۱-۲ء میں ۸۰ فیصد میں غذا پیدا ہوتی تھی اور ۱۹۱۳-۱۴ء میں بھی یہی حال رہا۔ کاشت کے مجموعی رقبہ میں اضافہ ہونے کے باوجود غذائی اجناس پیدا ہونے والے رقبہ میں یکسانیت ایک قابل لحاظ حقیقت ہے اور زرعی اعداد و شمار میں بھی یہی تناسب برقرار رہا چند مستثنات جیسے بوٹ یا چارہ کی فصل کے علاوہ فصلوں کے رقبہ میں کوئی نمایاں اضافہ نہیں ہوا۔ زیادہ تر صوبوں میں یہ اضافہ کاشت کے کل رقبہ کے اضافہ کے تناسب ہے۔ تمام فصلوں میں سب سے نمایاں مقام چاول کو حاصل تھا۔ تناسب میں واحد نمایاں فرق یہی ہوا کہ گیہوں کی کاشت کے رقبہ میں کافی اضافہ ہوا۔ لیکن یہ یاد رہے کہ گیہوں کے رقبہ میں کسی قدر کمی بیشی ہوتی رہی۔ غذائی اجناس کے رقبہ میں یہ اضافہ آبادی میں اضافہ کی وجہ سے ضروری ہو گیا جیسا کہ پہلے زمانہ میں ہوا تھا۔ برصغیر ہندوستان بڑی حد تک غذائی برآمد کا ملک نہیں ہے۔ یہاں سے صرف چاول اور گیہوں ہی جیسے خاص اجناس برآمد ہوتی ہیں۔ تلہن اور چھوٹی اجناس جیسے جوار تقریباً تمام گھریلو استعمال کے لئے رکھ لی جاتی ہیں۔ چاول

لہ اس باب کے آخر میں جدول دیکھیں

کے سلسلہ میں بھی ہندوستان کا ذکر برما سے الگ ہونا چاہیئے۔ ہندوستان کے چاول کی برآمد خاص طور پر برما کے چاول پر مشتمل تھی اور اس مدت کے دوران یہ رجحان پیدا ہو گیا تھا کہ ہندوستان کے چاول کی برآمد میں زیادہ تر برما کا چاول ہی بھیجا جائے خود بنگال برما ہی سے چاول باقاعدہ طور پر منگاتا تھا۔ چاول کے بعد گیہوں کی ہی برآمد سب سے زیادہ ہوتی تھی پھر بھی اس کی مجموعی کاشت کا صرف ۱۰ فیصد ہی عام حالات میں برآمد کیا جاتا تھا۔ گیہوں کی برآمد بھی کافی گھٹتی بڑھتی رہتی تھی اور ہندوستان میں تھوڑی سی قلت ہونے پر اس اناج (گیہوں) کی برآمد میں کٹوتی ہو جاتی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ اچھے برسوں میں غذائی اجناس کی برآمد سے اس بات کا اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ ہندوستان غذا برآمد کرنے والا ملک ہے۔ یہ برآمدات ایک طرح سے قحط کے مقابل ذخیرہ کی حیثیت رکھتی تھیں۔ ذخیرہ اندوزی کے عوض جیسا کہ پہلے زمانہ میں ہوتا تھا جن برسوں میں پیداوار اچھی ہوتی تھی فالتو غلے برآمد کئے جاتے تھے۔ اوسط برسوں میں داخلی استعمال کے لئے جتنا ضروری ہوتا تھا اس سے زیادہ علاقہ میں غذائی اجناس کی کاشت ہوتی تھی تاکہ موسم کی سخت مزاجی کا مقابلہ کیا جائے۔ یہ بات اعداد و شمار سے بھی واضح ہوتی ہے کہ یہ اضافہ صرف چاول اور گیہوں کے علاقہ ہی میں نہیں ہوا بلکہ جوار، باجرا اور دوسری معمولی غذائی اجناس میں بھی ہوا جن کی برآمد ملک سے باہر نہ ہوتی تھی اسی وجہ سے یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ رقبہ میں اضافہ کی ضرورت آبادی کے بڑھنے سے ہوئی۔ زیر کاشت رقبہ کے بیشتر حصہ میں غذائی اجناس پیدا ہوتی تھیں اور زیادہ تر کاشتکار پہلے گھریلو اور مقامی منڈیوں کے لئے غذا پیدا کرتے تھے۔

صنعتی فصلوں میں تلہن اور کپاس کی کاشت کے رقبے سب سے زیادہ اہمیت رکھتے تھے۔ ان پندرہ برسوں کے دوران تلہن کے رقبہ میں مستقل اضافہ ہو رہا تھا اور ۲-۱۹۰۱ء کے بعد مجموعی رقبہ کا فی صد حصہ کسی قدر بڑھ گیا تھا۔ یہ فطری بات ہے کہ اس گروپ کے اجزا میں کسی قدر نمایاں کمی بیشی سال بہ سال ہوتی رہی لیکن تین خاص فصل یعنی تیسی، تل اور سرسوں نے اپنی پوزیشن برقرار رکھی۔ دوسری فصلوں میں مونگ پھلی نے انیسویں صدی کے اواخر میں اپنے انحطاط سے نجات حاصل کر لی اور نئی قسموں کے آجانے سے اس کی پوزیشن بہتر ہو گئی۔ تلہن زیادہ تر برآمدی فصل تھی۔ خاص طور سے اس گروپ سے تعلق رکھنے والے تیسی اور مونگ پھلی کا یہ حال تھا۔

کپاس کی کاشت کے علاقہ میں بھی مستقل اضافہ ہوا۔ یہ سچ ہے کہ کپاس پورے ہندوستان میں نہیں

---

[1] ایف نوئل پیٹن: انڈین وھیٹ اینڈ گرین ایلی وٹیرس (۱۹۱۳)

پیدا ہوسکتی تھی اور کپاس کے رقبہ میں جو نمایاں اضافہ ہوا وہ خاص طور پر کپاس پیدا کرنے والے علاقہ میں کپاس کی کاشت میں اضافہ کے تناسب سے ہوا۔ جوٹ کپاس کے مقابلہ میں ایک مخصوص علاقہ میں محدود تھی جیسے بنگال میں لیکن اس کی کاشت میں جو اضافہ ہوا اس کا تناسب اور زیادہ تھا۔ دوسرے علاقوں میں جوٹ پیدا کرنے کی بہت سی کوششیں ہوئیں لیکن ان میں سے زیادہ تر کوششیں ناکام رہیں اور جوٹ بنگال کے مخصوص علاقہ ہی میں پھیلتا رہا۔ دوسری اہم صنعتی فصل جیسے افیون اور نیل کی کاشت کے رقبہ میں یقیناً تخفیف ہوئی۔ اول الذکر کے معاملہ میں اس معاہدہ کا اثر پڑا جو حکومت ہند اور حکومت چین کے مابین ۱۹۰۷ء میں ہوا تھا اور آخر الذکر پر مصنوعی نیل کا اثر پڑا۔ چارہ والی فصلیں پیدا ہوئیں اور ان کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی کاشت کاروں نے سمجھ لیا تھا کہ یہ فصلیں ان کے جانوروں کے مناسب چارے کے لئے ضروری ہیں۔ یہ بڑی منافع بخش ثابت ہوئیں اور گردشی فصل کے لحاظ سے بھی مفید تھیں۔ گنا کے زیر کاشت علاقہ میں وہی حال قائم رہا جو پہلے تھا بلکہ بعض جگہوں میں کسی قدر کمی واقع ہوئی۔ ۱۸۹۰ء۔ ۱۹۱۰ء[1] کے دوران اس فصل کے رقبہ میں ۲۰ فیصد کمی واقع ہوئی لیکن اس مدت کے آخر میں یہ کسی حد تک بحال ہونے لگی تھی۔ تمام اعداد و شمار واضح طور پر یہ بتاتے ہیں کہ ہندستانی زراعت کا کردار جہاں تک فصلوں کا تعلق ہے، بدل گیا تھا لیکن ان پندرہ برسوں میں بہت تھوڑا تغیر آیا تھا۔ مقامی استعمال کے لئے ہی جو غذائی اجناس پیدا کی جاتی تھیں ان کا خاص مقام تھا اور صنعتی فصلوں میں بھی کاشت کے رقبہ میں جو اضافہ ہوا وہ صرف جانی پہچانی فصلوں جیسے کپاس، جوٹ اور تلہن میں ہوا جب کہ نیل، افیون اور گنے میں جو کمی ہوئی اس کے اسباب ان کی متعلقہ صنعتوں سے ہی وابستہ تھے۔

بدقسمتی سے پیداوار کے اعداد و شمار نہیں ملتے اور مویشی، ہل گاڑی وغیرہ کے سلسلہ میں جو اعداد و شمار ملتے ہیں وہ محض قیاس پر مبنی ہیں اس لئے مختلف برسوں کا موازنہ کرنے کے لئے ان پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا پھر بھی ہم سرکاری ایجنسیوں کی اس کارکردگی کی طرف رجوع ہوتے ہیں جس نے اس بات کا جائزہ لیا ہے کہ کاشتکار کے طریقوں میں کس حد تک ترقی ہوئی ہے۔ کسی ملک کی زرعی معیشت میں ایسی اصلاحات اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ صرف سرکاری ادارے ہی اس قسم کی اطلاعات فراہم کیا کرتے تھے یہ ادارے بڑے موزوں تھے کیونکہ کاشت کار رعب دیکھتا تھا کہ افسران خود ایسے نئے تجربوں میں دلچسپی لے رہے ہیں تو وہ بھی ان کو آزمانے کے لئے تیار ہو جاتا حالانکہ وہ بذات خود ان

---

[1] الیف۔ نوئل پیٹن: ہندستان میں چینی (۱۹۱۱)

کے نتائج سے پر امید نہ ہوتا تھا۔ گرچہ زرعی ترقی کا ایک خاص حصہ انیسویں صدی میں سرکاری ایجنسیوں کے ذریعہ لائی ہوئی نئی قسموں اور ترکیبوں سے حاصل ہو چکا ہے پھر بھی اس سمت میں کوئی منظم اور مرکوز کوشش نہیں ہوئی تھی۔ شعبہ زراعت برسوں سے صوبوں میں قائم تھا مگر خاص بات یہ ہے کہ توجہ اور ماہرین زراعت کی کمی کے باعث کوئی ٹھوس کام نہیں ہو سکا۔ ان منتشر قوتوں کو یکجا کرنے کا کام سب سے پہلے لارڈ کرزن کے زمانہ حکومت میں شروع ہوا۔ سب سے بڑا کام یہ ہوا کہ ۱۹۰۱ء میں پورے ہندوستان کے لئے ایک انسپکٹر جنرل برائے زراعت کا تقرر ہوا۔ مختلف زراعتی شعبوں کے لئے پہلی بار ایک ایسا سربراہ مل گیا جو زرعی معاملہ میں بھی مہارت رکھتا تھا۔ اس کے بعد ایک زرعی تحقیقی ادارہ (ایگریکلچرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ)، چند صوبائی زرعی کالج اور اسکول قائم ہوئے اس مقصد کے حصول کے لئے حکومت باقاعدہ طور پر کچھ کرنا چاہتی تھی نہ کہ اٹکل پچو طریقے سے، جس کا پتہ زراعتی شعبہ کے خرچ سے چلتا ہے۔ ایک دہائی کی مدت بہت ہی مختصر تھی، اس شعبہ کے عملے بھی مختصر تھے اور بے ضابطہ اس کے علاوہ اس اہم مد پر حقیر سی رقم خرچ ہوئی تھی لہٰذا اس دہائی کے گذرنے پر کوئی واضح نتیجہ نہیں نکلا۔

کپاس میں سدھار کیسے ہو، یہ ہندوستان کے کاشتکاروں کا ہمیشہ ایک محبوب ترین موضوع رہا ہے اس سلسلہ میں چند اچھے نمونے کاشت میں لائے گئے اور ملکی اقسام کے مختلف تجربات خصوصا مدراس پریسیڈنسی میں کیئے گئے کپاس کے معیار کو بہتر کرنے کے راستہ میں بڑی رکاوٹوں میں سے ایک کاوٹ یہ بھی کہ کاشتکاروں کو اصلی بیج نہیں ملتا تھا[1] اور بیج کی سپلائی کے لئے اونٹنے کی مقامی مشین، کے استعمال کا رواج بھی بڑا افسوس ناک تھا۔ اس برائی کو کسی حد تک روکنے کے لئے بیج فارم قائم کئے گئے ان کے دو مقاصد تھے۔ ایک تو اچھے بیجوں کو تیار کرنا اور دوسرے بہتر قسم کے بیجوں کو تقسیم کرنا، لیکن سچ تو یہ ہے کہ کپاس کا معیار اعلیٰ معیار کے کپاس کے مارکٹ بن جانے سے ہی بڑھا۔ یہ بعض ایسے اسباب کا نتیجہ تھا جن سے مجبوراً ہندوستان کی مل صنعت کو اعلیٰ معیار کی اشیاء تیار کرنے کی طرف متوجہ ہونا پڑا اگرچہ وہ اب تک اس سے غافل رہی تھی۔ ایسے اعلیٰ سوتی کپڑے کے لئے مارکٹ ابھی تک محدود تھا لیکن یہ وسیع ہو رہا تھا اور کپاس کے معیار میں برتری پیدا ہونے کا راز اسی میں پوشیدہ تھا۔

برآمدی فصل کی حیثیت سے گیہوں کی اہمیت بڑھ رہی تھی اس لئے فطری طور پر توجہ کی گئی کہ برآمد کے

---

[1] کمبوڈیا کپاس کی فوری توسیع اور اس کے معیار میں گراوٹ کی سبق آموز تاریخ دیکھئے:

جے۔ میکنا: ہندوستان میں زراعت (۱۹۱۵ء)، ہندوستانی کپاس کمیٹی کی رپورٹ باب ۴ (۱۹۱۹ء)

لئے گیہوں بیرونی مارکیٹ کی ضرورتوں کے مطابق ہو۔ ہندوستان میں تحقیق کے جن اہم ترین شعبوں میں کام ہوا ان میں سے ایک یہ تھا کہ ملک میں جو گیہوں پیدا ہو رہا ہے اس کی مختلف قسموں کی جانچ پڑتال کی جائے اور ان علاقوں کی نشاندہی کی جائے جہاں کے لئے یہ اقسام سب سے زیادہ موافق ہوں۔ پھپھوند کورو۔ کنے اور گوداموں میں رکھتے وقت کیڑوں سے بربادی کا سوال بھی اُٹھایا گیا اور ہندوستان میں بہتوں نے ان مشینوں کی حمایت کی جن سے غلہ اوپر اٹھا کر رکھا جاتا ہے جسے (GRAIN ELEVATOR) کہتے ہیں لیکن عملی اعتبار سے یہ اقدام ایک سوال بن کر رہ گیا اور یہ معاملہ ہنوز مشکوک ہے[1]

یہ چند مثالیں ہیں۔ کئی مسائل توجہ طلب تھے۔ یہ ہندوستان کی تمام اقسام سے تعلق رکھتے تھے۔ چاول کی نئی قسموں کا بعض علاقوں میں کامیابی کے ساتھ تجربہ کیا گیا۔ مونگ پھلی کی بہتر اور جلد بوئی جانے والی قسمیں جو ملکی مارکٹ کے لئے موافق ہوں۔ کاشت میں لائی گئیں۔ آخرالذکر کے سلسلہ میں سب سے کامیاب تجربہ اپر برما میں مونگ پھلی کی کاشت کا تجربہ تھا۔ فصلوں میں سدھار لانے کے علاوہ ترقی یافتہ آلات اور مصنوعی کھاد میں بھی تجربے کئے گئے۔ گذشتہ صدی کی متعدد ناکامیوں سے کچھ فائدہ ضرور حاصل ہوا اور اب کاشت کاروں کی ضروریات اور اس کی اقتصادی حالت پر زیادہ توجہ دی جانے لگی۔ ہلکے آہنی ہل اور پانی نکالنے کے لئے چھوٹے پمپ بہت سے حصوں میں استعمال ہونے لگے۔ مختلف کوششوں کی ایک مثال تو یہ ہے کہ مدراس میں سر فیڈرک نکولسن کے ماتحت ماہی پروری کا شعبہ قائم کیا گیا جس نے بالخصوص مالا بار کے سواحل پر بڑے اور بہتر جال کا انتظام کیا اور یہ کام امداد باہمی کے طریقوں پر ہوتا تھا اس نے ماہی گیری کا بہتر طریقہ مروج کیا۔ سارڈن تیل اور مچھلی کی کھاد کے صنعتی ادارے قائم کئے[2]

لیکن پھر بھی یہ سارے ترقیاتی سلسلے کسی انقلابی نوعیت کے حامل نہ تھے وہ اپنی وسعت کے اعتبار سے محدود تھے اور وہ کسانوں کی رسائی سے بعید تھے۔ بہت کچھ کام کرنا تھا۔ لیکن تھوڑا بہت جو کچھ بھی کیا گیا اس سے کاشت کاروں کی حالت بہتر ہوئی۔ گورنمنٹ کے ترقیاتی اقدامات میں جو کامیابی نصیب

---

[1] اے اور جی۔ ایل۔ سی ہووارڈ؛ ہندوستان میں گیہوں (۱۹۰۹) ایف نوایل سٹین کی کتاب گیہوں وغیرہ اور ہندوستان کی زراعت سے متعلق روائل کمیشن کی رپورٹ ص۔ ۵۔ ۴۴ (۱۹۲۸ء) دیکھیں۔

[2] سر فیڈرک نکولسن اور مسٹر گوبندن کی شہادت دیکھئے؛ ہندوستان کا صنعتی کمیشن، شواہد نامہ جلد سوم (۱۸-۱۹۱۶ء)

ہوئی اس کا ایک خاص سبب یہ تھا کہ زمین رکھنے والے مقامی طبقہ کا اشتراک طلب کیے جانے پر حاصل ہوا۔ بہت سے معاملوں میں یہ ایجنسی سب سے زیادہ مفید ثابت ہوئی اور صوبہ متوسط اور بمبئی پریسیڈنسی کے کچھ حصوں میں زمین رکھنے والوں کی مقامی جماعتیں بنائی گئیں جو زراعتی محکمہ کے ساتھ مل کر کام کرتی تھیں [۱]۔

ہندوستان میں زرعی ترقی لانے میں سب سے بڑی رکاوٹ کسانوں کی مفلسی تھی ان کی پرانی مقروضیت ان کے افلاس کا سب سے بڑا سبب تھی۔ ہندوستان کی زرعی معیشت قرض کسان کی زندگی میں وہی کردار ادا کرتا ہے جو پانی کرتا ہے یہ حقیقت اہم ہے کہ اب تک ہندوستان میں دیہی قرض کے انتظام کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ جسٹس رانا ڈے نے ٹھیک ہی زور دیا تھا کہ منظم قرض کی سہولت نہیں ہونے سے زرعی اور دیہی صنعت کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ ہے [۲] ہندوستان کی زراعت میں کسی مسلسل بہتری کی کوئی امید نہیں اگر کسانوں کو زمین میں لگائے ہوئے سرمایہ کے لیے مقامی مہاجنوں کو سود کی اتنی گراں شرح ادا کرنی پڑے۔ یہ بات بہت پہلے ہی محسوس کی گئی تھی اور ہندوستان کے اقتصادی حالات پر جن مصنفوں نے قلم اٹھایا تھا ان تمام لوگوں کے لیے ساہوکار کی حیثیت کالے کتے (HATE NOIR E) کی تھی لیکن پھر بھی مہاجن ہندوستان کی زراعت کو سرگرم رکھنے کا ایک اہم فرض انجام دے رہے تھے اس لیے اسے خارج کرنے یا برا بھلا کہنے کی کوئی ضرورت نہ تھی اگر ہم اس کے عوض کسی بہتر صورت کا انتظام نہیں کر سکتے اس حقیقت پر بہت سے مصنفوں نے زور دیا ہے کہ ساہوکار یا اس کا استحصال محض ہندوستان کی زراعت سے ہی وابستہ نہیں ہے۔ اور جیسا کہ سر ایف۔ نکولسن نے لکھا ہے "ساہوکاروں کی جگہ منظم قرض نے لے لی ہے جو تہذیب کا لازمی ارتقاء ہے۔ یہ صرف آسان اور سستا نہیں جس کی ضرورت ہے" [۳] زمین بینک اور یورپ کے امداد باہمی اداروں کی طرف پہلے توجہ دی گئی جنھوں نے وہاں سے ساہوکاروں کو نکالنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس سلسلہ میں پہلا اقدام مدراس کی حکومت نے یہ کیا کہ اس نے مسٹر (بعد میں سر فیڈریک) نیکولسن کو اس مسئلہ کا مطالعہ کرنے کے لیے مقرر کیا۔

---

[۱] زراعتی شعبوں کے ذریعہ ہندوستان کی زراعت میں سدھار لانے سے متعلق رپورٹ ۱۹۰۹ء، ۱۹۱۰ء، ۱۹۱۲ء، ۱۹۱۳ء اور ۱۹۱۴ء زرعی انجمنوں کے لیے ۱۹۱۲ء کی رپورٹ دیکھیے ص ص ۔ ۱۵ - ۱۱

[۲] راناڈے: ہندوستان میں دیہی قرض کی تنظیم نو سے متعلق مضمون، ہندوستان کی اقتصادیات (۱۸۹۸ء)

[۳] مدراس پریسیڈنسی میں لینڈ بینک کے رواج کے امکان سے متعلق رپورٹ، ج اول ص ۴۲

ن کی رپورٹ بڑی جامع تھی مگر اس پر کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا۔ اس درمیان کچھ ضلعوں کے کام الگ الگ اس معاملہ میں دلچسپی لے رہے تھے۔ شمالی مغربی صوبہ کے مسٹر ڈوپرنیکس نے اس صوبہ میں کچھ تجرباتی دیہی بینک قائم کیے۔ اسی زمانہ میں مسٹر میکلگان اور کیپٹن کروسٹھویٹ نے پنجاب کے ملتان ضلع میں ایسی سوسائٹیاں قائم کی تھیں لہ ان سوسائٹیوں میں مقامی کاشتکاروں نے خاصی دلچسپی لی جس سے ہمت پاکر حکومت نے ہندوستان میں قرض دینے کے لیے امداد باہمی کی انجمن قائم کرنے کی جانچ پڑتال کرنے کے لیے ایک چھوٹی سی کمیٹی مقرر کی اس کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں وہ سارے نقشے مرتب کر دیے جن کے مطابق ہندوستان میں سوسائٹیوں کی تشکیل ہوگی۔ ۱۹۰۴ء میں پہلا امداد باہمی انجمن کا قانون پاس ہوا اور حکومت نے اس امداد باہمی کو فروغ دینے کے لیے ہر صوبہ کے لیے صوبائی رجسٹرار مقرر کرنے کے لیے پہلا قدم اٹھایا۔ بدقسمتی سے پہلا ایکٹ اپنی وسعت کے اعتبار سے بہت محدود تھا۔ اس کی رو سے انجمن کا کام ممبروں کو فنڈ بہم پہنچانا تھا اور بس۔ اس کے علاوہ بہت سی دفعات جس طرح عدالتوں نے تشریح کی تھی اور اس تحریک کی توسیع کے لیے رکاوٹ بن گئیں سلہ۔ اسی لیے یہ ایکٹ ۱۹۱۲ء میں نئے ایکٹ کے آجانے سے منسوخ ہوگیا جس میں یہ ساری پرانی پابندیاں ہٹا دی گئیں فوراً ہی کئی انجمنیں قائم ہوگئیں جو فراہمی اور فروخت کا مقصد رکھتی تھیں۔ فراہمی اور فروخت کی یہ انجمنیں ہندوستان کی زرعی ترقی کی توسیع میں بڑی معاون ثابت ہوئیں۔ ۱۹۱۴ء میں اس تحریک کی عمر مشکل ایک دہائی ہوئی ہوگی۔ اس مختصر مدت کے پیش نظر اس تحریک نے جو فروغ حاصل کیا وہ بڑا تشفی بخش تھا۔ ۱۹۱۳-۱۴ء میں پوزیشن یہ تھی۔

ممبران اور دیگر انجمنوں کو جو قرض دیا گیا	ممبروں کی تعداد	انجمن کی تعداد
۵۰۴،۱۷،۳۱۰ روپے	۶۹۵،۹۹۸	۱۴،۸۸۱

تقریباً یہ تمام انجمنیں زرعی انجمنیں تھیں اور ان میں سے زیادہ تر انجمنیں قرضہ دینے والی تھیں۔

لہ ۱۹۰۰ء میں یہ نام بدل کر آگرہ و اودھ کا صوبہ صوبہ متحدہ ہوگیا جہاں تک ممکن ہوسکا ہے نام کا استعمال اس زمانہ کے مطابق ہوا ہے جس کا تذکرہ آیا ہے۔

سلہ ہندوستان میں کوپریٹو کریڈیٹ سوسائٹیز کے قیام سے متعلق رپورٹ (۱۹۰۱ء) مسٹر میکلگن وغیرہ کی شہادت

سلہ ایچ۔ ڈبلیو۔ ولف: ہندوستان میں امداد باہمی، باب دوم وسوم

برطانوی ہندوستان کے زرعی اعداد و شمار

ہزار ایکڑ

	۱۸۹۴-۹۵ء	۱۹۰۱-۲ء	۱۹۰۶-۷ء	۱۹۱۲-۱۳ء	۱۹۱۳-۱۴ء
بنجر زمین	۳۰,۱۸۳	۴۲,۱۴۷	۳۹,۹۳۵	۴۸,۷۶۰	۵۲,۶۲۰
خالص رقبہ جہاں فصل لگی	۱۹۶,۶۰۱	۱۹۹,۷۰۸	۲۱۴,۲۲۶	۲۲۴,۱۶۶	۲۱۹,۱۹۲
سیراب علاقہ	۲۳,۸۲۵	۳۲,۵۸۲	۳۶,۶۵۴	۴۵,۵۳۹	۴۶,۸۳۶
چاول	۶۹,۲۸۰	۷۰,۰۹۷	۷۲,۵۴۱	۷۸,۷۵۲	۷۶,۹۰۸
گیہوں	۲۲,۷۶۱	۱۸۶۰۷	۲۵۱۳۷	۲۳۸۶۱	۲۲۶۸۵
جوار	۲۰,۸۶۳	۲۱,۸۱۹	۲۰,۷۸۱	۲۰,۹۶۸	۲۱۴۰۵
باجرا	۱۱,۳۳۷	۱۳,۱۹۷	۱۵,۳۴	۱۶,۲۶۹	۱۵,۳۸۵
کل غذائی اجناس	۱۸۱,۵۷۶	۱۷۶,۹۹۹	۱۹۵,۱۱۷	۲۰۱,۳۷۳	۱۹۱,۵۷۳
چینی	۲,۸۸۹	۲۵۹۶	۲۶۲۴	۲,۷۱۲	۲۷۰۸
تلہن	۱۳,۹۳۰	۱۱۹۶۸	۱۳,۹۶۵	۱۴۹۳۶	۱۴,۶۵۸
کپاس	۹,۷۱۷	۱۰,۲۹۹	۱۳,۷۷۱	۱۴,۱۳۸	۱۵,۸۴۴
جوٹ	۲۲۷۵	۲,۲۷۸	۳,۵۲۳	۳,۳۲۴	۳,۱۳۶
چارہ والی فصلیں	۱۹۳۱	۲۹۴۴	۴۵۴۸	۵۷۷۰	۵,۹۱۰
نیل	۱۷۰۵	۷۹۲	۴۴۹	۲۲۷	۱۶۹
چائے	۴۱۴	۴۹۵	۵۰۵	۵۵۸	۵۱۲

آٹھواں باب

صنعتی ترقی - ۱۹۱۴-۱۸۹۵ء

۱۹۰۰-۱۸۹۵ء کے دوران ان صنعتوں کے راستہ میں بڑی رکاوٹ پیدا ہوئی جو ۱۸۹۵ء میں خوب فروغ پا رہی تھیں۔ زراعت کے زوال کے نتیجہ میں ان صنعتوں کو نقصان اٹھانا لازمی تھا خصوصاً وہ صنعتیں جن کی اپنی منڈی کا دارومدار ملکی مانگ پر تھا۔ صنعتوں کا ایسا ہمہ روانہ زوال ہندوستان کے قدیم اقتصادی ڈھانچہ کی نمایاں خصوصیت تھی اور موجودہ ہندوستان میں بھی کاریگروالی صنعتوں کا وہی حال ہے جو پرانے زمانہ میں تھا۔ بڑی صنعتوں میں کوئلہ کی صنعت پر ہندوستان کے زرعی انتشار کا بہت معمولی اثر پڑا اور جوٹ پر بھی زیادہ اثر نہیں ہوا[1]

اس کے برعکس کپاس کی صنعت کا حال جداگانہ تھا۔ بنے ہوئے سامان کی کھپت خاص طور پر ہندستان میں تھی اس کے علاوہ ہندستانی ملوں میں جو سوت تیار ہوتا تھا اس کا زیادہ حصہ ہندستان کے ہینڈلوم بنکروں کی مانگ کو پورا کرنے میں صرف ہوتا تھا اس کے بدلے میں ہندوستان کے ہینڈلوم بنکر خاص طور پر کاشتکاروں کو موٹا کپڑا فراہم کرتے تھے اب یہ بات بالکل ظاہر ہو گئی ہے کہ کہ سرد بازاری کے زمانہ میں پہلا معاشی اثر جو کاشت کار پر پڑتا ہے وہ اس کے اپنے کپڑوں ہی پر پڑتا تھا۔ اس لیے اس ملک کے بنکر زرعی مزدور کے ساتھ سب سے پہلے رلیف کے لیے آتے تھے۔ اس طرح مل سے تیار شدہ سوت کے لیے مارکٹ زرعی سرد بازاری کے زمانہ میں تیزی سے سکڑ کر رہ جاتا تھا۔ اس لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ دو خوف ناک قحط (۱۹۰۰-۱۸۹۵) کے دوران کپاس کی صنعت بھی شدید تجارتی سرد بازاری کی زد میں آئی۔ قحط اور اس کے نتیجہ میں ہینڈلوم بنکر سے وابستہ

---

[1] جوٹ کی صنعت بھی اپنی ہندستانی مانگ سے متاثر ہوئی کیونکہ غذائی اجناس اور دوسرے خام ساز و سامان میں کمی آجانے سے بوروں کی مانگ بھی متاثر ہوئی تھی۔

سرد بازاری سے کپاس کی صنعت میں بھی بڑی حد تک بدحالی رونما ہوئی لیکن اس مدت میں دوسرے اسباب بھی کارفرما تھے جو ایسی صورت حال پیدا کرنے میں ویسی ہی اہمیت رکھتے تھے۔

۱۸۹۶ء میں پہلی بار ایک مہیب شکل میں وبا ہندوستان میں آئی جو زمانہ قدیم سے یہاں کی آبادی میں تباہی مچا رہی تھی گلٹی والے طاعون کی یہ وبا اس سال سب سے پہلے بمبئی میں آئی۔ ہندوستان میں شاید یہ وبا پہلے بھی آئی تھی مگر اس خوف ناک شکل میں کبھی نہ آئی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بمبئی کی آبادی نے اس عجیب غریب خوفناک وبا سے دہشت زدہ ہو کر بڑی تعداد میں شہر کو چھوڑ دیا بڑے پیمانہ پر ہجرت ہوئی اور اس کے ساتھ کپاس کی صنعت سے وابستہ مزدوروں نے بھی اس شہر کو چھوڑ دیا۔ یہ پہلی ضرب تھی دو ایک سال بعد لوگ اس وبا کے عادی ہو گئے اور گرچہ اس کی شدت میں کمی نہ آئی پھر بھی مزدور اس کی آمد سے اتنے خوف زدہ نہ ہوئے تھے جتنے کہ وہ پہلی بار ہوئے تھے۔ پہلے قحط کے بعد طاعون پھیلا اور طاعون کے بعد پھر قحط آیا لیکن یہی سب کچھ نہ تھا۔ اس کے بعد ہی دوسرے حالات بھی رونما ہوئے۔

۱۹۰۲ء میں امریکہ میں کپاس کی سٹہ بازی ہوئی، اس سے کپاس کی قیمت غیر معمولی طور پر چڑھ گئی۔ مل اور ہینڈ لوم کی صنعت کو بڑا نقصان ہوا۔ کپاس کی اونچی قیمت سے تیار شدہ مال خصوصاً موٹے سامان کی پیداوار جس پر ہندوستانی صنعت خاص طور پر مبنی تھی بہت ہی غیر منافع بخش ہو گئی۔ دوسرا سبب ہندستان کے اہم خارجی مارکٹ یعنی چین میں انتشار کا پیدا ہونا تھا۔ ہندوستان سے حکومت کی بیرونی برآمد کا بیشتر حصہ چین جاتا تھا اس لیے اس مارکٹ میں سرد بازاری سے سوت کی کتائی کی صنعت کو بڑی ضرب لگی۔ سرد بازاری کا یہ زمانہ ۱۸۹۶ء سے لے کر تقریباً ۱۹۰۵ء تک جاری رہا۔ اس کے درمیان میں کبھی کبھی کچھ بہتر حالات ہو جاتے تھے لیکن اس سرد بازاری کے باوجود اس صنعت کے فروغ میں کم و بیش تسلسل قائم رہا۔

کپاس کی صنعت ۱۹۱۴-۱۸۹۵ء

	۱۸۹۵-۹۶ء	۱۹۰۰-۱ء	۱۹۰۴-۵ء	۱۹۰۷-۸ء	۱۹۰۷-۱۴ء
کپاس ملوں کی تعداد	۱۵۰	۱۹۴	۲۰۶	۲۲۷	۲۶۴
ملازم کی تعداد	۱۴۶,۵۵۲	۱۵۶,۳۵۵	۱۹۶,۳۶۹	۲۲۵,۳۶۷	۲۶۰۸۴۷
لوم کی تعداد	۳۷۲۷۸	۴۰۵۴۲	۴۷,۳۰۵	۶۶,۷۱۸	۹۶,۶۸۸
سپنڈل	۳,۸۵۲,۶۱	۴,۹۴۲,۲۹۰	۵,۱۹۶,۴۳۳	۵,۷۶۳,۷۱۰	۲,۶۲,۵۷۶

اس فہرست سے معلوم ہوتا ہے کہ سرد بازاری کی اس مدت کے دوران اس صنعت میں نمایاں

ترقی ہوئی۔ اعداد و شمار سے معلوم ہوگا کہ اس مدت میں لوم کی تعداد کی بہ نسبت اسپنڈل کی تعداد زیادہ بڑھ رہی تھی اور ۹۶-۱۸۹۵ تا ۱۹۰۰ء کے درمیان ہی اسپنڈل کی تعداد کا زیادہ حصہ بڑھا تھا۔ درحقیقت اسپنڈل کی تعداد میں اس تیزی سے اضافہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ چین کے بازار میں اسٹاک جمع ہوگیا جس سے وہاں کی مانگ ختم ہوگئی۔

۱۹۰۵ء کے بعد سرد بازاری ختم ہوگئی چھوٹے پیمانہ پر پھر زرعی خوشحالی آگئی، صنعتی مرکزوں میں لوگ پلیگ سے خوف زدہ نہ رہے، خام کپاس کا دام حسب معمولی اپنی سطح پر آگیا اور چین کا اسٹاک خالی ہوگیا اس لیے اگلے دو تین برسوں میں بمبئی کی صنعت میں خوشحالی نمایاں طور پر تھی اور سوت کاتنے والے ملوں نے بہت ہی زیادہ منافع کمانا شروع کیا۔ سوت کی مانگ اتنی زیادہ اور قیمت اتنی منافع بخش تھی کہ مل دن میں اس وقت تک چالو رہتی جہاں تک کہ ممکن ہوتا اور بجلی کی روشنی آجانے سے کام کا دن بھی بڑھ گیا تھا۔ پیداوار تیزی سے ہو رہی تھی۔ چین کا مارکٹ اسٹاک سے بھر گیا۔ اس کے ساتھ ۱۹۰۷ء میں پوری دنیا میں عام تجارتی سرد بازاری آگئی۔ ہر جگہ بالخصوص سوت کی ملوں میں تھوڑے وقت تک کام چلانا پڑا۔ اس سرد بازاری کے بعد پیش رفت جاری رہی اور ۱۹۱۴ء میں تو کپاس کی صنعت ترقی پذیر اور بڑی حد تک خوشحال صنعت تھی۔

اس عام ترقی کے علاوہ اس صنعت کی جدید تاریخ میں دو رجحانات کا پتہ چلتا ہے وہ رجحانات یہ تھے! (۱) اس صدی کے آغاز سے اسپنڈل کی تعداد کے مقابلہ میں لوم کی تعداد میں تیز تر ترقی کا نمایاں تسلسل اور (۲) کپاس کے صنعت گروں کا بہتر قسم کے مال پیدا کرنے کا رجحان۔ پہلے رجحان کا پتہ آسانی سے جدول سے ہو سکتا ہے۔ پارچہ بافی کی صنعت کی ترقی کا سبب تلاش کرنے کے لیے دور جانا نہ ہوگا۔ اس کا سبب گذشتہ بیس برسوں کا شدید اتار چڑھاؤ تھا۔ بمبئی انڈسٹری کے لیے سوت کا مارکٹ خاص طور پر چین اور خود اپنے ملک کا مارکٹ تھا کیونکہ اس کی برآمد گویا پورے طور پر چین کے مارکٹ پر منحصر تھی۔ یہاں اسے جاپان اور لنکا شائر کے مقابلہ کا سامنا کرنا پڑا۔ اس طرح اپنی برآمد کے لیے صرف ایک مارکٹ پر پورے طور پر دارومدار کرنے سے، ظاہر ہے، سوت کی صنعت کے منافع میں شدید اتار چڑھاؤ تھا۔ یہ بھی یاد رہے کہ چین کا مارکٹ خود بھی بہت زیادہ مستقل نہ تھا۔ جہاں تک گھر کے مارکٹ کا سوال ہے یہ بھی کاشت کار کی مالی حالت کے مطابق گھٹتا بڑھتا تھا اس لیے بمبئی کی صنعت اپنے سوت کے سامان کے لیے نئے مارکٹ دریافت کرنے کی کوشش میں لگی رہتی تھی لیکن اس معاملہ میں اسے کوئی خاص کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ مسٹر گراہم کلارک ملوں کے بڑے تناسب میں لوم کی تعداد میں

اضافہ کرنے کے رجحان کا دوسرا سبب پیش کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ چونکہ کپڑے کا مارکٹ خام اشیاء سے دور افتادہ تھا اس لیے وہ سوت کے مارکٹ کے مقابلہ میں زیادہ پائدار تھا۔ کبھی کبھی سوت کی ملوں کو اتنا زیادہ منافع ہوتا ہے جو پارچہ بافی کی ملوں کو کبھی میسر نہیں ہوتا لیکن جب ردعمل ہوتا ہے تو سوت مل کو حسب دستور پہلے احساس ہوتا ہے۔ اس طرح ۱۹۰۵ء اور ۱۹۰۶ء کے کچھ حصہ میں سوت مل خوب روپیہ کما رہی تھی جب کہ پارچہ باف ملوں کو اوسط منافع مل رہا تھا۔ اس وقت (اپریل ۱۹۰۷ء) سوت کی ملیں تھوڑے وقت کے لیے چل رہی ہیں لیکن پارچہ بافی کی ملیں وہی منافع کما رہی ہیں جو وہ پہلے کماتی تھیں[۱]۔ اسے دیکھتے ہوئے یہ فطری بات تھی کہ یہ صنعت اب پارچہ بافی کے مارکٹ کی طرف ضرور رخ کرے جو زیادہ پائدار تھا۔ بٹے ہوئے سامان کا مارکٹ زیادہ تر خانگی مارکٹ تھا کیونکہ کل پیداوار کا محض ½ حصہ ہی باہر بھیجا جاتا تھا۔ سوت کی برآمد ایک تہائی ہوتی تھی لیکن یہ تناسب کسی قدر گھٹتا جا رہا تھا، یہ ساری برآمدات عرب، ایران، مشرقی افریقہ اور STRAID کو جاتی تھیں۔ اب مل کے تیار شدہ مال کے لیے گھریلو مارکٹ جو غریب طبقہ پر منحصر نہیں تھا۔ ہینڈلوم کے تیار شدہ مال کے مارکٹ کے مقابلہ میں زیادہ پائدار تھا۔ اس لیے اس کاروبار میں کثیر منافع نہ تھا لیکن اس صنعت کی خوشحالی زیادہ پائدار تھی۔ سوت کے بہتر نمبر کی پیداوار کا رجحان انہی وجوہ سے تھا۔ کپاس کی صنعت کی ترقی کے آغاز میں جب کہ مارکٹ بڑا وسیع تھا اور صنعت کی وسعت مختصر تھی، بہاؤ اسی سمت میں فطری طور تھا جس سمت میں منافع بہت زیادہ آسانی سے حاصل ہوتا تھا۔ شروع میں ایجنٹ کو نفع نقصان کے حساب کا لحاظ کیے بغیر مل کی کل پیداوار پر رقم ادا کرنے کا عام گیر رواج تھا جس سے موٹا سوت اور معمولی قسم کے خوردہ سامان کی عام پیداوار کے لیے تقویت ملتی تھی اور جب ایک بار ان موٹے سامان کے لیے مشینیں قائم ہو جاتی تو اس سے اعلیٰ معیار کا سامان پیدا کرنا دشوار اور غیر منافع بخش ہو جاتا تھا لیکن ۱۸۹۰ء کے بعد موٹے سوت کا بیرونی مارکٹ کے بڑھنے کی رفتار بہت ہی سست تھی اور گھریلو مارکٹ پر بھی تقریباً ۱۹۰۰ء تک پورا قبضہ ہو گیا تھا اور اس صنعت میں مقابلہ بہت سخت ہو گیا تھا۔ اس لیے صنعت کاروں کو زیادہ منافع بخش گوشوں کی طرف متوجہ ہونا پڑا[۲]۔ سوت کی کتائی میں بہترین نیا مارکٹ اعلیٰ قسم کے سوت کو حاصل تھا جس پر اب تک لنکا شائر کا پورا غلبہ تھا۔ اس صنعت کے لیے نئے مارکٹ کی

---

[۱] گراہم کلارک: سوتی کپڑے ص ۱۳

[۲] مسٹر (بعد میں سر) ڈی۔ ای۔ واچہ کا مضمون دیکھیے جس میں یہ زور دیا گیا تھا کہ اس صنعت کو عمدہ مال تیار کرنے کی تحریک شروع کرنی چاہیے۔ یہ مضمون انڈسٹریل کوارٹرلی ریویو آن ویسٹرن انڈیا، جلد ا نمبر ۳ (۱۸۹۲) میں ہے۔

کی تلاش کے جذبہ سے ہی لوم کی تعداد میں نمایاں اضافہ ہوا۔ اس سلسلہ میں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ نویں دہائی کے بعد بٹے سوت اور عام سوت کی ہندوستان سے برآمد ہونے والی مقدار گویا جوں کی توں تھی جب کہ خوردہ مال کی مقدار قدرے گھٹ گئی تھی اس لیے جامد یا گھٹتے ہوئے بیرونی مارکٹ کے پیش نظر اس ترقی پذیر صنعت کو گھریلو مارکٹ کی طرف زیادہ سے زیادہ متوجہ ہونا پڑا اور اس میدان میں عمدہ سوت اور خوردہ مال تیار کرنا سب سے زیادہ امید افزا تھا۔

اس وقت ہندوستان میں جوٹ کی صنعت کی پیش رفت اپنی تیز رفتاری کے سوا کسی خاص خصوصیت کی حامل نہ تھی

جوٹ کی صنعت ۱۹۱۴-۱۸۹۵ء

	۱۸۹۵-۹ء	۱۹۰۱-۲ء	۱۹۰۷-۸ء	۱۹۱۳-۱۴ء
مل کی تعداد	۲۸	۳۶	۵۴	۶۴
ملازموں کی تعداد	۸۰،۱۴	۱۱۴،۷۹۵	۱۸۶،۷۷۱	۲۱۶،۲۸۸
لوم	۱۰،۱۶۹	۱۶،۱۱۹	۲۶،۲۴۴	۳۶،۵۰
اسپنڈل	۲۱۴،۷۶۹	۳۳۱،۳۸۲	۵۶۲،۲۷۴	۷۴۴،۲۸۹

عملہ، لوم اور اسپنڈل کی تعداد کی نسبت زیادہ مختصر تناسب میں مل کی تعداد بڑھنے کا قدیم رجحان ہنوز نمایاں تھا مگر بہت زیادہ نہیں۔ یہاں دوسری خصوصیت یہ ہے کہ لوم اور اسپنڈل کی تعداد میں اضافہ کرنے والوں کے تناسب سے بہت زیادہ تھا۔ بہتر مشینوں کے استعمال یا بڑے پیمانہ پر انتظام وانصرام سے جو پہلے نہ تھا۔ مزدوروں کی تعداد میں کمی ممکن ہوسکی۔ ۱۹۰۰-۱۸۹۵ کے دوران اس صنعت کی پیشرفت قحط کے باعث اتنی زیادہ تیز نہ تھی قحط کا اگرچہ براہ راست اثر اس صنعت پر نہیں پڑا۔ پھر بھی اس کا بالواسطہ اثر اس طرح پڑا کہ اس کی وجہ سے غذائی اجناس اور دوسری زرعی خام اشیاء ہندوستان سے باہر جانا بند ہوگئیں اس طرح ہندوستان سے بوروں کی مانگ کم ہوگئی۔ اس صنعت کو سرد بازاری کے دوروں سے بھی گذرنا پڑا جیسے ۱۹۰۵-۶ء کے دوران ایک ایسا وقت آیا۔ جوٹ کی ملوں کی پیش رفت زیادہ تر کلکتہ کے گرد ہوئی اور اس علاقہ کے باہر اس صنعت کی وسعت غیر اہم تھی۔ بنگال کی صنعت کو ایک

بڑا فائدہ یہ ہوا کہ یہ خام جوٹ کی سپلائی کے سرچشمہ کے پاس واقع تھی کیونکہ بنگال کو جوٹ کا اجارہ حاصل تھا۔ پھر بھی اس دہائی میں مقابلہ باہر بالخصوص جرمنی اور ریاست ہائے متحدہ میں بڑھ رہا تھا۔ یورپین اور امریکی صنعتوں کو عموماً اپنی قومی حکومتوں سے تقویت ملتی تھی کیونکہ خارجی جوٹ کی مصنوعات پر ٹیکس عائد تھا لیکن خام جوٹ ٹیکس سے مستثنیٰ تھا۔ لیکن اس سے ہندوستانی صنعت کی پیش رفت میں کوئی کوئی مداخلت نہیں ہوئی بلکہ جوٹ کی برآمد میں اضافہ کے ساتھ ساتھ جوٹ کے تیار شدہ مال کی برآمدات بھی تیزی سے بڑھتی رہیں۔

۱۸۹۵-۱۹۱۴ کی مدت کے دوران ہندوستان میں معدنیات کی پیداوار تیزی سے بڑھ رہی تھی کوئلہ کی کان کنی کی قدیم صنعت نے بڑی ترقی کی تھی اور پٹرولیم اور منگنیز کی دو نئی صنعتوں نے اس مدت میں بڑی اہمیت حاصل کی تھی۔ اس عظیم الشان اضافہ کا کچھ اندازہ حسب ذیل جدول سے ہو سکتا ہے:

ہندوستان میں معدنی پیداوار کی پنجسالہ اوسط) روپیہ میں کل سالانہ قدر و قیمت

۱۸۹۸-۱۹۰۳ء	۱۹۰۴-۸ء	۱۹۰۹-۱۳ء
۶,۴۹,۴۸,۹۰۵ روپیے	۱۰,۰۷,۴۴۸۷۵	۱۲,۵۸,۹۸,۳۳۰

کوئلہ کی کان کنی کی صنعت کا ریکارڈ تو گویا مسلسل ترقی کی تصویر پیش کرتا ہے۔ اس نے بڑی تیز رفتاری سے ترقی کی بلکہ یہ ترقی بڑے سے بڑے رجائی کی امیدوں سے بھی زیادہ ہوئی۔ ۱۸۹۱-۹۵ء کے دوران کوئلہ کی اوسط پیداوار ۲,۴۶,۰۰۰ ٹن تھی جب کہ ۱۸۹۶-۱۹۰۰ء کے دوران اوسط پیداوار بڑھ کر ۴۴,۲۸,۰۰۰ ٹن ہوگئی۔ ان پانچ برسوں کے دوران عظیم الشان ترقی حاصل ہوئی اور اس کے علاوہ آنے والے برسوں میں ترقی کی شرح اچھی طرح قائم رہی۔ کوئلہ کی صنعت کو قحط کے دوران نقصان سہنا نہیں پڑا اس کا سبب یہ تھا کہ اس کے خاص گاہکوں میں ریلوے، جوٹ اور بنگال کی دوسری صنعتیں تھیں۔ قحط کے دوران ریل کو نقصان ہونے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوا بلکہ ان کا کام تو اور زیادہ چلا۔

کوئلہ کی صنعت ۱۴۔۱۹۰۰

	۱۹۰۱ء	۱۹۰۶ء	۱۹۱۱ء	۱۹۱۴ء
کل پیداوار، ٹن میں	۶،۰۳۸،۰۵۳	۹،۱۱۲،۶۶۳	۱۹،۰۵۱،۸۴۵	۱۵،۷۳۸،۱۵۳
ملازم کی تعداد	....	۹۹،۱۳۸	۱۱۶،۱۵۳	۱۵۱،۳۷۶

یہ پیش رفت کوئلہ کی نئی کانوں کی دریافت سے نہیں ہوئی تھی بلکہ بنگال کی پہلے کی جانی پہچانی کوئلہ کانوں سے ہی کوئلہ نکالا گیا اور زیادہ فائدہ اٹھایا گیا[1] ۱۹۰۶ء میں کوئلہ کی ان تمام کانوں سے ہندوستان کی کل کوئلہ کی پیداوار کا نوے فی صد پیدا ہوتا تھا[2] اس مدت میں اس صنعت کی تاریخ مسلسل تھی ہاں اس کی پیش رفت کی شرح ہمیشہ تیز رہی تھی اور عموماً یکساں رہی تھی لیکن اگر ہم ہندوستان میں ریلوے کی توسیع اور کوئلہ کی کان کنی کی صنعت سے مقابلہ کرتے ہوئے اس کا جائزہ لیں تو اس کی تاریخ کے دو واضح ادوار ملیں گے پہلا دور ۱۸۹۵ سے تقریباً ۱۹۰۵ء تک کا دور ہے اور دوسرا ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۴ء تک کا ہے۔ پہلے دور کی دو نمایاں خصوصیات تھیں : (۱) درآمد سے زیادہ ہندوستانی کوئلہ کی برآمد میں اضافہ ہوا اور (۲) مجموعی پیداوار میں ریلوے کے حاصل کردہ حصّہ (SHGE) میں کمی ۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ہندوستان میں کوئلہ کی درآمد بھی تیزی سے گھٹ رہی تھی ۔ اس زمانہ میں ریلوے کی پوری مانگ کم و بیش ہندوستانی کوئلہ سے پوری ہو رہی تھی ۔

۱۹۰۲ کے بعد ہندوستانی ریلوے نے بیرونی کوئلہ استعمال کرنا تقریباً چھوڑ دیا تھا۔ اس سال کے بعد ہندوستان کی ریلوے میں جتنا کوئلہ استعمال ہوتا تھا اس میں ننانوے فی صد ہندوستانی کوئلہ ہوتا تھا۔ ۱۸۹۵ء میں ہندوستان کی کوئلہ کی کل پیداوار کا تقریباً ۴۸ فیصد حصّہ ہندوستان کی ریل میں خرچ ہوتا تھا۔ ۱۹۰۶ء میں یہ گھٹ کر ۳۰ فیصد ہو گیا اور کچھ عرصہ تک یہ برابر گھٹتا رہا۔ ان دونوں رجحانات سے پتہ چلتا تھا کہ ہندوستان کی کوئلہ کی پیداوار ریلوے اور کوئلہ کی پیداوار ریلوے اور کوئلہ استعمال کرنے والی صنعتوں کی بہ نسبت کسی

---

[1] ۱۹۱۱ء میں جب صوبوں کی تنظیم نو ہوئی تو یہ علاقے نئے صوبہ بہار اور اڑیسہ کا حصّہ تھے ۔

[2] سر ٹی۔ ہولینڈ : ہندوستان کے معدنی وسائل کا ایک خاکہ (۱۹۰۸ء)

قدر زیادہ تیز رفتار سے بڑھ رہی تھی لیکن یہ ساری خصوصیات ۱۹۰۸ء کے بعد معدوم ہوگئیں۔ ہندستانی کوئلہ کی برآمد کسی قدر گھٹ گئی اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ۱۹۰۸ء کی گرم بازی کے دوران ہندوستان سے گھٹیا درجہ کا کوئلہ باہر بھیجا گیا تھا لیکن اس کا صرف یہی سبب نہ تھا۔ جہاں تک درآمد کا سوال آتا ہے "ہندستان میں ۱۸۸۱ء اور ۱۸۹۵ء کے درمیان کوئلہ کی درآمد گویا جاری رہی۔ اگلے سال ایک مستقل کمی ۱۹۰۹ء تک جاری رہی جب کہ درآمد بہت ہی کم رہ گئی تھی۔ ۱۹۰۸ء کے دوران کوئلہ کی قیمت بڑھ جانے سے ۱۹۰۹ء میں مقدار میں اضافہ ہوا"[1] لیکن اس سال کے بعد مقدار میں کسی قدر اضافہ ہوتا رہا۔ درآمد سے برآمد پھر بھی زیادہ تھی لیکن دونوں کے فرق بہت کم ہوگیا تھا۔ ہندستانی ریلوے کے مصرف میں آنے والے کل ہندستانی کوئلہ کا تناسب اگلے دور کے آخری برسوں کے ۹۹ فیصد سے گھٹا کر ۹۵ فیصد ہوگیا اور یہ اس امر کے باوجود تھا کہ پہلے کے مقابلہ میں اب ریلوے ہندستان کے کل کوئلہ کی پیداوار کا بیشتر حصہ اپنے مصرف میں لا رہی تھی۔ ریل کے مصرف میں آنے والا ہندستانی کوئلہ اس مدت (۱۳-۱۹۰۹ء) میں مجموعی پیداوار کا ۳۱ فیصد تھا جو اگلے دور (۰۸-۱۹۰۴) کے اعداد و شمار سے زیادہ تھا اور اس سے ظاہر ہے کہ ریلوے کی توسیع کوئلہ استعمال کرنے والے دوسرے اداروں سے زیادہ ہوگئی تھی۔"[2] لیکن ان حقیقتوں سے صرف یہی ظاہر نہیں ہوتا کہ ریلوے کی توسیع کوئلہ استعمال کرنے والے اداروں سے زیادہ ہوئی ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ریل اور کوئلہ استعمال کرنے والے دوسرے ہندوستان میں کوئلہ کی پیداوار سے بہت زیادہ تیز رفتار سے ترقی کر رہے تھے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ہندستان کا کوئلہ بیرونی کوئلہ کے مقابلہ میں دو رکاوٹوں سے دوچار تھا۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ یہ عمدہ معیار کا نہ تھا جس کی خاص صنعتی کاموں کے لیے ضرورت تھی اور دوسری بات یہ تھی کہ اونچے ریلوے کرایہ کی وجہ سے ہندوستان کے ان حصوں میں مقابلہ سخت ہوگیا تھا جو کوئلہ کی کانوں سے بہت دور تھے۔ اس لیے بنگال اور ویلز کے کوئلہ میں قیمت کا فرق مغربی بندرگاہ جیسے کراچی میں بہت کم تھا خصوصاً جب کہ ہم کوالٹی کا فرق بھی ملحوظ نظر رکھیں۔

مواصلات اور فیکٹری صنعتوں کی ترقی سے کوئلہ کی صنعت کو فروغ مل رہا تھا۔ پیداوار میں کثیر اضافہ اس امر سے ہوا کہ اس صنعت میں مشینوں کا استعمال پورے طور پر ہو رہا تھا لیکن پھر بھی چھوٹی

---

[1] وی۔ بال: ہندستان میں کوئلہ کی کانیں، ترمیم شدہ از آر۔ آر۔ سمپسن، باب سوم (۱۹۱۳ء)

[2] ہندستان کی معدنی پیداوار کا پنجسالہ ریویو (۱۳-۱۹۰۹) ص ۱۷

چھوٹی چھوٹی کانوں میں بہت کم مشینیں استعمال ہو رہی تھیں کان کنی کے پٹہ اور لائسنس کی منظوری کی شرائط میں جو تبدیلی ہوئی اس سے بھی اس صنعت کے فروغ میں بڑی مدد ملی۔ ان سے متعلق پرانے قوانین بے شک بڑے تکلیف دہ تھے اور ان سے سرمایہ داروں پر غیر ضروری بندشیں عائد ہو جاتی تھیں۔ قوانین کی تبدیلی سے پہلے اور بعد میں جو مراعات ملیں ان کے اعداد و شمار بڑے سبق آموز ہیں۔ ۱۸۹۹ء میں تعداد صرف ۹۰ تھی لیکن بڑھ کر ۱۹۰۴ء میں ۱۸۹، ۱۹۰۶ء میں ۲۵۲ اور ۱۹۰۷ء میں ۴۰۰ ہو گئی[1]

جس طرح کوئلہ سے فائدہ اٹھایا گیا تقریباً اسی رفتار سے برما کے پٹرولیم ذخیرے کا بھی استعمال ہوا اور اس میں پیش رفت ہوئی۔ بہت ہی طویل عرصہ سے اپر برما کی ان کانوں سے خام تیل نکالنے کا قدیم طریقہ کام میں آرہا تھا۔ مشین کا استعمال بہت کم ہوتا تھا اور ان کانوں کی تنظیم گلڈ کے مانند ادارہ سے ہوتی تھی[2]۔ ۱۸۸۰ء تک اس صنعت میں جدید طریقوں کا ذرا بھی استعمال نہیں ہوا تھا۔ اس سال تیل نکالنے کے لیے دو کمپنیاں قائم ہوئیں جو جدید زمین کن مشینوں سے لیس تھیں۔ آغاز معمولی تھا اور ۱۸۹۰ء میں تیل صرف ۵،۹،۱۶،۵ ملین گیلن دستیاب ہو سکا۔ اپر برما کے ذخیرے ہی صرف اہم تھے اور ان سے ہندوستان کی کل سپلائی کا ۹۵ فیصد دستیاب ہوتا تھا۔ تقریباً ایک دہائی تک پیداوار زیادہ نہیں بڑھی ۱۸۹۶ء کے بعد ہی اہم سرچشمہ کی بات ہونے لگی[3] مگر ۱۸۹۶ء کے بعد پیداوار میں اضافہ تیزی سے ہوا۔ پھر بھی اس پیش رفت سے ہندوستان کی ساری ضرورتیں مکمل طور پر نہیں ہوئی تھیں درآمد برابر بڑھتی گئی۔ برما کی تیل کی برآمد زیادہ نہ تھی۔

پٹرول کی صنعت

	۱۸۹۶	۱۹۰۰	۱۹۰۵	۱۹۱۰	۱۹۱۴
تیل گیلن میں	۱۵۰۴۹۲۸۹	۳۷،۷۲۹،۲۱۱	۱۴۴،۷۹۴،۴۴۴	۲۱۴،۸۲۹،۶۴۷	۲۵۹،۳۴۲،۷۱۰

---

[1] سرٹی۔ ہولینڈ، ج۔ س

[2] ڈاکٹر ایف۔ نٹیلنگ۔ اپر برما میں پٹرولیم انڈسٹری (۱۸۹۲ء)

[3] ای۔ ایچ۔ پاسکو، برما میں تیل کے خطے (۱۹۱۲)

ہندوستان کی دوسری اہم معدنی صنعت مینگنیز کی ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ گویا بیسویں صدی کی تخلیق ہے کیونکہ مینگنیز کی صنعت گرچہ ۱۸۹۲ء میں مدراس پریسیڈنسی میں شروع ہوگئی تھی پھر بھی انیسویں صدی کے اختتام تک اس کی پیداوار برائے نام تھی اور صوبہ متوسط کے اہم ذخیروں پر کام ۱۹۰۰ تک نہ ہوا تھا۔ شروع ہی میں روس اور جاپان کی جنگ چھڑ جانے سے اس صنعت کو بڑی تقویت ملی کیونکہ جنگ کی وجہ سے روس کی سپلائی میں بہت کمی آگئی اب تک روس کی سپلائی ہی تمام ذرائع سے زیادہ تھی۔ اس کی نمایاں پیش رفت کی دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ اس زمانہ میں یورپ اور ریاست ہائے متحدہ میں فولاد کی تجارت زوروں سے ہو رہی تھی[1] پیداوار میں تیزی سے اضافہ ہوا اور ۱۹۰۷ء میں پیداوار اپنے انتہائی نقطہ کو پہنچ گئی جب یہ ۹۰۰،۰۰۰ ٹن سے بڑھ گئی اور تھوڑے وقت کے لیے یعنی ۱۱-۱۹۰۸ء میں ہندوستان کی دنیا میں سب سے زیادہ مینگنیز پیدا کرنے والے ملک کی ہوگئی ۱۹۰۸ء میں جب فولاد کی تجارت میں سردبازاری آگئی تو اس صنعت میں بھی سردبازاری آگئی۔ تھوڑے وقت کے لیے اس کی حالت سدھر گئی جب کہ روس کی سپلائی پھر رک گئی۔ ہندوستان میں مینگنیز کی پیداوار صرف برآمد کے لیے ہوتی تھی کیونکہ یہاں فولاد کا کوئی مقامی کارخانہ نہ تھا۔ اس صنعت میں کام کرنے والوں کی تعداد ۱۹۱۳ء میں ۲۰،۵۰۰ تھی۔

ان دو متذکرہ بالا صنعتوں سے ہندوستان کی سونے کی صنعت زیادہ قدیم تھی۔ ہندوستان میں سونے کی کان صرف میسور کی کولار کی کان تھی۔ ہندوستان کے پرانے کاروباریوں کی توجہ اس کان کی طرف گئی اور تقریباً ۱۸۸۰ء میں ہندوستان میں سونے سے فائدہ اٹھانے کے لیے بہت سی کمپنیاں بنائی گئیں شروع میں بڑی امیدیں تھیں لیکن یہ تمام امیدیں خاک میں مل گئیں" اتنی اُمیدوں کے ساتھ جو کمپنیاں بنائی گئیں وہ ۱۸۸۵ء میں بیٹھ گئیں اور اسی سال میسور کمپنی کی یہ آخری کوشش تھی کہ رگ زر (REEF) کی دولت دریافت کرلی۔ ۱۸۸۷ء تک ملحقہ کمپنیوں نے کام کرنا شروع کردیا اور اس وقت سے لے کر ۱۹۰۵ء تک اس کان کی تاریخ میں مسلسل ترقی و کامرانی ہوتی رہی"۔[2] آخرالذکر تاریخ کے بعد سے ہندستان کی پیداوار گرگئی کیونکہ کمتر درجہ کی پٹی آچکی تھی۔ ۱۹۰۲ء تک ہندوستان معدنی مصنوعات میں سونا

---

[1] اے۔ ایچ۔ کرنس، مینگنیز کے منصوبے ص ۳۴ (۱۹۱۹) ہولینڈ اور فرمر دیکھیے۔ ہندوستان کی معدنی پیداوار کا پنجسالہ ریویو ۸-۱۹۰۴، ص ص ۹-۱۲۸

[2] ہندستان کی معدنی پیداوار کا پنجسالہ خاکہ (۱۳-۱۹۱۹) ص ۸۵

سب سے زیادہ قیمتی تھا جس کی جگہ ۱۹۰۲ء کے بعد کوئلہ نے لے لی[1]

ہندوستان کی دوسری اہم معدنی صنعتیں نمک، ابرک اور شورا کی ہیں۔ پہلی صنعت بڑی اہم ہے اس کی سپلائی مختلف وسیلوں جیسے سمندر، چٹان اور جھیل سے دستیاب ہوتی تھی۔ پھر بھی ہندوستان کی پیداوار سے ملکی ضروریات مکمل طور پر پوری نہیں ہوتی تھیں ابرک پیدا کرنے میں ہندوستان دنیا میں خاص مقام رکھتا ہے۔ یہ صنعت گرچہ اہم نہیں ہے پھر بھی اس میں کام کرنے والوں کی تعداد ۱۹۱۳ء میں ۲۰،۰۰۰ تھی۔ شورا میں ہندوستان کو اجارہ حاصل تھا یہ ایک زمانہ میں تمام اعلیٰ آتش خیزوں کا ضروری عنصر تھا لیکن جب اس کا بدل (تقریباً ۱۸۶۰ء میں) دریافت ہو گیا تو اس صنعت میں جمود آ گیا[1]

ہندوستان کے لوہے کے ذخیروں کے سلسلے میں جو کثرت سے یہاں موجود ہیں، لوہے تیار کرنے کی واحد کامیاب کوشش برا کر ورکس نے رانی گنج کی کانوں کے پاس کی۔ دوسرے کئی اقدامات بھی کیے گیے مگر یہ تمام ناکامیاب رہے۔ اس صدی کی پہلی دہائی میں ٹاٹا اینڈ سنس نے ہندوستان میں لوہا اور فولاد تیار کرنے کے لیے اپنی کمپنی جاری کی اس نے ۱۹۱۱ء میں کام شروع کر دیا لیکن ظاہر ہے ۱۹۱۴ء تک ان کی پیداوار زیادہ نہ تھی[3]

اس مدت کے دوران ہندوستان کی مدنی پیداوار میں مجموعی حیثیت سے نمایاں اضافہ ہوا۔ لیکن ہندوستان کی ضرورت کے مقابلہ میں یہ ہنوز غیر اہم تھی۔ یہ اس امر سے ظاہر ہے کہ ہندوستان میں درآمد ہونے والی معدنیات مصنوعات کی مجموعی قیمت ملک میں پیدا ہونے والی تمام معدنیات سے بہت زیادہ تھی۔ ترقی صرف ناکافی نہ تھی بلکہ یہ یکطرفہ بھی تھی۔ ہندوستان کی چھ اہم معدنیات میں کوئلہ پٹرول، سونا، نمک، مینگنیز اور ابرک تھے۔ ان میں سے پہلی چار معدنیات سرٹی۔ ہولینڈ کے لفظوں میں براہ راست طریقوں" سے صرف ہو جاتی ہیں اور آخری دو معدنیات صرف برآمد کے لیے نکالی جاتی ہیں۔ ہندوستان میں تقریباً پورے طور پر آہنی دھات METALLIEROUS کی کمی تھی۔ آہنی دھات کی معدنیات کی کان کنی کی طرف متوجہ نہیں ہونے کی خاص وجہ یہ تھی کہ دھات کو صاف کرنے کے جدید طریقوں یا کیمیاوی ترقیوں میں ذیلی مصنوع (LEYPRODUCT) کی منافع میں ایک اہم اور ناگزیر حیثیت ہو گئی ہے اور اس کا استعمال کیے

---

[1] ای۔آر۔واٹس۔ مونوگراف۔ لوہا اور فولاد، بنگال (۱۹۰۷)

[2] راناڈے: ہندوستانی اقتصادیات سے متعلق مضامین (۱۸۹۸)

[3] لوویٹ فریزر: ہندوستان میں لوہا اور فولاد (۱۹۱۹ء)

بغیر معدنیات پر پوری توجہ ممکن نہیں۔ اور محض دھات کا کام نفع بخش نہیں ہو سکتا۔ ہندوستان جیسے ملک کو اس وقت تک درآمد کا ٹیکس ادا کرنے کے لیے رضامند ہونا چاہیے جب تک کہ صنعتیں ابھریں اور معاشی دائرہ کو پورا کرنے کے لیے کیمیاوی مصنوعات کی کافی تعداد کی انہیں ضرورت نہ ہو کیونکہ کیمیاوی اور دھات کو صاف کرنے کی صنعتیں فطری طور پر ہم رو ہیں"[1] تمام معدنیات کے ہنرمندانہ استعمال سے ہی یورپ کی صنعت ہندوستان کی قدیم اور مضبوط دھات اور کیمیاوی صنعتوں کو مٹا دینے میں کامیاب ہوئی اور جیسا کہ اوپر کے اقتباس میں اشارہ کیا گیا ان صنعتوں کی تجدید ہندوستان میں صنعتوں کی مجموعی ترقی کی تحریک پر منحصر تھی۔

بڑی صنعتوں اور معدنیات کی عام پیداوار کے بعد اب ہم صنعتوں کے دوسرے گروپ یعنی نخل کاری PLANTATION کا جائزہ لیں۔ چائے کی صنعت کے سوا ان تمام صنعتوں کی تاریخ بڑی رنگارنگ ہے ان میں سے قدیم ترین صنعت نیل کی تھی جو ۱۸۶۰ء تا ۱۸۹۵ء گویا جادو رہی جرمنی کے سائنس داں زمانہ دراز سے مصنوعی نیل تیار کرنے کی کوشش کر رہے تھے ان میں سے کچھ کوششیں کامیاب ہوئیں لیکن ۱۸۹۷ء کے بعد ہی تجارتی نقطہ نگاہ سے پہلا تیار شدہ نیل مارکٹ میں آیا اس سے اتنا خوف و ہراس پیدا ہوا کہ نیل کی وسیع علاقہ میں کاشت تقریباً ختم ہوگئی۔ ۱۸۹۷ء کے بعد ہی دو بڑے ناسازگار موسم آئے۔ اس لیے ۱۸۹۷ء کے بعد نیل کی صنعت ہندوستان میں تدریجی طور پر زوال پذیر ہوئی۔ نیل کی کاشت کا علاقہ تیزی سے کم ہونے لگا اور برآمد گرنے لگی کیونکہ مصنوعی نیل کی مقدار گرچہ پہلے بہت زیادہ نہ تھی پھر بھی یہ تیزی سے بڑھنے لگی اور اس کے دام قدرتی نیل کے مقابلہ میں بہت کم ہو گئے۔ نخل کاروں نے اپنی پوزیشن کچھ تو دوسری فصل لگا کر اور کچھ نیل کی کاشت اور اس سے مال تیار کرنے کے طریقوں میں تبدیلی لا کر بہتر بنانے کی کوشش کی لیکن اس صنعت کا زوال رک نہ سکا۔ نیل کی برآمد کے اعداد و شمار بتا رہے ہیں کہ یہ زوال کتنی تیزی سے ہوا۔ یہ اچھے اشاریہ ہیں کیونکہ ہندوستان میں پیدا ہونے والا تقریباً تمام نیل برآمد ہوتا تھا، صرف تھوڑی مقدار میں گھٹیا درجہ کا نیل ملک میں رہ جاتا تھا) ۹۶-۱۸۹۵ء میں برآمد کی مقدار ۱۶۶،۳۰۸ ہنڈرویٹ تھی اور ۱۴-۱۹۱۳ء میں ۱۰،۹۳۹ ہنڈرویٹ۔

قہوہ کی صنعت کو ۱۸۰۹ سے ۱۸۹۶ء تک خوشحالی کا مختصر دور میسر ہوا لیکن ۱۸۹۶ء میں برازیل

---

[1] ہولینڈ اور فرمر: ح۔ س۔ ص ۱۰ سرٹی ہولینڈ کا مضمون بعنوان "ہندوستان کی معدنی ترقی" بھی دیکھیں جو ہندوستان کی پہلی صنعتی کانفرنس (۱۹۰۵) میں پڑھا گیا۔

جب اپنے سیاسی انتشار سے کسی قدر نجات پا چکا تھا تو وہ پورے طور پر اپنی پیداوار کرنے لگا اور قیمتیں گرنے لگیں۔ اسی سال سے قہوہ کی کاشت کے علاقہ میں برابر کمی ہونے لگی اس کے ساتھ ہی ساتھ برآمدات میں نمایاں طور پر کمی نہیں ہوئی۔ قہوہ سے متعلق سالانہ رپورٹ (۱۰-۱۹۰۹) اس طرح ہے "یہ صحیح ہے کہ ۹۷-۱۸۹۶ء کے موسم سے قہوہ کی کاشت کے علاقہ میں برابر کمی ہوتی گئی پھر بھی پیداوار جیسا کہ برآمدات سے ظاہر ہے سال بہ سال گھٹتی بڑھتی رہی اور جس کی کاشت بڑی حد تک برآمد کی وجہ سے ہی ہوتی تھی، اس سے ظاہر ہے کہ چھوٹی فصل کے بعد بڑی فصل ہوتی رہی۔[۱] مجموعی اعتبار سے برآمدات یکساں رہیں ان سے صرف تھوڑا سا اشارہ انحطاط کی طرف ملتا ہے، کاشت کا علاقہ ۱۹۰۰-۱ کے ۲۰۶،۸۷۷ ایکڑ سے گھٹ کر ۱۴-۱۹۱۳ء میں ۲۰۳،۶۷۷ ایکڑ ہو گیا۔[۲]

اس کے برعکس چائے کی صنعت برابر بڑھتی جا رہی تھی۔ نیل کے عالمی مارکٹ میں مصنوعی نیل نے

---

[۱] سی۔ راؤسن "نیل کی کاشت وغیرہ"۔ جرنل آف دی روآئل سوسائٹی آف آرٹس (۱۹۰۰)

[۲] نیل اور قہوہ کی صنعت کی وسعت و ترقی کا اندازہ لگانے کے لیے جو اشارات استعمال میں لائے گئے ہیں وہ کاشت کے علاقہ اور برآمدات کے اعداد و شمار ہیں۔ کارخانوں کے صحیح آمد و خرچ اور ان میں کام کرنے والوں کی تعداد سے بہتر انڈکس تیار ہو سکتا تھا۔ اعداد و شمار کے عدم وجود سے ایسا ناممکن ہے۔ گورنمنٹ تو کئی سالوں تک "بڑی صنعتوں" کے اعداد و شمار شائع کرتی رہی تھی۔ لیکن یہ معتبر نہیں اور کئی برسوں کے موازنہ کے لیے تو بالکل ناقابل اعتماد ہیں۔ دشواریوں کا پتہ ہندوستان کے مالیاتی اور کامرشیل اعداد و شمار کے گیارھویں شمارہ کے حسب ذیل اقتباس سے چلے گا "بڑی صنعتوں کے سلسلہ میں بھی جو اعداد و شمار ہیں وہ نامکمل ہیں جن کا جدول میں ذکر آنا ضروری تھا اور جو اعداد و شمار ہیں وہ کبھی مشکوک نظر آتے ہیں..... ۱۹۰۱ء کے بعد کسی کارخانہ یا ادارہ کا کوئی حساب نہیں ملتا جہاں سال بھر اوسطاً ۲۵ سے کم آدمی کام کرتے ہیں اور ۱۹۰۲ء سے بمبئی پریسیڈنسی کے وہ تمام ادارے خارج ہیں جن میں اوسطاً ۵۰ سے کم آدمی کام کرتے ہیں..... ۱۹۰۱ء کے بعد کا مفصل حساب اگلے برسوں کے اعداد سے مقابلہ کرنے کے لائق نہیں جو اس جلد کے اگلے ایڈیشن میں مندرج ہیں کیونکہ ایک بڑی صنعت کے بارے میں رپورٹ کرنے والا ہر آفیسر <u>اپنی رائے کے مطابق کام کرتا تھا</u> (خط کشیدہ الفاظ میرے ہیں) بعد میں اعداد و شمار جمع کرنے کی بنیاد پورے ہندوستان میں ۵۰ یا اس سے زیادہ ہو گئی۔ لیکن پھر بھی نیل کی صنعت کے اعداد و شمار جمع کرنے کی بنیاد پورے ہندوستان میں ۵۰ یا اس سے زیادہ ہو گئی۔ لیکن پھر بھی نیل کی صنعت کے اعداد و شمار کے خلاف ایک خاص ریمارک دیکھتے ہیں"۔ اس جدول سے مکمل ریکارڈ کے بدلہ اس صنعت کی وسعت کا اشارہ ہو سکتا ہے"۔ قہوے کے سلسلہ میں اعداد و شمار کے ڈائرکٹر جنرل ڈاکٹر اوکونور کہتے ہیں: "جنوبی ہندوستان میں قہوے کی کاشت کا علاقہ

(باقی حاشیہ صفحہ دیکھیں)

بیسویں صدی میں اپنا نمایاں مقام حاصل کر لیا تھا، قہوہ کے مارکٹ میں دور آغاز سے ہی برازیل کے قہوہ نے قبضہ جما لیا تھا لیکن چائے کے مارکٹ میں ہندستانی چائے اپنی پوزیشن بہتر بنا رہی تھی اور اب تو وہ اہم ترین درجہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس صنعت کی ترقی کا سبب یہ ہوا کہ ہندستانی چائے نے چین کی چائے کو برطانوی مارکٹ سے باہر نکال دیا۔ یہ تبدیلی مکمل طور پر ہوگئی۔ ۱۹۶۶ء میں برطانیہ میں چائے کی کل درآمد میں ہندستانی چائے ۵۹ فیصد، لنکا کی چائے ۳۱ فیصد اور چینی چائے صرف ۱۰ فی صدرہ گئی تھی چائے کے علاقہ میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا ۱۸۹۵ء تک نمایاں طور پر اضافہ ہوتا رہا۔ ۱۸۹۷ء اور ۱۸۹۸ء میں سب سے زیادہ اضافہ ہوا۔ دو اگلے دو برسوں میں اضافہ کی شرح تیزی سے رک گئی اور ۱۹۰۲ء میں تقریباً ختم ہوگئی۔ پیداوار بھی تیزی سے بڑھ رہی تھی اور پیداوار میں نمایاں اضافہ ہونے سے ۱۸۹۵ء کے بعد چائے کی قیمت میں تیزی سے کمی واقع ہوئی۔ کچھ وقت کے لیے ریاست ہائے متحدہ کی مانگ ساکت رہی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۰۲ء اور ۱۹۰۶ء کے درمیان علاقہ میں کمی آگئی اور اس صنعت میں سرد بازاری آگئی۔ ۱۹۰۶ء کے بعد پھر ترقی شروع ہوئی۔ ریاست متحدہ کا مارکٹ برابر پھیلنے لگا اور ایک اہم اور نمو پذیر مارکٹ روس میں پیدا ہوگیا۔

مجموعی اعتبار سے ہندستان کی صنعت میں نخل بندی تناسب کے اعتبار سے مختصر حصہ لے رہی تھی۔ ان کی پوزیشن دوسری صنعتوں سے کسی قدر مختلف تھی۔ ان پر گویا فرنگیوں کا مکمل قبضہ تھا۔ وہ ملک کے عام مزدور کے قوانین سے بری تھیں، عام صنعت کار کے مقابلہ میں ان نخل کاروں کو اپنے مزدوروں پر زیادہ کنٹرول ہوتا تھا۔ یہ صنعتیں کچھ تو زرعی تھیں اور کچھ صنعتی اور یہ تمام صنعتیں اپنی مصنوعات کا بیشتر حصہ باہر بھیجتی تھیں۔ چائے اور قہوہ کی صنعتوں سے بنجر علاقے کام میں آنے لگے۔ ہندستان کی صنعتی ترقی میں ان کی خاص اہمیت یہ ہے کہ ان صنعتوں نے ملک کے گنجان علاقوں کے زیادہ تر مزدوروں کے لیے روزگار فراہم کیا۔

ہندستان کی چینی صنعت ان صنعتوں میں سے تھی جنہیں نویں دہائی میں برے دن کا سامنا کرنا پڑا۔ ۱۸۹۰ - ۱۹۰۰ء کی دہائی میں بیرونی تجارت کی نمایاں خصوصیات میں سے ایک یہ تھی کہ چینی کی درآمد

(بقیہ دیگر صفحہ کا) پیداوار اور حالات کا صحت کے ساتھ تعین کرنا دشوار ہے کیونکہ نخل کار کسی نامعلوم اور ناقابل تصور وجوہ سے صنعت سے متعلق اعداد و شمار کی واقفیت فراہم نہیں کرتے تھے۔" (ہندستان کی تجارت کا جائزہ ۱۹۰۲ء، ص ۲۱) ہندستان کی بیرونی تجارت کے اعداد و شمار سب سے زیادہ معتبر ہیں اور زرعی اعداد و شمار بڑی صنعتوں کے اعداد و شمار سے کسی قدر زیادہ معتبر ہیں

میں عظیم الشان اضافہ ہوا۔ اس سے پہلے درآمد کچھ عرصہ کے لیے برابر بڑھتی رہی۔ یہ خاص طور پر ماریشس اور جاوا سے آتی تھی۔ اس زمانہ میں ہندستان کی صنعت کو نقصان سہنا نہیں پڑا۔ جب امریکہ میں درآمدات پر حفاظتی ٹیکس لگانے پر ہندستان میں چقندر سے بننے والی BEAT SUGER چینی کی درآمد شروع ہوگئی تب ہندوستان کی اس صنعت پر کاری ضرب لگی۔ چقندر کی چینی سے دام بہت ہی گھٹ گیا اور ہندستانی کارخانوں میں چینی صاف کرنے کا کام نفع بخش نہ رہا۔[1] اس صنعت کے خاص مراکز صوبہ متحدہ اور بنگال کے چند ضلعوں میں تھے۔ ۱۸۹۵ء اور ۱۹۰۰ء کے درمیان صوبہ متحدہ کے صاف کرنے والے چھوٹے کارخانوں میں سے ۱۰۸ سے زیادہ کارخانے بند کرنے پڑے اور بنگال کے ضلعوں مثلاً جیسور میں بہت سے کارخانے بند ہوگئے۔[2] چقندر کی چینی BEAT SUGAR پر ٹیکس لگایا گیا تاکہ اس کا ردعمل دور ہو مگر اس سے اس صنعت کو فائدہ نہ ہوا۔ یہ بحث اٹھائی گئی تھی کہ چینی کا دام بڑھ جانے سے گنے کی کاشت کے علاقہ یا گڑ کی قیمت پر کوئی اثر نہ پڑے گا۔ یہ توقع غلط ثابت ہوئی اور کاشت کا علاقہ سمٹنے لگا۔ اس کمی کا خاص سبب یہ تھا کہ قیمتوں کے عمومی اضافہ سے غذائی اجناس، کپاس اور دوسری فصلوں کی کاشت بڑی منافع بخش ہوگئی تھی۔ بیرونی مقابلہ کی وجہ سے چینی کے دام میں اضافہ عام اضافہ کے تناسب سے نہ ہوا تھا۔ اس لیے چینی کی کاشت ترک کرکے دوسری زیادہ نفع بخش فصلیں لگائی جانے لگیں۔[3] چقندر کی شکر کے مقابلہ سے اس صنعت میں انحطاط ضرور ہوا مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ صنعت ضرور ترقی کرتی۔ جس بنیاد پر یہ صنعت قائم تھی وہی ناپائدار تھی۔ پیداوار کا یونٹ بہت ہی مختصر تھا، جو طریقے عمل میں لائے جا رہے تھے وہ دقیانوسی اور ضائع ہونے والے تھے۔ ان سے زیادہ تر کارخانوں میں کسی مشین کا استعمال نہ تھا اور چونکہ چینی گڑ سے تیار کی جاتی تھی نہ کہ براہ راست گنے کے رس سے، اس لیے اس صنعت کو سخت نقصان اٹھانا پڑتا تھا۔ اس انحطاط کے دوسرے اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی تھا کہ حکومت نے راب سے رم بنانے کی اجازت نہیں دی۔ ہندستان میں کاشت کا جو طریقہ تھا وہ بھی اس صنعت کی تجدید کے لیے رکاوٹ ثابت ہوا۔

---

[1] ایس۔ ایم ہادی: شمالی مغربی صوبہ اور اودھ کی چینی کی صنعت (۱۸۹۹)

[2] ایسٹ انڈیا (شوگر) کاونٹر ویلنگ ڈیوٹیز ایکٹ۔ مراسلات وغیرہ (۱۹۰۱) (پارلیمانی کاغذ)

[3] مسٹر مولیسن کا میمورنڈم۔ ایضاً

[4] الیف۔ نوئل پیٹن، ہندوستان میں چینی (۱۹۱۱)

تقریباً یہی حال مدراس کی چرم سازی کی صنعت کا ہوا اور ۱۸۹۹ء سے مدراس بڑھتی ہوئی مقداریں ان کی برآمد کرنے لگا (جب کہ اس وقت تک خام چمڑے کی برآمدات ناقابل ذکر تھیں)۔ یہ انحطاط امریکہ میں چرم سازی کے کروم طریقہ کی دریافت کی وجہ سے ہوا۔ اس کے علاوہ بوٹ (جوتا جو ٹخنے تک اونچا ہو) اور جوتے کی صنعتوں میں مشینوں کے بڑے پیمانہ پر استعمال ہونے سے مغرب میں خام چمڑے اور کھال کی مانگ بہت زیادہ ہوگئی قیمت میں بہت اضافہ ہوگیا۔ چرم سازوں (TAUNEX) کو نفع بخش طریقہ سے اپنا کاروبار چلانا بہت ہی مشکل ہوگیا۔ ایک دوسرے طریقے سے بھی کروم چرم سازی کی دریافت نے ہندستانی چرم سازی کو متاثر کیا۔ ان طریقوں کے ایجاد ہونے سے پہلے بیرونی ممالک خصوصاً برطانیہ میں مدراس کے چمڑے کی بڑی مانگ تھی جو نباتات اور چھال سے صاف کیے جاتے تھے لیکن ان کے استعمال سے پہلے بیرونی چرم سازوں کو پھر سے صاف کرنا پڑتا تھا۔ بنات اور چھال سے صاف کیے گئے چمڑے کو کروم کے طریقہ سے اور زیادہ صاف کرنا ناممکن سا تھا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہندستانی چرم اور چمڑے کے لیے مارکٹ بہت ہی سمٹ گیا[1] دوسرا الٹا اثر یہ پڑا کہ روآئل سوسائٹی آف آرٹس کی مقررہ کمیٹی نے یہ بتایا کہ ہندستان کی تیار شدہ چمڑا کتابوں کی جلد سازی کے لیے مناسب نہیں ہے۔ اسی زمانہ میں ہندستانی چرم سازی میں کروم کے طریقہ کو عمل میں لانے کی کوشش کی گئی لیکن یہ زیادہ تر ناکام رہی۔ اسی دہائی میں بمبئی اور مدراس پریسیڈنسی بالخصوص اول الذکر میں بڑے پیمانہ پر چلنے والی سازی کی [illegible] نے بھی کسی قدر ترقی ہوئی۔ بمبئی اور احمدآباد دو بڑے مراکز تھے۔ یہ صنعت مدراس کی زوال پذیر [illegible] کی بہ نسبت بہت ہی بڑے پیمانہ پر کام کر رہی تھی اور اس اکائی کو ورکشاپ کہلانے کے بجائے کارخانہ کہا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ چند چرم ساز اداروں کو چھوڑ کر اس صنعت میں جو طریقے استعمال ہوتے تھے وہ بڑے ہی دقیانوسی تھے[2]۔ اس صنعت کی وسعت مجموعی اعتبار سے مختصر تھی۔

ان بیس برسوں میں اس صنعت کے اس شعبہ میں عظیم الشان ترقی ہوئی جس میں کپاس کی جن (GIN) گانٹھ بنانے والی مل، چاول اور لکڑی کی ملیں وغیرہ شامل تھیں۔ چاول کی ملیں اب تک کم و بیش برما تک محدود تھیں لیکن اب وہ خاص ہندوستان بالخصوص مدراس اور بنگال پریسیڈنسی

---

[1] چیٹرٹن: چمڑے (مدراس) اور دوسرے صوبائی مونوگراف

[2] اے۔ گتھری: مونوگراف، چمڑے کی صنعت (بمبئی، ۱۹۱۰)

میں پھیل گئیں۔ انجینیرنگ اور ریلوے ورکشاپ، لوہے اور پیتل ڈھالنے والی صنعتیں بھی پھیل گئیں۔ ہندوستان میں ریلوے کی توسیع اور سائیکل، موٹر، ٹرام وغیرہ کے بڑھتے ہوئے استعمال سے ان صنعتوں میں ترقی ہوئی۔ ان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پہلے کے مقابلہ میں معمولی کام کے لیے چھوٹی مشینوں کا اب استعمال کسی قدر بڑھ گیا جیسے پانی نکالنے والا پمپ اور ایسی ورکشاپ صنعتوں میں موٹر پمپ کا استعمال ہونے لگا جہاں اب تک میکانکی طاقت سے کام نہیں لیا گیا تھا اس کے علاوہ ہندوستان کے بہت سے حصوں میں تیل اور آٹا کی ملیں کام کرنے لگیں۔

مختلف کاموں میں بہتر مشین کا استعمال آہستہ آہستہ بڑھنے لگا، جہاں طاقت کام میں نہ آتی تھی وہاں چھوٹے موٹر کام کرنے لگے تو ایسی صنعتوں میں جہاں پیچیدہ طریقہ عمل کی حاجت نہ تھی وہاں چھوٹے مقامی اور جدا جدا کارخانے قائم ہو گئے، انھی اسباب کی بنا پر اس مدت میں ہندوستان میں صحیح معنوں میں صنعتی ترقی ہوئی خواہ اس کی وسعت کچھ بھی رہی ہو۔

۱۹۱۱ء میں ہندوستان کی جو صنعت شماری ہوئی اس کے نتائج کا مطالعہ کرنے سے اس بیان کی حقیقت معلوم ہوگی اس سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ ہندوستان میں جدید صنعت کی وسعت بہت ہی محدود تھی ایک کارخانہ سے مراد ایسا صنعتی ادارہ تھا جہاں اوسطاً ۲۰ آدمی سے زیادہ کام کرتے ہوں اس گنتی میں کل ۷،۱۱۳ فیکٹریاں آئیں۔ ان میں سے ۴،۵۶۹ یعنی دو تہائی سے تھوڑا کم کسی نہ کسی شکل میں میکانکی قوت استعمال کرتی تھیں، باقی تمام فیکٹریوں میں صنعتی کام کے لیے کسی میکانکی طاقت کا استعمال نہیں ہوتا تھا۔ اس صنعت میں کل کام کرنے والوں کی تعداد ۲،۱۰۵،۸۲۴ تھی[۱] یہ صنعت محض چھوٹی ہی نہ تھی بلکہ اس کی نوعیت گنتی کرنے والے کمشنر نے صنعت کو ۱۶ گروپوں میں تقسیم کیا تھا ان میں سے صرف یہی چار گروپ میں ۱۰۰،۰۰۰ سے زیادہ آدمی کام کرتے تھے۔ وہ یہ تھے :

	کام کرنے والے
(۱) خاص چیزوں کی پیداوار یعنی نخل بندیاں وغیرہ	۸۱۰،۴۰۷
(۲) کپڑے کے کارخانے یا ٹیکسٹائیلز	۵۵۷،۵۸۹
(۳) کانیں	۲۲۴،۰۸۷
(۴) نقل و حمل سے متعلق صنعتیں	۱۲۵،۱۱۷
کل	۱،۷۱۷،۲۰۰

---

[۱] ۱۹۱۱ء میں ہندوستان کی آبادی تقریباً ۳۱ کروڑ ۵۰ لاکھ تھی

ان چار گروپوں میں ہندوستان کی صنعتی آبادی کا ۱۸ فیصد شامل تھا لیکن یہ تمام گروپ ہمہ گیر تھے۔ اور ان سے کسی قدر مختلف النوع صنعت کا اندازہ ہوتا تھا۔ اس کا صحیح اندازہ جداگانہ صنعتوں کی گنتی سے ہو سکتا ہے جن میں ۲۰,۰۰۰ سے زیادہ آدمی کام کرتے تھے۔

۱۹۱۱ء کی صنعتی گنتی

صنعت	کام کرنے والوں کی تعداد	صنعت	کام کرنے والوں کی تعداد
چائے کی نخل بندیاں	۷۰۳,۵۸۵	اینٹ اور کارخانے	۴۶,۱۵۶
کپاس	۵۵۷,۵۸۹	آٹا اور چاول کی ملیں	۴۲,۳۷۴
جوٹ بٹوا وغیرہ	۲۲۲,۳۱۹	چھاپہ خانے	۵۴۱,۵۹۸
کانیں	۱۴۲,۹۷۷	نیل کی کھتیاں	۳۰،۹۵
ریلوے ورکشاپ	۹۸,۷۲۳	سونے کی کانیں	۲۸،۵۹۲
قہوہ کی نخل بندیاں	۵۷,۶۲۳	مشنیری اور انجنیرنگ ورکشاپ	۲۳,۱۴۷

ان صنعتوں کے بعد لکڑی چیرنے والی مل، پتھر اور سنگ مرمر کی کانیں، عمارتی لکڑی کے یارڈ، لوہے گلانے اور نیل صاف کرنے والی صنعتیں آتی ہیں۔ ان تمام صنعتوں میں مل کر ۱۰ ہزار سے زیادہ آدمی کام کرتے تھے۔ ان میں صرف پہلی چار صنعتیں اہمیت رکھنے والی تھیں۔ نخل بندیوں میں کام کرنے والے آدمیوں میں سے زیادہ تر زرعی کاموں میں مشغول رہتے تھے۔ معدنی صنعتوں کی یک طرفہ ترقی کا حال پہلے ہی پیش کیا جا چکا ہے اس لیے معدنی صنعت کو چھوڑ کر خاص کارخانہ والی صنعتوں میں کپاس اور جوٹ کے بعد صرف متعلقہ صنعتیں رہ جاتی ہیں، جیسے ورکشاپ، گلانے والے کارخانے (فاونڈریز) وغیرہ اور ان کے علاوہ اونٹنے والی مشین، گانٹھ بنانے والے، چاول اور عمارتی لکڑی کی ملیں آتی ہیں۔ اگر ہم آٹا اور نیل کی چکیاں وغیرہ کو بھی شامل کر لیں تو بڑی ٹیکسٹائل صنعت کے بعد یہ آخر الذکر دو جماعتیں ہندوستان میں قابل غور جدید صنعتیں تھیں اس زمانہ میں ان صنعتوں کی وسعت ہندوستان میں بہت ہی محدود تھی اور یہ یاد رکھنا چاہیے کہ پیچیدہ طریق کار کو استعمال کرنے والی صنعتیں بالکل مفقود تھیں۔

ہندوستان کے کارخانوں میں مزدوروں کی حالت پر توجہ کریں تو معلوم ہوگا کہ ۱۸۹۲ء کا فیکٹری

ایکٹ ۱۹۱۲ء تک لاگو رہا جب ۱۸۹۲ء میں ایکٹ پاس ہوا تو اس کی دفعات کے بارے میں عموماً اطمینان کا اظہار کیا گیا۔ اس ایکٹ کے پاس ہونے کے تقریباً ایک دہائی کے بعد مزدوروں کے اوقات کار کے سلسلہ میں ایک نیا پہلو پیدا ہو گیا جس کا اس وقت لحاظ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ تھا کارخانوں میں بجلی کی روشنی آنے کا مسئلہ۔ بمبئی کی صنعت میں اس کے آتے ہی سوت کا بازار گرم ہو گیا۔ اس کی وجہ سے ملوں میں زیادہ دیر تک کام کرنا بڑا ہی نفع بخش ہو گیا اور یہ بجلی کی روشنی کی وجہ سے ممکن بھی ہو گیا۔ ۱۸۹۱ء کی کمیٹی نے سورج نکلنے سے سورج ڈوبنے تک کے وقت کو ہندوستان میں نارمل وقت سمجھا تھا۔ کمیٹی کی نظر میں یہ بہت زیادہ نہ تھا۔ لیکن یہ سارا اندازہ اب ختم ہو کر رہ گیا۔ بمبئی کی صنعت میں ۱۹۰۵ء کے دوران کام کرنے کے اوقات کافی طویل ہوتے تھے یہ کبھی صبح کے ۵ بجے سے رات کے ۹ بجے تک ہوتے تھے کام کے اوقات اس زمانہ میں اوسطاً ۱۴ گھنٹے روزانہ ہوتے تھے۔[1] لوگوں نے اخبارات میں مضامین لکھ کر کام کے اوقات کی زیادتی کی طرف توجہ مبذول کرائی۔ گورنمنٹ نے ٹیکسٹائل کارخانوں میں کام کرنے والوں کے حالات کی جانچ پڑتال کے لیے کمیٹی مقرر کی جس نے اپنی رپورٹ میں اور مفصل اور وسیع تحقیقات کی ضرورت کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے مطابق ایک دوسرا کمیشن فیکٹری مزدوروں کے لیے مجموعی مسئلہ پر غور کرنے کے لیے مقرر ہوا جس نے ۱۹۰۸ء میں اپنی رپورٹ پیش کی۔ اس رپورٹ سے جو حقائق سامنے آئے ان میں ایک دلچسپ بات یہ تھی کہ زیادہ تر صورتوں میں ۱۸۹۲ء کے ایکٹ کی دفعات کی کھلم کھلا خلاف ورزی ہوئی تھی۔ صوبہ متحدہ، جنوبی مدراس، بنگال اور پنجاب کی سوتی ملوں میں لڑکے بھی مردوں کے برابر اتنے ہی گھنٹے کام کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ۹ برس سے کم عمر کے لڑکے آدھا وقت کام کرنے والے کی حیثیت سے کارخانوں پر کام پر لگائے جاتے تھے۔ اس سلسلہ میں ایک مل کے مینیجر (کلکتہ جوٹ مل) نے بتایا کہ کام میں لگانے سے پہلے وہ جانچ کے لیے لڑکوں کو ڈاکٹر کے پاس اس ڈر سے نہیں بھیجتا تھا کہ ان میں سے زیادہ تر رد کر دیئے جائیں گے۔ اس نے یہ بھی تسلیم کیا کہ ۱۸۹۱ء کے فیکٹری ایکٹ میں ترمیم ہونے کے بعد ملوں نے اپنے سسٹم میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔[2] ۱۸۹۱ء میں جب خاندیش کا اونٹنے والی مشین کا کارخانہ ایکٹ کے ماتحت آ گیا تو اس کے حالات اب بہتر ہو گئے تھے لیکن دوسری جگہوں میں اونٹنے والی مشین کے چھوٹے کارخانہ اور چاول کی ملوں میں کام کے اوقات ابھی

---

[1] رپورٹ آف دی ٹیکسٹائل فیکٹریز لیبر کمیٹی (۱۹۰۷ء)

[2] رپورٹ آف دی انڈین فیکٹری لیبر کمیشن (۱۹۰۸ء) ص ۱۷

تک بہت زیادہ تھے۔گجرات کے اونٹنے والی مشین کارخانے جو ایکٹ کے تحت نہ آتے تھے کبھی کبھی ۱۵ سے ۱۸ گھنٹے روزانہ چالو رہتے تھے۔ چونکہ یہ سارے کارخانے چاول اور کپاس کی سپلائی پر پورے طور پر منحصر تھے اس لیے یہ رک رک کر کام کرتے تھے جس موسم میں کام بہت بڑھ جاتا تھا کام کے اوقات بھی بہت زیادہ ہو جاتے تھے۔ بالغ مرد کام کرنے والوں کے لیے شمالی ہندوستان میں کام کے اوقات بہت ہی خراب تھے۔ یہ اوقات زیادہ تر کپاس کی صنعت میں تھے شمالی ہندوستان کے مراکز یعنی آگرہ، دہلی اور کانپور میں خصوصاً بہت خراب تھے۔ اوسط اوقات ½ ۱۳ گھنٹوں سے زیادہ ہوتے تھے کلکتہ کی جوٹ کی صنعت میں بنکروں کے علاوہ کام کے اوقات زیادہ نہ ہوتے تھے، بنکروں کو تو کبھی کبھی ۱۵ گھنٹے روزانہ کام کرنا پڑتا تھا۔ لڑکوں کے کام کے اوقات ہر جگہ زیادہ تھے اور کارخانوں میں کام کرنے والے لڑکوں کی جسمانی ساخت باہر کے لڑکوں کی بہ نسبت خراب تھی لیکن اس زمانہ میں سب سے زیادہ اس بات پر بحث ہوتی تھی کہ کس طرح بالغ مردوں کے اوقات کار باقاعدہ کیے جائیں کمشنروں میں سے اکثریت نے گرچہ اس نکتہ پر قانونی باضابطگی کے لیے سفارش نہیں کی، پھر بھی یہ بتایا کہ مزدور کام کے ایسے سخت اوقات سے پریشان ہیں اور ان لوگوں نے عورتوں اور بچوں کے لیے کام کے اوقات باضابطہ کر دیئے۔ اس طرح ان کے خیال میں مرد کے اوقات کار اپنے آپ کم ہو جائیں گے اس نکتہ سے متعلق ڈاکٹر نائر کی رائے جداگانہ تھی اکثر شواہد سے یہ مناسب نظر آتا تھا کہ کام کے اوقات کم ہو جانے چاہئیں۔ کام سے زیادہ اوقات کے حق میں خاص طور پر یہ بات تھی کہ ہندوستانی مزدوروں میں کام کرنے کے دوران گشت لگانے کی فطرت ثانیہ بن گئی تھی مگر شہادت سے یہ معلوم ہوا کہ زیادہ اوقات کی وجہ سے ایسی فطرت لازمی ہو گئی تھی۔ اس سلسلہ میں کانپور کے الگن ملز نے ایک دلچسپ تجربہ کیا۔ ایک زمانہ میں ان ملوں میں ۱۵ گھنٹہ روزانہ کام ہوتا تھا لیکن یہ غیر کفایت شعار اور بے سود ثابت ہوا اس لیے رفتہ رفتہ وقت گھٹا کر ۱۲ گھنٹہ کر دیا گیا اور یہ پتہ چلا کہ مجموعی پیداوار میں کوئی فرق نہیں آیا اور لوگوں کو وہی تنخواہ ملی اور کام بھی بہتر ہوا[1] اس قسم کا تجربہ مدراس کے بکنگھم مل میں بھی کیا گیا اس کے منیجر کو یہ پتہ چلا کہ جب اوقات کار میں پون گھنٹہ کم کر دیا گیا یعنی ½ ۱۲ سے ¾ ۱۱) تو مجموعی پیداوار میں کوئی کمی نہیں آئی، اس نے اس کی وجہ بہتر مشین، بہتر نگرانی اور کاریگر کا مزید استعمال بتایا[2] مسٹر ابعد میں سرا

---

[1] فیکٹری لیبر کمیشن: شواہد کی تفصیل۔ الگن ملز کے مسٹر ہوس کی شہادت

[2] ایضاً۔ مسٹر الیگزینڈر کی شہادت۔ بہتر مشین کے عنصر نے کسی قدر اس تجربہ کی قیمت کو غیر اہم بنا دیا۔

بنیز بھی دادا بھائی مہتا نے جو ناگپور امپریس مل کے تجربہ کار منیجر تھے، اسی نوعیت کی شہادت دی[1] کام کے مختصر اوقات زیادہ کفایت شعارانہ ثابت ہوئے۔ ڈاکٹر نائر کا خیال تھا کہ کام کے طویل اوقات نہ صرف گشت لگانے اور خراب کام کی ترغیب دیتے ہیں بلکہ وقتاً فوقتاً رخصت لینے کے بھی ذمہ دار ہوتے ہیں اور وہ اسی وجہ سے کام سے اکثر غیر حاضر رہتے ہیں۔ یہ حد سے زیادہ اوقات کار کام کرنے والوں کی صحت کے لیے بڑے مضر ہیں اور وہ ان کاموں میں تھک کر وقت سے پہلے مر جاتے ہیں۔ اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں ڈاکٹر نائر نے یہ بتایا کہ کارخانوں میں کوئی معمر آدمی نظر نہیں آتا اس کے باعث ملوں میں مزدوروں کی آمدنی محدود ہو جاتی ہے کیونکہ وہی لوگ کام کر سکتے ہیں جو جسمانی طور پر ایسی سختی برداشت کرنے کی طاقت رکھتے ہیں[2]۔

کارخانہ میں طویل اوقات سے مزدور کی آمد محدود ہو جاتی تھی بعض صنعتی مراکز کے افسوسناک اور غیر صحت مندانہ حالات بھی اس کے ذمہ دار تھے کیونکہ ایسے مرکزوں میں مزدور آنے سے بھاگتے تھے۔ ہندوستان میں اس وقت یہ عام شکایت تھی کہ صنعتی اداروں میں کام کرنے والے مزدور کی قلت ہے یہاں دونوں قسم کی قلت کے فرق کو سمجھنا چاہیئے کچھ صنعتی کارخانے تو ایسے تھے جہاں مزدور کی قلت بہت پہلے سے چلی آرہی تھی۔ یہ حال ان صنعتوں یا کارخانوں کا تھا جہاں کام کرنے کے حالات یا مکانی حالات بہت ہی خراب تھے یا جہاں کام بڑا سخت تھا اس طرح فولے نے بتایا تھا کہ بنگال میں صرف کلکتہ کی سوتی ملوں میں ایک زمانہ سے یہ قلت چلی آرہی ہے (جہاں کام کے اوقات بہت زیادہ، اجرت بہت کم اور جوٹ کی صنعت سے زیادہ سخت کام کرنا پڑتا تھا) اس کے علاوہ ہوڑہ کی کچھ جوٹ ملوں میں بھی یہی حال تھا (جو بڑے گنجان علاقہ میں تھے اور جہاں کے مقامی حالات خاص طور پر خراب تھے) کوئلہ کی کان کنی کی صنعت کا بھی یہی حال تھا[3] کوئلہ کی صنعت کے بارے میں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ کان کے اوپر کام کرنے والے مزدور کی کوئی کمی نہیں تھی۔ صوبہ متحدہ کے بہت سے مراکز میں بھی ایک زمانہ سے قلت چلی آرہی تھی یہ بڑی حیرت کی بات ہے کیونکہ ان مراکز کے گرد جو ضلعے تھے خود وہاں سے ہندوستان کی ہجرت کرنے والی آبادی کا زیادہ حصہ آتا تھا۔ اور اسی علاقہ سے کلکتہ کی صنعتوں میں

---

[1] ایضاً۔ شہادت: ہندوستان کی تیسری صنعتی کانفرنس (۱۹۰۷ء) میں جو مضمون پڑھا گیا اسے بھی دیکھیئے

[2] ایضاً۔ مسٹر فری مینٹل کی شہادت

[3] بی۔ فولے: رپورٹ آن لیبر ان بنگال (۱۹۰۶ء)

زیادہ مزدور آیا کرتے تھے۔ ان میں سے زیادہ تر مرکزوں میں قلت دو عناصر سے واقع ہوئی تھی یعنی کام کرنے کے خراب حالات اور مکان کی صورت حال کے خراب ہونے سے یہ روایتی قلت صنعت کے حالات کی وجہ سے ہی قائم تھی اس کا کوئی اور سبب نہ تھا۔

لیکن مزدور کی قلت کا ایک دوسرا پہلو بھی تھا۔ یہ تھا وقتی قلت کا پہلو جن صنعتوں میں یہ وقتی قلت محسوس نہیں کی جاتی تھی وہ یہ صنعتیں تھیں (۱) وہ صنعتیں جہاں مزدور کی فراہمی کا خاص خیال رکھا جاتا تھا یا وہ صنعتیں جو مزدوروں سے ایسا کام لیتی تھیں جسے ہندوستانی مزدور پسند کرتے تھے یا (۳) موسمی صنعتیں جن کا وقت کھیتی کے زمانہ سے نہیں ٹکراتا تھا۔ پہلی قسم کی صنعتوں میں گریڈیہہ کی کوئلہ کانیں آتی ہیں۔ یہاں مزدوروں کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا تھا اور کبھی کوئی قلت نہ ہوئی۔ یہی حال کلکتہ کی جوٹ مل کا بھی تھا جو اپنے کام کرنے والوں کو بہت سہولتیں دیتی تھیں۔ ریلوے بنانے کے لیے بھی مزدوروں کی کوئی کمی نہ ہوئی۔ ہندوستان کے مزدور اسے خاص طور پر پسند کرتے تھے۔ تیسری قسم کی صنعت کی اچھی مثال جوٹ کی گانٹھ بنانے والی صنعت میں ملتی ہے اور اس میں بھی کبھی کوئی قلت نہ ہوئی۔

لیکن دوسری تمام صنعتوں میں وقتی قلت محسوس کی جا رہی تھی۔ قلت کا زمانہ ایک جگہ سے دوسری جگہ مختلف ہوتا تھا یہ خاص طور پر اس بات پر منحصر تھا کہ صنعت کس علاقہ میں ہے۔ اس سلسلہ میں سرسری طور پر رائے قائم کرنا مشکل ہے لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ صنعتی مرکز میں مزدور کی سپلائی کی قلت کٹائی کے وقت ہوتی تھی اگر اس مرکز کے گرد ایسے دیہی ضلعے ہوتے جہاں سے مزدور کی سپلائی ہوتی تھی لیکن ایسے صنعتی مراکز میں جہاں مزدور دور کے ضلعوں سے آتے تھے وہاں گرمی یا شادی کے موسم (ان دونوں کا وقت ایک ہی تھا) میں قلت ہوتی۔ کانپور میں مزدور کی شدید قلت فصل لگانے کے وقت ہوتی تھی، شولاپور میں قلت کٹائی کے وقت محسوس ہوئی اور اس طرح کوئلہ کاٹنے والوں کی کمی خاص طور دھان لگانے اور کاٹنے کے زمانہ میں ہوتی تھی جہاں عموماً سنتھال کے قبائلی کام کرتے تھے[۱] اس کے برعکس بمبئی اور کلکتہ میں وقتی قلت گرمی اور شادی کے موسم میں محسوس کی جاتی تھی۔ پہلی قسم کی قلت بڑی آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مزدوروں نے اپنا رشتہ زمین سے نہیں توڑا ہے۔ مزدور ابھی تک جزوی طور پر کاشت کار بھی ہے۔ غالباً اسے زمین کا ایک قطعہ بھی ہے یا کسی میں اس کا حصہ پہنچتا ہے اور فصل کی کٹائی میں اپنے گھر والوں کی مدد کے لیے گاؤں

---

[۱] اے۔ ای۔ ہورن، صنعتی ترقی اور مزدور کا سوال، بنگال اکونومک جرنل (اپریل ۱۹۱۸ء)

چلا جاتا ہے۔ یہ ہر ملک کی صنعتی ترقی کا واضح اور نمایاں مرحلہ ہوتا ہے۔ اس قسم کی وقتی قلت اس وقت تک دور نہیں کی جا سکتی جب تک کہ ایک بڑی صنعت کی ترقی کے ساتھ ایک خاص کارخانہ کی اپنی آبادی پیدا نہ ہو جائے۔ کلکتہ اور بمبئی کے مزدور آگے کی منزل کا پتہ دیتے ہیں۔ یہاں کے مزدور کم از کم کلکتہ میں زرعی خاندان کے ممبر ہوتے ہیں لیکن ان کا تعلق زمین سے کٹ گیا ہے کیونکہ وہ کھیتوں میں باقاعدہ کام نہیں کرتے۔ یہاں پر کلکتہ اور بمبئی کے مزدور میں فرق کر لینا چاہیے۔ کلکتہ کے مزدور عام طور سے صوبہ متحدہ سے آتے تھے اور وہ اپنے خاندان کو ساتھ نہیں لاتے تھے اس لیے وہ وقتاً فوقتاً گھر جاتے تھے بمبئی اور کلکتہ دونوں جگہ مزدوروں کا زمین سے قطع تعلق اول گھر سے دور رہنے کے باعث ہوا۔ بمبئی کے مزدوروں کا تو گویا پورے طور پر قطع تعلق ہو گیا تھا کیونکہ بمبئی کا مزدور اپنی بیوی کے ساتھ شہر آتا اور اکثر ان کے ساتھ پورا خاندان کا خاندان کارخانوں میں کام کرنے کے لیے آجاتا تھا۔ لیکن بمبئی کا مزدور بھی پورے طور پر شہری نہ تھا وہ اپنا تعلق گاؤں سے قائم رکھتا تھا۔ وقتاً فوقتاً گھر جاتا اور عموماً اپنی ضعیفی کا زمانہ اپنے گھر ہی میں گذارتا۔ بچہ کی پیدائش کے لیے بھی وہ اپنی بیوی کو گاؤں بھیجتا۔ اس کا کوئی واضح سبب نہیں معلوم ہوتا کیونکہ مزدور کا زمین سے کوئی براہ راست رشتہ نہ تھا۔ فیکٹری کمیشن کے سامنے جو شہادتیں پیش کی گئیں، ان میں سے چند اقتباسات درج ذیل ہیں: ایک گواہ نے کہا تھا "سن رسیدہ لوگ اپنے گاؤں کو چلے جاتے ہیں اور مل کے کام پر نہیں آسکتے کیونکہ ان کی جسمانی طاقت جواب دے دیتی تھی عام طور پر وہ کچھ بچت نہیں کر پاتے اس لیے اپنے گذر اوقات کے لیے زمین جوتنا پڑتا تھا۔"[1] دوسرے نے کہا "جب ۴۰ یا ۴۵ کی عمر ہو جاتی ہے تو سن رسیدہ لوگ اپنے گھر چلے جاتے ہیں اس زمانہ میں اگر انھوں نے کچھ پس انداز کر لیا ہے تو کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کر لیتے ہیں اور اگر نہیں تو وہ بمبئی ہی میں رہ جاتے ہیں۔ اور اس کے بچے اس کی دیکھ بھال کرتے ہیں"[2] سب سے معتبر شہادت خود ایک کاری گر نے دی ہے: "بمبئی کے بہت ہی کم کاری گر بمبئی میں مقیم ہوتے ہیں تقریباً ہم سبھوں کے کوکن میں مکانات ہوتے ہیں اور سال میں ایک یا دو بار چند روز کے لیے جاتے ہیں۔ جب کوئی بہت ضعیف ہو جاتا ہے اور کام کرنے سے معذور ہو جاتا ہے تو وہ بمبئی واپس نہیں ہوتا بلکہ وہ گھر پر ہی آخری دن

---

[1] فیکٹری لیبر کمیشن: مسٹر کیلسکر کی شہادت

[2] ایضاً، مسٹر نارے کی شہادت

گذارتا ہے اور اس کے خاندان والے جو بمبئی میں کام کرتے ہیں وہ اسے بمبئی سے روپیہ بھیج کر اس کی مدد کرتے ہیں"۔[1] بچت یا منی آرڈر پر بھروسہ کرنا اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ کاریگر کو زمین نہیں ہوتی وہ دیہات کھیتی کے کاموں کے لیے نہیں جاتا بلکہ وہ چھٹی منانے جاتا ہے۔ معاشی اعتبار سے اس کاریگر کا زمین سے رشتہ یقینی ٹوٹ کر رہ گیا ہے۔ اس لئے کوئی خاص وجود ضرور ہوں گی جن سے کاریگر بمبئی میں سکونت پذیر نہیں ہو پاتے اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شہر میں خراب رہائشی حالت اور غیر ہموار صورت نہ ہوتی تو کارخانہ میں کام کرنے والی ایک مستقل پذیر ہو جاتی۔

مزدور کی وقتی قلت، اس صنعتی ترقی کے دور کا ایک فطری نتیجہ تھی جس سے ہندوستان گذر رہا تھا اور ہندوستانی صنعت کے خاص حالات سے اس نتیجہ میں شدت آگئی تھی[2]

---

[1] ایضاً، بھیوا باواجی کی شہادت (خط کشیدہ الفاظ میرے ہیں)

[2] بی۔ فوے دیکھیں، ح۔ س، باب ہفتم۔ مسٹر فوے کا خیال ہے کہ "بنگال کے موجودہ حالات کارخانے کے کاریگر اور زرعی طبقہ کے حالات سے ہم آہنگ نہیں ہیں"۔ صنعت گروں نے اس صورت حال کو بڑا ہی متضاد بنا دیا تھا۔

نواں باب

ریلوے اور آبپاشی

ہندوستان میں ریلوے اور نہروں کے سسٹم میں وہ مطابقت نہیں جو دنیا کے زیادہ تر حصوں میں پائی جاتی ہے۔ تقریباً ہر جگہ وہ نقل وحمل کے گویا دو شعبوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انگلینڈ میں تجارتی انقلاب جو آخر کار وسیع ریلوے کی تعمیر سے عمل میں آیا وہ اصل میں نہروں کے انگریزی طریقہ سے ہی شروع ہوا تھا۔ یہی حال بہت سے یورپین ممالک کا بھی تھا مگر ہندوستان میں نہریں شاذونادر ہی آمدورفت کے لئے تعمیر ہوتی ہیں۔ ہندوستان کے اندر آبی راستہ صرف بڑی ندیوں ہی میں ہوتا ہے اور ان میں سال بھر کام میں آنے والے آبی راستے نسبتاً مختصر ہوتے ہیں۔ بنگال اور مدراس کی بعض نہریں ہی میں کشتیاں بڑی حد تک چلائی جاتی ہیں اور یہی ایک ممکن راستہ ہے[1] اس لیے نہر اور ریلوے کے درمیان واضح رشتہ ہندوستان میں موجود نہیں۔

لیکن وہ دوسری طرح ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ اولاً یہ کہ ہندوستان کی حکومت نے یہ جلد ہی معلوم کرلیا کہ ہندوستان میں ریلوے اور نہر کی توسیع کا کام سرمایہ داروں پر نہیں چھوڑا جا سکتا ہے اس لئے حکومت کے ایک بڑے اہم شعبہ یعنی شعبہ تعمیرات عامہ (پی۔ ڈبلو۔ ڈی) نے عوام کی فلاح کے ان دو کاموں کو اپنے ذمہ لے لیا۔ یہ لارڈ ڈلہوزی کا کام تھا۔ آب پاشی اور ریلوے ایک دوسرے طریقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ کیونکہ ان دونوں کی فوری توسیع کا جو پہلے سبب بنایا گیا تھا وہ ایک ہی تھا یعنی قحط سے حفاظتی طریقے اور ان دونوں میں اس مقصد کے لئے جداگانہ طور پر صلاحیتیں کیا

---

[1] کرشنا اور گوداوری کے ڈیلٹ کے علاوہ ہندوستان میں کشتی رانی کا کوئی ایسا سلسلہ نہیں ہے جو لوگوں کے لئے بہت مفید ہو۔ ہندوستانی آبپاشی کمیشن کی رپورٹ ۳-۱۹۰۱ء باب سیزدہم

ہیں یہ بات بڑے گہرے اختلاف کا موضوع بن گئی جو انیسویں صدی کی آخری تین دہائیوں تک قائم رہا۔

حصہ اوّل

ریلوے

ریلوے کی تعمیر کے لئے حکومت کی پہلی پالیسی ضمانتی (گارنٹیڈ) کمپنیوں کی پالیسی تھی۔ تعمیر کا کام چلتا رہا اور پرائیوٹ کمپنیوں نے سرمایہ فراہم کیا جنھیں سرمایہ پر ۵ فیصد سود کی گارنٹی دی گئی اور ۵ فیصد سے فاضل منافع کمپنی اور حکومت کے بیچ تقسیم ہونا قرار پایا۔ حکومت نے معاہدے میں لائن کو ۲۵ یا ۵۰ سال کے بعد خریدنے کا اختیار اپنے تئیں محفوظ رکھا۔ ہندوستان میں ریلوے تعمیر کا کام اس پلان کے تحت ۱۸۶۹ء تک چلتا رہا لیکن یہ بہت ہی غیر کفایت شعارانہ ثابت ہوا اور ہر سال گورنمنٹ کمپنیوں کو ایک معقول رقم ضمانت کی وجہ سے دیتی رہی۔ شروع میں یہ بات مان لی گئی تھی کہ اپنی تعمیر کے تھوڑے ہی عرصہ میں ۵ فیصد سے زیادہ ادا کرنا شروع کر دے گی لیکن یہ اندازہ غلط ثابت ہوا۔ گارنٹی کی وجہ سے ریلوے کو اپنے انتظام میں کفایت شعارانہ ہونے کی کوئی ترغیب نہیں تھی[1] پہلا پلان جب فضول ثابت ہوا تو ترک کر دیا گیا اور ۱۸۶۹ء تا ۱۸۷۹ء حکومت نے اپنے طور پر ریلوے تعمیر کا سارا تجربہ خود کرنے کی کوشش کی۔ ۱۸۷۹ء سے پھر پرائیوٹ کمپنیوں کو اپنے میدان میں کام کرنے کی اجازت مل گئی۔ ان نئی کمپنیوں کو سود کی کوئی ضمانت نہیں دی گئی لیکن زیادہ تر صورتوں میں سرکار نے مالی امداد کی اور تقریباً ہر صورت میں انھیں مفت زمین دی گئی[2] اس کے ساتھ ہی ساتھ سرکار نے ریلوے تعمیر کا کام اپنے طور پر جاری رکھا اور یہ کام کچھ دیسی ریاستوں کی حکومتوں نے بھی شروع کیا۔ اس طرح ان تمام وسیلوں سے ریلوے تعمیر کا کام اس زمانہ میں کافی تیزی سے ہوا اور یہ سلسلہ جاری رہا۔ ۱۹۱۴ء تک حکومت نے ان تمام ریلوے کو حاصل کر لیا جن کی تعمیر پرانے گارنٹی سسٹم کے تحت ہوئی تھی۔ ۱۸۷۹ سے پرائیوٹ "امداد یافتہ" کمپنیوں کے ذریعہ توسیع کا کام زیادہ نہیں ہوا تھا اور ۱۹۱۴ء میں ہندوستان میں ریلوے لائن کا بیشتر حصہ حکومت کے قبضہ میں آ گیا۔

ہندوستان میں ریلوے سسٹم ۱۴-۱۹۱۳ء میں

ریل کا مجموعی طول (میلوں میں) جہاں آمد و رفت تھی ۳۴٫۶۵۶

---

[1] تعمیرات عامہ سے متعلق سیلکٹ کمیٹی کی رپورٹ (۱۸۷۹) منیجر جنرل ڈکنیس، جوائنٹ ڈینورس اور دوسرے کی کمیٹی کے سامنے گواہی بھی دیکھیں۔

[2] انڈین ریلوے فینانس اور ایڈمنسٹریشن سے متعلق کمیٹی کی رپورٹ (۱۹۰۷)

کمپنیوں کے ذریعہ تعمیر شدہ سرکاری لائنوں کا مجموعی طول (میلوں میں) ۱۸,۶۸۰] کل ۲۵,۹۱۱ میل
ریاست کے ذریعہ تعمیر شدہ سرکاری لائنوں کا مجموعی طول (میلوں میں) ۷,۲۳۱] لائن جو سرکار کے ماتحت تھی
سرکار اور کمپنیوں کے ذریعہ تعمیر شدہ دیسی ریاست کے لائنوں کا مجموعی طول (میلوں میں) ۴,۳۹۶
بقیہ پر چھوٹی پرائیوٹ کمپنیوں کا قبضہ تھا۔

ریلوے کی توسیع کے پہلے منصوبہ کا مسودہ لارڈ ڈلہوزی نے بنایا تھا جس نے سب سے پہلے خاص ٹرنک لائنوں کا نقشہ بنایا تھا۔ ان ٹرنک لائنوں کی تعمیر کا کام زیادہ تر لارڈ ڈلہوزی کے بنائے نقشہ کے مطابق ہوا۔ جس سسٹم کے تحت ہندوستان میں ریلوے تعمیر کا کام شروع ہوا اس نے لگے ہوئے سرمایہ کی فوری آمدنی کا کوئی جائزہ نہیں لیا تھا۔ اس لئے ریلوے کی تعمیر و ترقی عجیب و غریب طور پر ہوئی۔ آس پاس کے تجارتی مراکز کو ملانے پر کوئی توجہ نہیں دی گئی اور نہ معاون لائنوں کے باقاعدہ سسٹم کے ذریعہ ہر اس ضلع کی تجارت پر پورا دھیان دیا گیا جس سے ریلوے لائن گذرتی تھی اس کے بجائے ملک کے طول و عرض میں پھیلنے والے اہم ٹرنک لائنوں کی تعمیر کا منصوبہ عمل میں لایا گیا اور یہ خیال بھی رکھا گیا کہ ملک کے اندر کے بڑے بڑے شہروں کو کلکتہ، بمبئی اور مدراس جیسے بندرگاہوں سے ملا دیا جائے۔ ۱۸۷۵ء تک زیادہ تر بڑے مراکز ملا دیے گئے ان ٹرنک لائنوں کی تعمیر کا کام زیادہ تر ضامن کمپنیوں کے ذریعہ ہوا۔ بندرگاہوں سے ایسے راستے بنائے گئے تاکہ ملک کے اندرونی حصہ کے زرعی علاقوں سے ربط قائم ہو جائے اور زرعی پیداوار کی برآمد بھی آسانی سے ہو سکے۔ ۱۸۷۰ء کے پہلے بمبئی سے احمد آباد اور گجرات کا کپاس کا علاقہ، ناگپور سے خاندیش اور برار کا کپاس کا علاقہ اور شولاپور سے قرب و جوار کے کارناٹک کا کپاس والا علاقہ ریلوے کے ذریعہ ملا دیا گیا۔ کلکتہ سے جو سلسلے شروع ہوئے وہ صوبہ متحدہ کے زرخیز نگر گنجان علاقہ اور رانی گنج کے پاس کوئلہ کی کانوں سے ہوتے ہوئے مرزاپور اور الہ آباد کے ذریعہ شمال کے بڑے شہر کانپور اور دہلی تک چلا گیا۔ بمبئی اور کلکتہ جبل پور سے ۱۸۷۱ء میں ملا دیے گئے۔ بمبئی اور مدراس ۱۸۷۱ء میں مل گئے۔ کلکتہ دہلی سے ۱۸۶۷ء میں مل گیا لیکن ایک لمبے عرصہ تک بمبئی شمالی ہندوستان کے شہروں سے براہ راست نہ ملایا جا سکا۔ اس سے کلکتہ کی پوزیشن شمالی مغربی صوبہ کی پیداوار کی برآمدی تجارت کے لئے استوار ہو گئی۔ اہم راستوں میں سے ایک اہم راستہ کراچی اور پنجاب کے درمیان کا تھا جو ایک عرصہ تک ریلوے سے محروم رہا۔ اور اسی وجہ سے کراچی بندرگاہ کی حیثیت سے بہت دنوں تک اہمیت حاصل نہ کر سکا۔ غلہ کا سب سے مشہور علاقہ چھتیس گڈھ

بھی شروع میں ریلوے سے منقطع رہا۔ آٹھویں دہائی کے سالوں تک ریلوے لائن نہیں گئی۔ اور اس وقت تک مناسب مواصلات کی کمی سے قیمت اور قلت کی نوعیت پر غیر معمولی اثرات پڑ رہے تھے راۓ چوڑتک ریلوے کی توسیع نہ ہونے سے کرناٹک کے کپاس کے علاقے تک رسائی نہ ہو سکی اور آٹھویں دہائی کے اواخر تک بلگام، دھاروار اور ہبلی کے مشہور مرکز ریلوے سے الگ تھے۔ لیکن مجموعی اعتبار سے ریل کا سلسلہ ہندوستان میں تیزی سے ہوا اور اہم ترین مراکز جلد ہی مربوط ہو گئے۔

ہندوستان میں ریل کی توسیع کا خاص مقصد یہ تھا کہ قحط سے محفوظ کیا جائے اور اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ ریل نے قحط کے اثرات کم کرنے میں بڑی مدد دی۔ قحط کے کمشنروں (۱۸۸۰ء) نے اموات کے اعداد و شمار کا مقابلہ کرنے کے بعد یہ بتایا تھا کہ قحط سے موت سب سے زیادہ انہی علاقوں میں ہوتی ہے جہاں آمد و رفت کی آسانیاں بدترین حد تک ہیں۔ ۱۸۸۰ء تک ریلوے تعمیر نے قحط کی زد میں آنے والے علاقوں کو بڑی حد تک محفوظ کر دیا تھا۔ پھر بھی قحط سے بچاؤ ہی ریل کی توسیع کا واحد سبب نہیں تھا۔ ریلوے تعمیر سے متعلق ایک ابتدائی کمیٹی نے حسب ذیل اسباب بتائے تھے کہ ہندوستان میں ریلوے تعمیر کیوں تیزی سے ہو۔ (۱) قحط کا انسداد (۲) داخلی اور بیرونی تجارت کا فروغ۔ (۳) ان علاقوں میں جہاں ریلوے لائن جاتی ہے وہاں زیادہ اجرت بخش فصلوں کی پیداوار (۴) کوئلہ کی نئی کانوں کا کھلنا (۵) عوام کی معاشی حالت میں بہتری[1] ہندوستان میں ریلوے تعمیر سے متعلق تمام کمیٹیوں کی طرح یہ کمیٹی بھی اس نتیجہ پر پہنچی کہ ریلوے تعمیر کا کام تیزی سے جاری کرنے کی بڑی ضرورت ہے۔ اس پالیسی پر عمل درآمد ہونے میں ایک بڑی دشواری یہ تھی کہ آٹھویں دہائی کے درمیان اور اس کے بعد گورنمنٹ کی مالی حالت بڑی خراب تھی جس کے باعث ریل کی توسیع کے لئے پورا کا پورا قرض لیا گیا جس پر عمل کرنا ایک خطرناک پالیسی تھی۔ پبلک ورکس کمیٹی (۱۸۷۹ء) نے صرف ریل کے مقاصد کے لئے قرض لینے کی پالیسی کی سفارش کی تھی چونکہ توقع کی جا رہی تھی کہ تھوڑے ہی عرصہ میں ریل سے آمدنی شروع ہو جائے گی لیکن کمیٹی کی رپورٹ کے بعد چند ہی برسوں میں یہ پالیسی الٹ گئی اور حکومت نے اس کام کے لئے قحط بیمہ گرانٹ کا روپیہ بھی استعمال کرنا شروع کر دیا۔ حکومت کی یہ پالیسی کہ ہر قیمت پر ریلوے کی تعمیر کی جائے یہ پالیسی بہت سے گوشوں میں ہدفِ ملامت بنی اور مسٹر گوکھلے نے ایک عام جذبہ کا اظہار کیا جب انھوں نے یہ کہا تھا: "میرا یہ مطلب نہیں کہ ریلوے کی ملامت کی

---

[1] ہندوستان میں ریلوے سے متعلق کمیٹی کی رپورٹ (۱۸۸۴ء)

جائے بلکہ جس طریقہ سے حکومت زیادہ سے زیادہ ریلوے میں دلچسپی لے رہی ہے اور اس سے زیادہ اہم چیزوں کو نظر انداز کر رہی ہے وہ قابل اعتراض ہے"[1] تمام مالی دشواریوں کے باوجود اس تمام عرصہ میں ریلوے تعمیر کا کام مستقل طور پر ہوتا رہا۔

دو عناصر نے خاص طور پر ہندوستان میں ریلوے کی پالیسی کو اثر انداز کیا اول وہ لائین آتی ہیں جن کے مطابق ریلوے کی تعمیر کا نقشہ مرتب کیا گیا اور دوم انتظام کا مسئلہ تھا۔ پہلے نے ٹرنک لائنوں کی فوری تعمیر سے درآمدی مراکز بالخصوص اندرونی بازار اور بڑے بندرگاہوں کے درمیان تجارت کو فروغ دیا۔ اس زمانہ میں ریلوے تعمیر اندرونی تجارت کی ترقی سے زیادہ ملک کی بیرونی تجارت کے فروغ پر نظر رکھتی تھی چونکہ اس زمانہ میں بڑی صنعتیں ہندوستان میں نہیں تھیں اس لئے اس پالیسی کا ہونا فطری تھا لیکن اس نے مال کے کرایہ پر اپنا دائمی نقش چھوڑا جو بعد میں ہندوستان کی صنعتوں کے لئے بڑی حد تک ایک رکاوٹ بن گئی درحقیقت یہ پالیسی ۱۹۱۴ء تک بالکل نہیں بدلی۔ اس تاریخی فیصلہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ (صنعتی کمشنروں کے الفاظ میں) "عموماً بندرگاہوں کو جانے والی خام اشیا کے لئے موافق شرح طے ہوگئی"[2] اس کے علاوہ ملک کے اندرونی حصوں میں جو صنعتی مراکز تھے ان پر شرح خاص طور پر زیادہ تھی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صنعتیں بندرگاہوں میں مرکوز ہوگئیں۔ کوئلہ کی کانوں پر کرایہ کا خاص طور پر اثر پڑا[3] دوسرا واضح اثر یہ پڑا کہ اس مختلف شرح سے بندرگاہوں کی صنعتوں کو تقویت ملی اس کے علاوہ اندرونی حصوں کی صنعتوں کے مقابلہ میں بیرونی صنعتوں کو فروغ حاصل ہوا۔

انتظام کا سوال عجیب و غریب تھا خصوصاً اس صدی کے آغاز نے گرچہ ریلوے پر حکومت کا قبضہ تھا پھر بھی ان میں سے زیادہ تر کا انتظام حکومت کی طرف سے مختلف کمپنیاں کرتی تھیں۔ اس لئے ایک مشترکہ ریلوے پالیسی کے فائدے جن کی عام طور پر ایک واحد ملکیت سے توقع کی جاتی ہے وہ ہندوستان میں حاصل نہیں ہو رہے تھے۔ آمدورفت کے لئے مختلف ریلوے کمپنیوں میں ایک بے معنی مقابلہ ہوگیا جو ملک کے عام مفاد کے حق میں یقیناً مضر تھا اس کے علاوہ کمپنیوں کو پوری آزادی نہ تھی۔ سرکاری انجنیروں کو دیکھ بھال کے بڑے اختیارات حاصل تھے جو ریل کے کاموں

---

[1] ویلبی کمیشن کے سامنے شہادت ۱۹۰۰-۱۸۹۶ء

[2] ہندوستانی صنعتی کمیشن کی رپورٹ ۱۸-۱۹۱۶، باب نوزدہم

[3] ٹی۔ روبرٹسن (اسپشل کمشنر) ہندوستانی ریلوے کے انتظام اور اس کی کارگذاری سے متعلق رپورٹ (۱۹۰۳ء)

میں رُکاوٹ ڈالتے تھے اس کا اس قدر مضر نتیجہ نکلا کہ مسٹر رابرٹ سن نے واضح لفظوں میں رائے دی کہ ریلوے کا انتظام مکمل طور پر ریاست کے ہاتھ میں ہونا چاہیے یا پورے طور پر کمپنی کے ہاتھوں میں[1]۔ بیرون تجارت کے لیے مسابقت اور دوہرے انتظام کی پالیسی کی وجہ سے ایک بہت اہم کام ریلوے انجام نہ دے سکی۔ اس نے مقامی صنعتوں کو ترقی دینے کے سوال کو تقریباً بالکل ہی نظر انداز کر دیا[2]۔

ریلوے کے ساز و سامان مثلاً ڈبّے اور انجن وغیرہ کی تعداد بیسویں صدی کے اوائل تک تو تجارتی مقاصد کے لیے تشفی بخش تھی لیکن اس کے بعد بیرونی اور اندرونی تجارت کے فروغ کے ساتھ ساتھ مال لانے لے جانے کا کام بہت مشکل ہو گیا۔ بعض اوقات ریل ڈبّوں اور انجنوں کی کمی کا بہت ہی بُرا نتیجہ نکلتا تھا۔ مثال کے طور پر ۱۹۰۰-۱۸۹۹ کے قحط کے دوران صوبہ جات متوسط سے گجرات کے لیے اناج لے جانے کا کام ریلوے کو سونپا گیا لیکن ریلوے سارا اناج وقت پر گجرات لے جانے میں ناکام ثابت ہوئی۔ ۱۹۰۰ کے بعد تو یہ دشواری بہت ہی بڑھ گئی تھی۔ مال کی آمد و رفت خاص طور پر اناج، کوئلہ اور خام مینگنیز کی آمد و رفت میں اضافہ کی وجہ سے بھی مشکلات بڑھیں۔ چنانچہ انجن اور ڈبّوں کی تعداد میں اضافے کے ساتھ ساتھ کراسنگ، اسٹیشن، سائیڈنگ وغیرہ میں اضافہ کی ضرورت پر بھی زور دیا جانے لگا[3]۔ تاہم بعض اوقات اس صورت حال کے اسباب ریلوے کے قابو سے باہر ہوتے تھے۔ بعض جگہوں پر آمد و رفت اس قدر یک طرفہ اور ایک مختصر وقفے میں مرکوز تھی کہ زبردست بھیڑ ہو جاتی تھی اور پنجاب سے کراچی کے راستہ جو گیہوں بھیجا جاتا تھا یا برما سے سمندری راہ سے جو چاول آتا تھا وہ بھی بڑی مشکل سے پہنچ پاتا تھا[4]۔

ریلوے کی توسیع کے نتیجے میں قیمتوں کی ایک یکساں سطح قایم ہو گئی، خاص طور پر سارے مُلک میں اناج یکساں قیمت پر فروخت ہونے لگا۔ خام زرعی پیداوار کی برآمد میں بڑے پیمانے پر اضافہ ہوا، برآمد کی غرض سے اُگائی جانے والی فصلوں کی کاشت کو بڑھاوا ملا۔ نیز اندرونی تجارت میں بھی توسیع ہوئی۔ ہندوستانی صنعتوں خاص طور پر کوئلہ اور کپاس کی صنعتوں کے فروغ میں بھی ریلوے کی توسیع سے مدد ملی۔

---

[1] ایضاً باب I۔

[2] ایضاً باب II۔

[3] رپورٹ آف دی کمیٹی آن ریلوے فائننس اینڈ ایڈمنسٹریشن (۱۹۰۷)۔

[4] ایف۔ نوئل پیٹن، بر مارائس (۱۹۱۲)۔ اس کی کتاب انڈین وہیٹ اینڈ گرین ایلیویٹر بھی ملاحظہ ہو۔

مثلاً کوئلہ کی صنعت کا سارا مسئلہ یہ تھا کہ کس طرح کوئلہ کے گڑھے سے کوئلہ استعمال کرنے والے مقام تک پہنچایا جائے۔ صنعتی ارتقار کے معاملہ میں کچھ ایسے اسباب تھے جن کی تفصیل اوپر آگئی ہے کہ ریلوے صنعتوں کو اس حد تک ہندوستان میں فروغ نہ دے سکی جس حد تک وہ بالعموم دے سکتی تھی۔

ہندوستان میں ریلوے کی توسیع کے ساتھ ساتھ کنکر سے کٹی ہوئی پکی سڑکوں کی بھی توسیع ہوئی۔ ٹرنک لائن کی پالیسی کے لئے یہ لازم ہوگیا کہ اچھی سڑکیں بھی بنائی جائیں تاکہ ریلوے سے کوئی مفید کام لیا جاسکے۔ سڑکیں اتنی ہی تیزی سے بنائی گئیں جتنی تیزی سے ریلوے لائین نہیں اور ریلوے کی تعمیر سے زیادہ سڑکوں کے پھیلنے سے ہندوستان کی دیہی زندگی متاثر ہوئی۔ سڑکوں کی وجہ سے دیہی معیشت میں ہفتہ وار بازار کی اہمیت بڑھ گئی اور مقامی میلوں کا بھی اثر بڑھ گیا اسکے ساتھ ہی ساتھ ریلوے کی توسیع سے غیر ملکی اشیاء پورے ہندوستان میں انہی بازاروں اور میلوں کی مدد سے پہنچنے لگیں۔ سڑکوں کی توسیع نے گاؤں کی خود کفیل نوعیت کو توڑ دیا اور گاؤں کی کاشت کی نوعیت پر اس کا بھی اثر پڑا۔ کم از کم آس پاس کے گاؤں کو مقامی رنگ دینے کا عمل کسی حد تک ممکن ہوگیا اس طرح مواصلات کی اس توسیع کا گاؤں کی برادری کے متحدہ کردار کو توڑنے میں بڑا ہاتھ رہا ہے۔

حصّہ دوم - آبپاشی

اگر قحط کا مقابلہ کرنے کے لئے ریلوے کی تعمیر ایک نیا حربہ تھی تو آبپاشی بھی ایک بہت ہی پرانا طریقہ تھا۔ جنوب کے عظیم الشان اینی کٹ (ندی کا بند جو آبپاشی کے لئے بنایا جاتا ہے) جن میں بعض بڑے قدیم ہیں، اس بات کی شہادت دے رہے ہیں اسی طرح گنگا اور جمنا ندیوں سے مغل بادشاہوں کی نکالی ہوئی نہریں شاہد ہیں۔ سندھ کی سیلابی نہریں اور تالاب، کنواں، باندھ اور آہر جو ملک کے تمام حصوں میں پائے جاتے تھے اس بات کا اظہار آرہے ہیں کہ ہندوستان کے لوگ اپنی فصلوں کے لئے پانی کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ انگریزوں کے زمانہ حکومت میں سینچائی کی ترقی انہی راہوں پر ہوئی جو ہندوستان کے قدیم بادشاہوں اور ہندوستانی کاشتکاروں کی بتائی ہوئی تھیں۔ جدید انجنیئرنگ کے طریقوں کے استعمال سے یہ ممکن ہوسکا کہ پہلے سے زیادہ بڑے پیمانہ پر اس کا ارتقا ہو۔

ایسٹ انڈیا کمپنی جب ہندوستان میں اچھی طرح قائم ہوگئی تو اس نے بھی اس مسئلہ کی طرف کچھ توجہ دی۔ پہلا کام جو شروع ہوا وہ پرانے کاموں کو زندہ کرنے کا تھا جو عدم توجہی کا شکار تھے یعنی پوربی جمنا اور پچھمی جمنا کی نہریں اور کاویری اور کولیروں کے آبپاشی کے بند (ANICUT) آبپاشی کے چند نئے سلسلے بھی تعمیر ہوئے، گنگا کی نہر بنائی گئی اسی زمانہ میں سر آرتھر کاٹن کی سرکردگی

یں گوداوری کے آبپاشی کے بند مکمل ہوئے۔ جب کمپنی کا راج ختم ہوگیا تو پھر ان علاقوں میں سینچائی کو ترقی دینے کا کام اور تیزی سے ہوا۔ خود حکومت نے ان سارے کاموں کو انجام دیا۔ پرائیوٹ کمپنیوں کا طریقہ استعمال کیا گیا لیکن یہ بری طرح ناکام رہا[1]۔ ۱۸۶۰ اور ۱۸۸۰ء کے درمیان سب سے اہم کام جو شروع ہوئے وہ یہ تھے، لور گنگا نہر، آگرہ نہر، پنجاب کی سرہند نہر اور بمبئی دکن میں کھڑک واسلا باندھ جو انگریزوں کے ذریعہ پہلا بڑا تعمیری کام ہوا۔ پھر بھی ۱۸۸۰ء تک ترقی کی رفتار تیز نہ تھی چند ایسے پروجکٹوں میں کافی روپیہ جھونک دیا گیا جو اچھی طرح سوچے بھی نہ گئے تھے اور آبپاشی کے کاموں سے متعلق کوئی متعین پالیسی مرتب نہ ہوئی تھی۔ قحط کے زمانہ میں آبپاشی کی اہمیت ہمیشہ تسلیم کی گئی ہے اور آب پاشی کی سہولتوں کی توسیع کے لئے قحط کمیشن نے ہمیشہ پرزور سفارش کی تھی۔ ۱۸۸۰ء کے قحط کمیشن نے تعمیرات کے ایک متعین پروگرام کی سفارش کی تھی اور ۱۸۹۵ء تک ان میں سے زیادہ تر مکمل ہوگئے تھے۔ ان میں پنجاب کی وہ نہریں شامل ہیں جو ستلج اور چناب سے نکالی گئیں۔ صوبہ متحدہ میں لور گنگا اور بیٹوا کی نہریں تعمیر ہوئیں۔ کٹک اور ہگلی کے درمیان کشتی راں نہروں کا سلسلہ مکمل ہوا۔ قحط ریلیف اور بیمہ فنڈ ۸-۱۸۷۷ء کے قحط کا براہ راست نتیجہ تھا۔ اور اس فنڈ سے ریل اور نہر کے بہت سی حفاظتی تعمیرات کو روپیہ دیا گیا۔ حفاظتی تعمیر کا کام ۱۸۸۱ء سے شروع ہوا اسی سال بندیل کھنڈ میں بیٹوا کے نہر پروجیکٹ کو منظوری دی گئی۔ اس کے علاوہ ۱۹۰۰ء تک چند دوسری حفاظتی تعمیرات ہندوستان کے دوسرے حصے، بالخصوص بمبئی دکن میں مکمل ہوئیں۔ ان ابتدائی تعمیرات میں سب سے اہم "نیرا نہر سسٹم" تھا۔ ۱۸۹۶ء کے کمیشن نے بھی ایک مخصوص پروگرام بنایا لیکن جن خطوط پر بعد میں کام چلا انہیں آبپاشی کے کمیشن (۳-۱۹۰۱) نے مرتب کیا تھا۔ اس کمیشن نے بھی ایک مخصوص پروگرام بنایا لیکن جن خطوط پر بعد میں کام چلا انہیں آب پاشی کے کمیشن سے متعلق مفصل سفارشات پیش کیں۔ قحط سے بچاؤ کی خاطر آبپاشی کی توسیع کتنی ضروری ہے اس کی طرف بھی کمیشن نے بھی توجہ دلائی۔ نئی تعمیرات میں سے زیادہ تر جو ۱۹۰۳ء سے شروع ہوئیں وہ اسی کمیشن کی سفارشات کا نتیجہ تھیں۔ ۱۹۱۴ء تک گرچہ بہت سے پروجیکٹ ہاتھ میں تھے پھر بھی بہت سے پروجیکٹ مکمل نہیں ہوئے تھے۔ ان میں سے خاص یہ تھے۔ سندھ وغیرہ کے چند تعمیری کام اور حفاظتی کام جیسے بہار میں تربیتی نہر، بندیل کھنڈ میں کین نہر اور چند دوسرے پروجیکٹ[2]۔

---

[1] م۔ ب اڑیسہ کمپنی کی یہ بدنام مثال ہے

[2] ہندوستان میں آب پاشی کا جائزہ۔ باب نہم (۲۱-۱۹۱۸ء)

ہندوستان میں آب پاشی کے ارتقا کا ایک خاص دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ پنجاب میں نہری نوآبادیاں قائم ہوئیں۔ آبپاشی کے دیگر تمام پروجیکٹوں کا ایک مقصد یہ رہا تھا کہ موجودہ کاشت کو بہتر یا اسے زیادہ پائیدار بنایا جائے ۔ پنجاب نہر کولونی پروجیکٹ نے بنجر زمین کے ایک بڑے علاقہ کو زیر کاشت کیا جہاں آبادی نہ تھی۔ پہلا بڑا کام لورچناب نہر کا تھا جو ۱۸۹۲ء میں کھل گئی۔ اس اسکیم کے تحت اس علاقہ میں کاشت ہونے لگی اس لئے یہ نوآبادی کا سسٹم بڑا ہی کامیاب ثابت ہوا بعد میں گورنمنٹ کو اس قسم کے پروجیکٹ چلانے میں بڑی تقویت ملی۔ ان نہری نوآبادیوں میں روپیہ لگانے کا گورنمنٹ کا اقدام سب سے زیادہ نفع بخش ثابت ہوا۔ اور پنجاب کے زرعی علاقے میں کئی ہزار مربع میل شامل ہو جانے سے مشرقی پنجاب کے گنجان ضلعوں میں آبادی کا دباؤ بہت کم ہو گیا انہی ضلعوں سے لوگ ان علاقوں میں آباد کئے گئے تھے۔

۱۸۸۰ء کے کمیشن نے اندازہ لگایا تھا کہ برٹش انڈیا کا مجموعی طور پر دو کروڑ نوے لاکھ ایکڑ علاقہ زیر آبپاشی ہے ۱۹۰۳ء میں سینچائی کمیشن نے پورے ہندوستان کے اوسط سینچائی کے علاقہ کو تقریباً چار کروڑ چالیس لاکھ ایکڑ بتایا تھا۔ اور یہ اندازہ لگایا تھا کہ انیسویں صدی کی آخری چوتھائی میں سرکاری طریقہ سے سینچائی کا علاقہ تقریباً ۸۰ لاکھ ایکڑ اور پرائیوٹ طریقہ سے کم از کم ۳۰ لاکھ ایکڑ زیادہ تھا۔ ۱۴-۱۹۱۳ء میں سینچائی کا کل علاقہ تقریباً ۴ کروڑ اڑسٹھ لاکھ ایکڑ تھا۔

ہندوستان میں سینچائی کے کام کے دو حصے ہو گئے تھے۔ سبھی کام 'بڑے' یا چھوٹے ہوتے ہیں۔ بڑے کاموں کے لئے سرمایہ اور لگان خرچ کا مفصل حساب الگ الگ رکھا جاتا ہے۔ چھوٹے کاموں کا بالعموم ایسا حساب نہیں رکھا جاتا تھا۔ بڑے کاموں کو پھر دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا تھا ایک منافع بخش اور دوسرا حفاظتی۔ منافع بخش کاموں کے تحت ایسی نہریں آتی تھیں جن سے کاشت کے علاقہ یا فصل کی قیمت میں اتنا اضافہ ہو جاتا تھا کہ پانی کی قیمت ادا کرنے سے تعمیر خرچ پر سود کی اچھی شرح وصول ہو۔ حفاظتی کام کے تحت وہ نہریں آتی تھیں جن سے کچھ زیادہ حاصل نہیں ہوتا تھا یہاں تک کہ چالو رکھنے کا خرچ بھی نہیں نکلتا تھا۔ لیکن قحط سے بچنے کے لئے ایسی نہروں کی تعمیر اشد ضروری تھی۔ منافع بخش کام زیادہ تر گنگا اور سندھ کے میدان میں تھے۔ اس کے علاوہ سندھ کی سیلابی نہریں آتی تھیں۔ مدراس پریسیڈنسی کی بڑی ندیوں کے ڈیلٹا میں بھی ایسے ہی سلسلے تھے جب کہ حفاظتی سلسلے خاص طور پر ایسے علاقے جیسے بمبئی اور مدراس دکن، بندیل کھنڈ وغیرہ میں کام میں لائے گئے تھے۔

صرف یہ نہ تھا کہ آبپاشی کا کام ہر جگہ نفع بخش نہ تھا لیکن حفاظتی سلسلہ کی توسیع کے لئے بھی واضح

پابندیاں تھیں۔ اس سلسلہ میں سینچائی کمشنوں کا خیال تھا "ہمیں یقین ہے کہ ہندوستان میں بہت سے ایسے حصّے ہیں جہاں ہر ممکن آبپاشی کے زیادہ سے زیادہ استعمال کے باوجود ہم خشک سالی کے خلاف مکمل حفاظت نہیں کر سکیں گے"۔ [1] ہندوستان میں جو آبپاشی کی ترقی ہوئی ہے اس سے ملک کے صرف خاص حصّوں کو فائدہ پہنچا ہے۔ آب پاشی کے کمشنوں نے ہندوستان کو مٹی کے اعتبار سے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے (۱) کیوال مٹی (۲) شفاف مٹی (۳) دکنی مٹی۔ کیوال مٹی کا بیشتر علاقہ سندھ گنگا کا میدان ہے، دکن میں دکنی مٹی اور بقیہ حصّہ (خاص طور پر مدراس پریسیڈنسی، میسور، اڑیسہ اور چھوٹا ناگپور) میں شفاف مٹی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے یہ بتایا تھا کہ کیوال مٹی کے علاقہ کا ۲۵ فیصد اور شفاف مٹی کے علاقوں کا ۵ء۱۵ فیصد سیراب ہوتا ہے مگر دکنی مٹی کے علاقہ کا صرف ۳ء۲ فیصد حصّہ آبپاشی کی مدد سے محفوظ ہے۔ پہلے دو علاقوں ہی میں بڑی ندیاں بہتی ہیں مگر مسطح زمین ہونے کی وجہ سے کیوال مٹی کے علاقہ میں نہر کی تعمیر بہت ہی آسان تھی۔ شفاف مٹی والے علاقہ میں تالاب کے ذریعہ ذخیرہ اندوزی سینچائی کے کاموں کے لئے سب سے زیادہ مناسب تھی۔ لیکن تیسرے علاقہ میں بڑی ندیوں کے نہ ہونے اور زمین کی نوعیت کی وجہ سے نہروں کی تعمیر پر بڑی لاگت آتی تھی۔ اس طرح سرکار کے ذریعہ سینچائی کے بڑے سلسلوں کا پھیلاؤ محدود تھا اور ایسے کاموں کی افادیت یکساں طور پر ملک کے تمام حصوں میں بہم نہیں پہنچائی جا سکتی تھی۔

حکومت کے ذریعہ تعمیر شدہ سلسلے ہر میدان میں حاوی نہ تھے ۱۹۰۲ء میں آبپاشی کے کل رقبہ کا ۲ء۴۲ فیصد سرکاری سلسلوں کے ذریعہ سیراب ہوتا تھا اور بقیہ پرائیوٹ سلسلوں سے۔ پرائیوٹ سلسلوں میں تالاب کنواں اور آہر سب سے زیادہ نمایاں ذرائع تھے۔ ان پرائیوٹ طریقوں سے سیراب ہونے والے علاقہ میں کتنا اضافہ ہوا اس کے کوئی معتبر اعداد و شمار نہیں ہیں لیکن آبپاشی کے کمشنوں نے اسے کافی بتایا تھا۔ یہاں یہ بھی دیکھنا ہے کہ پہلے دو علاقوں کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچا تھا۔ دکنی مٹی کے علاقہ میں صرف کنواں کے ذریعہ سینچائی ممکن تھی اس علاقہ میں چونکہ پانی کافی گہرائی پر ملتا تھا اور زمین کی ایک خاص نوعیت تھی اس لئے کنواں کھودنے پر بڑا خرچ آتا تھا لیکن ایک بار جب کنواں بن گیا تو دوسرے حصوں کی بہ نسبت یہ بہت ہی دیرپا ہوتا تھا۔ آہر کے ذریعہ بارش کا پانی کھیتوں میں محفوظ رکھا جاتا تھا اس کے علاوہ زمین کا کٹاؤ بھی روکا جاتا تھا۔ [2] لوگ ان تمام وسیلوں

---

[1] سینچائی کمیشن کی رپورٹ، باب دوم

[2] کبھی کبھی یہ بڑے اہم ہوتے تھے مثلاً بمبئی پریسیڈنسی کے خاندیش اور ناسک ضلعوں میں بندھ ہار کا سسٹم

کا استعمال اچھی طرح سمجھتے تھے اور کسان اپنی لیاقت اور حالات کے بموجب ان سے کام لیتا تھا۔ سینچائی کے کمشنروں نے پرزور حمایت کی تھی کہ تقاوی، گرانٹ آسانی سے دے کر آبپاشی کے پرائیوٹ وسیلوں کو بڑھانے کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیئے۔

آب پاشی ہمیشہ صرف خالص برکت نہ تھی۔ پانی کے نکاس کا اچھا انتظام نہ ہوتا تو ایک جگہ پانی جمع ہو جاتا تھا اور ملیریا کی وبا پھیلتی تھی۔ پہلے جب نہریں بنائی گئیں تو اس برائی کا احساس نہ ہوا اس لئے نہر بننے کے وقت زمین کے گرد پانی کے نکاس کی طرف خاطرخواہ توجہ نہیں دی گئی۔ صوبہ متحدہ اور پنجاب میں پانی لگ جانے کے ساتھ ساتھ ریہہ نام کی نمکین سطح ابھر جاتی تھی جس سے زمین غیر زرخیز ہو جاتی تھی۔ اس برائی سے بچنے کے لئے صرف پانی کے نکاس کا اچھا انتظام ضروری تھا اور اس کے علاوہ نہر کی تعمیر کے دوران اور اس سے پہلے ہوشمندی کی ضرورت تھی۔

آبپاشی کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ اس سے موسموں کی شدت کے خطرات بڑی حد تک کم ہو گئے۔ جب ہندوستان میں قحط کے عظیم الشان اثرات کا جائزہ لیا جائے گا تو فوراً اس کی اہمیت کا اندازہ ہوگا۔ آبپاشی سے براہ راست صرف خوشحالی نہیں آئی بلکہ اس نے قحط یا قحط کے خوف کے تقریباً تمام خراب اثرات کو روک دیا۔ اس کا سب سے مفید اثر یہ پڑا کہ اس نے زرعی ترقی میں مدد پہنچائی۔ غیر یقینی بارش کا خوف جاتا رہا اس لئے کاشتکاروں کو اپنی زمین میں اپنا سرمایہ لگانے کی جرأت ہوئی۔ سیراب اور غیر سیراب علاقوں میں کاشت کے طریقوں میں بڑا واضح فرق تھا۔ ایسے فرق کی ایک سب سے اچھی مثال وہ تھی جو نیرا اور موتھا نہروں کے ذریعہ سیراب علاقہ اور بمبئی دکن کے دوسرے حصوں کے درمیان کاشت کاری کے معیار میں پائی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ کاشت کار کے لئے یہ ضروری ہو گیا کہ وہ زیادہ منافع بخش فصل جیسے گنا پیدا کرے اور گہری کھیتی کرے تاکہ وہ اپنے سیراب کھیت کا پانی ٹیکس اور فاضل ٹیکس وغیرہ ادا کر سکے۔ اس لئے ان دو اسباب یعنی نسبتاً مستقل منافع اور زیادہ ٹیکس اور دوسرے ٹیکس سے زیادہ منافع بخش اور خاص فصلوں کی کاشت ہونے لگی اس کے علاوہ گہری کاشت ہونے لگی۔ کسان عام غذائی اجناس کی کاشت گھریلو استعمال کے لئے نہیں کرتے جس طرح وہ پہلے کرتے تھے وہ ہندوستانی یا غیر ملکی مارکٹ کے لئے بڑی قیمتی فصل پیدا کرنے لگے۔ خواہ کوئی فصل ہو، پنجاب کا گیہوں ہو یا دکن کا گنا اثر یکساں ہوا۔ اس طرح زراعت کو تجارتی بنانے کی تحریک کو مدد ملی اور گھریلو استعمال کے لئے پیدا کرنے کے مقابلہ میں مارکٹ کے لئے پیدا کرنے کا رجحان اس سے واضح طور پر بڑھ گیا۔

دسواں باب

شہروں کی ترقی[1]

ڈاکٹر کلے فام کا کہنا ہے کہ "موجودہ حالات میں قومی زندگی کے صنعتی ہونے کی بہترین آزمائش اس امر سے ہوتی ہے کہ اس کے شہر کس رفتار سے بڑھ رہے ہیں[2]" اس لئے اگر ہم ہندوستان کی شہری آبادی کی ترقی کی رفتار و نوعیت کا حال دریافت کریں تو ہندوستان کی حالیہ صنعتی ترقی پر کچھ روشنی پڑے گی۔

ہمارے پاس اسے ثابت کرنے کے لئے گرچہ اعداد و شمار نہیں پھر بھی یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ ہندوستان کا شہری ارتقا صنعتی ترقی کی نوعیت کے پیش نظر بہت آگے تھا۔ مثال کے طور پر ہم یہ جانتے ہیں کہ کلایو کی رائے کے مطابق مرشد آباد کا شہر اس کے زمانہ میں لندن سے زیادہ گھنا آباد تھا اور اس زمانہ میں شمالی ہندوستان میں بہت سے بڑے اور گنجان آبادی والے شہر تھے پھر یہ فرض کرنے کی گنجائش نہیں کہ ہندوستان کی شہری آبادی کس طرح ۱۸۰۰ اور ۱۸۷۲ء کے درمیان بڑھ رہی تھی۔ اس زمانہ میں جن شہروں نے ترقی پائی، وہ صرف کلکتہ، بمبئی اور مدراس کے بندرگاہ تھے ان کے علاوہ چند اور جگہیں جیسے کانپور تھیں لیکن اس کے برعکس بہت سے قدیم دارالسلطنت کے شہر تھے جیسے ڈھاکہ، مرشد آباد، لکھنؤ، تنجور وغیرہ جہاں کی آبادی میں کافی کمی واقع ہوئی تھی۔ یہ خیال کرتے ہوئے کہ ہندوستان میں اس وقت جدید صنعت گویا مفقود تھی اور حمل و نقل کی آسانیاں ابھی تک زیادہ نہیں بڑھی تھیں اس کا زیادہ امکان ہے کہ ۱۸۷۲ء کی نسبت اس صدی کے آغاز میں ہندوستان میں شہری آبادی فیصد شرح کسی قدر زیادہ تھی۔ ۱۸۷۲ء میں شہری آبادی ۸ء۷ فیصد تھی اس لئے یہ بات بڑی احتیاط کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اس صدی

---

[1] مختلف مردم شماریوں کی صوبائی اور امپیریل رپورٹ پر یہ بات تقریباً پورے طور پر مبنی ہے

[2] جے۔ ایچ۔ کلے فام: فرانس اور جرمنی کا اقتصادی ارتقاء ۱۸۱۵-۱۹۱۴، ص ۵۳ (۱۹۲۱ء)

کے آغاز میں یہ تناسب کم ازکم ۹ اور ۱۰ فیصد کے درمیان ہے۔ انیسویں صدی کے آغاز میں مغربی ممالک میں شہری آبادی فیصد کے حساب سے یوں تھی: انگلینڈ اور ویلز ۲ء۲۱ اسکاٹ لینڈ ۰ء۱۷، فرانس ۹ء۵، پروشیا ۲۵ء۷، روس ۳ء۷، ریاست ہائے متحدہ ۸ء۳۔ ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اس صدی کے آغاز میں ہندوستان میں شہری ترقی کم ازکم اس حد تک ضرور ہوئی تھی جس حد تک فرانس میں۔

ان شہروں کی آبادی کی نوعیت کے بارے میں یہ پہلے ہی بتایا جا چکا ہے۔ ہندوستان کی آبادی کا جائزہ لینے کے لئے جو سب سے قدیم اعداد وشمار موجود ہیں وہ ۱۸۷۲ء کے ہی ہیں۔ ۱۸۷۲ء کی مردم شماری کے جو نتائج ہیں ان کی صحت خود مشتبہ ہے لیکن بعد والی مردم شماریاں کافی صحیح تھیں۔ ہندوستان کی شہری آبادی کے اعداد وشمار کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ 'شہر' کی تعریف ہر مردم شماری بدلتی رہتی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ مردم شماری کے صوبائی ناظموں نے تعریف کا مطلب اپنے طور پر نکالا ہے۔ عموماً ایک شہر کی تعریف کی گئی کہ یہ ایک ایسی جگہ ہے جہاں ... ۵ باشندے ہوں یا ایسی جگہ جہاں ... ۲ سے زیادہ باشندے واضح شہری خصوصیات کے حامل ہوں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ بہت سی جگہیں چھوڑ دی گئیں جہاں ... ۵ سے زیادہ باشندے تھے انہیں محض بڑا گاؤں سمجھا گیا۔ اس لئے ... ۱۰ سے کم آبادی والے شہروں کے اعداد وشمار معتبر نہیں ہیں۔ ان تمام ملکوں میں جو دشواری محسوس کی گئی وہ ان اعداد وشمار میں بھی محسوس کی گئی کہ یہاں شہری سرحد برابر بدلتی رہتی ہے۔ پھر بھی مجموعی اعتبار سے جہاں تک عمومیت اور بڑے گروپ کے موزانہ کا سوال ہے۔ اعداد وشمار بڑی حد تک قابل اعتبار ہیں۔

پھر بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان شہری اعداد وشمار کو پورے ہندوستان کے لئے سمجھنا نقص سے خالی نہیں کیونکہ یہاں بڑے اختلافات ملتے ہیں۔ بنگال صوبہ میں شہری آبادی مجموعی آبادی کی ۵ فیصد تھی جب کہ بمبئی پریسیڈنسی میں یہ بڑھ کر ۱۷ فیصد ہو گئی تھی بدقسمتی سے آج (۱۹۲۴ء) صوبوں کی تنظیم اتنی بے ہنگم ہے کہ ان میں سے کوئی بھی پورے طور پر موافق خصوصیات کا حامل نہیں۔ مختلف اقتصادی حصوں میں اختلاف اور زیادہ ہے مثلاً چھوٹا ناگپور کے پلیٹو میں آبادی کے صرف ۳ فیصد لوگ شہروں میں رہتے ہیں جب کہ گجرات کے گنجان صوبہ میں شہری باشندے تقریباً ۲۰ فیصد ہیں لیکن اگر ہم ان بڑی مثالوں کو نظر انداز کردیں تو ہندوستان کے زیادہ تر حصوں میں پوری آبادی کا تناسب ۸ سے ۱۲ فیصد ہے اور یہ تناسب بھی

لہ اے۔ ایف۔ ویبر: انیسویں صدی میں شہروں کی ترقی (۱۸۹۹ء)

گرچہ مختلف ہوتا ہم شہری آبادی کی نوعیت اور اس کی ترقی یا زوال پر حاوی اسباب ہر جگہ یکساں ہیں۔

مردم شماری کے حکام نے شہروں کو کئی درجوں میں تقسیم کیا ہے لیکن ان کی درجہ بندی کو یہاں پر تفصیل سے بیان کرنا غیر ضروری ہے۔[1] ہم ان کو تین حصوں میں تقسیم کریں گے۔ چھوٹے شہروں کا طبقہ یعنی ایسے شہر جہاں آبادی ۲۰,۰۰۰ یا کم ہو، درمیانی شہر جہاں آبادی ۲۰,۰۰۰ سے ۵۰,۰۰۰ ہو اور بڑے شہر جس کی حد ہندوستان میں ۵۰,۰۰۰ یا اس سے زیادہ قرار دی جا سکتی ہے۔ چھوٹے شہروں کے لیے ۲۰,۰۰۰ کی حد متعین کر دینے سے چھوٹے شہروں کی اعداد و شمار کی بہت سی غلطیاں بڑی حد تک دور ہو سکتی ہیں۔ مختلف مردم شماریوں کے زمانہ میں شہری آبادی مجموعی آبادی کا حسب ذیل تناسب رکھتی تھی۔

۱۸۷۲	۸,۷۲ فی صد
۱۸۸۱	۹,۴۱
۱۸۹۱	۹,۴۶ ″ ″
۱۹۰۱	۹,۸۸ ″ ″
۱۹۱۱	۹,۴۲ ″ ″

اس جدول سے کسی سمت واضح حرکت کا پتہ نہیں چلتا ہے۔ تناسب میں کسی قابل غور اضافہ کا پتہ ۱۸۷۲-۸۱ء ۱۹۰۱-۱۸۹۱ اور ۱۹۱۱-۲۱ء کی دہائیوں میں ملتا ہے۔ ۱۸۸۱ء اور ۱۸۹۱ء کے درمیان یہ تناسب غیر متحرک رہا جبکہ ۱۹۰۱ اور ۱۹۱۱ء کے درمیان کم ہو گیا۔ ۱۹۲۱ء کی مردم شماری کی رپورٹ سے یہ صاف ظاہر ہے کہ اس دہائی میں گرچہ اضافہ ہوا پھر بھی کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہوئی۔

۱۸۷۲ء کی مردم شماری میں غلطیوں کی وجہ سے یہ مشتبہ ہے کہ ۱۸۷۲-۸۱ء کی دہائی میں اضافہ اتنا زیادہ ہوا ہے جتنا کہ پیش کیا گیا ہے اس طرح ملک کی مجموعی آبادی کی بہ نسبت شہری آبادی کچھ ہی زیادہ تیزی سے بڑھی ہے اگر وہ واقعی بڑھی ہے۔

تناسب کی یکساں کیفیت کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ ہم یہ غور کریں کہ شہری آبادی کے کردار میں کوئی تغیر ہوا ہے یا نہیں یعنی مختلف درجوں کے تناسب میں کیا فرق ہوا ہے۔ یہ بھی تقریباً پورے طور پر غیر متحرک رہا ہے۔

مجموعی آبادی کے مقابلہ میں شہروں کے تین درجوں کی آبادی فیصد کے حساب سے:

---

[1] اس باب کے آخر میں جدول دیکھیں

باشندوں کی تعداد	۱۸۷۲	1911	1921
۲۰,۰۰۰ اور اس سے کم	۴۷٫۳	۴۷٫۴	۴۵٫۵
۲۰,۰۰۰ اور ۵۰,۰۰۰ کے درمیان	۱۸٫۳	۱۸٫۷	۱۸٫۳
۵۰,۰۰۰ اور اس سے زیادہ	۳۴٫۴	۳۳٫۹	۳۶٫۲

اگر پورے دور کو لے لیا جائے تو لیواسر کے مفروضہ کی کوئی تصدیق نہیں ہوتی کہ انسانی جماعتوں کی قوت کشش بالعموم ان کی کمیت کی متناسب ہوتی ہے[1] حقیقت یہ ہے کہ بڑے شہروں نے کسی قدر اپنی حیثیت کھودی ہے اور جس واحد امر سے اس رجحان کی ہندستان کے کسی زمانہ میں کارفرمائی ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ۱۱-۱۹۰۱ء کی دہائی میں ہندستان کی شہری آبادی میں جو اضافہ ہوا تھا تقریباً وہ تمام اضافہ ایسے شہروں کی جماعت میں رونما ہوا جن کی آبادی ۱۰۰,۰۰۰ اور اس سے زیادہ تھی۔

اس لئے شہری آبادی کے اعداد و شمار کے مطالعہ سے ہمیں کوئی مدد نہیں ملتی۔ اگر کچھ معلوم ہوتا ہے تو وہ یہ ہے کہ ہندستان میں اقتصادی جمود تھا۔ اس صورت میں ہم ان مختلف قوتوں کا کسی قدر عمومی جائزہ لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں جو گذشتہ چالیس برسوں میں ہندستان میں شہروں کے پھیلنے پر کارفرما تھیں۔

ریلوے کی تعمیر ان تمام عناصر میں سے ہے جس نے موجودہ زمانہ میں ہندستان کے اندر شہروں کی ترقی کو متعین کیا ہے یہ ایسا عنصر ہے جو شہروں کی ترقی کو دو طرح سے اثر انداز کرتا ہے اول یہ کہ شہر میں ریل آجانے سے عموماً تجارت بڑھ جاتی ہے۔ اگر شہر پہلے سے ایک مشہور تجارتی مرکز ہے تو ریل سے اس کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے جس علاقہ سے ریل گذرتی ہے اس علاقہ میں تجارت کے نئے مراکز پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے لیکن اگر ریل سے شہر کی آبادی اس طرح بڑھ سکتی ہے تو اس کا الٹا اثر بھی ہوتا ہے۔ اکثر ریل کی تعمیر کے تقاضوں کے پیش نظر پرانے شہر خاص لائن سے دور ہو جاتے ہیں۔ فطری طور پر اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ تجارت کے پرانے راستے چھوٹ گئے جس سے ان شہروں پر زوال آنے لگتا ہے۔

ابھی ریل کو چھوڑ دیں اور شہر کی آبادی جس طرح بڑھی اس کا جائزہ لیں۔

(۱) نئی صنعتیں یا پرانی صنعتوں کی مزید ترقی (۲) قحط (۳) بے زمین مزدور طبقہ کا ظہور (۴) دولت مند زمیندار اور دوسروں کے شہر میں رہنے کا رجحان۔ ان مختلف اسباب میں صنعتوں کی ترقی دوسرے

---

[1] ویبر، ح۔س، باب نہم

تمام ملکوں میں سب سے اہم رہی ہے لیکن ہندوستان میں اس کا اثر واقعی اتنا غیر معمولی نہیں ہوا۔ درحقیقت آج ہندوستان میں بہت کم ایسے شہر ہیں جو نئی صنعتوں کی پیداوار ہیں۔ جمشید پور ایک نمایاں استثنا کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ شہر پورے طور پر ٹاٹا آئرن اینڈ اسٹیل ورکس کی کارگذاریوں کا نتیجہ ہے لیکن دوسری بہت کم صورتوں میں صرف صنعتوں کی ترقی سے شہر کو فروغ حاصل ہوا ہے۔

نئی صنعتوں کے ابھرنے یا ترقی پانے کی بہ نسبت ہندوستان میں قحط زیادہ کثرت سے رونما ہوتے رہے ہیں اور قحط سے شہری آبادی میں یقینی کافی اضافہ ہوتا ہے۔ قحط کے دوران دیہی آبادی کے پاس کام نہیں ہوتا، ہم ہندوستانی قحط کو قومی بیروزگاری کا زمانہ کہہ سکتے ہیں۔ چونکہ کھیتوں میں کوئی کام نہیں رہتا اس لئے دیہات کی آبادی کام کی تلاش میں شہروں کی طرف جاتی ہے۔ پرانے دور میں قحط کے وقت لوگوں کی شہروں کی طرف یہ نقل و حرکت نمایاں طور پر نظر آتی تھی۔ یہ کہا جاتا ہے کہ ۱۸۶۸ء کے بڑے راجپوتانہ قحط میں آگرہ، دہلی اور دوسرے قرب و جوار کے شہروں کی آبادی دوگنی ہو گئی لیکن مواصلات کی بہتری اور ریلیف کا اچھا انتظام ہو جانے سے شہروں کی طرف یہ حرکت بڑی حد تک رک گئی تھی پھر بھی ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ۸۱۔۱۸۷۲ اور ۱۹۰۱۔۱۸۹۱ کی دو دہائیاں جب کہ شہروں کی طرف یہ حرکت بہت زیادہ نمایاں تھی۔ ایسی دو دہائیاں تھیں جب ہندوستان میں ہر طرف قحط پھیلا ہوا تھا۔ لیکن یہ بتا دینا ضروری ہے کہ قحط کے دوران گرچہ لوگ شہروں کی طرف بھاگ کر چلے آتے ہیں مگر یہ نقل و حرکت عارضی ہی ہوتی ہے جب تک کہ ان شہروں میں ایسا روزگار نہ ہو جس میں یہ نئی آبادی لگ جائے روزگار نہ ہونے کی وجہ سے شہروں میں آنے والے لوگوں کی بھیڑ زرعی روزگار پاتے ہی دیہات کی طرف لوٹنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

یہی بات بے زمین مزدور طبقہ جو پیدا ہوا تھا اس پر بھی لاگو ہوتی ہے۔ قحط سے ہی ایسا طبقہ پیدا ہوا تھا، پرانے کسان مالکوں کے بیدخل ہونے سے بھی یہ طبقہ ابھرا تھا۔ یہ سلسلہ تقریباً پچاس برسوں سے چلا آرہا تھا۔ بے زمین مزدور طبقہ کے ابھرنے سے شہر کے پھیلنے میں منفی طور پر مدد ملتی ہے یا فروغ حاصل ہوتا ہے۔ ایسا طبقہ کسان طبقہ کی طرح زمین سے وابستہ نہیں ہوتا اسلیے وہ شہروں کی طرف ہجرت کرنے کے لئے جلد آمادہ ہو جاتا ہے لیکن اس جگہ یہ بات قابل غور ہے کہ وہ شہروں میں صرف اسی صورت میں مستقل طور پر ہجرت کر سکتا ہے جب اسے وہاں روزگار مل جائے۔ یہ سچ ہے کہ آبادی کی حرکت کے لئے کسی نمایاں ترغیب کی ضرورت ہوتی ہے اور ایسی ترغیب میں اسی وقت کشش ہوتی ہے جب یہ اجرت کے اضافہ کی شکل میں نظر آئے یا بہتر معیار زندگی کا امکان پورا ہو۔

آخر میں ہم دولت مند زمیندار اور دوسروں کے شہر میں سکونت پذیر ہونے کے رجحان پر غور کریں

گے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ موجودہ زمانہ میں شہری زندگی کی عظیم الشان کشش سے اپنے گھر سے علیحدہ رہنے والے زمینداروں کی بڑی حوصلہ افزائی ہوئی ہے اس طرح شہروں کی آبادی میں جزوی اضافہ ہوا ہے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ دولت مند طبقہ کے محدود ہونے سے اس کا تعداد پر اثر بہت ہی کم ہوا ہے۔ ان اسباب پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوگا کہ تجارت کا فروغ اور صنعتوں کی ترقی ہی وہ اہم اسباب ہیں جن کے نتیجہ میں دیہات سے شہر کی طرف متعین اور مستقل نقل وحرکت پیدا ہوتی ہے۔

دوسری طرف کئی دیگر اسباب ہندوستان میں ایسے ہیں جن کا الٹا اثر پڑ رہا ہے انہیں ہم حسب ذیل صورتوں میں پیش کر سکتے ہیں۔ (ا) تجارتی راستوں کا مختلف شاخوں میں تبدیل ہو جانا (ب) پرانی دستی صنعتوں کا زوال (ج) وبائیں (د) شہروں کے غیر صحت مند اور خراب رہائشی حالات۔ تجارتی راستوں کی تبدیلی ریل کی توسیع اور دوسرے اسباب کا نتیجہ تھی۔ بہت سے قدیم شہروں کے زوال کا یہ ایک بہت ہی نمایاں سبب رہا ہے۔ مثال کے لئے ہم مرزا پور کا نام لے سکتے ہیں جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے۔ یہ شہر گنگا کے کنارے ایک خاص پوزیشن رکھنے کی وجہ سے ایک مشہور تجارتی بازار بن گیا تھا یہ خوشحالی کے نقطہ عروج کو پہنچ گیا تھا جب چھٹی دہائی کے دوران لنکا شائر میں کپاس کے قحط ہو جانے سے شمالی اور متوسط ہندوستان کے کپاس کی تمام برآمدات مرزا پور سے ہی ہو کر گنگا کے نیچے گذرتی تھیں لیکن جیسے ہی گنگا کے کنارے ریلوے لائن بن گئی تو اس کے بعد ندی کے آبی راستہ کی اہمیت بہت حد تک ختم ہوگئی اور مرزا پور تیزی سے زوال پذیر ہو گیا۔ دوسری مثال ساگر کی ہے۔ جو ریلوے کے زمانہ کے پہلے ایک مشہور تجارتی مرکز تھا اور نربدا وادی اور سنٹرل انڈیا ایجنسی کے ذریعہ نمک تقسیم کرنے کا خاص گودام تھا لیکن تجارتی راستہ بدل جانے سے ساگر تیزی سے زوال پذیر ہو گیا۔ ریل صرف واحد ایجنسی نہ تھی جس سے تجارت کے راستے بدل گئے۔ ندی کے راستوں کی بے رحمیاں بھی ہیں جن کا لحاظ رکھنا ہوگا۔ اراودی کا دھارا بدل جانے کی وجہ سے اپر برما کا ترقی پذیر شہر منگیان مکمل طور پر برباد ہو کر رہ گیا۔ اور بنگال کے بہت سے قدیم شہر گنگا کا راستہ بدل جانے کے باعث برباد ہو گئے۔ ریل سے جو مقامی تجارتی مرکز ہٹ کر رہ گئے تھے وہاں اسی قسم کا تجارتی تغیر ہوتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ پورے طور پر علیحدہ رہ جائیں۔ اگر کسی شہر کو ریل کی تعمیر کا فائدہ چند برسوں کے لئے مل جائے تو تجارت کے قدیم راستوں کو بدل جانے کے لئے یہ کافی ہے۔ اودھ کے غلہ اور چمڑے کی تجارت میں کانپور لکھنؤ سے صرف اس لئے بازی لے گیا کہ لکھنؤ سے پہلے کانپور تک ریل بن گئی تھی [1]

---

[1] ہوائے: ح۔ س

تجارتی راستوں کی تبدیلی کی بہ نسبت دستی صنعت کا انحطاط زیادہ اہم سبب رہے جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ قدیم ہندوستانی شہروں کی صنعتیں خاص طور پر تعیشاتی یا آرٹ کی صنعتیں رہی تھیں اور یہ اپنی خوشحالی کے لئے امرا اور دربار کی مانگ پر منحصر تھیں۔ دربار ختم ہونے ہی زیادہ تر مانگ ختم ہوگئی۔ یہ ٹھیک ہے کہ صنعتیں فوراً ختم نہیں ہوئیں۔ یہ دستی صنعتیں پرانی اور جمی ہوئی تھیں اور ایک زمانہ میں ہندوستانی شرفا کو ان میں بہت سے سامان کی ضرورت پڑتی تھی اسی طرح خوب صورت چھوٹی موٹی آرائشی چیزوں کی یورپ والوں میں اچھی مانگ تھی۔ جس سے فنی نقطہ نظر سے صنعت کی قدر و قیمت کم تو ضرور ہوئی مگر پھر بھی کاری گروں کو زندہ رہنے کا سہارا تو ملا۔ لیکن تعلیم کی آمد اور ہندوستانی بورژوا کے پیدا ہونے سے یہ مانگ آہستہ آہستہ ختم ہوگئی اور دستی صنعتیں سستے یورپی مقابلہ سے دہشت زدہ ہوکر جلد ہی غیر اہم ہوگئیں دستی صنعت کاروں نے اپنے پرانے پیشے ترک کر دیئے اور انہیں کھیتی یا دوسرا پیشہ اختیار کرنا پڑا جہاں ان کے لیے گنجائش تھی۔ دستی صنعتوں کا انحطاط اور آبادی کی لازمی تخفیف بہت سے پرانے شہروں کا مقدر بن گئی۔ یہ عمل فطری طور سے آہستہ آہستہ ہوا لیکن یہ بہت نمایاں تھا اور شہر ہی میں دوسرے پیشے حاصل ہو سکتے تھے اور جہاں نئی صنعتیں شروع کی جا سکتی تھیں تاکہ آبادی کو نقصان نہ سہنا پڑے۔ نئی زندگی کی ایک بڑی اچھی مثال ڈھاکہ کی ہے۔ نواب کا دربار ختم ہونے کے بعد ڈھاکہ اپنی مشہور ململ کی صنعت اور دیگر دستی صنعتوں کے ساتھ تیزی سے زوال پذیر ہوگیا۔ اور یہ زوال ۱۸۰۰ء تک جاری رہا لیکن اسی وقت پوربی بنگال میں جوٹ کی کھیتی مقبول ہوگئی اور ڈھاکہ کے گرد متعدد جوٹ کی گانٹھ بنانے والی مشینیں قائم ہوگئیں۔ اس تجارت وصنعت سے ڈھاکہ نے پھر شہرت حاصل کرلی اور گذشتہ پچاس برسوں میں اس کی شہرت برابر بڑھتی رہی۔ امرتسر میں شال کی صنعت ختم ہونے پر اس کے بدلے نویں دہائی میں چٹائی کی ترقی پذیر صنعت قائم ہوگئی۔ بدقسمتی سے یہ چٹائی کی صنعت کمزور بنیاد پر قائم ہوئی تھی اس لئے اگلی دہائی میں امرتسر کو پھر زوال نصیب ہوا۔
مرشد آباد کا حال ڈھاکہ کے برعکس ہے۔ کلایو کے زمانہ میں مرشد آباد کا شہر لندن سے بہتر سمجھا جاتا تھا لیکن انگریزی سلطنت میں آنے کے بعد سے اس کا زوال برابر جاری رہا یا مالدا کی مثال لیجئے جس کی ریشم کی پرانی صنعت مشہور تھی یا شانتی پور کی مثال لیجیے جس کی ململ کی صنعت تھی اور جن کی مصنوعات صرف ڈھاکہ کی مصنوعات سے ہی کمتر تھیں یہ محض بنگال کی مثالیں پیش کی گئی ہیں لیکن ایسی مثالیں ہندوستان کے دوسرے حصوں سے بھی پیش کی جا سکتی ہیں اس لئے کہ قصہ وہی ہے خواہ برہا میں مانڈے کا ہو یا دکن میں پیٹھان کا۔

تجارتی راستوں کی تبدیلی اور دستی صنعتوں کا زوال وہ اسباب ہیں جن سے شہری آبادی میں صاف طور پر انحطاط ہو رہا ہے لیکن وبا اور غیر صحت مند رہائشی حالات بھی شہروں کے بڑھنے میں حارج رہے ہیں ان کے برعکس قحط کی طرح وبائیں لوگوں کو گنجان شہری علاقوں سے دور کھلے دیہات میں بھگا لے جاتی ہیں ۔ یہ معلوم ہوگا کہ شہری آبادی کا تناسب اس صدی کی پہلی دہائی کے دوران کسی قدر گھٹ گیا، یہ صورت حال بالخصوص ہندوستان کے بڑے حصہ میں پھیلی ہوئی پلیگ کی وبا کا نتیجہ تھی ۔ یہ دکن صوبہ متوسط اور بہار میں خاص طور پر پھیلی ہوئی تھی ۔ اس وبا نے شہری آبادی کی ایک بڑی تعداد کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور شہروں سے بہت سے لوگوں کو باہر نکال دیا ۔ قحط کے اثر کی مانند اس کا اثر کسی قدر عارضی تھا ۔ اس لئے کہ وبا ختم ہوتے ہی لوگ شہر کی طرف لوٹ آتے ہیں ۔

غیر صحت مند حالات اور خراب رہائشی انتظام شہروں کے بڑھنے میں کسی قدر مختلف طریقہ سے اثر انداز ہوتے ہیں اگر دیہات سے شہر کی طرف لوگوں کی ہجرت ہونے لگتی ہے تو ان صورتوں کا اس پر خراب اثر پڑتا ہے ۔ کلکتہ کی بستیوں، اور بمبئی کے 'چال' کے غیر صحت مند حالات کے بارے میں سب جانتے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ خراب رہائشی حالات مزدوروں کو بڑی حد تک ان شہروں سے دور رکھتے ہیں ۔ یہ حتمی طور پر ثابت ہو چکا ہے کہ کلکتہ کی جوٹ ملوں میں جہاں قلی کے لئے صاف اور صحت مند انتظام کیا جاتا ہے وہاں مزدور کی کوئی دقت نہیں ہوئی جس کی شکایت عام طور پر کی جاتی ہے ۔

ایک دوسرا پہلو بھی ہے ۔ پرانے زمانہ میں ہندوستان کے بعض حصوں میں یہ واضح رجحان تھا کہ لوگ دیوار بند شہروں کی طرف رخ کرتے تھے ۔ یہ خاص طور پر اس وجہ سے تھا کہ دیوار بند شہروں میں ڈاکوؤں سے محفوظ رہنے کا بہتر انتظام تھا جن کا بعض اوقات بہت زور ہوتا تھا ۔ گذشتہ سو برسوں میں جب کھلی ڈکیتی گویا مفقود ہوگئی تو ان دیوار بند شہروں کا کوئی خاص مقصد نہ رہا اور زراعت پیشہ لوگوں کے لئے ایسے شہروں میں مقیم ہونا بہت دشوار طلب تھا اس لئے ساتویں دہائی کے دوران ہندوستان کے بہت سے حصوں میں بالخصوص صوبہ متوسط میں ان چھوٹے شہروں کی آبادی کے منتشر ہونے کا واضح رجحان ہوگیا ۔

شہروں کی ترقی پذیری کا یہ سادہ عمل ٹھہرا اب چھوٹے شہر کی قیمت پر بڑے شہر بڑھتے ہیں ۔ اب ہم ان کا مزید جائزہ لے سکتے ہیں ۔ اس قسم کی تحریک کا اعداد و شمار سے کوئی اندازہ نہیں ہوتا لیکن گو یہ صورت حال ہے پھر بھی مختلف مردم شماریوں کی رپورٹ میں بہت سے ایسے حوالے ملتے ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ چھوٹے شہر ویسے کے ویسے ہیں یا زوال پذیر ہیں اور بڑے شہر بڑھ

رہی ہیں دوسری طرف مردم شماری کے بعض ناظموں کا خیال ہے کہ چھوٹے شہروں میں زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ بعض ایسی وجہیں ہیں جن سے یہ یقین ہوتا ہے کہ چھوٹے شہروں کی بہ نسبت بڑے شہروں میں زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ ابھی ہندستان میں تجارت کے بڑے شہروں میں مرکوز ہونے کا عمل یقیناً جاری ہے۔ یہ بات دہلی جیسے مرکز میں دیکھی جا سکتی ہے۔ یہاں تجارت کے لئے زیادہ آسانیاں اور مارکٹ بہتر ہیں اس لئے قرب وجوار کے چھوٹے شہروں کے لئے یہ بڑی کشش رکھتی ہے مرکوز ہونے کے اس رجحان کے برعکس ریل کے زمانہ میں انتشار کا رجحان بھی پایا جاتا ہے۔ پنجاب کی مردم شماری کی رپورٹ (۱۹۱۱) حسب ذیل ہے: تقریباً ہر ریلوے اسٹیشن برآمد کا ایک مرکز ہے۔ قرب وجوار کے علاقہ سے غلہ، کپاس وغیرہ ان اسٹیشنوں میں آتے ہیں اور برآمد کرنے والے فرم کے ایجنٹ ان جگہوں میں آنے والی اشیاء کو خریدنے کا انتظام کرتے ہیں اس طرح کاشتکاروں کو اپنا فاضل اناج بیچنے کے لئے تجارتی منڈیوں میں نہیں جانا پڑتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مقامی منڈیاں ختم ہونے لگیں۔ اسی طرح انیسویں صدی کی آخری دہائی میں فیروزپور کا زوال تجارت کے ختم ہونے کے باعث ہوا، جہاں سے دور اور نزدیک کے گاؤں کا مال کھینچ کر ریلوے لائنوں کے زیادہ تر اسٹیشنوں پر یورپی اور ہندستانی فرم کی چھوٹی چھوٹی ایجنسیاں کھل جانے سے آگیا جو پہلے اسی شہر میں آیا کرتا تھا[1]۔ تجارت کے مرکوز اور اس کے منتشر ہونے کے ان دونوں عمل سے چھوٹے چھوٹے شہر اور تجارتی مراکز سب سے زیادہ متاثر ہوئے۔ پھر پچھلے تیس برسوں کے دوران اجرت میں اضافہ قیمتوں کے اضافے کے مطابق ان چھوٹے شہروں میں اتنا زیادہ نہیں ہوا تھا جتنا کہ ان بڑے صنعتی مرکزوں میں ہوا تھا اُجرت کی شرح میں فرق ہونے سے چھوٹے شہر کے کاریگر بڑے شہروں میں جایا کرتے ہیں۔

ایک اور دوسرا سبب بھی ہے اور وہ ہے انتظامیہ کے مرکوز ہونے کا۔ موجودہ طرز کے ماتحت عدل وانصاف، مالیات قانونی پیشہ اور دوسرے کاموں پر گذر اوقات کرنے والے تمام لوگوں کو ضلعوں کے صدر مقام میں رہنا پڑتا ہے۔ تقریباً دوسرے تمام ملکوں میں یہ شہری آبادی کا ایک بہت ہی معمولی تناسب ہوتا ہے مگر ہندستان جیسے ملک میں یہ خاصا ہوتا ہے اس لئے عموماً ضلع کے صدر مقام ضلع کے دوسرے مرکزوں کے خون سے پنپتے ہیں۔ مثال کے طور پر برار کے ایلچ پور اور واسم دونوں کی آبادی میں کمی ضلع کا صدر مقام دوسری جگہوں میں منتقل ہونے کی وجہ سے

---

[1] پنجاب کی مردم شماری کی رپورٹ ۱۹۰۱ء

واقع ہوئی۔ ۱۱۔ ۱۹۰۱ء میں بڑے پیمانہ پر ڈھاکہ کی آبادی میں بیشتر اضافہ ایسٹرن بنگال اور آسام کا نیا صوبہ بن جانے سے ہوا جس کا دار لسلطنت ڈھاکہ ہوگیا۔ چھوٹے شہروں کی بہ نسبت بڑے شہروں میں بیشتر اضافہ کے بعض دوسرے اسباب بھی ہیں۔ مگر ایسا لگتا ہے کہ بہت سے بڑے شہروں کے سست زوال کے اثرات سے ان اسباب کا عمل زائل ہوگیا ہے۔

کسی قدر ان مختلف اثرات کے عمومی جائزہ میں کچھ اضافہ ہندستان کے چند خاص شہروں کے مطالعہ سے ہوسکتا ہے۔ یہاں پر جو مثالیں دی گئیں ہیں وہ پوری کی پوری بڑے شہروں کی جماعت سے لی گئی ہیں۔ ہندستان کے دو بڑے شہر کلکتہ اور بمبئی میں اضافہ کافی ہوا ہے لیکن وہ نہ تو اتنا ہے اور نہ مستقل ہی رہا ہے۔ اوپر سے اگر شروع کریں تو بڑے شہروں کی جماعت میں ہم جس قابل لحاظ اضافہ سے دوچار ہوتے ہیں وہ رنگون ہے۔

۱۸۷۲ء میں رنگون کی آبادی ٹھیک ایک لاکھ سے کم تھی ۱۹۱۱ء میں یہ دو لاکھ اور ۹۳ ہزار ہوگئی گویا چالیس برسوں میں ایک لاکھ اور ۹۴ ہزار کا اضافہ ہوا۔ ۱۸۷۲ء میں رنگون نے بڑی شہرت حاصل نہیں کی تھی اپر برما کے سلطنت میں ملا دینے اور چاول میں برآمدی تجارت بڑھ جانے سے ہی رنگون ایک بندرگاہ کی حیثیت سے تیزی سے بڑھنے لگا۔ اس کا عروج مسلسل رہا ہے برما آج (۱۹۲۴ء) ہندستان کی مجموعی چاول کی برآمد کی تین چوتھائی سے زیادہ باہر بھیجتا ہے اور تقریباً یہ تمام برآمد رنگون سے ہوتی ہے۔ بعد میں چاول کوٹنے اور لکڑی چیرنے کی دو صنعتیں رنگون میں نسبتاً نئی ہیں اور ان میں مزدور طبقہ کا صرف معمولی تناسب کام کرتا ہے۔ رنگون کی آبادی کے بارے میں دوسری دلچسپ خصوصیت یہ ہے کہ یہ آبادی زیادہ تر ہندوستان سے آنے والے قلی مزدوروں پر مشتمل ہے اور رنگون کی ترقی کا انحصار ہندستان کے مزدور کی مسلسل سپلائی پر ہے۔

رنگون کی طرح دوسری مثال کراچی کی ہے۔ ہندستان کے گیہوں کی تجارت سے کراچی کا وہی تعلق ہے جو رنگون کا چاول کی تجارت سے ہے۔ گذشتہ چالیس برسوں میں کراچی کی آبادی دوگنی سے زیادہ ہوگئی ہے۔ یہ صرف کراچی کی بندرگاہ کی حیثیت سے اہمیت بڑھ جانے سے ہوا ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ کراچی میں کوئی مشہور صنعت نہیں ہے آبادی میں اضافہ کا مکمل انحصار اس تجارت پر ہے جو اس بندرگاہ سے ہوتی ہے۔ رنگون اور کراچی کی مثال سے ہمارے بڑے شہروں کی اہم ترین جماعت واضح ہوتی ہے۔ اس میں وہ بندرگاہ آتے ہیں جس کی خوشحالی کا دارومدار اس کی اپنی برآمدی تجارت پر ہے۔ اسی جماعت میں کلکتہ اور بمبئی بھی جزوی طور پر رکھے جاسکتے ہیں لیکن

حقیقت یہ ہے کہ ہندستان میں محض تھوڑے سے بندرگاہ ہیں۔

صنعتی شہروں کی دوسری جماعت ہے جس پر غور کیا جائے گا اس کی بہترین مثال احمدآباد کی ہے۔ احمدآباد ایک پرانا شہر ہے جو اپنی دستی صنعتوں اور اپنے کاری گروں کی مہارت کے لئے مشہور ہے لیکن اس کی موجودہ شہرت کارخانہ کی صنعت کی وجہ سے ہے۔ گذشتہ چالیس برسوں میں اس کی آبادی تقریباً ایک لاکھ بڑھ گئی ہے۔ کپاس اور کپاس کے سامان کے علاوہ احمدآباد کی تجارت بہت زیادہ نہیں ہے اور یہ اس لحاظ سے ہندستانی شہروں میں انفرادیت رکھتا ہے کہ اس کی آبادی کے نصف سے زیادہ لوگ اس صنعت میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ یہاں کی خاص صنعت کپاس کی کتائی اور بنائی ہے جس کے لئے احمدآباد کو خاص سہولتیں حاصل ہیں لیکن اب یہاں بعض نئی صنعتیں بالخصوص چرم سازی اور چرم سے متعلق پیدا ہو رہی ہیں۔

لیکن یہ تسلیم کرنا ضروری ہے کہ احمدآباد کی مثال استثنا کی حیثیت رکھتی ہے ہندستانی شہروں میں ایسے خالص صنعتی شہر کی دوسری مثال نہیں ملتی اس کے برخلاف مدورا اور کانپور ہندستان میں صنعتی شہروں کے نمائندے کی حیثیت سے پیش کئے جا سکتے ہیں۔ دونوں کی خوشحالی کا دور مشہور تجارتی مرکز کی حیثیت سے شروع ہوا۔ کانپور جلد ہی بڑھتی ہوئی چرم کی صنعت کا مرکز بن گیا بعد میں وہاں کپاس کی صنعت اور اون کی صنعت بھی قائم ہوئی۔ یہ شہر برابر ترقی کرتا رہا لیکن اس صدی کی پہلی دہائی میں پلیگ کی سخت زد میں آگیا۔ لیکن ابھی شمالی ہندستان میں صنعت گری کا یہ شاید سب سے مشہور مرکز ہے۔ اس کے باوجود کانپور بڑی حد تک ایک تجارتی شہر ہی ہے۔ مدورا کی دو تاریخیں ہیں۔ بیسویں صدی کے آغاز تک یہ بڑی حد تک تھی کپاس اور اناج کا تجارتی مرکز تھا اس کی خوشحالی خاص طور پر پیری یار آبپاشی اسکیم کی ترقی کے باعث تھی لیکن اس صدی کی پہلی دہائی میں بالخصوص ہاتھ کرگھا کی بنائی اور رنگ ریزی کی صنعتوں میں مدورا کی آبادی کا کثیر حصہ لگا رہا۔

پھر شہروں کی بہت ہی بڑی جماعت آتی ہے جس کا اپنی خوشحالی کے لئے تقریباً پورے طور پر تجارت پر دارومدار ہے۔ ان میں مشہور داخلی تجارتی گودام جیسے لاہور اور دلی شامل ہیں لیکن دلی کی حیثیت ایسے شہر کی ہے جس کے کافی لوگ صنعت میں لگے ہوئے ہیں۔ لاہور اور پنجاب کے دوسرے شہر جیسے ملتان اور راولپنڈی کا یہ حال نہیں ہے۔ موجودہ زمانہ میں ملتان کی ترقی خاص طور پر اس وجہ سے ہوئی ہے کہ وہ کراچی کے تجارتی راستہ پر واقع ہے اور عام برآمدی تجارت بڑھ جانے سے بھی اسے فروغ حاصل ہوا۔ اس جماعت کے شہروں میں کوئی خاص بات نہیں۔ یہ تمام کافی بڑے ریلوے

اسٹیشن کے مراکز ہیں اور اناج کپاس، جوٹ یا تلہن کے بڑے گودام ہیں۔ بڑی تعداد میں سے چند خاص مراکز صوبہ متحدہ میں بریلی اور میرٹھ، مشرقی بنگال میں نرائن گنج، صوبہ متوسط میں ناگپور اور بمبئی پریسیڈنسی میں ہبلی ہیں اور یہ تمام خام زرعی اشیا کی تجارت کے مراکز ہیں۔

اس کے برخلاف انحطاط پذیر شہروں کی جماعت ناقابل ذکر نہیں ہے۔ ہندوستان کے قدیم ترین شہروں میں سے پٹنہ ہے جو تیزی سے انحطاط کا شکار ہے۔ یہ انحطاط دستی صنعتوں اور دریائی صنعت کے ختم ہونے سے ہوا ہے اس کے علاوہ پلیگ کی شدید آفت کا بھی اس کے زوال میں ہاتھ رہا ہے دوسری مثال لکھنؤ کی ہے جس کے زوال کے آغاز کا بیان پہلے ہی کیا جا چکا ہے۔ یہ خاندانی شہروں کی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ بعد میں وہ متبرک شہر آتے ہیں جن میں سے زیادہ کا حال برا ہوا ہے۔ گیا تیزی سے زوال پا رہا ہے۔ الہ آباد صوبہ متحدہ کا مرکز سلطنت ہونے کے باوجود وہیں کا وہیں ہے ۱۸۹۱ء سے ۱۹۱۱ء تک بنارس کی آبادی ۱۹۰۰۰ سے گھٹ گئی۔ متھرا کی بھی اہم حیثیت تیزی سے گھٹ رہی ہے۔ یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ہندوستان میں دہریت کی لہر سے یہ زوال آرہا ہے۔ یاتری ابھی بھی حسب دستور تعداد میں جمع ہوتے ہیں بالخصوص مواصلات کی ترقی سے یاترا بہت کم خطرناک اور سستی بھی ہوگئی ہے لیکن ان شہروں کی قدیم صنعتوں کی مصنوعات کے لئے اب لوگوں کی مانگ بہت کم ہوگئی ہے۔ دربار مرکز رہے ہوں یا تیرتھ استھان، ان شہروں کی آبادی میں انحطاط کا سبب ایک ہی رہا ہے۔ یہ پرانی دستی صنعتوں کا انحطاط ہے۔ اس کا پتہ بڑودا، اندور جیسے شہر اور راجپوتانہ کے بہت سے مشہور شہروں کی صورت حالات سے چلتا ہے جن کا زوال برابر ہوتا رہا ہے حالاں کہ ان جگہوں میں دربار ابھی تک قائم ہے۔

اس لئے جب ہم اعداد و شمار کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم دو متضاد رجحانات دیکھتے ہیں جو تقریباً باہم متوازن ہیں۔ غیر متحرک یا زوال پذیر شہروں کے باوجود ترقی پذیر شہروں میں ترقی کی شرح شہری آبادی کی فیصد شرح کے ٹھیک برابر ہے لیکن پرانے شہروں کے زوال کی یہ صورت ہندوستان کے ساتھ ہی نہیں ہے۔ یہی چیز ہم انگلینڈ میں بھی دیکھتے ہیں جب صنعتی مرکز دکھن سے اتر کی طرف منتقل ہوگیا تھا اور جب قدیم صنعتی شہر، جیسے نورروچ یا برسٹل نے اپنی اہمیت کھودی تھی لیکن انگلینڈ اور دوسرے بہت سے ملکوں میں نئے صنعتی مرکزوں کی ترقی پرانے شہروں کے زوال سے بہت زیادہ تھی۔

اس حقیقت پر روشنی اس امر سے پڑتی ہے کہ ہندوستان میں صنعتوں کی ترقی کی رفتار بہت سست ہے۔ شہروں میں جو کچھ بھی تھوڑی ترقی ہوئی ہے وہ صنعت کی بہ نسبت تجارت

سے زیادہ ہوئی ہے۔ چند صنعتی شہر جیسے احمد آباد اور جمشید پور یا ہگلی کے کنارے چند جوٹ شہروں کو چھوڑ کر صنعتی مرکز ہندوستان میں تقریباً مفقود ہے اور ملے جلے شہر یعنی کچھ تجارتی اور کچھ صنعتی میں تجارت کا عنصر صنعت کے عنصر سے بہت زیادہ ہے۔ پھر ہندوستان میں بڑے شہروں کے مجموعہ یا اس شئے کا جسے پروفیسر جیڈلیس CANURBATIN کہتے ہیں مکمل فقدان ہے۔ شہروں کا مجموعہ جو مغربی ممالک کے ایسے شہروں کے مشابہ ہے وہ صرف ہگلی کے کنارے جوٹ کے شہروں کی جماعت میں ملتا ہے جس میں کلکتہ بھی شامل ہے۔ بہار کے کوئلہ اور لوہا کے علاقہ میں ایسے شہروں کے گروپ ابھر سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ زیادہ تر ملکوں میں شہروں کے سب سے بڑے مجموعے کوئلے اور لوہے کے علاقہ ہی میں پائے جاتے ہیں۔

ہندوستان میں جدید صنعت کا ارتقا بہت ہی سست رفتار سے ہوا ہے۔ یہ اس امر سے پورے طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ جدید تجارت اور صنعت کی ترقی دستی صنعتوں کے انحطاط کے نتیجہ میں جو زوال پیدا ہوا اس کو وہ کسی طرح سنبھال سکی۔

ہر مردم شماری میں شہری آبادی کا تغیر

مردم شماری کا سال	۱۸۷۲ء	۱۸۸۱ء	۱۸۹۱ء	۱۹۰۱ء	۱۹۱۱ء	۱۹۲۱ء
پوری آبادی	۲۰۶,۱۶۲۳۶۰	۲۵۳۸۹۶۳۳۰	۲۸۷,۳۱۴,۶۱۷	۲۹۴,۳۶۱,۰۵۶	۳۱۵,۱۵۶,۳۹۶	۳۱۶,۰۱۷,۷۵۱
شہری آبادی	۱۸,۰۸۲۴۸۴	۲۳,۹۳۵,۳۸۲	۲۷,۲۵۴,۶۱۱	۲۹,۱۸۳,۵۲۸	۲۹,۷۴۸,۲۲۸	۳۲,۴۱۸,۷۷۶
شہری آبادی کی درجہ بندی						
۱۰۰,۰۰۰ یا اس سے زیادہ کے شہر	۴,۳۲۱,۹۱۷	۵,۲۹۵,۰۹۷	۶,۱۷۰,۴۸۰	۶,۶۳۴,۷۴۹	۷,۰۰۵,۶۸۲	۸,۲۱۱,۷۰۴
۵۰,۰۰۰ سے ۱۰۰,۰۰۰ تک	۱,۸۵۶,۲۹۷	۲,۴۱۱,۴۷۰	۲,۰۱۰,۲۵۹	۲,۱۳۰,۵۶۵	۳,۰۱۰,۲۸۱	۳,۵۱۷,۷۴۹
۲۰,۰۰۰ سے ۵۰,۰۰۰ تک	۳,۳۳۸,۴۹۰	۴,۴۷۰,۹۹۵	۵,۰۹۹,۰۰۰	۵,۴۷۳,۹۸۹	۵,۵۵۴,۸۲۰	۵,۹۲۵,۷۶۵
۱۰,۰۰۰ سے ۲۰,۰۰۰ تک	۳,۶۳۴,۳۷۳	۴,۸۴۲,۰۷۲	۵,۴۱۰,۰۶۳	۵,۹۷۵,۱۸۰	۶,۱۶۳,۹۵۴	۶,۲۰۹,۵۸۳
۵,۰۰۰ سے ۱۰,۰۰۰ تک	۳,۵۸۷,۳۷۲	۵,۰۲۹,۴۵۷	۵,۰۶۲,۹۸۵	۵,۹۶۳,۴۷۱	۵,۹۴۴,۵۰۳	۶,۲۲۳,۰۱۱
۵,۰۰۰ سے کم	۱,۳۴۴,۰۲۵	۱,۸۸۶,۲۹۱	۲,۱۰۱,۰۵۴	۲,۱۰۵,۵۷۴	۲,۰۰۷,۸۸۸	۲,۳۳۱,۰۵۴
اگلے مردم شماری میں علاقوں کے گنتی میں نہیں آنے کی وجہ سے آبادی جو ہر مردم شماری میں شامل کی گئی	....	۳۳,۱۳۹,۰۸۱	۵,۶۱۳,۹۰۲	۲,۶۶۲,۰۷۷	۱,۶۹۳,۳۶۵	۸۶,۶۳۳

۸۔ مجموعی آبادی سے کم ہوتی ہے کیونکہ بعض علاقوں کی شہری درجہ بندی کے اعداد و شمار موجود نہ تھے۔

گیارھواں باب

زراعت کا عبوری دور

اگلے ابواب میں مختلف ادوار کی جو تقسیم اختیار کی گئی ہے وہ تقسیم وہی ہے جو موسمی آفتوں سے ہوئی ہے۔ ہندوستان کی زرعی اور صنعتی معیشت میں قحط اتنا اہم رول ادا کرتا ہے کہ اس وجہ سے یہ تقسیم مناسب قرار دی جا سکتی ہے۔ یہ بات پہلے بھی کہی جا چکی ہے کہ زیر غور دور کے آغاز ہی میں ہندوستان قحط کا کردار تیزی سے بدل رہا تھا۔ اسی طرح یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اس پورے دور میں قحط کی اہمیت دھیرے دھیرے کم ہو رہی تھی۔ اس لیے ہم شمالی مغربی صوبہ کے ۱۸۶۱ء والے قحط اور ۱۸۶۹ء کے راجپوتانہ والے قحط سے آگے کے تمام قحطوں کا جائزہ لیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ۷۷-۱۸۷۶ء میں ہی اثرات کم محسوس ہوئے اور یہاں تک کہ لگاتار دو شدید قحط میں بھی اتنے مصائب اور اموات اس صدی کے آخر میں نہیں ہوئی جتنی کہ ۷۷-۱۸۷۶ء میں ہوئی تھی۔ اب ذرا زیادہ قریب سے دور کی طرف دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ ۸-۱۹۰۷ء کے قحط سے لوگ بہت ہی جلد جاں بر ہوئے اور ۱۹۱۸ء میں جس طرح شدید طور پر بارش ناکام رہی اس کے اثرات نسبتاً کم ہی محسوس کیے گئے۔ ان حقیقتوں سے ایک واضح نتیجہ اکثر نکالا گیا ہے کہ آج کاشتکار طبقہ پہلے کی بہ نسبت، یعنی ستر سال پہلے سے زیادہ خوشحال ہے۔ یہ لازمی طور پر نتیجہ نہیں نکلتا۔ قحط کے اثرات اس حد تک شدید طور پر محسوس نہیں کیے گئے اس کے خاص اسباب یہ ہیں کہ ملک کے ایک حصہ سے دوسرے حصہ میں اناج بھیجنے کے بہتر رسل و رسائل موجود تھے اور اس لیے بھی کہ ریلیف کا کام خوش اسلوبی سے ہو رہا تھا جو کاشتکار طبقہ خریدنے کی نسبت زیادہ بیچتے تھے اگر ان کی خوشحالی قیمتوں کے بڑھ جانے سے زیادہ ہوگئی تو بھی یہ بات مشتبہ ہے کہ کاشتکاروں کے بڑے طبقہ کی پوزیشن کس حد تک اچھی ہوئی ہے جس کے پاس زمین تھوڑی ہوتی ہے اور جو زیادہ تر دوسرے کاموں سے اپنی آمدنی بڑھاتے ہیں۔ یہ کہا جاتا ہے کہ اس صدی کے شروع سے زرعی مزدور کی اصلی اجرت بڑھی ہے [1] لیکن یہ ٹھیک

(۱) آگے صفحے پر

سے معلوم نہیں کہ اس اضافہ سے وہ کس حد تک خراب موسموں سے محفوظ رہتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ کاشتکاروں کی حالت میں مادی بہتری سے زیادہ حمل ونقل کے بہتر وسیلہ سے قحط کے اثرات میں اتنی بڑی کمی واقع ہوئی۔

مواصلات کی یہی آسانی تھی جس سے ہندوستان کی زراعت میں اہم تبدیلی آرہی تھی اس تبدیلی کے لیے چونکہ کوئی اور بہتر اصلاح نہیں ملتی اسی لیے ہم اس کو زراعت کی تجارت گری (Commercialisation of Agriculture) کہہ سکتے ہیں۔ جس بنیاد پر ہندوستان میں کھیتی ہوتی تھی وہ آہستہ آہستہ بدل رہی تھی۔ اب کھیتی کا مقصد محض گھریلو استعمال کے لیے پیدا کرنا نہیں تھا بلکہ بازار میں فروخت کے لیے پیدا کرنا تھا۔ اس زمانہ میں تبدیلی آہستہ آہستہ ہندوستان میں ہوئی اور آج بھی (۱۹۲۱ء) ہندوستان میں زیادہ کھیتی تقریباً مکمل طور پر گھریلو استعمال کے لیے ہی ہوتی ہے لیکن ان تمام جگہوں میں جہاں خاص فصلیں یا بہتر غذائی اجناس کی پیداوار ہوتی ہے وہاں مارکٹ کے لیے ہی زیادہ کاشت ہوتی ہے خود کفیل دیہی معیشت میں جہاں جنس میں قیمت ادا ہوتی ہے اور زیادہ تر کاموں کے لیے کٹائی کے وقت ہی اُجرت مل جاتی ہے یہ فطری ہے کہ پوری کھیتی کسان کے خاندان کو غذا سپلائی کرنے کی خاطر ہو۔ حمل ونقل کی آسانیاں جب پھیل گئیں تو گاؤں کا مستحکم کردار ٹوٹنے لگا اور اس سے زرعی معیشت بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہی۔ اس تبدیلی کا پتہ۔ کاشت ہونے والی بعض صنعتی فصلوں کے علاقہ میں تدریجی طور پر توسیع ہونے سے چلتا ہے اور اس امر سے بھی کہ مختلف ضلعوں میں خاص خاص فصلیں پیدا کی جارہی تھیں۔ برآمدی تجارت بڑھ گئی اور اس کے ساتھ ساتھ اندرونی تجارت نے بھی بڑی حد تک فروغ پایا۔ آبپاشی کا علاقہ بڑھنے سے بھی اس تحریک کو تقویت ملی لیکن اس تبدیلی کا پتہ صنعتی فصلوں کی کاشت کا علاقہ بڑھ جانے سے اتنا زیادہ نہیں چلتا جتنا کہ ان تبدیلیوں سے معلوم ہوتا ہے جو فصل کو بازار میں لانے کے طریقوں میں پیدا ہوئیں۔ مختلف فصلوں کا تناسب نہیں بدلا بلکہ کاشتکاری کی بُنیاد ہی بدل گئی ہے۔ آج کا کسان اپنے گھر کی ضرورت کی زرعی غذا پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتا جس طرح اسے اس زمانہ میں کرنی پڑتی تھی۔

(پچھلے صفحہ سے) ۱۔ کے۔ ایل۔ دت: "ہندوستان میں قیمتوں کے بڑھنے سے متعلق جانچ پڑتال کی رپورٹ" ج ا ص ۷-۱۶۹ (۱۹۱۴ء)، اس کے مقابل کیٹنگ کی کتاب زرعی ترقی، باب ہشتم دیکھئے اس کا خیال ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز سے اصل اجرت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔

جبکہ مواصلات ناقص تھے۔ اب وہ بڑی آسانی سے اپنی ضروریات کے لیے بازار چلا جاتا ہے اور اپنی فاضل پیداوار کو بھی وہاں جاکر بیچتا ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ گذشتہ صدی وسط سے پہلے ہر قسم کی زرعی پیداوار کے لیے مارکٹ نہ تھا۔ اس تجارت گری کے رجحان کو سب سے پہلے تقویت اس وقت ملی جب کہ روپیہ کی معیشت نقد لگان دینے کا طریقہ ختم ہوا اور نقدی لگان کا رواج ہوا۔ لگان کے علاوہ اس کا اثر یہ ہوا کہ کسان کو کٹائی کے فوراً بعد ہی اپنی پیداوار کا ایک حصہ بیچ دینا پڑتا تھا اور چونکہ اسی زمانہ میں اس کو قرض کا سود ادا کرنا واجب ہوجاتا تھا اس لیے وہ اپنی کل پیداوار کا ایک بڑا حصہ بیچ دیتا تھا۔ بہت سی صورتوں میں کسانوں کو سال کے آخر میں اپنے ساہوکار سے اناج کا کچھ حصہ خریدنا پڑتا تھا جو اس نے کٹائی کے وقت (جہاں یہ غلہ کا اناج ہوتا) اس کے ہاتھوں فروخت کیا تھا۔ اس طرح روپیہ کی معیشت آجانے اور بہتر مواصلات سے جس سے گاؤں کی زرعی پیداوار باہر بھیجنے میں آسانی ہوگئی۔ ہندوستانی زراعت کی تجارت گری کی تحریک پیدا ہوئی۔ جب کسان اپنے گھریلو استعمال کے لیے زیادہ کاشت کرتا تھا تب بھی بعض عجیب وغریب حالات کی وجہ سے اس کی پیداوار فصل کٹتے ہی مارکٹ میں آجاتی تھی زراعت کی تجارت گری زیادہ تر ایسے علاقہ میں بڑھی جہاں ملک سے باہر بھیجنے کے لیے فصلیں پیدا کی جاتی تھیں۔ یہی حال برما کے چاول کے علاقہ، پنجاب کے گیہوں کے علاقہ، مشرقی بنگال کے جوٹ کے علاقہ اور خاندیش گجرات اور برار کے کپاس کے علاقہ کا تھا۔ برآمد کرنے والوں کے انتظام کے ذریعہ فصل کو تیزی سے بندرگاہ تک لے جانے کا بازاری نظام پیدا ہوگیا تھا۔ برار کے کپاس والے علاقہ میں بہت سے ایسے مراکز ہیں جہاں فصل کٹتے ہی برآمد کرنے والوں اور مل کمپنیوں کی جانب سے کافی خریداریاں ہوتی ہیں۔ یہاں بالعموم خود کاشتکار ہی اپنی کپاس مارکٹ لاتے ہیں اور انھیں دلالوں سے سابقہ نہیں پڑتا۔ اس کے برعکس برما کی چاول کی تجارت سے متعلق بازاری نظام کا حال مسٹر نوئل پیٹن اس طرح بیان کرتے ہیں: "زیادہ تر صورتوں میں مقامی ساہوکار یا چھوٹے دلال یا مل مالکوں یا سٹہ بازوں کے ایجنٹ کھلیان ہی میں دھان خرید لیتے ہیں۔ چھوٹا مقامی ساہوکار جو جنگل کا دلال کہلاتا ہے ریلوے اسٹیشن پر تاجروں یا دوسرے سے پیشگی کی رقم لے لیتا ہے، اور وہ کھلیانوں میں جاجاکر اس دام سے کم پر خریدتا ہے جو وہ اپنے اصل خریدار سے اسٹیشن پاتا ہے"[1] تقریباً یہ تمام دھان کوٹنے کے لیے رنگون بھیجدیا جاتا تھا۔ کپاس

۱۔ ایف۔ نوئل پیٹن: برما کے چاول (۱۹۱۲ء)

اور جوٹ والے علاقوں میں مارکٹ کے یہ مراکز اسٹیم سے چلنے والی گانٹھ بنانے والی مشینوں کے لیے کشش رکھتے تھے۔ پنجاب اور صوبہ متحدہ میں بھی جہاں خام زرعی پیداوار کی برآمد کرنے سے پہلے کچھ نہیں کرنا پڑتا وہاں ہر ریلوے اسٹیشن برآمد کا مرکز بن گیا اور وہاں مقامی تاجر اور برآمد کاروں کے ایجنٹ کھنچ کر آتے تھے۔ حیدر آباد کی مردم شماری کی رپورٹ (۱۹۱۱ء) مرٹھواڑا کے کپاس کی کاشت میں غیر معمولی اضافہ کا حوالہ دیتے ہوئے بتاتی ہے کہ "جب کوئی ملک غذائی اجناس کے بدلے صنعت گری کا خام مال تیار کرنے لگتا ہے تو وہ صنعتی ہونے کی راہ پر چلنے لگتا ہے۔" یہ بیان پورے طور پر ہندوستان پر لاگو نہیں ہو سکتا کیونکہ غذائی اجناس کی بے دخلی زیادہ نہیں ہوئی حقیقتاً کچھ علاقوں میں صنعتی فصلوں نے غذائی اجناس کی جگہ لے لی لیکن دوسرے علاقوں میں غذائی اجناس کی حالت بہتر ہوگئی۔ ملک کے مختلف حصوں میں پیدا ہونے والی الگ الگ فصلوں کے تناسب میں کسی حد تک از سر نو تقسیم ہوئی اور خاص خاص فصلیں ان علاقوں میں زیادہ ہونے لگیں جہاں ان فصلوں کے لئے موافق حالات تھے۔ اس عمل کے نتیجہ میں یہ ضروری نہیں کہ صنعتی ہونے کا مرحلہ آجائے اور یہ بات مشکوک ہے کہ صنعتی کا یہ عمل ہندوستان میں کس حد تک ہوا ہے۔ لیکن زراعت کے تجارتی ہونے کا عمل یقینی طور پر شروع ہوا۔ پوری فصل کا کثیر حصہ گھر پر رکھے جانے کے بجائے اب مارکٹ میں آنے لگا۔ قدرتی طور پر یہ تحریک ان فصلوں میں نہ تھی جن کی داخلی یا بیرونی تجارت بڑی تھی لیکن جہاں اندرونی تجارت جیسے جوار کی فصلوں میں زیادہ اہم نہ تھی وہاں پھر بھی بعض حالات کی وجہ سے ایک بڑا حصہ مارکٹ میں آتا تھا۔

ان حالات میں سرکاری لگان اور مہاجنوں کے سود کی ادائیگی ہوتی تھی۔ ان دونوں قرضوں کو ادا کرنے کے لیے کسان فصل کٹتے ہی مارکٹ دوڑتا تھا اور اسے اپنی پیداوار کا بڑا حصہ ہر قیمت پر بیچنا پڑتا تھا۔ زیادہ تر غریب کسانوں کو تقریباً چھ مہینوں کے بعد فصل کا وہ حصہ خریدنا پڑتا تھا جسے انھوں نے فصل کٹتے وقت بیچا تھا۔ کٹائی کے وقت قیمت بہت کم ہوتی تھی، لیکن چھ مہینوں میں اتنی بڑھ جاتی تھی کہ کسانوں کے لیے اس قیمت پر خریدنا تباہ کن تھا۔[۱] مسٹر نوئل پیٹن کا خیال ہے کہ برما کے مہاجنوں کا منافع زیادہ تر چھ مہینوں میں قیمت کے بڑھنے پر منحصر تھا۔ کسان جب مارکٹ آتا تو وہ قرض میں اور اس طرح چند ہی برسوں میں وہ بالکل برباد ہو کر رہ جاتا۔

۱۔ ایف۔ نوئل پیٹن، ح۔ س۔ ہندوستانی گیہوں وغیرہ

قرض کی یہ لعنت ہندوستان کی کھیتی کی سب سے بڑی رکاوٹوں میں سے ایک ہے پچھلے باب میں اس قرض کے اسباب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کسان کے قرض کا مرکزہ اس کو اپنے ورثہ میں ملتا تھا اور موسموں کی اونچ نیچ سے یہ اور زیادہ بڑھتا تھا۔ یہ صرف دکن ہی میں نہ تھا کہ مطلق ملکیت کا حق مل جائے اور کسان کا زمین سے حق ہٹ جانے سے کسانوں کا قرض بڑھ گیا تھا۔ انہی اسباب سے پنجاب میں بھی یہی نتیجہ پیدا ہوا تھا! مسٹر اوڈوائر رو آئل سوسائٹی آف آرٹس کے سامنے اپنا مضمون پڑھتے ہوئے ان اثرات کی نشاندہی کرتے ہیں جو کسان کو اپنے زمین پر مکمل حق مل جانے سے پیدا ہوئے[۲] راجپوتانہ کی خاص ریاستوں کے حالات کا انگریزی سلطنت سے مقابلہ کرتے ہوئے یہ بتاتے ہیں کہ ان ریاستوں میں کسان کم مقروض ہیں اس لیے انھیں اپنی زمین پر مکمل حقوق نہیں ہیں۔ دکن کی بلوہ کمیٹی کی رپورٹ کے فوراً بعد یہ پتہ چلا کہ یہ حال تقریباً پورے ہندوستان کا ہے انیسویں صدی کے اواخر میں ہندوستان کے بہت سے حصوں میں قانون لاگو ہوا جس کی رو سے کسانوں کے اپنی زمین منتقل کرنے کے حق پر بہت سی پابندیاں عائد ہوگئیں۔ دکن کاشتکار ریلیف ایکٹ خاص تبدیلیوں کے ساتھ بمبئی پریسیڈنسی کے بہت سے دوسرے ضلعوں میں لاگو ہوا۔ دکن ایکٹ کی رو سے زمین کو منتقل کرنے پر براہِ راست پابندی نہ تھی لیکن نئے قانون جیسے صوبہ متوسط کے کاشت ایکٹ ۱۸۹۸ء (Central Provinces Tenency Act, 1898) کی دفعات جن سے سیر (گھریلو زمین) زمین کو منتقل کرنے کے حق پر پابندی آگئی یا پنجاب کے قانون انتقال آراضی (Zand Alienation Act, 1900) سے ایسی بندشیں ضرور آگئیں پنجاب کے قانونِ انتقال آراضی کے مطابق زرعی قبیلہ کے فرد کے نام زمین منتقل کی جاسکتی تھی مگر غیر زرعی قبیلہ کے فرد کے نام نہیں، آخر الذکر قبیلہ کے فرد پر پابندی تھی اس قسم کے قانون کا فوری نتیجہ یہ ہوا کہ ساکھ گھٹ گئی مثلاً دکن کاشتکار ریلیف ایکٹ کا سب سے پہلا اثر یہ ہوا کہ سود خوری کے کام کو بڑا نقصان ہوا اور چھوٹے ساہوکار مفلس ہوگئے[۳] اس کے یہ معنی بھی ہوتے ہیں کہ کسان اب اتنی آزادی سے قرض نہیں لے سکتا تھا جتنی کہ وہ ایکٹ پاس ہونے سے پہلے لیا کرتا تھا۔ پنجاب اور دوسری جگہوں میں جو ایکٹ پاس ہوئے اور پابندیاں آئیں

۱۔ ایس۔ ایس۔ تھوربرن، مسلمان اور ساہوکار (۱۸۸۸ء)

۲۔ اوڈوائر: زرعی حالات، وغیرہ، جنرل آف دی رو آئل سوسائٹی آف آرٹس (۱۸۹۹ء)

۳۔ دکن کاشتکار ریلیف ایکٹ، دو جلد (۹۶-۱۸۷۵) سے متعلق کاغذات

ان کے یہی اثرات پڑے۔ آخرالذکر قسم کے قانون کا بھی یہی اثر ہوا کہ زمین کا کثرت سے منتقل ہونا رُک گیا۔ پنجاب ایکٹ کاشتکاروں کا میگنا چارٹ کہا گیا ہے اس سے متعلق سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا ان قوانین سے مقروضیت رُک گئی۔ ایسا نہیں لگتا کہ ان قوانین نے بڑے پیمانے پر کام کیا ہو جہاں کسانوں پر زمین الگ کرنے پر براہِ راست پابندی تھی وہاں ان قوانین کے زیر اثر بیدخلی کم ہوئی۔ مختلف دفعات سے مجسٹریٹ کو قرض کی پوری تاریخ جاننے اور سمجھنے کا مرضی کے مطابق اختیار مل گیا تھا جس سے مہاجنوں کے مکارانہ طریقے رُک گئے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ کاشتکاروں کو قرض دینے سے پہلے مہاجنوں کو معقول ضمانت دینے یا زمین کو گروی رکھنے کی ضرورت پڑتی تھی۔ اس نے اس کی کچھ بدترین صورتوں کو بدل دیا لیکن کاشت کا قطعہ بہت مختصر ہوا اور موسم میں بہت ردو بدل ہوں تو ایسی صورت میں کسانوں کی قرض کی ضرورت اتنی ہی شدید رہی جتنی کہ پہلے تھی۔ صرف ناموافق موسم ہی میں ان کا قرض نہیں بڑھتا تھا۔ خوشحالی کے زمانہ میں بھی ان کے قرض میں اضافہ ہوتا تھا۔ کپاس کی گرم بازاری کے زمانہ میں خوشحالی کے ساتھ ساتھ قرض کے لئے آسانی ہوگئی جس سے دکن کے کاشتکار بری طرح قرض میں ڈوب گئے[۱]۔ اس صدی کے آغاز سے پنجاب نے خوشحالی کا دور دیکھا[۲]۔ بہت سی جگہوں میں خوشحالی کے ساتھ ساتھ قرض کی لعنت بھی آگئی جس سے ہمت پست ہوگئی۔ خوشحالی کے معنی کرایہ اور زمین کی قیمت میں مستقل اضافہ کے بھی ہوتے ہیں۔ زمین دار کاشتکار جب دیکھتا ہے کہ اس کی ساکھ بہت بڑھ گئی تو وہ اس سے پورا فائدہ اٹھانے میں ذرا بھی پس وپیش نہیں کرتا۔ اس کے تباہ کن اثرات کے مقابلہ میں بعض سمتوں میں ساکھ کو منفی طور پر کم کر دینے کا اثر نہیں ہوتا حقیقت یہ ہے کہ بعض حالتوں میں ایسی پابندیوں سے کسانوں پر قرض کا قطعی اثر پہلے کی بہ نسبت زیادہ خراب پڑا۔ جس چیز کی ضرورت تھی اور جس سے برائی واقعی ختم ہوسکتی تھی وہ ان شرائط کی مثبت اصلاح تھی جن پر قرض ملتا تھا اور اس سے ان مقاصد پر اچھا اثر پڑتا تھا جن مقاصد کے لیے وہ قرض طلب کرتے تھے۔ کسی بھی قانون سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا تھا۔ اس کا واحد اور کامیاب علاج یہ ہے کہ کوآپریٹو کریڈٹ سسٹم کی اشاعت ہو اور کاشتکاروں میں امداد باہمی کا جذبہ پھیل جائے۔

مہاجنوں نے پرانے کاشتکاروں کو کس حد تک بیدخل کر دیا تھا اس کا پتہ لگانا ناممکن ہے۔ اس سلسلہ میں صرف رہن کے اعداد وشمار مرتب ہوئے ہیں وہ بھی ناتمام ہیں۔ عمومی رپورٹ سے یہ معلوم ہوتا ہے

۱۔ اوپر دیکھیں، باب دوم

۲ ایم۔ ایل۔ ڈارلنگ: "پنجاب میں خوشحالی اور قرض" انڈین جنرل آف اکنامکس (جنوری ۱۹۲۱ء)

کہ گذشتہ صدی کے اواخر تک یہ عمل برابر بڑھتا جا رہا تھا۔ آبادی کا اضافہ ایک اہم عنصر تھا انیسویں صدی کے اوائل میں جب زمین کافی تھی اور مزدور کی قلت تھی اس وقت مہاجنوں کو زمین لینے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ۱۸۶۰ء تک یہ صورت حال نہ تھی۔ زمین کی قیمت برابر بڑھنے لگی اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسی وقت سے زمین کسانوں کے ہاتھ سے نکل کر مہاجنوں کے ہاتھ میں جانے لگی۔

اس صدی کے آغاز میں سرکار نے ان جگہوں میں اس تیز عمل کو روکنے کا اقدام کیا جہاں اثرات سب سے زیادہ نمایاں تھے جیسے صوبہ متوسط، پنجاب، بندیل کھنڈ وغیرہ۔ ان پرانے مالکوں کی بیدخلی ہنوز جاری ہے گرچہ اس کی رفتار قانون کے زیر اثر رک گئی ہے۔ اس عمل کے اثرات واقعی ہندوستان میں برے تھے ملک کے زیادہ تر حصوں میں ساہوکار کاشتکار نہیں ہوتا اور جہاں زمین کاشتکار کے ہاتھ میں آ بھی جاتی ہے تو بھی اس منتقلی سے کاشت کے طریقہ میں بالعموم کوئی فرق نہیں پڑتا۔ زیادہ تر صورتوں میں وہی پرانا کاشتکار کھیتی کرتا ہے مگر اب وہ اپنے قرض کے سابق کے عوض زیادہ لگان ادا کرتا ہے۔ اس منتقلی سے صرف یہی فرق ہو جاتا ہے کہ زمین کا جو اصلی کاشتکار ہے اس کا حال پہلے کی بہ نسبت زیادہ سقیم ہو جاتا ہے اور اچھی کھیتی کرنے کے لیے پہلے جو امنگ تھی وہ اب بالکل ختم ہو گئی اس لیے کہ اس عمل سے ہندوستان میں جیسا کہ دوسرے ملکوں میں ہوا کاشت کی اکائی میں استحکام اور توسیع نہیں ہوتی اس سے صرف یہ ظاہر ہے کہ کھیتی کے منافع کی تقسیم کسی قدر بدل گئی ہے۔ جہاں ایک مالک کے ماتحت زمین کافی اور ایک جگہ تھی وہاں بھی وہ مختلف پلاٹ میں بٹ جاتی تھی اور وہ چھوٹے چھوٹے کاشتکاروں کو کرایہ پر دے دی جاتی تھی۔ اگر کاشت کا اصلی یونٹ (جو ہندوستان کے مختلف حصوں میں الگ الگ زمین رکھنے والوں کے اوسط رقبہ سے بہت مختلف ہوتا تھا) ایک چھوٹا قطعہ زمین رہ جائے تو یہ تسلیم کر لینا ضروری ہے کہ جو کاشت زمین کے مالک کاشتکار سے ہوگی وہ محض کھیت جوتنے والے کسان سے بہتر ہوگی۔ اس کا بجز خراب اثر اس وجہ سے اور رہا کہ ملک کے زیادہ تر حصوں میں زمین دار یہ نہیں چاہتے تھے کہ طویل المدت پٹہ دیا جائے اس لیے زیادہ تر کسانوں کا حال یہ ہوتا تھا کہ وہ کسان محض مرضی پر رہ جاتے تھے[1] صورت حال یہ تھی کہ ان کاشتکاروں کی کمی برابر بڑھ رہی تھی جو زمین کے مالک ہوں اور اچھی کھیتی کریں۔ اس طرح زمین کے مالک کاشتکار کے جوتنے والے کسان کی حیثیت میں بدل جانے کی رو بڑی افسوس ناک تھی۔ اس طرح بے کھیت مزدوروں کی بڑھتی ہوئی تعداد میں سے ایسے

۱۔ این۔ جی گنگولی: آگرہ کے آسامیوں کی شکایات (۱۹۱۵ء)

جوتنے والے کسان لے لیے جاتے تھے جو ان مالکوں کی مرضی کے غلام ہوں۔
یہ کہا گیا ہے کہ کاشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی وجہ سے ہی قرض زیادہ بڑھا۔ اس سے زمین کی مزید تقسیم اور اس کے اور زیادہ ٹکڑے (Fragmentation) ہونے کا سوال اُٹھتا ہے جو ہندوستان میں ابھی اہم سوال بن گیا ہے۔ یہ بار بار کہا گیا ہے کہ آج ہندوستان کی اوسط کاشت کا سائز غیر اقتصادی (Uneconomic) ہے۔ برودا کمیٹی نے اقتصادی کاشت کی تعریف یہ کی ہے کہ یہ ایک ایسا قطعہ زمین ہے جو ایک عام کاشتکار خاندان کی مجموعی محنت سے اچھی طرح جوتا جا سکے۔ اس تعریف میں نقص نکالنا آسان ہے لیکن جب تک خاندان کی یہ اکائی کم وبیش محنت کی اس اکائی کے برابر رہے گی جو اس کی کاشت کے کاموں کے لیے حاصل ہے۔ اس وقت تک یہ تعریف معقول نظر آتی ہے۔ بدقسمتی سے ایک اوسط قطعہ زمین ہندوستان کے بہت سے حصوں میں کاشتکار خاندان کے ہر فرد کو مزدوری نہیں دے سکتا تھا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس کے کچھ لوگ دوسرے کاموں میں لگ جائیں گے اور اس طرح خاندان کی آمدنی میں اضافہ کریں گے۔ ہندوستان میں ایسا ہی ہوتا ہے جہاں اسے دوسرے روزگار آسانی سے ملتے ہیں[1]۔ لیکن ملک کے بہت سے حصوں میں زرعی محنت کے سوا کوئی دوسرا روزگار نہیں ملتا۔ اس قسم کے زرعی مزدوروں کی اجرت علاوہ کٹائی کے وقت کے[2]، اتنی کم ہوتی ہے کہ خاندان کی آمدنی میں اضافہ بہت ہی قلیل ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خاندان کی ساری محنت اسی چھوٹے قطعہ زمین میں صرف ہوتی ہے مگر پھر بھی اس کھیتی سے اتنا فائدہ نہیں ہوتا کہ کاشتکار اور اس کے خاندان کا گذارہ ہو سکے۔ اس قطعہ کاشت کا ایک دوسرا خراب پہلو بھی تھا۔ یہ صرف چھوٹا ہی نہیں ہوتا تھا بلکہ بکھرا بھی ہوتا تھا مثلاً پانچ ایکڑ کا قطعہ زمین کئی ٹکڑوں میں گاؤں کے مختلف حصوں میں بکھرا رہتا تھا[3]۔ اس سے بھی کاشتکاری اور

۱۔ ڈاکٹر ایچ۔ ایچ۔ مان: دکن کے گاؤں میں زمین اور مزدور (نمبر ۱، پمپلہ سوداگر (اسی گاؤں کا بیان ہے) کے مزدوروں کا بڑا حصہ کرکی کے ورکشاپ میں کھنچ کر آجاتا تھا جو پاس ہی میں تھا۔

۲۔ لیکن کٹائی کے وقت کاشتکار کو اپنے خاندان کی ساری محنت کی ضرورت ہوتی تھی۔

۳۔ اس مزید تقسیم اور اجزا کاری کے لیے ڈاکٹر مان کی دوسری دیکھئے، اس کے علاوہ جی کیٹنگ کی کتاب مغربی ہندوستان میں زرعی ترقی، ضمیمہ ۱ اور ایچ۔ ایس۔ جیونس، صوبہ متحدہ میں زرعی کاشت کا استحکام دیکھئے۔

بھی غیر کفایت شعار ہو جاتی تھی کیونکہ اس طرح زمین کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے کاشتکار کے پاس جو بھی سرمایہ ہوتا وہ پورے منافع بخش طور پر استعمال نہیں ہو سکتا تھا۔

ہندوؤں کا قانون وراثت جس کی رو سے باپ کی جائداد اس کے تمام بیٹوں میں برابر تقسیم ہوتی ہے وہ مزید تقسیم اور زمین کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے (Fragmentation) کی افسوس ناک تحریک کا ذمہ دار قرار دیا گیا۔ یہ معلوم ہوگا کہ مزید تقسیم (Subdivision) کی یہ تحریک واقعی سب سے زیادہ مضر تھی کیونکہ جب کسی وقت زمین کے ان الگ الگ ٹکڑوں کو گاؤں میں ایک ساتھ کر بھی دیا جائے تو بھی تھوڑے عرصہ بعد ٹکڑے ٹکڑے ہونے کا عمل برابر جاری رہے گا اور یہ برائی ختم نہ ہوگی۔ یہ بالعموم تسلیم کر لیا گیا ہے اور ان برائیوں کو دور کرنے کے لیے جو قوانین بنائے گئے ہیں ان میں سے زیادہ تر مزید تقسیم کے اسی عمل کو روکتے ہیں۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ہندوؤں کا قانون وراثت اس برائی کا بڑی حد تک ذمہ دار ہے تو بھی اصلی وجہ کہیں اور ضرور تلاش کرنی چاہئے۔ یہ خیال کرنا چاہئے کہ ساری جائداد کو بیٹوں میں برابر تقسیم کرنے کا ہندوؤں کا یہ قانون کوئی انوکھا نہیں ہے کسی قدر اسی قسم کے قانون بعض یورپین ملکوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ یہاں بھی زمین کی بیٹوں میں تقریباً اسی طرح تقسیم ہوتی ہے لیکن ان ملکوں میں مزید تقسیم (Subdivision) کا عمل اتنا نہیں ملتا جتنا کہ ہندوستان میں ہے۔ بلجیم کی مثال لیں۔ یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ چھوٹے چھوٹے قطعہ کاشت کا ملک ہے۔ یہاں مزید تقسیم زیادہ نہیں ہوتی چونکہ جائداد کو بیٹوں کے درمیان مشترکہ رکھنے کا رواج ہے نہ کہ تقسیم کرنے کا اور ان میں سے ایک کھیتی کرتا ہے اور دوسرے بھائیوں کو اس کا کرایہ دیتا ہے۔ مسٹر راؤن ٹری کہتے ہیں: "اگر یہ رواج نہ ہوتا تو جائداد کی تقسیم جلد ہی بہت زیادہ ہو جاتی اور یہ نقصان دہ ہوتی"[1] ہندوستان میں ایسا رواج نہیں اس کو یہ ہندوستانی کسانوں کی رجعت پرستی یا ضد کہہ کر تاویل نہیں کر سکتے۔ جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ کسان اپنی آمدنی کو بڑھانے کے لیے دوسرے کام بھی کرنا چاہتا ہے اگر وہ مل جائے لیکن جب ایسا روزگار موجود نہ ہو تو اسے ملزم نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اگر وہ بے زمین مزدور ہو کر باپ کے جائداد کا حصہ مانگنے پر مصر ہو۔ واقعی یہ ایک اہم پہلو ہے لیکن پھر ہم یہ شور مختلف جگہوں سے سنتے ہیں کہ زرعی مزدوروں کی قلت ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ قلت کی شکایت صرف کٹائی کے وقت ہوتی ہے یہ ایک حد تک اس وجہ

۱۔ آر۔ سیبم راؤن ٹری: زمین اور مزدور، بلجیم کے نتائج، باب چہارم ص ۴۷

سے ہے کہ چھوٹے کاشتکار اور اس کے خاندان کے فاضل کام کرنے والے کٹائی کے وقت نہیں ملتے جب کہ دوسرے وقت مل جاتے ہیں۔ مسٹر کیٹنگ نے اس قلت کے تین دوسرے اسباب بتائے ہیں![1] اول یہ ہے کہ کاشت کا علاقہ بڑھ گیا ہے۔ دوم یہ کہ شہری صنعتوں کی ترقی ہوئی ہے۔ اگر ہم پورے ہندوستان کو پیش نظر رکھیں تو دوسرے سبب کو قابل لحاظ سمجھنا مشتبہ لگتا ہے۔ بعض حصوں میں مزدوروں کی سپلائی ہجرت کی رو سے متاثر ہو جاتی تھی۔ یہ خاص طور پر مدراس پریسیڈنسی کے بعض حصوں کا حال تھا جہاں سے کافی مزدور لنکا اور ملیشیا کی آبادیات میں چلے جاتے تھے۔ سماجی حالات مزدوروں کو ہجرت کرنے کی بڑی ترغیب دیتے تھے۔ مسٹر کیٹنگ نے تیسری وجہ بھی بتائی ہے اور یہ وجہ بڑی اہم ہے۔ وہ وجہ یہ ہے کہ جب ایک بڑا کاشتکار اس لائق ہو جاتا ہے تو وہ اپنے خاندان کی مدد سے کھیتوں میں کام کرنے کا رواج ترک کر دیتا ہے اور وہ مزدوری پر آدمی رکھ کر کھیتی کا کام کراتا ہے۔ اگر یہ بیان سارے ہندوستان کے لیے صحیح تھا اور ایسی تحریک ہمہ گیر تھی تو زرعی مزدوروں کی قلت کا یہی ایک بڑا سبب ہوگا۔ پھر بھی کٹائی کے وقت زرعی مزدور کی جو قلت ہوتی تھی وہ اس مفروضہ کو غلط ثابت نہیں کر سکتی کہ کھیتوں میں کام کرنے والوں کی تعداد کھیتوں سے اچھی طرح گذر اوقات ہونے والی تعداد سے زیادہ تھی۔

مختصر یہ کہ ہندوستان کی زراعت میں رونما ہونے والی تین اہم تبدیلیوں کی طرف اشارے کیے گئے ہیں۔ اس پر زیادہ زور نہیں دیا جا سکتا کہ یہ تمام رجحانات بڑی سُست رفتار سے کام کر رہے تھے اور پھر ان کی ترقی کی حد متعین کرنا ناممکن ہے۔ یہ تبدیلیاں پہلی شکل میں یہ تھیں کہ زراعت تجارتی ہو رہی تھی جو خود ایک مفید تحریک تھی کیونکہ اس سے فصلوں کی کسی قدر مناسب تقسیم عمل میں آگئی اور کاشتکاری کے منافع میں بھی اضافہ ہو گیا اور یہ حمل و نقل کے بہتر ذریعوں کا ہی نتیجہ تھا دوسرے دو رجحانات (یعنی پرانے زمین مالکوں کی بیدخلی اور زمین کی بیحد مزید تقسیم) سے عام کاشتکار بری طرح متاثر ہو رہے تھے ان دونوں رجحانات میں آبادی کا اضافہ ایک اہم عنصر تھا اور اہم صنعتی ترقی کی غیر موجودگی بھی بڑی حد تک ذمہ دار تھی زمین پر اتنے لوگوں کے انحصار سے بھی زرعی تحریک بری طرح مجروح ہوئی۔ بڑے پیمانہ پر کھیتی ایسی جگہوں پر نہیں ہو سکتی تھی جہاں مالگذاری زیادہ ہو اور چھوٹے قطعہ زمین کے لیے مقابلہ شدید۔ کیونکہ مسٹر راؤن ٹری نے

۱۔ کیٹنگ، ح۔س، باب ہشتم

ٹھیک ہی بتایا ہے ان ملکوں میں جہاں زمین کی مزید تقسیم بہت ہوئی ہو وہاں دوسری جگہوں کی بہ نسبت زمین کا لگان اور قیمت زیادہ ہوتی ہے[۱] اس لیے زمین رکھنے والوں کے لئے زمین کو چھوٹے پلاٹ کر کے کرایہ پر دینا بڑے پیمانہ کی کاشت کرنے سے زیادہ سود مند تھا۔ دوسرے طور سے بھی کاشتکاری کے بہتر طریقہ کی رفتار ترقی دھیمی پڑ گئی اس کا اندازہ ہمیں اس وقت ہوگا جب ہم یہ غور کریں کہ زیادہ تر ملکوں میں زراعت میں مشین کا استعمال زرعی مزدور کے گراں ہونے سے ہی ہوا ہے۔

۱۔ راؤن ٹری، ح۔س۔ باب چہارم

بارھواں باب

دیہات کے کاریگر

ہندوستان کے قدیم اقتصادی ڈھانچہ میں دیہات کے کاریگروں کی پوزیشن بالکل متعین تھی۔ شہری دستی صنعتیں گرچہ ان کی صنعتی تنظیم میں بڑی ترقی ہوئی تھی پھر بھی تعداد کے لحاظ سے غیر اہم تھیں اس لیے قدیم ہندوستان میں دیہات کے کاریگر تعداد کے اعتبار سے اہم ترین صنعتی کاریگر تھے۔ جیسے زمانہ گذرتا گیا کاریگروں کی یہ نمایاں پوزیشن ختم ہونے لگی لیکن آج بھی (۱۹۲۴ء) ہندوستان کی بیشتر صنعتی آبادی دیہات کے کاریگروں پر مشتمل ہے۔ اگر اس تعداد میں نمایاں کمی نہیں ہوئی لیکن اس کے برعکس اس کی اہمیت باقی نہیں رہی اور پرانی واضح پوزیشن بھی برقرار نہ رہی اور آج غیر مستقل ہے۔

جیسا کہ پہلے باب میں بتایا گیا ہے گاؤں میں سبھی کاریگر اس قسم کی پوزیشن نہیں رکھتے تھے۔ کاریگروں کی ایک جماعت تھی جس میں گاؤں کے ملازم آتے تھے اور دوسرے وہ جو آزاد تھے ان دو جماعتوں کے رتبہ میں کیا فرق تھا اس کی پوری وضاحت حسب ذیل اقتباس سے ہوتی ہے: "گاؤں کے ادنیٰ ملازم اور آزاد کاریگر میں واضح فرق ملتا ہے۔ بڑھئی، لوہار، کمہار، مہتر اور گاؤں میں جہاں عورتیں پردہ کرتی ہیں، دھوبی ان تمام جماعتوں کو جن کی خدمات روزمرہ گھریلو زندگی یا کاشتکاری میں لازمی تھیں انھیں ان کے کام کی نوعیت سے اجرت نہیں ملتی تھی بلکہ انھیں کھیت کی پیداوار کا متعین حصہ مزدوری کے طور پر ملتا تھا اور جن خدمات کا انجام دینا ان کے لیے ضروری تھا وہ مقدار سے نہیں بلکہ جنس سے ناپی جاتی تھیں۔۔۔ لیکن وہ کاریگر جن کی خدمات کبھی کبھار درکار ہوتی تھیں جیسے بنکر، تیلی، رنگریز انہیں کام کی نوعیت سے اجرت ملتی ہے بالعموم یہ نقد نہیں بلکہ جنس میں ہی ملتی ہے یا انہیں خام اشیاء کا متعین حصہ رکھنے کی اجازت ہوتی ہے جو اس کے مالک کام کرنے کے لیے دیتے ہیں"۔[1] اس سے دو

۱۔ پنجاب کی مردم شماری کی رپورٹ ص ۳۰۷ (۱۸۸۱)

جماعتوں کے کاریگروں کے رتبہ کا فرق واضح ہو جاتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ دیہی معیشت میں رتبہ کے اس فرق کے معنی اقتصادی پوزیشن کے فرق کے ہیں۔ دو جماعتوں کے اس فرق سے ان کی باہمی اقتصادی حالت کا اتنا زیادہ پتہ نہیں چلتا جتنا کہ ادائیگی کے طریقہ اور ان کی خدمات کی اجرت کے وقت کا پتہ چلتا ہے۔ اول الذکر جماعت کو واضح فائدے حاصل تھے اس لیے ان کی آمدنی متعین تھی اور مستقل لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کس حد تک واقعی سود مند تھا۔ یہ صحیح ہے کہ فصل بالکل خراب ہو جانے پر گاؤں کے بنکر اور رنگ ریز کو کوئی کام نہیں ملتا اور بھوکا مرنا پڑا لیکن ادنیٰ ملازم طبقہ کا بھی حال بہت بہتر نہ تھا کیونکہ فصل بالکل خراب ہونے پر پیداوار میں ان کا حصہ بھی بہت کم ہو جاتا تھا حقیقت یہ ہے کہ دونوں جماعتوں کا فرق صرف آسانی کے لیے پیدا کیا گیا تھا اور گاؤں کے تمام کاریگروں کی خوشحالی کسانوں کی خوشحالی پر واضح طور پر منحصر تھی اور پورے گاؤں کی خوشحالی صرف ایک بڑی حقیقت یعنی زرعی موسم کی نوعیت پر منحصر تھی۔

جس طرح تمام کاریگر گاؤں کے ملازم طبقہ میں شامل نہیں تھے اسی طرح گاؤں کا ملازم طبقہ صرف کاریگروں پر مشتمل نہ تھا۔ بعض حالتوں میں کئی پیشے ملے جلے رہتے تھے اس لیے یہ بتانا مشکل ہے کہ کون اصلی کاریگر ہے۔ مرہٹہ کے مہار لوگوں کی مثال لیجئے۔ اس کی پوزیشن گاؤں کے چوکیدار کی تھی اس حیثیت سے اس کے پاس تھوڑی سی زمین ہوتی تھی لیکن اس کی زندگی زیادہ تر گاؤں کے چندہ پر بسر ہوتی تھی اور سب سے پہلے یہی بے زمین مزدور طبقہ بھی شامل ہوا۔ اس میں کاریگر ہونے کی کوئی خصوصیت نہ تھی لیکن پھر بھی بہت سی جگہوں میں مہار بھی موٹے کپڑے بنتا تھا۔ کمہار بھی کاریگر تھا لیکن چونکہ ملک کے بہت سے حصوں میں اسے کام کے لیے گدھا رکھنا پڑتا تھا اس لیے عموماً وہ گاؤں کا بوجھ اٹھانے والا بھی ہوتا تھا۔ چمار اکثر دن میں مزدوری بھی کرتا تھا ان مشکلوں کے باوجود خالص کاشتکاروں کے علاوہ گاؤں کی آبادی کی تین واضح جماعتیں ہو سکتی ہیں سماجی اور معاشی اعتبار سے ان میں بلند ترین درجہ پجاری اور مہنت کی جماعت کو حاصل تھا اس کے بعد کاریگروں میں لوہار، بڑھئی، تیلی، بنکر، کمہار اور چمار آتے تھے۔ آخر میں چوکیدار، مہتر وغیرہ جیسے گاؤں کے ملازم آتے تھے اور یہ جماعت غیر تربیت یافتہ مزدور جماعت تھی اور جہاں ان کے پاس تھوڑی بہت جو زمین بھی ہوتی تھی وہ ان کی ضروریات کے لیے ناکافی تھی۔ وہ زیادہ تر مزدور تھے گرچہ وہ کبھی کبھار اس قسم کا کام بھی جیسے موٹے کپڑے بنا، ٹوکری یا چٹائی بنانا کر لیتے تھے۔

نصف صدی سے زائد اس مدت میں جو تبدیلیاں اس ڈھانچہ میں آئی ہیں وہ بہت زیادہ غیر معمولی

نظر نہیں آتی ہیں۔ زیادہ تر پرانے کاریگروں کو آج واجبات مل رہے ہیں! کاموں کے لیے ادائیگی آج بھی زیادہ تر جنس میں ہوتی ہے۔ آج گاؤں میں کاریگروں کے پاس وہی سازوسامان ہیں جو اسے پہلے حاصل تھے اس لیے یہ تبدیلی، خواہ اس کی نوعیت یا وسعت جیسی بھی رہی ہو، انقلاب انگیز نہیں ہے لیکن تبدیلی کی سمت واضح ہے۔ یہ رجحان نہیں رہا ہے کہ واجبات اور خدمات بالکل معدوم ہو جائیں لیکن مروجہ واجبات کاریگر کی آمدنی میں پہلے کی نسبت بہت کم حصہ لے رہے ہیں۔ یہی بات زمین کے پلاٹ کے بارے میں صحیح ہے جو موروثی طور پر کاریگر کے پاس رہا کیا تھا۔ اس کی اہمیت بھی کم ہو گئی ہے پھر آج کا کاریگر گاؤں چھوڑنے کے لیے زیادہ آمادہ ہو گیا ہے۔ یہ تمام علامات اس بات کی ہیں کہ وہ رشتے اب ٹوٹ گئے ہیں جو ایک زمانہ میں اس جماعت کو متحد رکھتے تھے۔ گاؤں کے بزرگوں کی مجلس یعنی پنچایت کی اہمیت آہستہ آہستہ ختم ہو رہی تھی اس سے بھی وہ رشتے بڑی حد تک ڈھیلے پڑنے لگے ہیں لیکن مواصلات کی آسانی اور گاؤں سے باہر ان اشیا کی دستیابی کے امکان سے جو پہلے گاؤں ہی میں ملتی تھیں تمام کاریگروں کو گاؤں ہی میں رکھنے کی ضرورت اب کم محسوس ہونے لگی۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ان کی خدمات سے پیچھا چھڑا لیا گیا ہے لیکن اس نے اس تحریک کو خاص طور پر تقویت دی کہ کاریگروں کو کام کی مزدوری ملے نہ کہ سال بھر کا معاوضہ۔ فصل کی کٹائی میں جو حصہ ملتا تھا اس کی اہمیت رفتہ رفتہ گھٹنے لگی اور کام کے ذریعہ ادائیگی اب زیادہ ہونے لگی ابھی تک یہ تبدیلی مکمل طور پر نہیں ہوئی ہے مواصلات کی سہولت کی بنا پر خاص خاص کاریگر کچھ بڑے گاؤں اور قصبوں میں اکٹھا ہونے لگے۔ کیونکہ اب کوئی چیز باہر سے گاؤں میں لائی جا سکتی تھی جس کی فراہمی کے لیے گاؤں کا آدمی ہفتہ وار بازار کا انتظار کر سکتا تھا اس لیے خود کاریگر کی موجودگی اب اس جگہ ضروری نہ تھی۔ کاریگروں کے جزوی طور پر ایک جگہ ہونے کی تحریک کو دو عناصر متعین کرتے ہیں۔ (۱) کسانوں کی فوری ضروریات (۲) آمدورفت کی آسانی۔ ان دونوں شکلوں میں لوہار اور بڑھئی کی گاؤں میں ضرورت تھی۔ دونوں میں سے کسی ایک کی ضرورت کھیتی کے اوزار مرمت کے لیے ہو سکتی تھی۔ کمہاروں کے برتن دور سے نہیں لائے جا سکتے تھے اس لیے کہ وہ بڑے نازک ہوتے ہیں۔ چمار کی موجودگی خاص طور پر ایسے حصوں میں ضروری تھی،

۱۔ "بڑھئی، لوہار، دھوبی، حجام، کمہار وغیرہ ابھی بھی واضح فرائض اور اجرت کے ساتھ گاؤں کے ملازم کی حیثیت سے موجود ہیں" جے۔ ٹی۔ مارٹن، صوبہ متوسط کی مردم شماری کی رپورٹ (۱۹۱۱)

الگ جائزہ لینا ضروری ہے۔

پہلے لوہار اور بڑھئی کا جائزہ لیں۔ کاریگروں کی ان دونوں جماعتوں میں بڑی مشابہت تھی اور ہندوستان کے بہت سے حصوں میں ان کے پیشے آپس میں بدلتے رہتے تھے۔ وہ دونوں زرعی کاموں کے لیے ضروری تھے کیونکہ ان دونوں کا خاص کام کھیتی کے اوزار بنانا اور ان کی مرمت کرنا تھا۔ گاؤں کے لوہار کا کام ہمیشہ موٹا اور بھونڈا ہوا کرتا تھا اور ترقی یافتہ شکل کے اوزار کے استعمال کرنے میں مشکل یہ درپیش ہوتی تھی کہ لوہار اس کی مرمت کرنے سے معذور تھے۔ زرعی اوزار بنانے کے علاوہ وہ گھریلو استعمال کے بعض سامان اور دوسرے کاریگروں کے اوزار بناتا تھا۔ بیرونی حالات سے گاؤں کے لوہار کی پوزیشن زیادہ متاثر نہیں ہوئی تھی۔ اس نے کبھی کوئی بڑا اریجنل کام نہیں کیا تھا وہ صرف مرمت کے کام کیا کرتا تھا اور ایسے کاموں کی مانگ بہت ہی مستقل تھی۔ اس کے علاوہ گاؤں کے لوہار کی مانگ بھی بڑھ نہیں رہی تھی جبکہ شہروں کی صنعتوں میں جہاں لوہار کی ضرورت ہوتی تھی وہاں مانگ بڑھ رہی تھی۔ مثلاً شمالی ہندوستان میں چھری چاقو کی تجارت بڑھ رہی تھی اور تقریباً پورے ہندوستان میں انجینئرنگ ورکشاپ اور لوہے ڈھالنے کا کام ترقی پا رہا تھا۔ ا یہ ٹھیک طور پر معلوم نہیں کہ اس مانگ کو پورا کرنے کے لیے گاؤں کے لوہار کے شہر جانے کی کوئی تحریک تھی یا نہیں لیکن یہ کسی صورت میں بھی نمایاں طور پر نہ تھی۔ جب بھی وہ شہر جاتا اس کی پوزیشن یقینی بہتر ہو جاتی تھی۔ اس عرصہ میں لوہار کی حالت کم و بیش یکساں رہی ہاں شہر کے لوہار کا حال ضرور بہتر ہوا۔ اس لیے فطری طور پر گاؤں کے دوسرے کاریگروں کے ساتھ وہ زیادہ سے زیادہ کام کرنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ اس کے کام کی مانگ بڑھ نہیں رہی تھی۔ اور گاؤں کے لوہار کی تعداد میں اضافہ کے معنی تھے کہ ان میں کچھ لوگ دوسرے پیشوں کی طرف جائیں۔

بڑھئی کی دیہی معیشت میں پوزیشن اسی قسم کی تھی لیکن وہ لوہار سے مرمت کا کام کرتا تھا اور خود کوئی چیز بنانے کا کام زیادہ۔ اس کی پوزیشن یہاں بدتر ہوگئی۔ گنا پیرنے والی لوہے کی مشین کی وجہ سے گنا پیدا کرنے والے علاقہ میں اس کی پوزیشن بڑی کمتر ہوگئی۔ لوہے کے ہل آنے سے بھی یہی حال ہوا لیکن چونکہ یہ تحریک بہت عام نہ تھی اس لیے اس کا اثر زیادہ نہیں ہوا۔ پھر بھی جہاں جہاں زرعی کاموں کے لیے مشینوں کا استعمال ہو رہا تھا وہ بڑھئی کی پوزیشن گر بڑا رہی تھی اس طرح بنگال کی مردم شماری رپورٹ (۱۹۰۱ء) بڑھئی کو گاؤں کے ایسے کاریگروں میں شامل کرتی ہے

جہاں کنواں سے سینچائی ہوتی ہے اور چمڑے کے ڈول عام ہیں۔ ان تمام کاریگروں میں بنکر کی حاجت اس نقطۂ نظر سے سب سے کم ہوتی تھی۔ کپڑے کی ضرورت کچھ وقت کے لیے ٹالی جاسکتی تھی اور بنکر کا مال دور دراز بازار سے آسانی سے لایا بھی جاسکتا تھا۔ اس لیے کاریگروں کی جماعت میں بنکر ہی سب سے پہلے نظر آتے ہیں جو بڑے شہروں میں اکٹھا ہوتے نظر آتے ہیں۔ یہی حال رنگ ریزوں کا تھا، پھر یہ بات تھی کہ بنکر بھی رنگنے کا کام کرتے تھے۔ سُنار کی بھی ایک مثال ہے۔ ان علاقوں کے علاوہ جہاں وہ مہاجنی بھی کرتے تھے۔ سناروں میں مجتمع ہونے کا رجحان خاص طور پر نمایاں تھا۔[۱] مواصلات کی آسانی سے کاریگروں کے مجتمع ہونے کے اس رجحان کے علاوہ دو دوسرے اسباب بھی تھے جن سے کاریگروں کے طبقہ میں تبدیلی آرہی تھی۔ یہ دونوں رجحانات ان تمام صورتوں میں نمایاں تھے جہاں بیرونی مقابلہ یا دوسرے اسباب سے صنعت کا حال پست تھا۔ یہ رجحانات اس قسم کے تھے کہ کاریگر اپنے پیشہ سے نکل کر دن بھر مزدوری کرنے والوں کی جماعت میں شامل ہوجاتے یا روزگار کی تلاش میں شہر کو جانکلتے مگر شہروں میں بھاگ نکلنے کے امکانات بہت محدود تھے۔ دن بھر مزدوری کرنے والا طبقہ گاؤں کے ملازم کے نچلے طبقہ سے ہی آتا تھا لیکن کاریگر طبقہ میں سے بھی بہت اس میں شریک ہونے پر مجبور تھے۔ آخر میں بہت سے ایسے بھی کاریگر تھے جو اپنی پوزیشن بہتر بناتے ہی اپنے خاندانی پیشوں کو چھوڑ دیتے تھے اور کھیتی کرنے لگتے تھے۔ یہ ایک حد تک ان بعض سماجی قوتوں کا نتیجہ تھا جو اس جماعت میں کارفرما تھیں یہی وہ سمت تھی جدھر وہ کاریگر جارہے تھے جنھیں اپنے پیشے چھوڑنے پڑ رہے تھے۔ جہاں تک خاندانی پیشہ وروں کا سوال ہے ان کی پوزیشن میں تبدیلی برائے نام تھی۔ ان کی تنظیم یا اس کی غیر موجودگی اور اس کی کارکردگی کے طریقے ہنوز بدلے نہیں تھے اور جہاں ان کی مزدوری گھٹ گئی تھی وہاں ابھی تک ان کی کام سے ادائیگی جنس میں ہوتی تھی اور ان کی آمدنی تقریباً جوں کی توں تھی۔ جو بڑے گاؤں میں مجتمع ہو رہے تھے۔ صرف ان کی صنعت کی تنظیم اور اقتصادی پوزیشن میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آئی تھی۔ علیحدہ علیحدہ جماعتوں کی معاشی حالت میں تبدیلیاں کبھی کبھی بڑی شدید ہوتی تھیں۔ اس لیے کاریگروں کی چند نمایاں جماعتوں کا الگ

۱۔ ۱۹۰۱ء کی پنجاب کی مردم شماری بتاتی ہے کہ قیمتی دھات کی قیمت میں غیر یقینی کی وجہ سے جو چھوٹے گاؤں میں رہنے والے سناروں کے ناموافق ہے زیادہ دولت مند سناروں میں ریلوے لائن پر آباد شہروں میں منتقل ہونے کا رجحان پایا جاتا ہے۔

جن کی جماعت تیزی سے ختم ہو رہی تھی۔ اگر گاؤں کا بڑھئی شہر کو چلا جاتا تو اس صورت حال بہتر ہو جاتی تھی۔ عمارتی سامان کی تجارت گھوڑے گاڑی اور شہروں کی فرنیچر کی صنعتوں کے عام کاموں سے بڑھئی کی مانگ میں بڑی تیزی آ رہی تھی! بڑھئی کے ساتھ بیرونی مقابلہ براہ راست نہ تھا بلکہ بالواسطہ تھا اس طرح کچھ علاقوں میں اس کی حالت خراب ہو رہی تھی مگر کچھ حصے میں اس کا حال جوں کا توں تھا لیکن شہروں میں لوہار اور بڑھئی دونوں کے لیے پوزیشن کو بہتر کرنے کے مواقع تھے ان دونوں صورتوں میں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ شہری صنعت کی وسعت یکدم محدود تھی۔

کاریگروں کی جماعت میں کمہار شاید سب سے زیادہ غریب تھے۔ گاؤں کی تمام مصنوعات میں اس کے برتن سب سے سستے ہوتے تھے۔ اس کے کاروبار میں جو پونجی لگی تھی وہ بہت ہی مختصر تھی۔ گاؤں کے کاریگروں میں کمہار کی جماعت زوال پذیر تھی اور ہر جگہ اس صنعت کی تعداد میں کمی ہو رہی تھی [۱] پیتل اور تانبے والے برتن کی ہندوستانی صنعت اور درآمد شدہ سستے مینا کے کام کے برتن کے مقابلہ کی وہ بیرونی قوتیں تھیں جن کے اثر سے اس صنعت میں انحطاط پیدا ہو رہا تھا۔ ہندوستان میں مٹی کے برتن بنانے کی ایک چھوٹی فیکٹری انڈسٹری تھی لیکن اس کی مصنوعات کا معیار بہت اچھا تھا اور ان کا گاؤں کے کمہار سے کوئی مقابلہ نہ تھا پیتل اور تانبے والے برتن کی صنعت کے مقابلہ سے کمہار اپنے اعلیٰ جماعت کے گاہکوں میں متاثر ہوا۔ اچھے کاشتکار گھریلو استعمال کے لیے مٹی کے برتن کو تیزی سے ترک کر رہے تھے اور اس کے بدلے پیتل اور تانبے کے برتن استعمال کر رہے تھے مگر یہ کہنا مشکل ہے کہ کس حد تک لوہے کے مینا کے کام کے برتن گاؤں میں آئے۔ تاہم غریب طبقہ کی مانگ قائم رہی۔ کمہار کے لیے شہر میں ہجرت کرنے کے علاوہ کوئی دوسرا چارہ نہ تھا جیسا کہ لوہار یا بڑھئی کو تھا اس لیے خاندانی پیشے کو چھوڑ کر کمہار عام زرعی محنت کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔

گاؤں کے کاریگروں میں شاید چرم ساز پر سب سے زیادہ سخت ضرب پڑی۔ جب خام چرسہ اور چمڑے کی عالمی قیمت میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا تو اس کی پوزیشن تیزی سے خراب ہونے لگی۔

۱۔ اے۔ سی۔ چٹرجی، صوبہ متحدہ کی صنعتوں سے متعلق یادداشت، باب سوم (۱۹۰۸ء)

۲۔ بمبئی، سفال سازی اور شیشہ گری سے متعلق مونوگراف۔ سی۔ ای۔ لو، صوبہ متوسط اور برار کے صنعتی سروے سے متعلق رپورٹ، باب چہارم (۱۹۱۰ء)، چٹرجی بھی دیکھیں، ح۔ س۔ باب چہاردہم

بہت سے علاقوں میں مردہ مویشی کے چمڑے اجرت کے علاوہ مل جاتے تھے پھر بھی اس سے زیادہ مدد نہیں ملی۔ جہاں بھی گاؤں میں اسے خام مال خریدنا پڑتا اس کی پوزیشن بڑی نازک ہو جاتی کیونکہ یہاں برآمد کرنے والے کانپور، بمبئی یا احمد آباد جیسے شہری چرم سازوں کے ایجنٹ اس سے زیادہ دام دے کر اسے پچھاڑ دیتے تھے۔ چرم ساز کی حالت سے صاف طور پر یہ ظاہر ہوگیا کہ رسم و رواج کے رشتے اقتصادی قوتوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے جب تک چمڑے کی قیمت زیادہ نہیں ہوئی اس وقت تک لوگ اسے فاضل اُجرت سمجھ کر دیدیتے تھے بلکہ بیسویں صدی کے آغاز سے مثلاً صوبہ متوسط میں مُردہ مویشی پر وہ اس کے حق کی سخت مخالفت کرنے لگے۔ اس کے بارے میں مسٹر مارٹن کہتے ہیں: "انفرادیت کی ترقی سے پہلے ہی جماعتی تنظیم رفتہ رفتہ ختم ہو رہی تھی جس کا پتہ کاشتکار کے نظریہ میں اس تبدیلی سے چلتا ہے جو مردہ جانور کے چمڑے سے متعلق تھا جو اب تک مہار اور چمار کی فالتو مزدوری سمجھے جاتے تھے۔"[۱] مدراس صوبہ میں اس طرح کی مثال ملتی تھی۔ "یہاں مدیگا (چرم کار) ایک یا دو رعیت کے خاندان سے وابستہ ہوتے تھے اور وہ ان کے گھروں کے مردہ جانوروں کے حقدار تھے۔" لیکن "بعد میں مدیگا کے درمیان ایک دوسرے کے حق کو ہتھیانے کا رجحان نظر آنے لگا ہے اور رعیت بھی اپنے خاندانی مدیگا کی خدمات سے گریز کرنے لگے اور اپنی ضروریات کے لیے کھلے بازار جانے لگے۔ ایسی صورتوں میں رعیت اپنے مردہ جانوروں کے چمڑے کی قیمت مدیگا سے مانگتے ہیں۔"[۲] ان مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسم و رواج کا رشتہ کمزور تھا۔ واجبات ادا ہوتے تھے اور خدمات انجام پاتی تھیں جب تک کہ وہ تکلیف دہ یا مہنگے نہ پڑتے تھے خام چرسہ اور چمڑے کی قیمت میں زیادہ اضافہ ہو جانے سے دیہات کے چرم کاروں کا حال بہت برا ہو گیا تھا اور اس کی جماعت سے بہت بڑی تعداد زرعی کاموں میں لگنے پر مجبور ہو گئی اور کچھ لوگ شہر کی چرم ساز صنعت میں لگ گئے۔ گاؤں کے چرم کاروں کا انحطاط شاید سب سے زیادہ تھا۔

تیلی گاؤں کا ملازم نہیں ہوتا تھا۔ وہ ہندوستان میں ہر جگہ پایا جاتا تھا۔ جیسا کہ گاؤں کی تقریباً تمام صنعتوں کا حال تھا اسی طرح کاشتکار تیلی کو خام اشیاء دیتا تھا یعنی تلہن دیتا تھا اور وہ اسے پیرتا تھا۔ ہندوستان میں تیل کے دو اہم استعمال یہ تھے (۱) روشنی کے لیے (۲) کھانا پکانے کے کاموں

۱۔ صوبہ متوسط کی مردم شماری کی رپورٹ (۱۹۱۱ء)

۲۔ چیٹرٹن، مونوگراف، مدراس میں چمڑا اور اس کے کمانے کا کام

کے لیے۔ معدنی تیل کی درآمد اور اس کے بڑھتے ہوئے استعمال سے تیلی کی پوزیشن بڑی خراب ہوگئی۔ روشنی کے لیے مٹی کے تیل کا استعمال پورے ہندوستان میں تیزی سے ہونے لگا۔ اس طرح تیلی کے کام کا بہت ہی اہم حصہ اس سے چھن گیا۔ یہ انحطاط تقریباً ۱۸۸۰ء میں شروع ہوا پھر بھی ہندوستان سے تلہن کی برآمد اور شہروں میں تیل پیرنے کی صنعت کی ترقی سے تیلی کی پوزیشن پر کوئی خاص اثر نہیں پڑا کیونکہ ہر کاشتکار اسے تلہن دیتا تھا اور شہر کی صنعت ابھی تک اپنی وسعت میں بہت مختصر تھی اور اس نے شہر کے مارکٹ پر بھی پورے طور پر قبضہ نہیں کیا تھا اس کا گاؤں کے تیلی پر کوئی اثر نہیں ہو سکتا تھا پھر بھی مٹی کے تیل کے آجانے سے تیلی کی تعداد میں یقینی بڑی کمی ہوگئی ہوگی۔

ہر بڑے گاؤں میں رنگ ریز پائے جاتے تھے۔ پرانے ہندوستانی طریقہ سے رنگنے کا عمل بڑا ہی پیچیدہ ہوتا تھا اور رنگنے والے کو خاصی مہارت درکار ہوتی تھی۔ اس معاملہ میں بیرونی سامان کا مقابلہ ایک اہم عنصر تھا۔ تقریباً ۱۸۷۰ء میں نیلین رنگ کا ہندوستان میں رواج ہوا۔ یہ پہلے بڑا تیز ہوتا تھا اور ہندوستانی رنگوں سے گھٹیا ہوتا تھا لیکن اس میں دو فائدے تھے۔ وہ بہت سستا ہوتا تھا اور آسانی سے استعمال ہوتا تھا۔ اس لیے وہ ہندوستان میں تیزی سے پھیل گیا اور ۱۸۹۰ء تک ہندوستان کے رنگوں کا استعمال تقریباً ختم ہوگیا۔ جس آسانی سے یہ رنگ استعمال ہوتے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رنگنے والوں کی مانگ کم ہوگئی۔ کیونکہ لوگ رنگ خود استعمال کرنے لگے لیکن ان درآمدات سے ہندوستان کے رنگ ریز طبقہ کو جو اصلی نقصان ہوا وہ یہ تھا کہ نباتی رنگوں کے استعمال کا جو گہرا علم انہیں حاصل تھا وہ ان درآمدات سے بیکار ہو کر رہ گیا اور اس صنعت کی اہمیت گھٹ گئی۔ مسٹر فاسٹ کہتے ہیں: ”حقیقت یہ ہے کہ سستے انیلین اور الیسزرن رنگوں کے ہندوستان میں استعمال ہونے کا اثر یہ پڑا کہ اس صنعت کو جو چاہے اپنا سکتا ہے کیونکہ رنگنے کے کام کے لیے اب خصوصی مشق اور علم کی ضرورت نہ تھی، اس کی ضرورت اس وقت تھی جبکہ دیسی اجزا کا استعمال ہوتا تھا“۔[1] اس سے اس صنعت میں مقابلہ شدید ہوگیا اور اس سے منافع میں بہت کمی ہوگئی اور غیر ملکی رنگوں کے آنے کے بعد سے یہ صنعت تیزی سے زوال پذیر ہوگئی ہے۔ ملوں میں رنگین سُوت کی تیاری سے بھی اس صنعت پر بُرا اثر پڑا کیوں کہ بُنکر کپڑے رنگوانے کے بدلہ عام طور پر براہ راست رنگا ہوا سُوت حاصل کر لیتے تھے۔ اس صنعت کا انحطاط اس وجہ سے بھی تیزی سے ہوا کہ زیادہ تر

۱۔ مونوگراف: رنگ اور رنگائی، بمبئی

رنگنے والے استعمال میں آنے والے انیلن رنگوں سے بھی پورا فائدہ نہیں اُٹھاتے تھے۔ مدورا اور دوسری جگہوں میں اس صنعت کو کارخانوں میں منظم کرنے کی ایک چھوٹی سی تحریک شروع ہوئی لیکن مدورا کے علاوہ کامیاب نہ ہوئی۔

رنگ ریزی کی صنعت اور اس کی خوشحالی کپاس کے دھاگہ سے تیار ہونے والی ہینڈلوم صنعت سے گہرے طور پر وابستہ تھی۔ ہینڈلوم انڈسٹری ہندوستان میں سب سے بڑی اور سب سے زیادہ پھیلی ہوئی ہے۔ یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ پچھلے سالوں سے اس پر کافی توجہ دی جارہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ کپاس کے دھاگہ سے بُنائی ملک کی دوسری صنعتوں سے بہت ہی زیادہ مقامی رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ ہندوستان کے زیادہ تر شہروں اور بڑے بڑے گاؤں میں بنکروں کی آبادیاں ہیں تاہم بنکر بیشتر گاؤں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ اس میں ابھی اختلاف رائے پایا جاتا ہے کہ یہ صنعت زوال پذیر ہے یا نہیں اگر کوئی ایسا سوچے تو حق بجانب ہے کہ ۱۸۵۰ کے بعد کئی برسوں تک یہ ضرور تیزی سے زوال پذیر تھی یہ زوال خاص طور پر اس صنعت میں دکھائی دیا جہاں اعلیٰ قسم کے سامان تیار ہوتے تھے۔ ہندوستانی لوم کی مختلف مصنوعات کی تجارتی اہمیت سے متعلق ڈاکٹر واٹسن نے جو رائے ظاہر کی ہے وہ دلچسپ ہے وہ کہتے ہیں: "بعض کپڑے ایسے ہیں جو شاید ہاتھ سے بہترین اور سب سے سستے تیار ہوں گے ... دیسی لوم سے کشیدہ کاریاں شال اور دری تیار کرتے رہیں گے جن کے لیے وہ اتنے مشہور ہو چکے ہیں" لیکن اس سے زیادہ دلچسپ رائے موٹے کپڑے سے متعلق ہے: "گاڑھے کپڑے زیادہ پائدار ہوتے ہیں اور گرم بھی۔ ان کی تجارتی اہمیت کا ثبوت اس امر سے ملتا ہے کہ انگلینڈ کے حالیہ کپاس کے قحط کے دوران اور اس کے نتیجہ میں خام اشیاء کی قیمت بڑھ جانے پر دیسی مال نے انگلینڈ کے مال کی بہ نسبت اپنی پوزیشن زیادہ برقرار رکھی حالانکہ اول الذکر کا دام یورپی مال سے زیادہ بڑھ گیا تھا"[۱] اس طرح دو طرح کے سامان تھے۔ اوّل کارچوبی اور دوسرے اعلیٰ سامان جن کی تیاری میں ہینڈلوم کو بڑی آسانی تھی، دوم یہ کہ موٹے کپڑے جن سے عام کاشتکاروں کی ضرورت اچھی طرح پوری ہوتی تھی۔ اس میدان میں کپاس سے تیار ہونے والی ہندوستان کی ہینڈلوم صنعت کو خاص مقام حاصل تھا۔ ان دونوں کے درمیان اوسط قسم کے کپڑے اور میڈیم کاونٹ کے سامان ہوتے تھے جہاں مل انڈسٹری خواہ ہندوستان کی ہو یا بیرنی،

۱۔ واٹسن: ہندوستان کے ٹیکسٹائل مینوفیکچرس وغیرہ (۱۸۶۷ء)

وہ قطعی طور پر ہینڈلوم انڈسٹری کو مات کر دیتی تھی۔ اس مقابلہ کی یہ ساری تاریخ ہے لیکن یہ واضح طور پر بتایا نہیں جا سکتا کہ یہ صنعت کس عرصہ میں زوال پذیر ہوئی اور کب یہ عمل رک گیا اس کے علاوہ یہ دور ملک کے ایک حصّہ سے دوسرے حصّہ میں مختلف رہا کیوں کہ بنگال گرچہ انیسویں صدی کے اوائل ہی میں مقابلہ کی زد میں آ گیا تھا مگر صوبہ متوسط کی صنعت پر چھٹی دہائی کے بعد تک کوئی اثر نہ ہوا۔

ہندوستان کے تمام حصّوں میں ہینڈلوم انڈسٹری کی تاریخ میں کبھی نہ کبھی ایک ایسا مرحلہ ضرور آ گیا تھا جب کہ مل انڈسٹری نے دو صدوں کے درمیان مارکٹ کے اتنے بڑے حصّہ پر قبضہ کر لیا تھا جتنا وہ کر سکتی تھی۔ اس نقطہ پر ایک قسم کا توازن پیدا ہو گیا تھا اور اس کے بعد ہینڈلوم صنعت میں اگر کسی قسم کا انحطاط ہوا ہے تو وہ بہت سست رفتار رہا ہے۔ ہم آگے چل کر اس مفروضہ کی وضاحت کریں گے ہینڈلوم صنعت میں ہونے والے تغیرات کا اعداد و شمار کے لحاظ سے اندازہ لگانے کی دو کوششیں مدراس میں ہوئی ہیں[1]۔ ۱۸۹۱ء میں مردم شماری کا کمشنر اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ اس پر یقین کرنے کا کوئی واضح سبب نہیں ملتا کہ اس صنعت کی تعداد گھٹ رہی ہے جب کہ ۱۹۱۱ء میں مسٹر چیٹرٹن اس فیصلہ پر آ پہنچے تھے کہ گذشتہ چالیس برس یعنی ۱۹۱۱ء - ۱۸۷۱ء کے دوران اس صوبہ کے بنکروں کی تعداد میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ بمبئی کے بارے میں مسٹر اینتھووین ۱۸۹۵ء میں لکھتے ہیں: "بُنائی پر گذر اوقات کرنے والوں کی تعداد حالیہ برسوں میں شاید کافی گھٹ گئی تھی"، لیکن وہ پھر کہتے ہیں کہ " ہینڈلوم کے معاملہ میں خارجی مقابلہ کے اثرات کی آزمائش جو کچھ ہونا تھا ہو چکی ہے۔ اور وہ اس نتیجہ پر آتے ہیں کہ" اس صنعت میں اور زیادہ کمی ہونے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی ہے"[2] مسٹر مہتا بھی اسی نتیجہ کو زوردار الفاظ میں بیان کرتے ہیں: "یہ بات بڑی احتیاط کے ساتھ مانی جا سکتی ہے کہ اگر ہینڈلوم صنعت بڑھی نہیں ہے تو وہ حالیہ برسوں میں یقینی طور پر گھٹی بھی نہیں ہے"[3] صوبہ متحدہ کو صنعت کے بارے میں ۱۸۹۸ء میں

۱۔ مدراس پریسیڈنسی کی مردم شماری کی رپورٹ (۱۸۹۱ء اور ۱۹۱۱ء) اس سوال سے متعلق اعداد و شمار کی سطح کا جائزہ لینے کے لیے صنعتی کمیشن کی رپورٹ، ضمیمہ اول دیکھیں، یہ بات معلوم ہوئی کہ اس صدی کے آغاز سے موٹے کپڑے بننے والوں کی تعداد میں کچھ کمی آئی ہے لیکن عمدہ کپڑا تیار کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔

۲۔ انتھووین، مونوگراف، سوتی کپڑے (بمبئی ۱۸۹۵ء)

۳۔ پی۔ این۔ مہتا، ہینڈلوم صنعت کی رپورٹ (۱۹۰۹ء)

مسٹر سلبراڈ نے لکھا تھا کہ یہ صنعت واقعی گر گئی ہے لیکن گذشتہ دس بارہ برسوں میں گراوٹ کی شرح کافی کم ہو گئی ہے![1] بنگال میں انحطاط کے واضح آثار پائے جاتے تھے گرچہ یہاں بھی اعلیٰ قسم کے صنعت گر اور موٹے کپڑے کی صنعت اپنے مقام پر جمی ہوئی تھی[2] ایک دوسرے اندازہ کے مطابق تقریباً ۱۹۰۴ء تک مسلسل انحطاط جاری تھا اس کے بعد اس صنعت کو نئی حوصلہ افزائی ملی[3] اس نتیجہ کی تصدیق ایسٹرن بنگال کے جائزہ سے ہوتی ہے[4] مسٹر لطیفی نے پنجاب کا جو تازہ ترین سروے کیا ہے اس میں ترقی یا انحطاط کی شرح کا اندازہ لگانے کی کوشش نہیں کی گئی ہے،[5] لیکن مسٹر فرانسس نے ۱۸۸۴ء میں یہ خیال ظاہر کیا کہ "منچسٹر کے مقابلہ کے باوجود پنجابی بنکروں کی تجارت کم ہونے کے بجائے اور بڑھ رہی ہے"[6] اس صوبہ کی ہی صنعت کے بارے میں ۱۹۰۱ء کی مردم شماری کی رپورٹ یوں ہے: "عام رائے یہی ہے کہ گاؤں میں دیہی کپڑوں کی صنعت پر زیادہ برا اثر نہیں پڑا ہے"۔ صرف صوبہ متوسط میں مسلسل اور ہمہ گیر انحطاط کی خبر ملی ہے[7] جس طرح امید کی جاتی تھی، یہ شہادت یکساں نہیں ہے لیکن مجموعی طور پر اس نظریہ کو تقویت ملتی ہے کہ ان دو صنعتوں کے درمیان جو مقابلہ تھا اس میں ایک اسٹیج پر توازن پیدا ہو گیا تھا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس ملک کے زیادہ تر حصوں میں یہ صورت حال گذشتہ صدی کے اواخر میں پیدا ہوئی تھی[8]

بنکروں کی تعداد میں گرچہ بعد میں کمی ہوئی مگر یہ زیادہ نہ تھی جب مقابلہ شروع ہوا اس وقت

۱۔ سلبراڈ، مونوگراف، سوتی کپڑے، شمالی مغربی صوبہ

۲۔ بنرجی، سوتی کپڑے، بنگال (۱۸۹۸ء)

۳۔ جے۔ جی۔ کمنگ، بنگال کی صنعتی پوزیشن اور امکانات کا ریویو (۱۹۰۸ء)

۴۔ جی۔ این۔ گپتا: ایسٹ بنگال اور آسام کی صنعتیں اور وسائل (۱۹۰۸ء)

۵۔ اے۔ لطیف: صنعتی پنجاب (۱۹۱۱ء)

۶۔ فرانسیس، مونوگراف، سوتی کپڑے، پنجاب

۷۔ سی۔ ای۔ لو، رح۔ س۔

۸۔ اس صنعت کی وسعت کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ سر وی ٹھیکرسے کی رائے میں ہندوستان کی مل صنعت میں کھپنے والے سوت سے دو چند سوت اس صنعت میں کھپتا تھا پہلی صنعتی کانفرنس (۱۹۰۵ء) سامنے جو مضمون پڑھا گیا تھا اس کو دیکھیں۔ گرایم کلارک بھی دیکھیں۔ ح۔ س

انحطاط زیادہ تھا۔ بنکروں کی پوزیشن بھی شاید کچھ خراب ہوگئی تھی حالانکہ بڑی سطح پر ایسا ہونا ممکن نہ تھا کیونکہ انیسویں صدی کے آغاز میں ان کی پوزیشن پہلے ہی خراب ہوگئی تھی۔ ملک کی اس صنعت میں واقعی کمی واقع ہوئی ہوگی۔ شہری بنکر یا جہاں بھی بنکر بڑی تعداد میں رہتے تھے وہ کم از کم تجارتی اعتبار سے بڑے منظم تھے۔ اس کے علاوہ اسے کوئی دوسرا روزگار نہ تھا اپنے ہنر سے اسے لگاؤ تھا خواہ اس سے ذرا بھی فائدہ نہ ہو۔ دیہی بنکر جزوی طور پر مزدور بھی ہوتے تھے یا کاشتکار۔ اس لیے اسی جماعت کے بنکروں کی تعداد گھٹ رہی تھی۔ ہینڈلوم بنکروں کے مزید اجتماع کے رجحان کے ساتھ ہی ساتھ دیہاتی کسانوں میں بُنائی کو بالکل چھوڑ دینے یا اس کو پورے طور پر اختیار کرنے کا بھی رجحان پایا جاتا تھا۔[1]

گاؤں کی صنعتیں خوشحال نہ تھیں۔ کاریگروں کے دو مشہور طبقے جو کسی حد تک خوشحال اور بیرونی مقابلہ سے غیر متاثر تھے وہ لوہار اور بڑھئی کے طبقے تھے۔[2] یہ خاص طور پر اس لیے تھا کہ ہر گاؤں میں کھیتی کا جو طریقہ رائج تھا اس کے پیش نظر ایسے کاریگروں کا رہنا وہاں ضروری ہوتا تھا۔ دوسرے طبقوں کے زیادہ تر کاریگروں کی حالت خراب تھی اور ان کی تعداد برابر گھٹ رہی تھی۔ دوسرے پیشوں میں صرف لوہار اور بڑھئی کا ہی طبقہ تھا جسے شہروں میں اپنے اسی کام میں گذر اوقات کرنے کا معقول امکان تھا۔ یہ مشکل تھی کہ اگر وہ اپنے پیشے چھوڑیں تو پھر انھیں ایسا کام کرنا پڑتا تھا جس میں کسی تربیت کی ضرورت نہ تھی۔

گاؤں میں کاریگروں کی حیثیت کیا تھی اس کا صحیح جائزہ لینا مشکل ہے۔ عام طور پر یہ سسٹم اب بڑی حد تک ڈھیلا ڈھالا ہے۔ جب جنس میں لگان دینے کا رواج رفتہ رفتہ ختم ہوگیا تو کٹائی کے وقت واجبات کی ادائیگی یا تو کم ہوگئی ہے یا بالکل ختم ہو رہی ہے۔ یہ کہنا بھی آسان نہیں کہ یہ رواج کب اور کس حصہ میں بالکل ختم ہوگیا۔ اس کے تدریجی اختتام کا جائزہ دستیاب

۱۔ انیسویں صدی ختم ہوتے ہوتے سوت کاتنے کی دیہات میں صنعت تقریباً ناپید ہوگئی۔ شاذ و نادر ہی بنکروں کے گھروں کی معمر عورت سوت کاتتی تھی لیکن یہ زیادہ تر شہروں ہی میں پایا جاتا تھا اس کا وجود اور اس کا بُرا حال دونوں بعض سماجی حالات کا نتیجہ تھے کیونکہ یہ بہت کم صنعتوں میں سے ایک صنعت تھی کہ پردہ نشین عورتیں اسے باوقار طور پر کر سکتی تھیں۔ حوالے دیکھئے، ح۔ س۔ لے۔ سی۔ چیٹرجی، ح۔ س۔

۲۔ جی۔ این۔ گپتا، ح۔ س

نہیں۔ اسی وقت معلوم ہوتا ہے جیسا کہ رواج بالکل ناپید ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ہم بمبئی پریسیڈنسی کے
کے دھیر کے بارے میں پڑھتے ہیں؛ "گاؤں کے لوگ ہی پانی کی مشکیں یا 'موٹ' کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔
اس کے لیے پہلے فصل کی کٹائی کے وقت ان کی ادائیگی ہو جاتی تھی لیکن اب یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ
رواج ختم ہو گیا"[۱] ۱۸۸۱ء کی مردم شماری کی رپورٹ میں ہر جگہ گاؤں کی جماعت تقریباً محفوظ ہے
لیکن یہاں بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض قوتیں ایسی کارفرما ہیں جن سے اتحاد کے رشتے ڈھیلے پڑ رہے ہیں"[۲]
۹۱۱ء میں بھی یہ سسٹم بالکل مستحکم تھا لیکن چرم کار (Tanners) کی جیسی صورتیں موجود ہیں ان سے معلوم
ہوتا ہے کہ یہ کسی وقت ختم ہو سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ کوئی آفت نہ آئی تھی
اور تغیر و تبدیلی کا عمل بہت ہی سست تھا۔ یہ مثال دی جا سکتی ہے کہ جہاں فصل کی کٹائی کا حصہ
ختم ہو گیا تھا وہاں بھی سالانہ تیوہار، شادی کی تقریبات وغیرہ میں دان (فاضل اجرت) دینے
کا رواج باقی تھا۔ جس نکتہ کی وضاحت مقصود ہے وہ یہ ہے کہ تقریباً تمام جگہوں میں واجبات
(dues) اور دان وغیرہ سے کاریگروں کی باقاعدہ آمدنی کی اہمیت برابر گھٹ رہی تھی۔ اس
وجہ سے وہ دوسرے پیشوں کو فوراً اختیار کر لیتے تھے۔ جب یہ وقت آگیا تو دوسرے رجحانات
پیدا ہونے لگے جن کا بیان اُوپر میں کیا گیا ہے۔ جس رجحان کا مزید مطالعہ ضروری ہے وہ یہ ہے کہ
کاریگر مکمل طور پر کاشتکاری اختیار کرنے لگے جو کاشتکار ایسا کر سکتے تھے۔ اس کے اسباب
واضح ہیں۔ گاؤں کی زیادہ تر صنعتوں سے منافع بہت کم ملتا تھا اس نے اپنی پوزیشن کو بہتر بنانے
کا روشن ترین امکان زراعت ہی سے وابستہ تھا کیوں کہ گاؤں کی صنعتوں کا حال بڑا ہی غیر
تشفی بخش تھا۔ اس کے علاوہ کاشتکاری کاریگروں کی تمام صنعتوں سے بہت زیادہ قابل
قدر سمجھی جاتی تھی۔

ایسے لوگوں کی تعداد میں اضافہ جن کے لیے اب اپنی خاندانی صنعت میں کوئی مقام
نہیں رہ گیا تھا، اس بڑھتے ہوئے اختلاف سے ظاہر ہوتا ہے جو ذات اور پیشہ کے اعداد و شمار میں
پایا جاتا تھا۔ ان اعداد و شمار سے یہ بات بالعموم معلوم ہوتی ہے کہ کاریگر اپنا پیشہ چھوڑ کر کھیتی یا عام
مزدوری میں لگ رہے ہیں لیکن مختلف گاؤں کی صنعتوں کا موازنہ کرنے کے لیے یہ اعداد و شمار

۱۔ مارٹن، مونوگراف، چمڑا، وغیرہ، بمبئی (۱۹۰۳ء)

۲۔ بمبئی کی مردم شماری (۱۸۸۱ء) کی رپورٹ میں گاؤں کی جماعت سے متعلق خصوصاً مسٹر بین کی یادداشت دیکھئے۔

غیر معتبر ہیں کیونکہ ذات والے پیشہ میں بہت سے لوگ اسی پیشہ کو درج کر دیتے تھے حالانکہ وہ دوسرا کام کرتے تھے یا کاری گروالی صنعت میں کچھ ایسے لوگ بھی لگے ہوئے تھے جو اپنی ذات سے متعلق ذکر نہیں کرتے تھے۔

آخر میں ہم ان اثرات پر غور کریں جو قحط کی وجہ سے کاریگروں پر ہوئے۔ مادی اعتبار سے کاریگر اسی سطح پر تھے جس سطح پر عام مزدور تھے ان میں سے بعض مثلاً بنکر اس سطح سے بہت نیچے تھے اس لیے قحط کے زمانہ میں ریلیف مانگنے والوں میں سب سے پہلے ہی کاریگر آتے تھے اور ان کے ساتھ گاؤں کے نچلے طبقہ کے ملازم اور روزانہ کام کرنے والے کھیت مزدور آتے تھے۔ تمام کاریگروں میں سب سے پہلے بنکر ہی آتے تھے[۵۶] سب سے زیادہ مصیبت ان ہی کو ہوتی تھی کیونکہ اسے زبردستی مجبور ہو کر اپنا پیشہ چھوڑنا پڑتا تھا۔ ریلیف کے کاموں میں سبھوں کو محنت مشقت کا کام کرنا پڑتا تھا۔ بڑھئی، لوہار، راج کو اپنے ہی پیشہ کا کام مل جاتا تھا لیکن دوسروں کے لیے کوئی ایسی امید نہیں تھی۔ بنکروں کو سب سے زیادہ مصیبت ہوتی تھی اس لیے کہ وہ جسمانی کاموں کے بالکل عادی نہ تھے اس عرصہ میں بہت سے لوگ اپنی مہارت کھو دیتے تھے اور انہیں پھر اپنا پیشہ اختیار کرنا دشوار ہو جاتا تھا۔ قحط کے کمشنروں (۱۸۹۶) نے ان اثرات کا بیان اس طرح کیا ہے" دوسری مدد نہیں ملنے پر بہت سے بنکر قحط کی شدت سے مجبور ہو کر اپنا پیشہ چھوڑ دیتے ہیں اور ان میں سے بڑی تعداد میں لوگ پھر اپنا پیشہ اختیار نہیں کرتے بلکہ عام مزدوروں کی جماعت میں شامل ہو جاتے ہیں اس طرح اس جماعت کی تعداد کو بڑھاتے ہیں"[۵۵] دوسرے کاریگروں پر بھی ایسا ہی اثر ہوا اگرچہ یہ اثر اتنا نہیں پڑا جتنا کہ بنکروں پر پڑا تھا۔

دیہی صنعت زوال پذیر صنعت تھی۔ جو لوگ صنعت سے نکال پھینکے جاتے وہ معمولی مزدوری کرنے لگتے تھے اور صرف چند خوش نصیب لوگ شہروں میں آکر صنعت میں لگ جاتے تھے، کچھ کھیتی کام کو بھی اختیار کر لیتے تھے جب کہ بقیہ لوگوں کی حالت یعنی وہ جو اپنا آبائی پیشہ اختیار کیے ہوئے تھے۔ پہلے جیسی تھی۔ ان کی حالت ایک افلاس زدہ طبقہ کی تھی جو موسمی اختلافات کی شدت سے محسوس کرتا تھا۔

تیرھواں باب

شہری صنعت کی تنظیم

ہندوستان میں مختلف قسم کی صنعتوں میں جس صنعت نے اپنی تنظیم میں نئی بیرونی قوتوں کا اثر قبول کیا ہے اور اس کے مطابق اپنے اندر مسلسل تبدیلی کرتی رہی ہیں وہ شہر کی دیسی صنعتیں تھیں۔ نخل بندی اور کارخانہ کی وہ قسمیں تھیں جو بڑی ترقی یافتہ شکل میں ہندوستان کے باہر سے آئی تھیں۔ دیسی صنعتوں میں گاؤں کی صنعت نئی قوتوں کا مقابلہ نہ کرسکی اور اس کے اندر انحطاط پیدا ہوگیا اس کی تنظیم ابھی ابتدائی شکل میں تھی۔ تنظیم کی صورت یہ تھی کہ کاری گر زیادہ تر حالتوں میں اپنے گاہک سے خام اشیاء لے کر کام کرتا تھا اور اس کام کی مزدوری اسے نقد یا جنس کی شکل میں ملتی تھی۔ بوچر نے اسے اجرت کا کام کہا ہے[1] دیہی صنعت کی تنظیم میں جو اہم تبدیلی ہوئی وہ کاری گروں کی ادائیگی کے طریقے میں ہوئی اور دوسرے کسی اعتبار سے کوئی تبدیلی نہیں ہوئی کاری گروں کے سرمایہ کی کمی یا کاری گروں کی نیم زرعی حالت میں کسی قسم کی تبدیلی کا پتہ نہیں چلتا۔

اس کے برخلاف شہری صنعت نے ان تمام دست کاریوں میں جن کی ترقی ہورہی تھی واضح تنظیمی تغیر کا ثبوت دیا تھا اس لیے صنعت کی یہ واحد قسم ہے جس میں نئی قوتوں کے اثرات کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے اس دور میں ان تمام دست کاریوں نے فنی اہمیت کھودی لیکن بہت سی صنعتوں نے جن کی پرانی مانگ ابھی تک قائم تھی، اپنی تجارتی اہمیت برقرار رکھی جیسے سونے اور چاندی کا کام کپاس اور ریشم کی مصنوعات، پیتل اور تانبے کے برتن وغیرہ یا کچھ ایسی صنعتیں تھیں جن کے لیے نئی مانگ پیدا ہوگئی تھی جیسے دری کی صنعت؛ دوسرا واضح رجحان یہ تھا کہ اعلیٰ درجہ کی مصنوعات کے بدلے سستے

---

[1] سی۔ بوچر، صنعتی ارتقا، ترجمہ از ایس۔ ایم۔ وکیٹ باب چہارم

سازو سامان مقبول تھے۔ لکڑی پر نقاشی، ہاتھی کے دانت پر کام، دھاتوں پر فنی نقاشی وغیرہ جیسی کاریگری بہ خاص طور پر نمایاں تھے، مانگ کی نوعیت میں تبدیلی کا یہ فطری نتیجہ تھا۔ یہ فنی صنعتیں جو کبھی درباروں کی مانگ پر زندہ تھیں اب ان کا انحصار عوام کی مانگ پر تھا۔

شہری صنعت کو دیہی صنعت سے جدا کرنے والی اہم خصوصیت سرمایہ دار کی موجودگی تھی لہ گرچہ یہ صنعت آزاد کاری گروں پر مشتمل تھی پھر بھی انہیں کسی نہ کسی شکل میں قرض کی ضرورت ہوتی تھی۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ یہ قرض بیوپاری کے ذریعہ صنعت کی خام اشیا کی شکل میں مل جاتا تھا۔ اس طرح صنعتی تنظیم کے ابتدائی مرحلہ میں آرائشی لکڑیوں یا ہاتھی کے دانت کے بیوپاری کاری گروں کو خام اشیا فراہم کرتے تھے لیکن تیار شدہ مال کو کھپانے سے اس کا کوئی سروکار نہ تھا دوسرا مرحلہ اس وقت آتا تھا جب خام اشیا کا بیوپاری بھی کاریگر سے تیار شدہ مال خرید کر اسے مارکٹ میں لاتا تھا، پھر اس وقت جب کہ بیوپاری کچا مال دیتا تھا اور اس کے کام کرنے کے لیے کاری گر الگ الگ کام کی مزدوری دیتا تھا۔ آخری مرحلہ اس وقت آتا تھا جب سرمایہ دار کے ہاتھوں تمام کاری گر ایک چھت کے نیچے جمع ہو جاتے جسے آپ ورکشاپ کہیں یا ایک چھوٹا کارخانہ۔ آج ہندوستان کی شہری صنعت میں یہ تمام مختلف قسمیں پائی جاتی ہیں کبھی کبھی یہ تمام قسمیں ایک ہی صنعت میں پائی جاتی ہیں۔

ہاتھ کرگھے سے پارچہ بافی کی صنعت چونکہ ہندوستان کی تمام دستی صنعتوں میں سب سے اہم اور ہمہ گیر ہے اس لیے شاید یہ بہترین صنعت ہے جس میں ہم ان مختلف تبدیلیوں کو دیکھ سکتے ہیں۔ سب سے پہلا مرحلہ ایک آزاد بنکر کا آتا ہے جو عموماً موٹا کپڑا تیار کرتا ہے اور مقامی طور پر اپنے مال کو فروخت کرتا ہے۔ اس کے پاس تقریباً کوئی سرمایہ نہیں ہوتا اور اپنے مقامی بیوپاری سے صرف تھوڑا سا سوت خرید سکتا ہے۔ ہر بار اسے مال تیار کرنا پڑتا ہے اور دوبارہ سوت خریدنے سے پہلے اسے اپنے تیار شدہ مال کو بیچنا پڑتا ہے۔ بعض جگہوں میں وہ فوراً سوت خرید لیتا ہے مگر بعض مقامات میں اسے ادھار لینا پڑتا ہے۔ بچولیہ (MIDDLE MAN) اس طرح پہلی بار آتا ہے جو زیادہ تر حالتوں میں سوت کا بیوپاری ہوتا ہے۔ سود کا بیوپاری قرض پر سود لیتا ہے۔

لہ خالص اجرت کا کام، شہروں میں بھی پایا جاتا تھا۔ مثلاً جب کوئی آدمی اپنے گھر پر لکڑی کا کام یا نقاشی کرانا چاہتا تھا تو وہ لکڑی پر نقاشی کرنے والے کو رکھ لیتا تھا اور اسے الگ الگ کام کی اجرت دیتا۔ یہ طریقہ زیور بنانے کے کام میں سب سے زیادہ مروج تھا۔ ہر حال میں گاہک ہی خام اشیا بہم پہنچاتا تھا اور سنار کو خوردہ کام کی مزدوری ملتی تھی مگر اب تھوڑے برسوں سے تیار شدہ زیورات خریدنے کا چلن آہستہ آہستہ پھیل رہا ہے۔

لیکن تیار شدہ مال کو فروخت کرنے سے اسے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ تنظیم کے یہ سارے مرحلے بالعموم صنعت کے چھوٹے مرکز اور صرف موٹے کپڑے کی تجارت میں آتے ہیں۔ آزاد بنکر کے صرف موٹے کپڑے تیار کرانے کا سبب ظاہر ہے۔ اگر بنکر کو خود ہی اپنا مال بیچنا ہے تو مارکٹ کا اس سے قریب اور کافی مستقل ہونا ضروری ہے۔ گاؤں کا بن کر عموماً دیہاتی بازار یا میلے جایا کرتا تھا جہاں وہ اپنے تیار شدہ مال کو آسانی سے فروخت کر سکتا تھا کبھی کبھی یہاں بھی خریدنے اور بیچنے والے کے بیچ بیچولئے —— (MIDDLE MAN) کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ بنرجی کا بیان ہے کہ دیہات کے بعض میلوں میں دلال ہوتے تھے جو بنکر اور اس کے گاہک کا آمنا سامنا کرا دیتے تھے[۵۱] عموماً بنکر اور گاہک اس قسم کے ہفتہ وار بازار اور میلہ ہی میں ایک دوسرے سے ملتے تھے۔ آزاد بنکر کے پاس تھوڑا سا کپڑا ہوتا تھا اس لیے اسے فوراً بیچنے کی ضرورت ہوتی تھی ہندستان میں عمدہ کپڑوں کی مانگ خاص خاص موسم میں ہوتی تھی اس لیے آزاد بنکر کے لیے اس قسم کی صنعت میں کوئی محفوظ جگہ نہ تھی۔ بڑے مرکزوں میں جہاں کپڑوں کی تجارت بہت منظم تھی بنکروں کو گاہکوں سے براہ راست ملنے کا اتفاق کم ہی ہوتا تھا۔ اس لیے یہاں آزاد بنکر بڑی تعداد میں نہیں ملتے تھے۔

آزاد بنکروں کی پوزیشن بڑی نازک ہوتی تھی۔ مسٹر مہتا کا اندازہ ہے کہ بنکروں کی مجموعی تعداد کے صرف ۲۵ فیصد بنکر اس جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ اگر کافی دنوں تک وہ اپنا مال نہیں بیچ سکا تو پھر گویا اس کا مقروض ہونا ضروری ہے۔ قرض لینے کے بعد تو وہ اپنے گاہکوں کے ہاتھ اپنا مال براہ راست فروخت کرنے کا انتظار نہیں کر سکتا تھا بلکہ وہ درمیانی آدمی کے ہاتھ بیچ دیتا تھا تاکہ اُسے فوراً نقد معاوضہ مل جائے۔ کبھی کبھی سوت کا بیوپاری اور کپڑے کا بیوپاری الگ الگ ہوتا تھا[۵۲] لیکن زیادہ تر حالتوں میں وہ ایک ہی ہوتے تھے۔ سوت کے بیوپاری کو مجبوراً بہت سی صورتوں میں کپڑے کا بیوپاری ہونا پڑتا تھا[۵۳] چونکہ بنکر بالعموم اس کا قرضدار ہوتا تھا اور جب وہ اپنا مال فروخت نہیں کرتا تو وہ کپڑے دے کر ہی اپنے قرض کی ضمانت دے سکتا تھا۔ سوت کے بیوپاری کے لیے کپڑا ہی ایک ضمانت ہو سکتا تھا اس لیے وہ سوت کے ساتھ

---

[۵۱] مونوگراف، سوتی کپڑے، بنگال

[۵۲] لو، صوبہ متوسط اور برار کے صنعتی سروے کی رپورٹ، باب سوم (۱۹۱۰)

[۵۳] اے۔ آر۔ براؤن، "بانکورا کے بنکروں کے اقتصادی حالات" بنگال اکونومک جرنل (جنوری، ۱۹۱۷)

کپڑے کا بھی بیوپار کرتا تھا۔ بنکر ادھار سوت لیتا اور پھر وہ کپڑے تیار کر کے سوت کے بیوپاری کے ہاتھ بیچ دیتا یہ طریقہ اس طریقہ سے مختلف تھا جس کے مطابق بنکر اپنے بیوپاری کے لیے خوردہ کام کی اجرت پر کام کرتا تھا بہت سی صورتوں میں جہاں سوت اور کپڑے کے بیوپاری ایک ہی ہوتے تھے۔ بیوپاری سوت پر سود لینے کے بدلے پہلے ہی تخمینہ لگا دیتا تھا کہ وہ کپڑے کو ایک خام دام پر خریدے گا۔ عام ہینڈ لوم صنعت میں بنکر مجموعی تعداد کا ایک بڑا تناسب رکھتے تھے واقعی ان کا حال بہت بُرا تھا کیونکہ دونوں حدوں پر بیوپاری کافی منافع لے لیتا تھا اور صرف اتنا ہی چھوڑتا تھا کہ بمشکل تمام اس کی مزدوری بچ سکے۔ لیکن وہ کم از کم جزوی طور پر آزاد تھے۔ جب بنکر بیوپاری کا بھاری قرضدار ہو جاتا تو یہ آزادی بھی ختم ہو جاتی تھی۔ اسے اپنے لوم کا قبضہ قرض دہندہ کو دینا پڑتا تھا اور خوردہ کام کی اجرت پر اس کا کام کرتا تھا اس طرح زیادہ تر مرکزوں میں چند بڑے بیوپاری ہی ہوتے تھے جن کا کام بنکروں کی پوری تعداد میں سے تقریباً آدھے لوگ اجرت پر کرتے تھے بنکر جب اپنی آزادی کو اس طریقہ سے کھو دیتے تو ان کے لیے اسے پھر حاصل کرنا ناممکن تھا۔ اسی لیے اس صنعت کے زیادہ تر مرکزوں میں دو قسم کے بنکر ہوا کرتے تھے، ایک آزاد کاری گر اور دوسرا وہ جو اپنے سرمایہ دار کے لیے اجرت پر کام کرتا تھا۔ لیکن اس صنعت کے بعض شعبوں میں آزاد کاری گر بالکل ناپید ہو گئے تھے۔ یہ صورت حال وہاں بھی جہاں مصنوعات کے لیے مارکٹ صنعت کے مرکز سے دور ہوا کرتا تھا اور جہاں کچا مال قیمتی ہوتا تھا۔ ایسی صورتوں میں گھریلو صنعت یا لاکمیشن انڈسٹری" بڑی ترقی یافتہ تھی۔ اس قسم کی ایک اچھی مثال کوئمبٹور کی وہ صنعت ہے جو عمدہ کپاس کے دھاگہ سے مال تیار کرتی تھی۔ اس صنعت کی مصنوعات کے لیے مارکٹ مرہٹہ صوبہ میں تھا جو کوئمبٹور سے بہت دوری پر تھا۔ یہ تجارت چند تاجروں کے ہاتھوں میں مرکوز تھی۔ تاجروں سے بنکر کو بالعموم سوت یا ریشم اور سنہرے دھاگہ (یہ صنعت کناری والے کپڑے کی تھی) کی ملین مقدار ملتی تھی اور جب وہ مال تیار کرتا تھا تو اسے اُجرت ملتی تھی۔ اس صنعت کے بنکر ہمیشہ کسی ایک بیوپاری سے وابستہ ہوتے تھے۔ یہ ٹھیک ہے کہ بُن کر اپنے گھر پر اپنے لوم کی مدد سے کام کرتا تھا[1] اس لیے مخصوص مانگ پر چلنے والی صنعت میں بُنکر بچولئے (MIDDLE MAN) کی مرضی ہی پر کام کرتا تھا۔ بعض بنکروں کا مال اتنا خراب ہو گیا تھا کہ ان کے پاس اپنے لوم بھی نہ رہے۔ یہ قلی بُنکر کہلاتے تھے یہ آزاد بنکروں کے امیر طبقہ کے یہاں کام کرتے تھے اوسطاً ہر بنکر کے گھر میں صرف ایک لوم ہوتا تھا لیکن امیر بنکروں کا ایک

---

[1] مسٹر این۔ جی۔ چنیار کی شہادت کی تفصیلات، صنعتی کمیشن، ج ۳ (۱۸-۱۹۱۶)

چھوٹا طبقہ ایسا بھی تھا جس کے پاس کبھی کبھی پانچ یا چھ لوم ہوتے تھے۔ یہ ان قلی بنکروں کو فاضل لوم پر کام کرنے کے لیے رکھ لیتے تھے یہ امر قابل غور ہے کہ کوئمبٹور کی صنعت میں پانچ یا چھ لوم رکھنے والے بنکر بھی تاجروں کی مرضی کے مطابق ہی کام کرتے تھے۔ بہت سی جگہوں میں بہت سے لوم رکھنے والے اور قلی بنکر کو کام پر رکھنے والے بنکر بھی دوسرے بنکروں کو کسی حد تک مالی امداد دیتے تھے۔

بالکل آزاد بنکر کاری گر صرف گاؤں یا چھوٹے شہروں کی صنعت میں پائے جاتے تھے مسٹر مہتا کہتے ہیں "وہ تمام بن کر جو کاری گر کے سسٹم کے مطابق کام کرتے ہیں وہ کم و بیش زمین سے وابستہ ہوتے ہیں۔"[1] نیم آزاد کاریگر بھی بڑے شہروں کی ایسی صنعت میں ملتے ہیں جہاں موٹا کپڑا تیار ہوتا ہے۔ لیکن جیسے ہی عمدہ کپڑے تیار ہونے لگے گھر یلو طریق کار آگیا۔ آزاد بنکر اتنے غریب ہوتے تھے کہ وہ ریشم، سنہرا دھاگہ یا دوسری قیمتی خام اشیا خرید نہیں سکتے تھے۔ چھوٹے مرکز یا گاؤں میں جہاں عمدہ قسم کے سامان تیار ہوتے تھے بنکر عموماً مقامی مہاجن کے آرڈر کے مطابق ہی کام کرتے تھے۔ اس کے برعکس قلی بنکر زیادہ تر جگہوں میں ملتے تھے اور بڑے مرکزوں میں تو ان کی خاص حیثیت ہوتی تھی۔

کپاس کی ہینڈ لوم صنعت کے بہت سے شعبوں میں فیکڑی سسٹم کو عمل میں لانا ممکن نہ تھا کیونکہ جہاں مانگ یقینی تھی وہاں فیکڑی سسٹم کے مقابلہ میں گھریلو صنعت میں سرمایہ دار کے لیے ایک بڑا فائدہ تھا اور وہ یہ کہ اپنے کسی نقصان کے بغیر کاروبار کے مندا ہونے کی صورت میں کام روک سکتا ہے دوسری صورتوں میں جب جہاں مانگ کافی مستقل ہے وہاں ہینڈ لوم انڈسٹری میں فیکڑی سسٹم کا تجربہ کیا گیا ہے لیکن وہ ناکام رہا ہے۔ اس ناکامیابی کے اسباب عام طور پر یہی دیئے گئے ہیں کہ بنکر فیکڑی باقاعدہ طور پر نہیں جاتے اور پھر اس سے اس کے خاندان کی محنت بھی بیکار ہو جاتی ہے جب وہ گھر چھوڑ کر کارخانہ جاتا ہے۔[2] دوسرا سبب واقعی اہم ہے لیکن خاص سبب یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہینڈ لوم صنعت میں کارخانہ کی تنظیم آجانے سے جو کفایت شعاری ہوتی ہے وہ اتنی زیادہ نہیں ہوتی کہ سرمایہ دار بنکر کو اس اجرت سے بہت زیادہ رقم دے سکے جو اسے گھر پر کام کرنے سے مل رہی ہو۔ ہینڈ لوم میں کسی بہتر طریقہ مثلاً ماکور کے استعمال سے کفایت شعاری ہو سکتی ہے وہ اسی وقت ممکن ہے جب بنکر گھر پر ہی کام کرے۔ اس سے کفایت شعاری بہت زیادہ نہیں ہو سکتی تھی اس لیے سرمایہ دار

---

[1] مہتا۔ ح۔ س

[2] رائے بہادر پی تھیاگراجیتی، ح۔ س، ج ۳

اتنی زیادہ مزدوری نہیں دے سکتا تھا کہ بنکر گھر چھوڑنے پر آمادہ ہو جائے اور فیکٹری میں باقاعدہ طور پر کام کر سکے اس لیے کمیشن سسٹم یا گھر پر کام کرنے کا طریقہ زور پکڑ رہا تھا اور اس صنعت کی تنظیم کی یہ نمایاں قسم تھی۔

ریشم کی بنائی کی صنعت کی تنظیم کپاس سے تیار ہونے والے سامان کے بہتر کلاس کی تنظیم کی مانند تھی جیسا کہ توقع کی جاتی تھی چونکہ خام اشیا بڑی قیمتی ہوتی تھیں اس لیے بنکر پورے طور پر بیوپاری کے لیے کام کرتا تھا۔ برہم پور کی تنظیم کا ذکر کرتے ہوئے مدراس مونوگراف کہتا ہے "زیادہ تر بنکر بالخصوص زیادہ قیمتی کپڑے کی تیاری میں خوردہ کام کے طریقہ پر تاجروں کے لیے کام کرتے ہیں۔" [۱] بمبئی مونوگراف اس عمل کی ترقی کا حال بیان کرتا ہے جس کے ذریعہ بنکر زیادہ سے زیادہ بیوپاری پر انحصار کرنے لگے۔ "یہاں بھی جو قسم نئی اور اہم ہے وہ یکساں ہے۔ تاجر چھوٹا روپیہ پیشگی دیتا ہے، ریشم دیتا ہے اور بنکر سے مناقع پر کپڑا کافی خرید لیتا ہے"۔ [۱]

پیتل اور تانبے کے برتن کی ایسی صنعت تھی جو دیہی ہندوستان میں کبھی بھی زیادہ پھیلی ہوئی نہیں تھی۔ یہ ہمیشہ سے شہری صنعت رہی تھی لیکن اس دور کے شروع ہونے سے یہ صنعت پہلے سے زیادہ بڑے شہروں میں مرکوز ہونے لگی اس صنعت کی تنظیم کی جو مختلف قسمیں تھیں ان میں آزاد کاریگر کام کرنے والے استاد نیز ایک یا دو مددگار اور ورکشاپ شامل تھے۔ پہلے دو کا غلبہ چھوٹے شہروں میں ہوتا تھا۔ یہ صنعت ترقی پذیر تھی اور اس کی مصنوعات کی مانگ بہت زیادہ تھی۔ کام میں تخصیص اور امتیاز تیز رفتاری سے بڑھ رہا تھا اور آہستہ آہستہ مشین کا استعمال ہو رہا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس صنعت کے چند بڑے شہروں میں مرکوز ہونے کی تحریک پیدا ہو گئی اور ورکشاپ ایک خاص قسم کی تنظیم بن گئی۔ بہت سے بڑے شہروں میں ورکشاپ ہوتے تھے جہاں بیس یا اس سے زیادہ کاریگر کام کرتے تھے [۲]۔ یہ صنعت کپاس کی ہینڈ لوم صنعت سے واضح طور پر مختلف ہے۔ ہینڈ لوم میں ایک آدمی کام کرتا تھا اور اس کے مختلف کاموں کو تقسیم نہیں کیا جا سکتا تھا۔ تانبے اور پیتل کے برتن کی صنعت میں مختلف مراحل ہوتے تھے اور کام مختلف حصوں میں بٹا ہوتا تھا اور ہر ایک کے لیے خاص طور پر تربیت یافتہ کاریگر ہو سکتا تھا۔ اور اس سے فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا۔ کچھ معمولی کاموں کے

---

[۱] ایڈورڈس، مونوگراف، ریشمی کپڑے، بمبئی (۱۹۱۰ء)

[۲] ڈیمبر، مونوگراف، تانبے اور پیتل کے سامان، شمالی مغربی صوبہ (۱۸۹۹ء)

لیے چھوٹی مشین کا بھی استعمال ممکن تھا۔ اس لیے اسی تنظیم کا پھیلنا لازمی تھا جس میں خاص طور پر تربیت یافتہ کاریگر ایک ساتھ کام کر سکتے تھے اور جہاں یونٹ کے بڑے ہونے کی وجہ سے معمولی کاموں کے لیے مشین کا استعمال ممکن تھا اور اس سے کافی بچت بھی ہو سکتی تھی۔

تارا اور گوٹا کناری (TINSE) کی صنعت (بلکہ سونے اور چاندی کے تار کی صنعت) ہمارے سامنے ایک ایسی مثال پیش کرتی ہیں جہاں مختلف کاموں میں اور زیادہ تخفیص ممکن تھی۔ یہاں یہ ضروری تھا کہ خام اشیا سے مال تیار ہونے کے پہلے یہ مختلف کاریگروں کے ہاتھوں سے گذریں۔ اس لیے اس صنعت میں آزاد کاریگر کے لیے کوئی جگہ نہ تھی"۔ ہر ایک مرحلہ پر بیوپاری ہی مال دیتا ہے اور پھر تیار شدہ مال لے لیتا ہے"۔[1] بیوپاری مختلف طبقہ کے ہوتے تھے۔ صوبہ متحدہ میں کشیدہ کاری کے تاجروں سے مانگ آیا کرتی تھی۔ کہتے ہیں کہ مشین سے جو مال تیار ہوتا تھا وہ ہاتھ سے تیار ہونے مال سے بہت ہی کمتر درجہ کا ہوتا ہے۔ اس لیے اپنی حفاظت کے لیے اسے مشین کا سہارا لینا پڑا اور سستے سامان تیار کرنا پڑا۔ لیکن یہ صورت حال ہر جگہ نہ تھی۔ مشین کا کثرت سے استعمال صرف بمبئی اور گجرات کے شہروں میں تھا اور صرف انہی جگہوں میں اس صنعت نے بیرونی مقابلہ کا ڈٹ کر سامنا کیا۔ جیسے ہی مشین کا استعمال ہوا، واقعی تنظیم، کارخانہ کی تنظیم کے مطابق ہو گئی۔

دری کی صنعت واحد شہری دستی صنعت تھی جس کا بیرونی مارکٹ کافی اچھا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندستان میں جو اونی قالین تیار ہوتے تھے ان کا زیادہ تر حصہ برآمد کے لیے ہوتا تھا۔ یہ بالکل سستی قالین کی صنعت تھی۔ اس صنعت کے صرف دو اہم مقام مرزا پور اور امرتسر تھے۔ ان دو جگہوں کی تنظیم کسی قدر مختلف تھی۔ مرزا پور میں یہ صنعت شہر کے گرد گاؤں میں بکھری ہوئی تھی اور شہر میں بہت ہی کم قالین باف ہوتے تھے۔ برآمد کرنے والے فرم ہی تجارت پر پورے طور پر قابض تھے لیکن ان کا اصل بنکروں سے براہ راست لگاؤ نہ تھا۔ ان کا لگاؤ لوم کے مالکوں سے تھا جو اپنے بنکر اور مزدور کام پر لگاتے تھے۔ یہ فرم لوم رکھنے والوں کو پیشگی رقم دیتے تھے جن سے پھر بنکروں کو پیشگی رقم ملتی تھی۔ زیادہ تر حالتوں میں بنکر لوم رکھنے والوں کے بہت زیادہ مقروض ہوتے تھے اور یہ ان کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر بنکروں کو باقاعدہ کام نہیں دیتے تھے کیونکہ مانگ بڑھ جانے پر فائدہ

---

[1] نیسیم، مونوگراف، تارا اور گوٹا کناری، بمبئی (۱۹۰۹)

مالکوں کو ہی ہوتا تھا کیوں کہ ان کے ساتھ اتنے زیادہ بنکر وابستہ ہوتے تھے۔ یہاں بھی تنظیم یا تو کمیشن کا سسٹم تھی یا گھریلو سسٹم۔[1] اس کے برخلاف امرتسر میں یہ صنعت خود شہر ہی میں مرکوز تھی۔ برآمد کرنے والے فرم کا ہی اس پر کنٹرول ہوتا تھا جو پروڈیوسر ہی تھے مسٹر لیٹیر کہتے ہیں کہ بالکل کارخانہ کی صنعت تھی لیکن تنظیم بالکل کارخانہ کی تنظیم نہ تھی۔ کیونکہ کارخانہ میں کام بنکر استاد کو ملا کرتا تھا اور یہ کاریگر ملازم رکھتے تھے۔ عموماً استاد کو اچھا منافع مل جاتا تھا لیکن کبھی کبھی فرم کے ساتھ اس کا معاہدہ غیر منافع بخش بھی ہو سکتا تھا اس طرح وہ کسی معنی میں کارخانہ کے فورمین کی طرح مزدور نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ واقعی پیداوار کے جوکھم کا بڑا حصہ برداشت کرتا تھا۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ صنعتی تنظیم کے تمام مرحلے جو اس صنعت میں پہلو بہ پہلو ملتے ہیں وہ ہندستان کی شہری دستی صنعت سے ہی پھیلے۔ اس دور میں جو خاص تبدیلیاں ہوئیں وہ یہ تھیں کہ تمام صنعتوں کے مارکٹ وسیع ہو گئے اور بیرونی مقابلہ بھی کرنا پڑا۔ مارکٹ کے وسیع ہو جانے سے ہر جگہ یہ اثر ہوا کہ صنعتیں اب زیادہ علاقہ میں محدود ہو گئیں اور ان کے اندر خصوصی مہارت بھی پیدا ہو گئی۔ پچھلے باب میں ہم نے دیکھا ہے کہ گاؤں والے ابھی تک باہری صنعتوں کی مصنوعات بہت کم استعمال کرتے ہیں اور یہ تمام رجحانات ان سے بڑی صنعتوں میں بھی سب سے زیادہ نمایاں تھے۔ کپاس کے دھاگہ سے تیار ہونے والے عمدہ مال میں جو اضافہ ہوا اور مختلف شہر بالخصوص مدراس صوبہ میں جو زیادہ تحقیق پیدا ہوئی وہ ان قوتوں کے نتائج تھے جنھوں نے سارے ہندستان کو عمدہ ٹیکسٹائل کا ایک مارکٹ بنا دیا۔ اس صنعت کی مصنوعات کی مانگ میں اضافہ ہونے کا فطری نتیجہ یہ ہوا کہ اصل پیدا کرنے والے اور استعمال کرنے والے ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ اس علیحدگی سے بچولئے (MIDDLE MAN) آنا لازمی ہو گیا۔ کاریگر کے پاس سرمایہ کی کمی تھی جس کی وجہ سے اس کی آزادی ختم ہو گئی۔ جہاں کہیں بیرونی مقابلہ شدید نہ تھا بالعموم اثر یہ پڑا کہ سرمایہ دار اپنے پرانے طریقوں کو چھوڑ کر نئے طریقوں کو اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے تقریباً تمام جگہوں میں اس نے کاریگروں کو اور پست ہمت کر دیا اور بچولئے (MIDDLEMAN) کے ہاتھوں کو مضبوط بنا دیا۔

جہاں بہت ہی تھوڑے سرمایہ کی ضرورت تھی اور صارفین قریب ہوتے تھے وہاں کاری گر سسٹم ہنوز قائم رہا جہاں کچا مال قیمتی ہوتا تھا یا صارفین دور ہوتے تھے

---

[1] کنور جگدیش پرساد، مونوگراف، دری بافی، صوبہ متحدہ (۱۹۰۷ء)

یا مانگ موسمی یا غیر یقینی ہوتی تھی، وہاں مزدور کا بیوپاری کے ماتحت آجانا تقریباً ناگزیر تھا۔ کبھار جب تک وہ سستے مٹی کے برتن بناتا آزاد تھا۔ گویا کبھی مقروض نہیں ہوا لیکن جیسے ہی وہ اینٹ بنانے لگا وہ مقروض ہو گیا۔ اس کے بعد جلد ہی تغیر مکمل ہو جاتا اور وہ درمیانی آدمی کے لیے جواب تاجر بن گیا ہے اینٹ بناتا تھا۔ ورکشاپ یا چھوٹا کارخانہ آخر میں آتا تھا۔ یہ عمل بہت ہی سست رفتار تھا لیکن بیرونی مقابلہ اور مشین کے استعمال کے زیر اثر اس قسم کی تنظیم کبھی کبھی ضروری ہو جاتی تھی۔ تار اور گوٹا کناری (TINSE) کی صنعت کی مثال ہمارے سامنے آتی ہے لیکن کارخانہ کی تنظیم اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی تھی جب تک کہ مانگ کافی مستقل نہ ہو اور جب کہ اس سے محنت بچانے والی مشینوں کا استعمال ممکن نہ ہو یا دوسرے طریقہ سے پیداوار کی قیمت میں نمایاں کفایت شعاری نہ آئے۔

کام کرنے کے حالات اور گھریلو صنعت میں حاصل ہونے والی اجرت بہت غیر تشفی بخش تھی[۲]۔ اس پوری جماعت میں کاری گر کو بہت ہی کم ملتا تھا اور اپنے حالات کو سدھارنے کا اسے بہت کم امکان تھا۔ جب کارخانہ کی تنظیم ہوئی اسے گھر سے باہر جانا پڑا اور اسے کام کرنے کے طریقوں میں جو کچھ بھی آزادی تھی وہ ختم ہو گئی لیکن اس کے برخلاف اس کی اجرت بڑھ گئی اور اس کی اقتصادی حالت یقیناً بہتر ہو گئی۔ یہاں پر آزاد کاری گر اور فیکٹری کاریگر کے درمیان موزانہ نہیں کیا گیا ہے۔ بدنصیبی سے جس میدان میں آزاد کاریگر کام کرتا تھا وہ بڑا ہی محدود تھا اور وہ تیزی سے ہندوستان کی شہری صنعت سے ناپید ہو رہا تھا۔

یہ معلوم کرنا سہل ہے کہ صنعتی تنظیم کی اس نشوونما میں کوئی نئی خصوصیات نہیں ملتی ہیں۔ دوسرے ملکوں میں بھی یہی خصوصیات ایسے تغیراتی مرحلہ میں ہمیشہ دیکھی گئی ہیں۔ اس سے صرف یہ یقین روشن ہو جاتا ہے کہ ایسا دعویٰ کرنے کی کوئی گنجائش نہیں جیسا کہ اکثر کیا جاتا ہے کہ ہندوستان کا معاشی ڈھانچہ اپنی قسم کا واحد ڈھانچہ ہے اور عام اقتصادی قوانین کے زمرہ سے باہر ہے۔

---

[۱] لو، ح۔س۔ باب چہارم

[۲] پھول کاری، کشیدہ اور دوسری نقش و نگار والی صنعتیں جہاں شریف مگر حاجت مند عورتیں کام کرتی تھیں ان کی حالت نیم بیگار جیسی تھی۔ منافع بالخصوص نقش و نگار والے کام میں کافی تھا لیکن عجیب و غریب حالات کی وجہ سے بیوپاری نے مزدوری کم سے کم کر دی۔

چودھواں باب

جنگ سے پہلے کا دور — ماحصل

ہم نے ابھی ہندوستان کی جنگ سے پہلے کی اقتصادی تاریخ کا جائزہ لیا ہے۔ یہ تاریخ لازمی طور پر تین مختلف ادوار سے گذرتی ہے۔ یہ ادوار اپنی خصوصیات کے لحاظ سے ایک دوسرے سے زیادہ مختلف نہیں۔ ۱۸۶۰ء۔۷۰ کی دہائی میں جو قوتیں سب سے پہلے آگے آئی تھیں وہ ان تمام برسوں میں ہمیشہ نمایاں رہیں۔ ان کے نتائج آہستہ آہستہ رونما ہوئے اور آج بھی یہی قوتیں ہیں جن سے ہندوستان کے واقعات تشکیل پا رہے ہیں اور یہ قوتیں مغرب کے معاشی ڈھانچہ کا نتیجہ تھیں۔ تین ادواری تقسیم اقتصادی خصوصیات کے فرق کی وجہ سے نہیں کی گئی ہے بلکہ ان ادوار سے خوشحالی اور بدحالی کے دائرے صاف طور پر نمایاں ہوتے ہیں۔

ان ادوار میں آہنگ کی ایک خاص کیفیت نظر آتی ہے۔ ۱۸۶۰ء تا ۱۸۷۵ء کا دور خوشحالی کا دور ہے مگر ایک خوفناک قحط آجانے سے یہ رَو رک گئی۔ تقریباً پانچ برسوں کی بدحالی کے بعد پھر ترقی شروع ہوئی اور ۱۸۸۰ء سے ۱۸۹۵ء کا دور اچھی خوشحالی کا دوسرا دور آیا۔ تب دو قحط رونما ہوئے جو پہلے قحط سے زیادہ سنگین تھے لیکن ۱۹۰۰ء تک ملک کسی حد تک جانبر ہو سکا اور اگلے چودہ سال یا جنگ چھڑنے تک اوسط درجے کی خوشحالی کے سال رہے۔ یہ ایسا آہنگ ہے جس کا مقابلہ تجارتی دور کی مماثل حرکتوں سے کیا جا سکتا ہے۔ ہندوستان چونکہ نمایاں طور پر ایک زراعتی ملک ہے اس لئے یہ حرکتیں کبھی اچھے موسم اور کبھی قحط سالی کے بدلنے والے ادوار سے پہنچانی جا سکتی ہیں، تجارتی اتار اور چڑھاؤ کے دوروں سے نہیں۔ بارش کی نوعیت اور سورج کے داغ میں کیا رشتہ ہے ایسی قیاسی بحث میں پڑنا یہاں مناسب نہیں اور نہ ہمیں تجارتی ادوار اور کٹائی کے نوعیت کے باہمی رشتہ سے سروکار ہے۔ ہم صرف یہ بتا رہے ہیں کہ آج بھی زراعت ہندوستان میں اتنی زیادہ اہم ہے

کہ ملک کی خوشحالی کے زمانے مجموعی طور پر زرعی موسموں کی نوعیت پر ہی تقریباً پورے طور پر منحصر ہوتے ہیں۔
اس سہ گانہ تقسیم کا دوسرا فائدہ بھی ہے اس سے ہندوستان کی صنعتی ترقی کے تین مرحلوں کی نشان دہی میں مدد ملتی ہے ۱۸۶۰ء تا ۱۸۷۵ء کا دور ایسا تھا جس نے کارخانہ اور نخل بندیوں کا آغاز دیکھا لیکن ۱۸۷۵ء میں جو ترقی ہوئی وہ برائے نام تھی۔ اسی مدت کے دوران ہندوستان میں دستی صنعتوں کا انحطاط تیزی سے شروع ہوا۔ یہ رو پورے اگلے دور نویں دہائی کے اواخر تک جاری رہی تقریباً ۱۸۷۵ء کے بعد ہی کارخانہ کی صنعت میں اصل ترقی شروع ہوئی اور اگلے بیس برس کی مدت میں دو ٹیکسٹائل صنعتوں نے ترقی کی پھر بھی نویں دہائی کے اواخر ہی میں پورے ہندوستان میں صنعتی ترقی شروع ہوئی اور بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں بہت سی معدنی اور کچھ چھوٹی متفرق صنعتیں مشہور ہوئیں۔ انہی سالوں میں ہندوستان میں چھوٹی مشینوں اور چھوٹے انجن کا استعمال پھیلنے لگا اور ہر جگہ مشینی سازوسامان کے بکثرت استعمال کا بالعموم رحجان نظر آیا ہاں ایک خصوصیت تھی جو ان تمام برسوں میں نمایاں رہی۔ ہندوستان کی قدیم صنعت عموماً غیر ترقی پذیر تھی اور جب مغرب میں پیداوار کے طریقوں میں سائنس کا مزید استعمال ہونے لگا تو ان صنعتوں میں تیز انحطاط کا یہ ہمیشہ لازمی سبب بن سکتا تھا۔ یہ عمل خاص طور پر دستی صنعتوں میں کارفرما تھا لیکن اس کا نشان چینی یا چرم ساز صنعتوں میں کارفرما تھا لیکن اس کا نشان چینی یا چرم ساز صنعتوں میں بھی ملتا تھا۔ حال میں کارخانہ کی جو صنعت قائم ہوئی تھیں صرف وہی صنعتیں ترقی پذیر تھیں۔

۱۹۱۴ء میں ہندوستان کی صنعتی پوزیشن کیا تھی؟ یہ سوال اکثر پوچھا گیا ہے اور بہت سے متضاد جوابات دیئے گئے ہیں۔ جب ہم کسی جواب کے لئے کوشش کرتے ہیں تو ایک چیز کا ہمیشہ ضرور خیال رکھنا چاہیے۔ ہم صرف نئی نشوونما کا لحاظ نہ رکھیں بلکہ قدیم صنعتی قسموں کے انحطاط کا بھی لحاظ رکھیں۔ کیفیتی بیان ناممکن ہے ایک عام جائزہ یہ ہوگا کہ گاؤں کی صنعت مجموعی اعتبار سے انحطاط پذیر تھی اور شہروں میں زیادہ تر قدیم دستی صنعتیں دم توڑ چکی تھیں جب کہ بعض اہم صنعتوں میں اگر کوئی افزائش نہ تھی تو کوئی بڑا انحطاط بھی جلوہ گر نہ تھا، جدید صنعتوں میں نخل بندیوں، ٹیکسٹائلز اور کوئلہ کانوں میں کافی لوگ کام پر لگے تھے اور بعد میں چھوٹی متفرق صنعتوں میں کافی ترقی ہوئی۔ لیکن اس طرح کے بیان دینے سے ہمیں کوئی مدد نہیں ملتی۔

کسی ملک کی صنعتی ترقی کا اندازہ لگانے کے لئے اکثر دو اشاریوں سے کام لیا گیا ہے۔
(۱) درآمدی اور برآمدی تجارت میں صنعتی اشیاء کا تناسب (۲) شہروں کا عروج ہندوستان کے معاملہ

میں پہلا پیمانہ بالکل تشفی بخش نہیں ہے کیونکہ اندرونی تجارت کے ساتھ بیرونی تجارت کا تناسب بہت زیادہ نہیں ہے پھر (تعداد کے لحاظ سے) ہندستان کی اہم ترین صنعتیں جیسے ہینڈلوم کے ذریعہ پارچہ بافی اس حساب میں شمار نہیں ہوئی ہے۔ مسٹر جسٹس راناڈے پہلے شخص تھے جنھوں نے اس کسوٹی پر ہندستان کے حالات پرکھے تھے اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ ساتویں دہائی کے وسط میں ہندستانی صنعتوں کی پوزیشن پست ترین ہوگئی تھی اور یہ بتایا تھا کہ اس زمانہ سے لے کر نویں دہائی کے اوائل تک پوزیشن رفتہ رفتہ باقاعدہ بہتر ہو رہی تھی۔ دوسرے عناصر سے بھی جن کا ہم نے جائزہ لیا ہے اس کی بھرپور تصدیق ہوتی ہے۔ پروفیسر کیل جس نے بعد میں راناڈے کے طریقوں کو اپنایا تھا اس نتیجہ پر پہونچے تھے کہ نویں دہائی سے تقریباً مسلسل ترقی ہو رہی تھی۔ اس طرح ہم اس پیمانہ سے اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں؛ کہ صنعتی پوزیشن اس صدی کے وسط سے لے کر ساتویں دہائی تک مستقل خراب ہوتی رہی (اس امر کا ثبوت اوپر دیا جا چکا ہے) اور ساتویں دہائی سے مجموعی طور پر مستقل ترقی ہوتی رہی۔ شہروں کے فروغ کی نوعیت اور اس کے کردار کا مطالعہ زیادہ اور کچھ ثابت نہیں کرتا اس سے صرف یہ واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ جب ہندستان کی قدیم صنعتوں کے زوال پر غور کیا جاتا ہے تو اس مدت کے دوران مجموعی صنعتی ترقی جو ہندستان میں ہوئی وہ بہت ہی مختصر تھی۔ صنعت شماری کے آمد و خرچ کی فہرست سے یہی نتیجہ ظاہر ہوتا ہے۔

صرف کل صنعتی ترقی مختصر نہ تھی بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ زراعت کی پوزیشن ہندوستان کی اول صنعت کے اعتبار سے اتنی ہی مستحکم تھی جتنی کہ پہلے کبھی تھی اور ہندستان کی آبادی کی مجموعی ترقی میں کاشتکار ہنوز اپنا مقام رکھتا ہے۔ پھر آبادی کی یہ ترقی وقتاً فوقتاً ہونے والے منظر کی حیثیت رکھتی تھی جس کا انحصار بالعموم موسموں کی نوعیت پر تھا۔ اضافہ کی اعداد یہ ہیں [1]

۱۸۷۲ء - ۸۱	۳٫۰ میلین
۱۸۸۱ء - ۹۱	۲۴٫۳ 〃
۱۸۹۱ء - ۱۹۰۱	۱٫۴ 〃
۱۹۰۱ء - ۱۱	۱۸٫۷ 〃
۱۹۱۱ء - ۲۱	۳٫۷ 〃

---

[1] ہندوستان کی مردم شماری کی رپورٹ ص۔ ۷، (۱۹۲۱ء)

آبادی کی بڑھنے پر قحط کا اثر بہت واضح ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر یہ متواتر مصیبت نہ آتی تو آبادی میں اضافہ اور بہت زیادہ ہوتا۔ پھر بھی جیسا اضافہ ہوا ہے اس بڑھتی ہوئی آبادی کے معنی یہ ہیں کہ ہندوستان کی زمین پر دباؤ بڑھ رہا ہے[1] گاؤں کی صنعت جب ختم ہو جاتی تھی تو اس کام میں لگے ہوئے لوگ اس کو چھوڑ کر زمین کی طرف لوٹ رہے تھے اور اس اضافہ کی ایک مخصوص تعداد ضرور شہروں میں کھپ رہی تھی۔ نتیجہ ظاہر ہے زیادہ سے زیادہ کناروں کی زمین (MARGIN LAND) کاشت میں آ رہی ہے اور ہندوستان کے بہت سے حصوں میں زمین کی مزید تقسیم بڑی بھیانک شکل اختیار کر رہی ہے۔ اس بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے راہ نکالنے کا مسئلہ آج ہندوستان کا سب سے اہم مسئلہ بن گیا ہے۔ زمین پر کام کرنے والوں کی زیادتی ہو جانے سے خود کھیتی کی ترقی میں رکاوٹ ہوتی ہے اور غیر کفایت شعارانہ مقصد زمین کا سوال حل نہیں ہو سکتا ہے جب تک کہ صنعتی ترقی سے زراعتی آبادی کا بڑا حصہ شہروں کو نہ چلا جائے۔

اس حد تک ہم مستحکم بنیاد پر تھے۔ سارے جائزہ سے یہ تمام نکات روشن ہوتے ہیں یعنی یہ کہ نئی صنعتوں کی ترقی سست رفتار ہے اور پرانی صنعتیں جزوی طور پر ختم ہو رہی ہیں۔ اور زمین پر آبادی کا دباؤ بڑھتا جا رہا ہے اور زرعی بہتری خصوصاً محنت بچانے والی مشین کے استعمال میں بہت ہی تھوڑی ترقی ہوئی ہے جو نمایاں تغیر رونما ہوا ہے وہ نہ تو زراعت میں ہوا اور نہ صنعت میں، بلکہ یہ تجارت میں ہوا ہے۔ تجارت کے طریقوں میں انقلاب آ گیا اور اندرونی اور بیرونی تجارت کے حجم میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ مارکٹ وسیع ہے اور بہتر طور پر منظم ہے۔ لیکن تجارتی انقلاب کے ساتھ ہی ساتھ صنعتی ترقی نہیں ہوئی ہے۔ جس راہ پر تھوڑی ترقی ہوئی ہے وہ واقعی عجیب نہیں۔ یہ راہیں گویا وہی راہیں ہیں جو زیادہ تر ملکوں کے صنعتی ارتقا میں اختیار کی گئی ہیں۔ اس صنعتی ارتقا سے متعلق ایک ہی قابل لحاظ بات ملتی ہے اور وہ ہے اس کی آہستہ روی۔

اس حد تک بنیاد مستحکم ہے لیکن پھر ترقی کی یہی آہستگی ہندوستان کے صنعتی ساز و سامان کی بعض خامیوں کی طرف اشارہ کرتی ہے اور جب ان خامیوں کی نوعیت کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو اقتصادی تاریخ کے جائزہ سے ہمیں زیادہ مدد نہیں ملتی پھر بھی کوشش کی جا سکتی ہے اور مختصر طور پر چند باتیں بتائی جا سکتی ہیں۔

پہلے سرمایہ کے سوال پر غور کریں، ہندوستان اپنے افلاس کے لئے مشہور ملک ہے اور اس کے پاس جو سرمایہ جمع ہے وہ تھوڑا ہی ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے۔ پورے ملک میں کھیتی جو ہندوستان

---

[1] اس مسئلے کے صحیح مطالعہ کے لئے پی کے وتال کی کتاب (ہندوستان کی آبادی کا مسئلہ) دیکھئے۔

اس کا بڑا حصہ زراعت میں درکار تھا، باقی سرمایہ صنعتی مالیات کی بالکل غیر منظم صورت کی وجہ سے غیر دستیاب رہ جاتا تھا جس کا استعمال صنعتی مقاصد کے لئے ہو سکتا تھا۔

چند اہم تجارتی مراکز کے علاوہ ہندوستان میں بینک کا منظم کام گویا نامعلوم تھا۔ اور جو چند بینک کام کر رہے تھے انھوں نے بھی صنعت کو مالیت دینے کی طرف توجہ دینا سود بخش نہیں سمجھا۔ یہ قابل افسوس نتیجہ انہی اسباب سے پیدا ہوا تھا جن کے زیر اثر ہندوستان کی ریلوے داخلی تجارت سے زیادہ برآمدی تجارت کی طرف نگاہ اٹھاتی تھی۔ پریسیڈنسی بینک شروع سے ہی غلہ کو دیہی علاقہ سے بندرگاہ تک لانے میں خاص طور پر مدد بہم پہنچاتا تھا۔ فصل کی کٹائی کے وقت ہی جگہ کی ضرورت تھی لیکن اس خاص موسم کے دوران روپیہ کی مانگ بہت قوی تھی اور اس کی شرح بہت زیادہ ہو جاتی تھی۔ اس لئے بینک اپنے وسائل کے زیادہ سے زیادہ حصہ کو ممکن حد تک کٹائی کے وقت کے لئے بچائے رکھنے کی پالیسی پر ہمیشہ عمل کرتا تھا اس کے معنی یہ تھے کہ بینک کسی صنعتی ادارہ کو بڑی طویل مدت کے لئے قرض نہیں دے سکتے تھے۔ ان اسباب سے بینک صنعتوں کو مدد بہم نہیں پہنچاتے تھے۔ ہندوستان کے مختصر سرمائے کے وسائل، ان کے لئے زراعت وصنعت دونوں کا مقابلہ، بیوپار اور سود پر روپیہ لگانے میں حاصل ہونے والا اونچا منافع اور خاص طور پر فصل کاٹتے وقت روپیہ کے انتظام ہو جانے پر اونچی شرح کا ہونا۔ ان تمام پہلوؤں کی وجہ سے ہندوستانی سرمایہ صنعت میں اچھی طرح لگنے سے رکا رہتا تھا۔ جہاں تک اُجرت کا سوال ہے ہندوستان میں محنت واقعی سستی تھی۔ نچلے طبقہ میں زندگی کا معیار بہت ہی پست ہے اور ان کی ضروریات محدود ہیں۔ دستی صنعتوں میں جہاں مہارت کی حاجت ہوتی ہے بالخصوص جہاں پیشہ خاندانی ہے وہاں بھی مزدوروں کی کارکردگی غیر معمولی طور پر نمایاں ہے۔ یہ اس کی مہارت اور زندگی کا پست معیار ہی ہے جس سے بنکر کو مشین سے تیار ہونے والے سامان کا مقابلہ کرنے میں مدد ملتی ہے۔ یہ بھی پورے طور پر ثابت ہو چکا ہے کہ جب مناسب ٹریننگ ہو اور معقول توجہ دی جائے تو ہندوستان کے مزدور اتنے ہی تیز ہوتے ہیں جتنے کوئی دوسرے مزدور ہو سکتے ہیں۔ اس کے برخلاف اس میں کوئی شک نہیں کہ موجودہ حالات کے پیش نظر ہندوستان کے مزدور واقعی کارکردگی میں پست ہیں اگر یہ دیکھیں کہ وہ کتنا کماتے ہیں۔ اس کے دو خاص اسباب محسوس ہوتے ہیں (۱) مزدور کی ناخواندگی (۲) ہندوستان کی صنعت میں موجودہ حالات بی۔ ڈی مہتا جو کبھی ناگپور امپرس ملز سے تعلق رکھتے تھے اور جو ہندوستانی محنت سے متعلق رائے پیش کرنے میں بہتوں سے زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں وہ اس پر ہمیشہ زور

کی خاص صنعت ہے چھوٹے کسان مالکوں یا کاشت کرنے والی رعیتوں سے ہوتی ہے۔ اس طرح جائداد کی تقسیم ہندوستان میں دوسرے بیشتر ملکوں سے بہت ہی زیادہ تھی۔ اب یہ حقیقت سبھی تسلیم کرتے ہیں کہ ملک کے وسائل کی مساوی تقسیم سے ملک میں سرمایہ کی بڑا اسٹاک بننے میں مدد نہیں ملتی سلیمین نے ہندوستان کی زمین کی مزید تقسیم پر افسوس ظاہر کرتے ہوئے بہت پہلے ۱۸۴۴ء میں کہا تھا کہ اس سے سرمایہ کے جمع اور مرکوز ہونے میں بڑی رکاوٹ ہوتی ہے جب کہ یہ سرمایہ ملک کے صنعتی ارتقا کے لئے بہت ہی ضروری ہے[1] اس کے بعد سے مزید تقسیم رکنے کے بجائے اور بڑھی ہے لیکن یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ملک کے بعض حصوں میں خصوصاً بنگال میں بڑے زمین مالکان تھے اور ان کے پاس سرمایہ کے کافی وسائل تھے اس سلسلہ میں یہ قابل غور ہے کہ گجرات ہی ملک کا واحد علاقہ ہے جہاں صنعت کی ترقی بڑی حد تک ہندوستان کے وسائل سے ہوئی ہے اور یہاں بڑے پرانے زمانہ سے تاجروں کا ایسا طبقہ موجود تھا جو بیرونی ملکوں سے تجارت کرنے کے حوصلے رکھتے تھے۔ پھر ملک کے زیادہ تر حصوں میں سرمایہ کے وسائل بڑے کاشتکاروں کے ہاتھوں میں تھے جو اپنی مرضی سے اپنے روپیہ کو زمین پر خرچ کرتے تھے یا حاجتمند کسان کو قرض پر دیتے تھے جس کا زیادہ امکان تھا۔

اس زرعی سرمایہ کے علاوہ جو صنعتی ارتقا کے لئے دستیاب نہ تھا ملک میں تاجروں کا ایک طبقہ تھا جس نے قدیم زمانہ کی تجارتی مشکلات کے پیش نظر تجارتی مالیت کو اعلیٰ درجہ کی تنظیم دی تھی۔ ملک کے اسی تجارتی سرمایہ کے لئے صنعت تجارت کے ساتھ مقابلہ کرتی تھی لیکن یہ تاجر صرف فوری منافع چاہتے تھے کیونکہ حمل ونقل کے وسائل میں ترقی ہو جانے کے بعد سے غلہ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا اور درآمدی تجارت خصوصاً سوتی کپڑوں کی، بڑی منافع بخش ہو گئی تھی اور ان دھندوں سے فوری منافع بھی حاصل ہو جاتا تھا۔ اس کے برخلاف مصنوعاتی صنعت میں منافع کے لئے بہت دنوں تک انتظار کرنا پڑتا تھا اور منافع بھی اتنا زیادہ یقینی نہ تھا جتنا کہ بیوپار میں تھا جب بھی سرمایہ کسی صنعتی کام میں لگایا جاتا ہے تو یہ مہم ایسی تھی کہ جلد ہی معقول منافع حاصل ہو جاتا۔ جیسے ہی کپاس اوٹنے (جننگ) یا چاول کے چھاٹنے میں منافع کی بات بالکل یقینی ثابت ہو گئی تو ان صنعتوں میں سرمایہ دوڑنے لگا اور جلد ہی بہت سے علاقوں میں پیدا ہونے والی خام اشیا سے نبٹنے کے لئے ضرورت سے زیادہ چھوٹے چھوٹے کارخانے کھل گئے۔ سرمایہ کے وسائل مختصر تھے اور

---

[1] سلیمین: ریمبلز اینڈ ریکلیکشنز، مؤلفہ اسمتھ ج۔۲۔ باب ہفدہم

دیتے تھے کہ تعلیم کی کمی ہندوستانی مزدور کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ تعلیم کی یکسر کمی سے ہندوستان کے مزدور سیدھے سادے مشینی کاموں کو بھی سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اس لئے پیچیدہ مشین آتے ہی اس کے کام کا معیار بہت پست ہو جاتا ہے۔ تعلیم کی یہی کمی ایک حد تک اس بات کی ذمہ دار ہے کہ مزدوروں کا معیار زندگی بلند نہیں ہوتا۔ جب تک یہ خواہش پیدا نہ ہو، صرف اجرت بڑھ جانے سے اس کی کارکردگی نہیں بڑھتی بلکہ اس سے مزدوروں میں لمبی چھٹی منانے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ کام کے زیادہ اوقات سے بھی ایک حد تک تعلیم کی کمی واقع ہوئی ہے لیکن حکومت کا مکمل تغافل اس کا ذمہ دار ہے یہ اس کا اہم فرض ہے۔ بڑے شہر بالعموم پورے ہندوستان میں صفائی کی کمی اور بڑے صنعتی اداروں میں قوانین صحت کو نظر انداز کرنے سے بھی ہندوستانی مزدوروں کی کارکردگی بڑی حد تک پست ہوئی ہے[۱]۔ زیادہ دیر تک کام کرنے کے اثرات پر پہلے روشنی ڈالی گئی ہے۔ جب جسمانی ساخت پست اور کمزور ہو، دماغ تعلیم سے بالکل بے بہرہ ہو اور آرام کا بہت ہی پست معیار ہو تو اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں کہ ہندوستان کے کارخانہ میں کام کرنے والے مزدور کی کارکردگی میں پستی آجاتی ہے۔ اس لئے اجرت کی کمی سے ہندوستان کی صنعت کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا تھا۔

جب سرمایہ گراں ہو اور محنت کی کارکردگی پست ہو تو ہندوستان کی صنعت میں دو خاص طریقوں سے رکاوٹیں آئیں۔ جہاں تک ملک کے وسائل کا تعلق ہے جن پر اس کے صنعتی ارتقا کا انحصار ہے وہ کئی جہتوں سے وافر ہیں۔ مثال کے طور پر خام زرعی پیداوار میں ہندوستان کے پاس مختلف قسمیں بھی ہیں اور اچھا ذخیرہ بھی ہے بعض مصنوعات میں ہندوستان کو گویا اجارہ (MONPOLY) حاصل ہے۔ لیکن بہت سی کمی بھی ہے اولاً یہ ضرور ہی کہنا چاہئے کہ حالیہ زمانہ تک ہندوستان کے وسائل سے متعلق عام لاعلمی قابل لحاظ تھی۔ اس طرح یہ حقیقت معلوم ہوئی ہو کہ ہندوستان میں لوہے کے بہت سے ذخیرے ہیں لیکن ان کی وسعت، ان کے تجارتی امکانات اور کبھی کبھی ان کے محل وقوع سے متعلق بھی مکمل لاعلمی رہی تھی[۲]۔

کسی ملک کے صنعتی ارتقا کی ایک پہلی ضرورت یہ ہے کہ بجلی پیدا کرنے کے لئے ایندھن کی سپلائی

---

[۱] ہندوستان کے صنعتی کمیشن کی رپورٹ، ضمیمہ ایل: "صنعتی ارتقا اور صحت عامہ" از میجر ایف۔ این وہائٹ

[۲] بعض قدیم ارضیاتی سروے ریکارڈ کا اتفاقیہ حوالہ مل جانے سے ہی آخرکار ٹاٹا آئرن اینڈ اسٹیل کمپنی ورکس کا مقام متعین ہوا۔ دیکھئے لوٹ فریزر کی کتاب، لوہا اور فولاد ہندوستان میں

کثیر ہو۔ اس کا اہم ترین وسیلہ کوئلہ ہے۔ کوئلہ گرچہ وافر نہیں، ہندوستان میں بہت ہی کافی مقدار میں دستیاب ہوتا ہے لیکن کوئلہ کی تمام اہم کانیں ایک چھوٹے علاقہ میں محدود ہیں اور ملک کا ایک بڑا حصہ بالخصوص مدراس صوبہ ان ذخیروں پر انحصار نہیں کرسکتا۔ بیسویں صدی کے قبل صنعتوں کی سست رفتار بڑی حدتک اسی وجہ سے تھی کیونکہ نویں دہائی کے اوائل میں جب ہندوستان میں ریلوے سسٹم پھیل چکا تھا تب جاکر کہیں کوئلے کی صنعت کو فروغ حاصل تھا۔ کوئلہ ڈھونے کا ریل کا بھاری کرایہ بھی قابل غور ہے۔ اس کے علاوہ صرف بنگال کا کوئلہ ہی دھات گلانے والے اچھے کوک کی پیداوار کے لئے موزوں تھا۔ چھوٹے انجنوں میں بجلی پیدا کرنے کے لیے تیل کا استعمال بھی مفید ہوسکتا ہے۔ ہندوستان میں پن بجلی کے مستقبل میں استعمال سے آج بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔ اس کو ترقی دینے میں خاص رکاوٹ موسمی بارش بنی ہوئی ہے کیوں کہ اس کے لئے بڑے بڑے آبی ذخیرے کی تعمیر لازمی ہے۔ صنعتی کمیشن کی سفارشات پر جو علم بحار و انہار (ہائیڈروگرافک) کے ذریعہ جو سروے کیا گیا تھا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عظیم الشان بجلی کی طاقت پیدا کرنے کے امکانات پچھمی اور پوربی گھاٹ تک ہی محدود ہیں۔ یہاں بھی بہت ہی کافی سرمایہ لگانے کی ضرورت ہے[1] سستی بجلی حاصل کرنے میں جو دشواری ہے اس کی بڑی ذمہ داری صنعتوں کی سست رفتار ترقی پر ہے۔

دھات خصوصاً لوہا اور فولاد کے کام کی کمی یکساں اہمیت رکھتی ہے۔ لوہا اور فولاد کی تیاری موجودہ زمانہ کی شاید سب سے اہم اور منفرد صنعت ہے۔ اس پر صنعتی ترقی کا سارا ڈھانچہ مبنی ہے۔ اس کے بغیر بڑی دشواری ہوسکتی ہے۔ ہندستان میں ریل کی تعمیر درآمد شدہ سامان سے ہوئی۔ کپڑے کی صنعتوں کی مشینیں بھی درآمد ہوئی تھیں۔ چھوٹی موٹر اور چھوٹی مل کا بھی یہی معاملہ تھا: تقریباً ملک میں استعمال ہونے والے ہر مشینی سامان، یہاں تک کہ نخل بندیوں میں استعمال ہونے والے بہت سے معمولی زرعی اوزار باہر سے منگائے جاتے تھے اس سے فطری طور پر ان اوزاروں کے ملک میں استعمال ہونے کی رفتار بڑی حدتک گھٹ جاتی تھی۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس سے ہندستانی صنعتوں کا دوسرے ملکوں سے مقابلہ کرنے میں دشواری بڑھ جاتی تھی۔ سنخولر کا کہنا ہے کہ صنعتی ارتقار کے اگلے مرحلے میں صنعتی ترقی کی معراج اور اس کا مرکز اس وقت ٹیکسٹائل کی عمدہ مصنوعات میں تھا[2]

---

[1] صنعتی رسالہ شائع کردہ از انڈین منیشنز بورڈ؛ ہندوستان میں پن بجلی کی طاقت از جے۔ ڈبلو میرس

[2] گستو سنخولر، بیوپاری سسٹم مترجمہ از ڈبلو۔ جے۔ ایشلے (۱۸۹۶ء)

اس میں ہندوستان عظیم الشان درجہ رکھتا تھا اور ہندوستان دوسرے ملک سے بہت پہلے ارتقار کے نقطۂ عروج کو پہونچ گیا تھا لیکن ترقی کے موجودہ مرحلہ کا دارومدار کوئلہ، اور لوہے پر ہے اور کوئلہ کی صنعت کا دیر سے ترقی پانا اور اس کا عجیب و غریب محلِ وقوع اور لوہے کی صنعت کا تقریباً عدم وجود ہندوستان میں آج کی صنعتوں کی کمی کا بڑی حد تک ذمہ دار ہے۔

یہ اکثر کہا گیا ہے کہ ہندوستان میں ریلوے کی توسیع و ترقی پہلے ہونے سے یہاں صنعتی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہو گئی۔ مختصر یہ کہ ریلوے نے ملک کو بیرونی مقابلہ کے لئے بالکل کھول دیا اور اس طرح دیسی صنعتوں کی ترقی میں رکاوٹ بن گئی۔ یہ صرف قیاس آرائی ہے اور اسے پورے طور پر ثابت کرنا مشکل ہے۔ حقیقت میں ایسا ممکن ہے کہ اگر دیر میں ریل کی توسیع ہوتی تو ہندوستان کی پرانی صنعتیں زیادہ دنوں تک زندہ رہتیں اور جدید صنعت کی ترقی کی رفتار اور بھی سست ہوتی۔ شاید ریل کی توسیع اتنی زیادہ قابل الزام نہیں جتنی ریلوے پالیسی ہوسکتی ہے۔ جیسا کہ پچھلے باب میں بتایا گیا ہے اس نے واقعی صنعتی ترقی کی طرف اتنی زیادہ توجہ نہیں دی جتنی اس سے توقع کی جاسکتی تھی۔

چند دوسرے اسباب بھی تھے۔ ایک ہندوستان میں ٹکنیکل تعلیم کی کمی تھی۔ اس لئے ہندوستان کو باہر کے ماہرین کا دست نگر ہونا پڑتا تھا۔ دوسرے زیادہ تر ملکوں میں بھی صنعتیں باہر کے ماہرین کی مدد سے قائم کی گئی تھیں لیکن ہندوستان کے ساتھ خاص بات یہ تھی کہ اپنے مخصوص سیاسی حالات کی وجہ سے وقت آنے پر دیسی ماہرین خارجی ماہرین کی جگہ نہیں لیتے تھے۔ درآمدات کی یہ روحان بوجھ کر جاری رکھی گئی دوسرا سبب یہ تھا کہ حکومت صنعتی ارتقار کی طرف کوئی توجہ نہ دیتی تھی۔ بیسویں صدی کے آغاز تک لیسیز فیر (سرکار کا تجارت میں دخل نہ دینے کا طریقہ) کی پالیسی پورے طور پر اختیار کی گئی۔ اس صدی کے آغاز سے بعض صوبائی حکومتوں نے اس معاملہ میں پوری دلچسپی لینا شروع کیا لیکن مدراس گورنمنٹ آف انڈسٹریز کی کارگذاریوں پر لارڈ مورے نے جو دھبہ لگایا تھا اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ غیر مداخلت کا اصول (لیسیز فیر) مشکل سے ختم ہو رہا تھا۔

جب ان تمام رکاوٹوں پر غور کیا جاتا ہے تو اس عمل کی سست رفتار اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے۔ ہندوستان ایسی صنعتوں کو ہی ترقی دے سکتا تھا جن میں ہندوستان کو بعض بڑی اچھی سہولتیں سرمایہ، محنت اور قدرتی وسائل سے متعلق ان تمام مشکلات پر قابو پانے کے لئے حاصل تھیں۔ جوٹ کی صنعت بڑے موافق مقام میں تھی وہ دنیا کے ایسے واحد حصہ سے قریب تھی جہاں جوٹ بڑے پیمانہ پر پیدا کیا جاتا تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ صنعت یورپین کی تھی۔ یورپ والوں کی صنعتوں کو سرمایہ کی کمی سے

اتنا پریشان نہیں ہونا پڑتا تھا جتنا کہ ہندوستانی صنعتوں کو ہندوستان کو کپاس کی صنعت کے ان شعبوں میں جہاں موٹا کام ہوتا تھا خاص سہولت بھی حاصل تھی۔ ہندوستان کے کپاس کے چھوٹے دھاگے موٹے سوت کے لئے خاص طور پر موزوں تھے۔ دیسی بازار بھی وسیع تھا اور یہ وسیع تر ہو سکتا تھا۔

بازار کے اس سوال کی اہمیت بڑھ رہی ہے۔ ہندوستانی صنعت کا انحصار زیادہ تر باہری مارکٹ پر ہے لیکن اس سمت میں توسیع کا میدان محدود معلوم ہوتا ہے۔ فیکڑی انڈسٹری کے ارتقا میں دوسرے ملکوں کا طویل آغاز رہا ہے صرف چند صورتوں میں جیسے جوٹ کی صنعت میں ہندوستان کی صنعت مستقل بیرونی مانگ پر انحصار کر سکتی ہے لیکن چین کے ساتھ سوت کی تجارت کی تاریخ یہ بتائی ہے کہ ہندوستان کو مستقبل میں اپنے گھریلو مانگ پر زیادہ سے زیادہ بھروسہ کرنا پڑے گا۔ گھریلو مانگ کو ترقی دینے کا یہ مسئلہ ابھی تک مناسب طور پر حل نہیں ہوا ہے۔ جن راستوں پر صنعتی ارتقا صورت پذیر ہوگا وہ ہمیشہ یہی راستے قرار دیئے گئے ہیں (۱) ملک میں مصنوعات کی بیرونی درآمد کو ہٹانا (۲) اس مارکٹ پر قبضہ جمانا جس کی ضرورت گاؤں کے کاریگر پوری کرتے ہیں۔ صرف یہ حقیقت کہ کوئی ملک کچھ مصنوعاتی سامان درآمد کرتا ہے کسی طرح یہ ظاہر نہیں کرتی کہ ان مصنوعات کو ترقی دینے کا امکان اس ملک کو حاصل ہے لیکن بعض صنعتوں میں ہندوستان بیرونی سامان کو ہٹانے میں اچھی کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔ گاؤں کے مارکٹ پر قبضہ جمانے کے لئے دو چیزوں کا ہونا ضروری ہے (۱) گاؤں کی آبادی کا معیار زندگی ضرور اونچا ہو یا (۲) صنعت گر بہت ہی سستے دام پر سامان تیار کرنے کے لائق ہوں ایک تیسرا ممکن راستہ جو صنعتی ارتقا اختیار کر سکتا ہے وہ یہ ہے کہ زرعی مصنوعات پر ملک سے باہر بھیجے جانے سے پہلے مزید کام کیے جائیں۔

آخر میں ہمیں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ صنعتی ارتقا کے حقیقی ہونے کے لئے ضروری ہے کہ یہ ہمہ جہت ہو اور زراعت کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کی ترقی بھی ہو۔ سر تھومس ہولینڈ نے دوسرے سلسلہ میں یہ بتایا ہے کہ موجودہ صنعت میں ضمنی پیداوار (BYPRDUCT) کی کیا قیمت ہے۔ تیل پیلنے اور آٹے والی صنعتوں کی ہندوستان میں ترقی کی راہ میں بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ کھلی اور بھوسہ کے لئے دیہی مارکٹ نہیں ہے۔

ہندوستان میں صنعتوں کی تیز رفتار ترقی میں جو بہت سی رکاوٹیں تھیں آہستہ آہستہ دور ہو رہی ہیں۔ حال ہی میں ایک صنعتی بنک قائم ہوا لازمی پرائمری تعلیم اور محنت کی بہتر تربیت

کے لئے اسکیمیں چل رہی ہیں، صحت، صفائی اور رہائشی حالات کے مسائل سنجیدگی سے ہاتھوں میں لئے جارہے ہیں۔ ہندوستان کے وسائل کی جانکاری بھی عام طور پر ہو رہی ہے اور تعلیم یافتہ طبقہ میں صنعتی کام کرنے کی بڑی خواہش ابھر رہی ہے، ریل کی پالیسی میں بھی بنیادی تبدیلی ہوتی ہوئی معلوم ہو رہی ہے اور حکومت کا رجحان اب واقعی ہمدردانہ ہے ان تمام باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مستقبل میں صنعتی ارتقا مستقل طور پر ہوگا۔ پھر بھی ہم خوش فہمی میں مبتلا نہ ہوں۔ ہندستان نے گرچہ گذشتہ دو دہائیوں میں اپنے سرمایہ کے وسائل بڑھائے ہوں تاہم وہ اب بھی ایک بہت غریب ملک ہے، عوام جاہل ہیں، اور اس بڑے ملک کے بہت بڑے مزدور طبقہ کی تربیت کے لئے کافی وقت درکار ہوگا۔ بجلی کے مسئلہ کا تشفی بخش طور پر حل نہیں ہوا ہے، لوہے کی صنعت ابھی تک بہت ہی چھوٹی ہے اور یہ صرف مصنوعات کی بہت ہی معمولی قسمیں تیار کر رہی ہے۔

ہر بات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہندستان مستقل صنعتی ارتقا کے دور میں داخل ہوگیا ہے اور کم از کم مستقبل قریب میں اس کا عمل لازمی طور پر سست رفتار ہوگا۔ اس دوران میں ہندستان اپنے صنعتی ارتقا کی تاخیر سے کوئی مادی فائدہ نہیں اٹھا رہا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ دوسرے زیادہ تر ملکوں کے مقابلہ میں ہمیں ارتقا کے پہلے مرحلہ میں فیکٹری قانون ملا لیکن اس نے ساری برائیوں کو جو فیکٹری کا لازمی نتیجہ ہیں اچھی طرح ختم نہیں کیا اور نہ وہ کر رہا ہے۔ ۱۹۲۱ء کی مردم شماری ہمیں بتاتی ہے کہ بمبئی لندن سے بہت ہی زیادہ گنجان ہے اور کراچی تو بمبئی سے بھی زیادہ بدتر ہے۔ اس صدی کی پہلی دہائی میں کارخانہ میں کام کرنے والوں کی حالت بالعموم اتنی ہی خراب تھی جتنی توقع تھی اور ان کی تنظیم کے نہ ہونے سے مزدوروں کا استحصال آسانی سے ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ہینڈلوم بنکروں کا ناگفتہ بہ حال ایسا ہی معلوم ہوتا ہے جیسا کہ انیسویں صدی کے شروع میں انگلینڈ کے بنکروں کا تھا یہی حال اس صدی کے آخیر میں ہندستانی بنکروں کا نہ تھا۔ مختصر یہ کہ ابتدائی مرحلوں میں ہندستان کو وہی مصیبتیں آئیں جو دوسرے ملکوں کے مماثل مرحلہ میں آئی تھیں دوسرے ملکوں کی مثالوں سے ہمیں بہت زیادہ مدد نہیں ملتی ہے صرف اس لئے کہ کسی ملک میں بھی صنعتی تنظیم کے تازہ ترین دور کی گوناگوں برائیوں کا کوئی انقلابی علاج ابھی تک معلوم نہیں ہوا ہے۔

پندرھواں باب

کاشتکار ۳۹-۱۹۱۴ء

ہندوستان کے زیادہ تر حصّوں میں کاشت کاروں کی اقتصادی حالت بڑی حد تک موسم کی نوعیت پر منحصر کررہی ہے۔ یہاں موسموں کی شدت اور آب پاشی کی سہولتیں ہر خطہ میں بدلتی رہتی ہیں۔ سال بہ سال طبعی پیداوار میں جو فرق ہوتا ہے اس کی وسعت (AMP TITUDE) کا تعین خصوصاً انہی اسباب سے ہوتا ہے۔ یہ یقین کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ قدرتی موسموں کا انداز چند برسوں میں تبدیل ہوگیا ہے مگر یہ صحیح ہے کہ مصنوعی آبپاشی سے محفوظ علاقے برابر بڑھتے جارہے ہیں۔ اس کے علاوہ فصلوں کے خراب ہونے کے مجموعی اثرات میں نمایاں تبدیلی پیدا ہوئی ہے فصل خراب ہونے کے اثرات اب محدود علاقہ پر ہوتے ہیں وہ اوران اثرات کی شدت میں بھی کمی ہوگئی ہے۔ حمل ونقل میں ترقی اور زراعت کے تجارتی ہوجانے سے یہ عمل پہلے شروع ہوا۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد سڑکوں پر آمدورفت کے مشینی ہوجانے سے دیہی ہندوستان میں یہ تغیر بہت جلد ہوا انتظام سلطنت میں سدھار ہوجانے سے بھی یہ تغیر رونما ہوا۔ پچھلے تجربے اور اختلافات کی وجہ سے مالگذاری معطل کرنے، معافی کرنے اور رلیف کے کاموں کا نسبتاً بہتر سسٹم آگیا حال کی دہائیوں کے زیادہ تر حصوں میں غذائی اجناس کی تجارت اور حمل ونقل پر گورنمنٹ کا کنٹرول زیادہ ہوگیا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مانسون فیل ہونے کی وجہ سے ملک کی پوری معیشت یا ملک کا بڑا علاقہ اس سے متاثر نہیں ہوتا بلکہ وہ عموماً مخصوص خطے اور دیہی معیشت تک محدود ہوتے ہیں۔ ۱۹-۱۹۱۸ کا موسم آخری موسم قرار دیا جاسکتا ہے جب کہ مانسون فیل ہونے کے اثرات پورے ملک میں محسوس کیے گئے تھے۔

۱۹-۱۹۱۸ء کا قحط ہندستان کے سنگین قحطوں میں سے ایک تھا جس کا مقابلہ ۷۸-۱۸۷۶ء یا ۱۹۰۰-۱۸۹۹ء کے قحط سے کیا جاسکتا ہے حقیقت میں یہ ناکامرانی اتنی مکمل تھی کہ یہ کہا جاتا ہے کہ

"اس سال (۱۹۱۹ء) کے وسط میں اس سراسیمگی کے اسباب موجود تھے کہ ملک میں غذا کا جو ذخیرہ ہے وہ سال بھر کے لئے کافی نہیں ہے۔" پھر بھی اس سال کے دوران رلیف پر رہنے والوں کی تعداد زیادہ سے زیادہ صرف ۶لاکھ تک گئی تھی جو ۱۹۰۰ کی زیادہ سے زیادہ تعداد کا دسواں حصہ ہے بڑی حد تک یہ پچھلے برسوں کے موافق حالات کا نتیجہ تھا۔ ۱۹۱۵-۱۶ اور ۱۹۱۶-۱۷ء کے سال بالخصوص چاول اور گیہوں کے لئے اچھے سال تھے اور ان برسوں کے دوران غذائی اجناس کی برآمد بہت ہی کم تھی۔ سرکار برآمد کا انتظام کرتی تھی اور جنگ کے آخری برسوں میں ساتھی ملکوں Allied Countries کو غذائی سامان بھیجتی تھی اور یہ بڑی خوش قسمتی تھی کہ ساتھی ملکوں کو کافی غذائی سامان بھیجنے کی ضرورت ۱۹۱۸ء کے قانون ختم ہوتے ہی عارضی صلح ہونے (Armistice) کی وجہ سے کم ہونے لگی۔ نومبر ۱۹۱۸ء کے بعد سے گورنمنٹ نے غذائی اجناس کی برآمد کو ایسے ملکوں تک ہی محدود رکھا جہاں ہندوستانی آبادی ہوتی تھی جو ہندوستان پر اپنی غذا کی سپلائی کے لئے انحصار کرنے کے عموماً عادی ہو گئے تھے، جیسے لنکا اور ملے ہوئے خاکنائے آب (Straits' Settlement) داخلی کنٹرول کا سنگین سسٹم بھی قائم ہو گیا اور ہر صوبہ کی فاضل غلہ کی تناسب تقسیم کی اسکیم عمل میں آگئی۔ برآمد اور قیمتوں کے کنٹرول کا سسٹم برما تک لاگو ہو گیا اور برما کے چاول کی بڑی مقدار ہندوستان بھیجنے کیلئے فراہم کی گئی۔ ہندوستان کی غذا کی سپلائی میں آسٹریلیا کے ۲لاکھ ٹن گیہوں کے آجانے سے اضافہ ہوا یہ گیہوں کی سپلائی سے متعلق رائل کمیشن کے ذریعہ درآمد ہوا تھا۔ غلہ، دلہن اور آٹا کی ہندوستان میں درآمد ۱۹۱۹ء میں ایسی زیادہ ہو گئی جو پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔

سرکاری امداد پر گذر کرنے والوں کی تعداد اس سال کے وسط کے بعد نہیں بڑھی کیونکہ اس کل مانسون پورے ہندوستان بھر میں بہت ہی اچھا ہوا تھا لیکن ۱۹۲۰ء کا مانسون پھر ہندوستان کے بہت سے حصوں میں خراب ہو گیا۔ بمبئی پریسیڈنسی اور صوبہ متوسط کے بعض ضلعوں میں قلت کا اعلان ہو گیا مدراس اور حیدرآباد ریاست کے دکنی ضلعوں میں خاص طور پر سخت مصیبت کا سامنا تھا۔ اس کے علاوہ ۱۹۲۰ء میں مانسون کے پہلے ختم ہو جانے سے خزاں میں بونے کا کام محدود پیمانہ پر ہوا جس کے نتیجہ میں ۱۹۲۱ء میں بہار کی فصلیں بالخصوص پنجاب کے گیہوں کی فصل بہت خراب ہوئی۔ گیہوں کی پیداوار نارمل پیداوار کی تقریباً ۲۵ فی صد کم ہوئی۔ گیہوں کا دام بہت بڑھ گیا اس لئے گورنمنٹ نے گیہوں کی برآمد پر پھر روک لگانا ضروری سمجھا اور ہندوستان میں گیہوں کی درآمد کی حوصلہ افزائی کی۔ ۱۹۲۱ء کے دوران ہندوستان میں غلہ اور دلہن کی درآمد ۱۹۱۹ء کے ریکارڈ اعداد سے بھی

بہت زیادہ بڑھ گئی۔ ۱۹۲۰-۲۱ء کا قحط اگرچہ ۱۹-۱۹۱۸ء کے قحط سے بہت کم وسیع علاقہ میں پھیلا تھا پھر بھی اس کے اثرات نسبتاً زیادہ محسوس کئے گئے اس سال ریلیف چاہنے والوں کی تعداد تناسب کے لحاظ سے بہت زیادہ تھی۔ ۱۹۲۰ء کے ختم ہونے تک تقریباً ایک لاکھ لوگ ریلیف پر تھے اور جون ۱۹۲۱ء تک ان کی تعداد بڑھ کر تقریباً ساڑھے لاکھ ہوگئی۔ ریلیف کا کام کچھ حصوں میں ۱۹۲۱ء کے خاتمہ تک جاری رکھنا پڑا۔

۱۹۲۱ء کے بعد دو دہائیوں میں مانسون کی کوئی ایسی ناکامیابی نہیں ہوئی جس کے اثرات ملک گیر ہوئے ہوں۔ ہاں مقامی طور پر بعض جگہوں میں مانسون کی شدید ناکامیابی ہوئی اور ملک کے کچھ حصے جیسے بنگال، مالا بار، سندھ اور گجرات کو انہی برسوں میں سیلاب سے کافی نقصان ہوا۔

زرعی کاموں کی وسعت اور کاشتکاروں کی دولت میں فرق کا پتہ ان اعداد و شمار سے چلتا ہے جو کاشت مالی زمین کے رقبہ اور زرعی پیداوار کے حجم سے متعلق ہیں۔ فصلوں کے رقبہ کے اعداد و شمار نسبتاً معتبر ہیں۔ اس سلسلہ میں برٹش انڈیا سے متعلق جو اعداد و شمار کی اطلاع ملتی ہے وہ مسلسل اور تقابلی ہیں یہ صورت ان اعداد و شمار کی نہیں جو دیسی ریاستوں سے متعلق ہیں۔ اس لئے برٹش انڈیا کے اعداد و شمار خانوں میں پیش کئے جاتے ہیں اور ان سے یہاں پر بحث کی جاتی ہے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان سے جس خاص تحریک اور رجحان کا پتہ چلتا ہے وہ کم و بیش سارے ہندوستان کے لئے صحیح ہیں۔ ان خانوں میں جو اعداد و شمار ملتے ہیں ان میں برٹش برما کے اعداد نہیں کیونکہ یہ ۱۹۳۷ء میں برٹش انڈیا سے الگ ہوگیا تھا۔

۱۹۳۹-۱۹۱۴ء کے پچیس برسوں کے دوران بوئے گئے اور کل کاٹے گئے علاقہ میں کوئی نمایاں کمی یا بیشی نظر نہیں آتی۔ اس مدت کے آخری سالوں میں ان کی یہ نسبت صرف تھوڑی بلند تھی اور ان مجموعی اعداد سے کسی متعلق رجحان یا تحریک کا پتہ نہیں چلتا۔ ۱۹-۱۹۱۸ء میں موسموں کی خاص نوعیت کا پتہ ان برسوں میں رقبہ کی خاص نچلی سطح سے چلتا ہے۔ کل کاٹے گئے رقبہ میں غذائی اجناس کے باہمی حصوں میں تقریباً کوئی حرکت نظر نہیں آتی۔ غذائی اجناس میں چاول، گیہوں، جو اور باجرا چار خاص اجناس سب سے زیادہ اہم تھیں۔ کل کاٹے گئے رقبہ میں غذائی اور غذائی اجناس کے باہمی حصوں میں تقریباً کوئی حرکت نظر نہیں آتی۔ غذائی اجناس میں چاول گیہوں، جو اور باجرا چار خاص اجناس سب سے زیادہ اہم تھیں کل کاٹے گئے رقبہ اور غذائی اجناس کے کل رقبہ میں ان چار اجناس کا حصہ ایک ساتھ مل کر مستقل رہا۔

برطانوی ہندوستان کے زرعی اعداد و شمار

(ہزار ایکڑ)

	۱۹۱۸-۱۹	۱۹۲۰-۲۱	۱۹۲۴-۲۵	۱۹۲۹-۳۰ء	۱۹۳۴-۳۵ء	۱۹۳۹-۴۰ء
بنجر زمین	۷۲,۶۶۸	۱۶,۳۴۷	۴۷,۱۶۹	۴۹,۷۱۴	۵۲,۲۹۷	۴۷,۳۲۸
زیر کاشت خالص علاقہ	۲۰۱,۳۸۴	۲۱۲,۲۶۰	۲۲۶,۹۸۰	۲۲۸,۱۹۱	۲۲۶,۹۸۱	۲۰۹,۹۶۰
آب پاشی کا علاقہ	۴۷,۲۲۲	۴۸,۹۵۷	۴۵,۲۹۹	۵۱,۰۱۰	۵۰,۵۳۴	۵۴,۹۴۵
چاول	۷۷,۶۱۳	۷۸,۱۲۰	۷۹,۳۰۶	۷۹,۴۲۴	۷۹,۵۲۰	۷۰,۱۰۱
گیہوں	۱۹,۱۴۷	۲۰,۳۶۸	۲۴,۸۴۸	۲۴,۷۳۱	۲۵,۶۵۵	۲۶,۱۲۸
جوار	۲۰,۵۳۷	۲۲,۶۹۰	۲۲,۴۷۰	۲۳,۲۴۱	۲۱۸۵۳	۲۱,۶۷۷
باجرا	۱۱,۲۰۱	۱۲,۰۰۲	۱۱,۹۶۵	۱۳,۲۹۱	۱۳,۱۰۲	۱۳,۳۶۲
کل غذائی اجناس	۱۷۷,۸۴۴	۱۸۶,۸۹۰	۲۰۰,۳۲۸	۲۰۰,۰۱۸	۲۰۰,۶۳۵	۱۸۷,۰۵۰
چینی	۳,۰۱۶	۲,۷۰۶	۲,۶۵۵	۲,۵۸۳	۳,۵۲۴	۳,۶۲۹
تلہن	۱۰,۴۷۳	۱۲۲۷۰	۱۵,۰۱۴	۱۶,۳۳۰	۱۴,۵۴۳	۱۶,۲۹۴
کپاس	۱۴,۴۰۱	۱۴,۱۱۴	۱۷,۴۱۴	۱۹,۱۴۱	۱۴,۴۸۶	۱۳,۳۴۴
جوٹ	۲,۴۷۳	۲۴۷۳	۲,۷۳۸	۳,۲۶۸	۲,۴۷۶	۳,۱۱۹
چائے	۶۸۸	۶۶۱	۷۱۶	۷۶۶	۷۸۳	۷۳۸
تمباکو	۱۰۴۷	۹۳۲	۱۰۶۶	۱۱۷۳	۱۲۵۷	۱,۱۸۱
چارے کی فصلیں	۷,۲۲۸	۸۱۰۸	۸,۸۳۶	۹,۳۸۱	۱۰,۳۰۸	۱۰,۴۹۷

سال بہ سال الگ الگ فصلوں کے زیر کاشت رقبہ میں کمی بیشی کافی ہوتی رہی لیکن اس پورے عرصہ میں کسی مستقل رجحان کا پتہ نہیں چلتا ہے ہاں صرف باجرا کے زیر کاشت علاقہ کے رقبہ اور تناسب میں معمولی گراوٹ کے رجحان کا پتہ چلتا ہے۔ خاص غذائی اجناس میں باجرا سب سے کم پیدا ہونے والی فصلوں میں سے ہے اور خاص طور پر ہلکی زمین میں ہوتا ہے۔ اس کی کاشت کے رقبہ میں کمی باجرا کے کھیت سے جوار یا گیہوں یا مونگ پھلی یا کپاس کے کھیت میں بدل جانے سے ہی ہوئی۔

غیر غذائی غلوں میں ان پچیس برسوں کے دوران کاشت کے رقبہ سے متعلق کسی نمایاں رجحان کا پتہ کپاس میں اور نہ جوٹ میں چلتا ہے۔ اس کے برخلاف تلہن، گنا اور نخل کاری کی فصلوں کے رقبہ میں واضح مگر مختصر بڑھنے والے رجحان کا پتہ چلتا ہے۔ تلہن والے گروپ میں رقبہ میں اضافہ مونگ پھلی کے رقبہ میں عظیم الشان مسلسل اضافہ ہونے سے ہوا مگر کچھ تلہن جیسے تل اور سرسوں کے رقبہ میں کمی ہوئی۔ نخل کاری فصلوں میں ربڑ اور چائے کی کاشت میں نمایاں اضافہ ہوا۔

سال بہ سال فصلوں کے زیر کاشت رقبہ میں کمی بیشی کا سبب بڑی حد تک سالانہ موسمول کی نوعیت سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے فصل کے رقبوں میں جو کمی بیشی ہوتی تھی اس کا تعلق باہمی منافع کی نسبت سے تھا۔ مثال کے طور پر بنگال میں چاول اور جوٹ کے درمیانی تناسب میں جو کمی بیشی ہوتی تھی اس کا یہی سبب تھا۔ کپاس اور مونگ پھلی کے زیر کاشت رقبہ میں بھی کمی بیشی کا خاص سبب یہی تھا۔ گنا کے رقبہ میں خصوصاً تیسری دہائی کے دوران مستقل اضافہ اس مستقل مارکٹ کا نتیجہ تھا جو ملک کے اندر چینی کی صنعت قائم ہو جانے سے بعض علاقوں میں اس فصل کے لئے پیدا ہو گیا تھا۔

اس دور میں زرعی کاموں کے لئے مجموعی کاشت کی بنیاد چھوٹے پیمانے پر پھیلی تھی فصلوں کے تناسب میں مجموعی اعتبار سے کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہوئی۔ دوسرا اہم سوال پیداوار سے متعلق ہے۔ تمام آباد ملکوں میں کاشت شدہ علاقہ میں توسیع کا امکان محدود ہی ہوتا ہے اس لئے فی ایکڑ پیداوار ہی میں اضافہ کرنا پڑتا ہے۔ پیداوار پر غور کرنے کے لئے اعداد و شمار بھی کم ملتے ہیں اور یہ قابل اعتبار بھی نہیں۔ اس لیے اس سلسلہ میں معتبر اور مجموعی حساب پیش کرنا ممکن نہیں۔ اس موضوع سے متعلق سب سے زیادہ قابل قبول بیانات وہ ہیں جو ڈاکٹر بلنتری نے ۱۱-۱۹۱۰ سے ۱-۱۹۴۰ کی چند اہم اجناس کے بارے میں پانچ صوبوں کے اعداد و شمار کا مطالعہ کرنے کے

بعد دیئے تھے[1] ڈاکٹر بینیرے اپنے ماحصل کا بیان اس طرح کرتے ہیں" نقدی فصلوں کے لئے جو اعداد شمار ہیں ان سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ پیداوار کی شرح عموماً بڑھ رہی ہے اور گنا کے بارے میں بھی یہ اعداد و شمار ملتے ہیں کہ جس طرح سیراب شدہ رقبہ میں اضافہ کا تناسب ہے اسی طرح بعض صورتوں میں گنا میں توسیع ہو رہی ہے۔ پیداوار کے رجحانات متضاد ملتے ہیں بعض ریاستوں میں بعض اجناس کی پیداوار میں اضافہ ملتا ہے اور بعض میں کمی یا باقی میں کسی نمایاں تغیر کا پتہ نہیں چلتا۔ عام طور پر کسی فصل کے رقبہ میں توسیع کے معنی یہ لئے گئے ہیں کہ پیداوار کی شرح گھٹ رہی ہے جبکہ سیراب شدہ رقبہ کے تناسب میں اضافہ کا الٹا اثر پڑا ہے"[2]

اس صدی کی پہلی دہائی کے دوران ہندستان کی زرعی حالت کیا تھی اس سلسلہ میں بحث کرتے ہوئے ملک کے مجموعی ایکڑی رقبہ میں غذائی اجناس کی فصلوں کے منتقل تناسب اور ملک سے غذائی اجناس کی برآمد حاشیائی پوزیشن کی طرف توجہ دی گئی ہے۔ یہ بتایا گیا ہے کہ یہ برآمدات بالخصوص گیہوں کی بہت ہی اتار چڑھاؤ کی زد میں آسکتی ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ برآمدات قحط سے بچاؤ کے لئے ذخیرہ کا کام کرتی تھیں یعنی فصل کی موسمی ناکامی کے مقابلہ میں یہ اس فاضل پیداوار کی عام برسوں میں ضرورت ہوتی تھی۔ ۱۹۱۴ء کے بعد بیس برسوں کے دوران غذائی اجناس کے زیر کاشت رقبہ میں نسبتاً تھوڑا اضافہ ہوا تھا اور آبادی کی مسلسل زیادتی سے غذائی اجناس کی برآمدی پوزیشن واضح طور پر بدل گئی تھی۔

یہ حساب لگایا گیا ہے کہ دوسری دہائی کے برسوں میں ہندستان اوسط فصلوں کے ساتھ گیہوں صرف اتنا پیدا کرتا تھا کہ اس سے گھریلو ضروریات پوری ہوتی تھیں، ناموافق برسوں میں درآمد ہوسکتی تھی اور جب اچھی فصل ہوتی تھی تب ہی فاضل غلہ برآمد کرنے کے لئے دستیاب ہوتا تھا[3] پھر بھی اس وقت ہندوستان میں گیہوں کے لئے گھریلو مانگ گھٹ بڑھ سکتی تھی اور دوسری دہائی کے برسوں میں گیہوں کی جہاز برداری کافی ہوئی جب کہ ہندستان میں اچھی پیداوار کے ساتھ ہی ساتھ عالمی قیمت بڑھ گئی تھی۔

---

[1] یہ قابل غور ہے کہ ڈاکٹر بینیر کے مطالعہ میں مشرقی ہندستان کا کوئی صوبہ نہیں آیا تھا

[2] وی۔ جی۔ بینزی: ہندستان میں خاص فصلوں کے رقبے اور پیداوار کے رجحانات"، ہندستان میں زرعی صورتحال ۱۹۵۹ء

[3] ہندستان: گیہوں پیدا کرنے والے اور برآمد کرنے والے ملک کی حیثیت سے، بلب نہم کیلیفورنیا، ۱۹۲۷ء

۲۵-۱۹۲۴ء میں برآمد خلاف دستور بڑھ گئی کیونکہ بڑے ذخیرے جمع ہو گئے تھے اور ہندوستان میں اچھی فصل ہوئی تھی اس کے ساتھ ہی ساتھ عالمی فصلوں کے بارے میں یہ امید کی جاتی تھی کہ ان کی پیداوار کم ہوگی جس کے معنی تھے کہ قیمتوں کی سطح اونچی ہوگی ۔ مگر اس سال کے بعد برآمدات کم ہوئیں اور ۹-۱۹۲۸، ۳۰-۱۹۲۹ اور ۳۲-۱۹۳۱ء کے دوران ہندوستان میں مجموعی اعتبار سے گیہوں کی درآمد ہوئی۔ گرچہ ۳۰-۱۹۲۹ء میں گیہوں کی فصل شاندار ہوئی پھر بھی کمزور عالمی مانگ اور بیرونی گیہوں کے مقابلہ کی وجہ سے برآمد برائے نام ہی ہوئی ۔ جیسے سرد بازاری (DEPRESSION) بڑھتی گئی ویسے خود ہندوستان کا مارکٹ اسٹریلیا کی درآمد سے خطرہ میں پڑ گیا اس لئے حکومت نے ہندوستانی گیہوں کے مفاد کی حفاظت کی خاطر درآمد پر مارچ ۱۹۳۱ء میں چالیس روپیہ فی ٹن کے حساب سے ٹیکس لگانا ضروری سمجھا ۔

یہ ٹیکس بعد میں حفاظتی ٹیکس بن گیا اور بتدریج کم ہوتا گیا یہاں تک کہ ۱۹۳۰ء میں پورا ٹیکس ہٹا لیا گیا۔ ۳۳-۱۹۳۲ء اور ۳۶-۱۹۲۵ء کے درمیان ہندوستان کے گیہوں کی برآمد درآمد بڑی بے چینی سطح پر رہی ۔ دوسری عالمی جنگ چھڑنے کے تین برسوں کے دوران دونوں کا حجم کسی قدر بڑھ گیا لیکن خالص درآمد یا خالص برآمد کسی سال میں بھی کوئی ایسی نمایاں نہ تھی ۔ ان برسوں کے دوران برآمدات تقریباً تمام کراچی سے برطانیہ کو ہوئیں ۔

۱۹۱۴ء کے قبل بھی ہندوستان سے چاول کی برآمدات برما سے ہی ہوئی تھیں ۔ ۱۹۱۴ء سے قبل پانچ برسوں کی اوسط برآمدات ۲۳۹۸ ہزار ٹن تھیں جن میں سے ۱۸۱۴ ہزار ٹن برآمدات برما سے ہوئیں ۔ اس کے علاوہ اسی زمانہ میں ہندوستان میں چاول کی کافی درآمد خاص برما سے ہوتی تھی اس طرح ہندوستان چاول کی خاص برآمد اس سے کم کرتا تھا جس کا پتہ ان اعداد وشمار سے ہوتا ہے جنگ کے بعد ہندوستان مستقل طور پر چاول کی خالص برآمد اس سے کم کرتا تھا جس کا پتہ ان اعداد و سے ہوتا ہے ۔ جنگ کے بعد ہندوستان مستقل طور پر چاول کی خالص درآمد کرنے لگا جنگ ختم ہوتے ہی پوزیشن غیر نارمل ہو گئی قحط اور قلت کی وجہ سے چاول وغیرہ کی درآمد بہت بڑھ گئی ۔ ۲۳-۱۹۲۲ء ۲۵-۱۹۲۴ء کے تین برسوں کی مدت سے اس زمانہ کی نارمل پوزیشن کا پتہ چل سکتا ہے ۔ ان تین برسوں کے دوران ہندوستان سے چاول کی اوسط سالانہ برآمد ۳۸۰ ہزار ٹن تھی اس کے ساتھ ہی ساتھ ہندوستان میں چاول کی اوسط سالانہ برآمد ۳۸۰ ہزار ٹن تھی اس کے ساتھ ہی ساتھ ہندوستان میں چاول کی اوسط سالانہ درآمد ۵۱۲ ہزار ٹن تھی ۔ آنے والوں برسوں میں یہ فرق مستقل بڑھتا رہا ۔

۹۴-۱۹۳۸ء میں ہندوستان سے چاول کی برآمد ۲۸۲ ہزار ٹن تھی جب کہ ہندوستان میں چاول کی درآمد ۱۲۸۲ ہزار ٹن تھی ۔ دوسری دہائی کے پہلے برسوں تک ہندوستان میں چاول کی درآمد صرف برما سے ہی ہوتی تھی بلکہ ۱۹۲۹ء میں بھی وہیں سے زیادہ درآمد ہوتی تھی لہ ۱۹۳۷ء میں جب برما ہندوستان سے الگ ہو گیا تو ہندوستان عالمی تجارت کے اعداد و شمار میں چاول کی درآمد کرنے والا ہو گیا ۔

دوسری زرعی مصنوعات کی بیرونی تجارت میں بھی تبدیلیاں ہوئیں ۔ اور ان کا اثر گھریلو پیداوار کاشت کے رقبہ پر پڑا ۔ جنگ اور اس کے مابعد نے ہندوستانی تلہن کے لئے یورپی مارکٹ کو متاثر کیا اور ۲۴-۱۹۱۴ء کی دہائی کے دوران یورپ میں ان کی درآمد کو کم کر دیا ۔ لیکن جنگ کا زمانہ دوسری تبدیلیاں بھی لایا جن کا زیادہ مسلسل اور طویل المدت اثر پڑا ۔ تکنیکی پہلو کے لحاظ سے بھی جنگ نے صاف کرنے کے طریقہ کو ترقی دینے میں مدد پہنچائی اور ان تبدیلیوں کا عمومی اثر یہ ہوا کہ تیل کو ایک دوسرے میں بدلنے کا عمل کافی بڑھ گیا ۔ اس کا اثر تلہن کی پوزیشن پر پڑا جس کی قیمت خاص جنہوں سے متعین ہوتی تھی ۔ اس کے علاوہ جنگ نے تلہن کی سپلائی کے دوسرے وسیلوں کو ترقی دینے میں مدد پہنچائی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ سے پہلے ہندوستان کے بعض تلہن کی جو خاص موافق پوزیشن تھی وہ ختم ہو گئی ۔ تل، تلی اور سرسوں کی برآمدات میں سب سے بڑی تبدیلی رونما ہوئی ۔ کپاس کے بنولے کی برآمدات بھی اس طرح متاثر ہوئے بغیر نہ رہیں ۔ مندرجہ ذیل نقشے سے اس تبدیلی کے حدود معلوم ہوتے ہیں ۔

ہندوستان کی برآمدات (ہزار ٹن میں)

	جنگ سے قبل کی اوسط (۱۹۱۴)	جنگ کے بعد کی اوسط	تین برسوں یعنی ۳۹-۱۹۳۶ کی اوسط
پتی	۳۷۹ (۶۳)	۱۴۲ (۵۹)	۲۸۰ (۶۴)
رائی اور سرسوں	۲۷۳ (۲۳)	۲۰۶ (۱۹)	۲۷ (۳ر۱)
تل	۱۱۹ (۲۵)	۲۸ (۶)	۱۲ (۲ر۸)
کپاس کے بنولے	۲۴۰	۱۵۵	۵
مونگ پھلی	۲۱۲ (۳۵)	۱۹۵ (۱۹)	۷۳۱ (۲۴ر۲)

لہ گورنمنٹ آف انڈیا، مارکٹنگ آف رائس اِن انڈیا اینڈ برما ص ۶۳ (۱۹۴۱ء)

بریکیٹ کے اعداد فصل کی کل پیداوار میں برآمدات کی فیصد شرح کو ظاہر کرتے ہیں ۔
(ماخذ : ریویو آف دی ٹریڈ آف انڈیا ۹-۱۹۳۸ء)

ان تبدیلیوں سے جس تلہن کو فائدہ ہوا وہ مونگ پھلی تھی جس کی برآمدات جنگ کے بعد کے زمانہ میں غیر معمولی طور پر بڑھ گئیں اس نئی صورت کا ان رجحانات سے مقابلہ کرنا دلچسپی سے خالی نہیں جو مختلف تلہن کی فصلوں کی کاشت کے رقبہ سے ظاہر ہوتے ہیں پہلے جو نقشہ پیش کیا گیا ہے اس

برٹش انڈیا ـــــ ۱۰ لاکھ ایکڑ میں

	کل تلہن	پٹی	تلی	تل	مونگ پھلی
۱۹۱۳ ـ ۱۴	۱۶٫۵	۲٫۶	۶٫۲	۳٫۹	۱٫۸
۱۹۲۱ ـ ۴ کا اوسط	۱۶٫۶	۳٫۵	۶٫۲	۳٫۳	۲٫۲
۱۹۳۶ ـ ۹ کا اوسط	۲۰٫۱	۳٫۵	۵٫۵	۳٫۳	۵٫۶

ماخذ : ڈبلو برنس : ہندوستان میں زرعی ترقی کے ٹکنیکی امکانات (۱۹۴۴)

معلوم ہوتا تھا کہ جنگ کے دوران تل کے برآمدی مارکٹ کو نقصان ہوا جب کہ تلی اور سرسوں کو نقصان خاص طور پر جنگ کے درمیانی برسوں میں ہو کاشت کے رقبہ میں جو رجحانات ملتے ہیں ان سے اس فرق کے اثرات کا پتہ چلتا ہے ۱۹۱۴ء اور ۱۹۳۹ء کے درمیانی برسوں میں متناسب کمی اس طرح کی ہوئی ۔
پھر بھی یہ کمی جس زمانہ میں ہوتی ہے وہ مختلف ہے ۔ ان اعداد سے جو قابل غور نکتہ ظاہر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ برآمدات کم ہو جانے کا نسبتاً تھوڑا اثر تلہن کی الگ الگ فصلوں کی کاشت پر ہوا ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تلہن کو گھریلو مانگ سے بڑی تقویت ملی ۔ اس کے علاوہ تکنیکل اسباب، جن سے مخصوص تلہن کی پوزیشن عالمی بازار میں کمتر ہوگئی وہ ہندوستانی مانگ پر لاگو نہیں ہوتے یہ خاص طور پر گھریلو استعمال یعنی پکوان کے لئے تیل کی مانگ تھی ۔ اس سلسلہ میں تکنیکل تبدیلی بہت اہم نہیں اور مانگ روایتی ترجیحات، مقامی پیداوار اور اس قسم کی دوسری وجہوں سے تقویت پاتی رہی ۔ اس کے علاوہ برآمدات گر جانے کے باوجود تلی اور تل کی کاشت کے باہم مستقل رہنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ہندوستانی مانگ بڑھ رہی ہے گرچہ اس کی رفتار سست ہے تلہن کے لئے ہندوستانی مانگ خاص طور پر غذائی مانگ ہے اور ان کو متعین کرنے والی

توتیں ان قوتوں کی طرح ہیں جن کا عمل غذائی اجناس اور دلہن کی پیداوار اور استعمال پر ہو رہا ہے۔

کپاس کے زیر کاشت رقبہ سے اس مدت میں مجموعی طور پر کسی مستقل رجحان کا پتہ نہیں چلتا۔ یہ تجارتی اتار چڑھاؤ کے ماتحت تھا جس کا تعین خصوصاً اضافی قیمتوں سے ہوتا تھا۔ ہندوستان کے خام کپاس کی برآمد کی مانگ ملک کے اندر کپاس کی قیمت متعین کرنے کا ایک بالواسطہ عنصر رہی تھی پہلے قیمتوں کا وہی رشتہ ہوتا تھا جو متبادل فصل بالخصوص جوار سے قائم ہوتا تھا مگر جنگ کے درمیانی دور میں مونگ پھلی کچھ علاقوں میں کپاس کا اہم بدل ہو گئی تھی۔ پنجاب اور سندھ میں آب پاشی سے ہونے والے کپاس کے علاقہ میں اضافہ تیسری دہائی کے دوران کی اہم خصوصیت تھی جس طرح زیر کاشت رقبہ کا حال تھا اس طرح خام کپاس کی اس برآمدی سطح میں کوئی قابل غور اضافہ نہیں ہوا تھا جو سطح پہلی عالمی جنگ کے وقت حاصل ہوئی تھی۔

جوٹ کے زیر کاشت رقبہ میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی تھی حالانکہ زیر کاشت علاقہ میں کمی اور بیشی کے طویل دور آئے تھے جوٹ کے زیر کاشت علاقے بہت سے اسباب پر منحصر تھے۔ ان میں سے ایک چاول کی قیمت اور دوسرے عناصر تھے جن سے چاول کے زیر کاشت رقبہ کا یقین ہوتا تھا۔ دوسرے اسباب میں خام جوٹ کی برآمدات کی مانگ اور ہندوستانی ملوں کے ذریعہ خام جوٹ کو مصرف میں لانے کی سطح شامل تھی۔ دوسری عالمی جنگ کے موقع پر خام جوٹ کی برآمدات کی سطح وہی تھی جو چوتھائی صدی پہلے تھی۔

گنا کے زیر کاشت علاقے سے اضافہ کے نمایاں رجحان کا پتہ بالخصوص تیسری دہائی کے دوران چلتا تھا اس کا گہرا تعلق اس تحفظ PROJECTION سے تھا جو چینی کی صنعت کو ملا کرتا تھا اور اس مستقل مانگ سے بھی تھا جو گنا پیدا کرنے والوں کے لئے پیدا کی گئی تھی۔ تیسری دہائی کے دوران رقبہ میں اضافہ خاص طور پر یو۔پی اور بہار میں ہوا جہاں اسی زمانہ میں چینی کی صنعت کی توسیع ہوئی۔

جنگ کے درمیانی برسوں میں فصلوں کی پیداوار سے متعلق ڈاکٹر بنیرے کی دریافت کے حوالہ سے معلوم ہوگا کہ اس زمانہ میں زرعی پیداوار کی سطح میں کوئی عام طور پر کوئی ترقی نہیں ہوئی پھر بھی بعض جہتوں سے کچھ ترقیاں طریق کار، ٹکنیک وغیرہ میں نظر آتی تھیں یہ کہا جا سکتا ہے کہ زرعی ترقی سے متعلق باضابطہ کام لارڈ کرزن کے شعبۂ زراعت کی تنظیم سے شروع ہوا نئی فصل یا ہندوستانی فصلوں کی نئی قسموں کو لانے کا کام بڑی حد تک چھوڑ دیا گیا اگرچہ پچھلی صدی میں اس پر

پوری توجہ دی گئی تھی، ایسی کوششوں کے کامیاب ہونے کا امکان بہت تھوڑا تھا۔ ہندوستانی اور صوبائی شعبہ ہائے زراعت نے جس اہم مسئلہ کو حل کیا وہ زرعی پیداوار کی موجودہ قسموں کے مطالعہ اور ان کی ترقی کا مسئلہ تھا۔

شاید ہندوستان میں اس قسم کی پہلی باضابطہ کوشش ہوورڈس کا مختلف قسم کے گیہوں کا مطالعہ تھی۔ جیسا کہ ڈاکٹر وایلکر نے بہت پہلے کہا تھا، پورے ہندوستان میں پیدا کی جانے والی فصلوں کے طریقہ کاشت اور ان کی مختلف قسموں میں کافی فرق پایا جاتا تھا اور یہ کھلی ہوئی بات تھی کہ موزوں ترین قسموں کے انتخاب اور ان کے معیاری ہو جانے سے کاشت کاروں کو غیر معمولی فائدہ ہوگا۔ زیادہ تر صوبوں میں فصلوں کی بہتر قسموں کے استعمال میں لانے کا کافی کام ہوا ہے۔ گیہوں، کپاس، جوٹ، مونگ پھلی اور گنا میں خاص طور پر کامیابی حاصل ہوئی۔ کاشتکاروں کو جب یقین ہو جاتا ہے کہ اس سے مالی طور پر فائدہ ہوگا تو وہ اسے اختیار کرنے کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ کاشت کار کے تیار ہونے کی نمایاں مثال زرعی کمیشن نے یہ دی تھی کہ خاندیش اور شمالی گجرات میں ۱۳-۱۹۱۲ء میں مونگ پھلی کی کاشت ۵۴۰۰ ایکڑ سے بڑھ کر ۲۷-۱۹۲۶ء میں ۳۱۰۰۰۰ ایکڑ ہو گئی۔ موزوں قسموں سے متعلق تجربات میں جو تحقیق کا کام ہوا ہے اسے ان قسموں کے علم کی توسیع اور ان ترقی یافتہ انواع کو خالص رکھنے کی کوشش سے تقویت دینی ضروری ہے۔ اس موخر الذکر مقصد کے لئے بیجوں کی توسیع اور تقسیم کے اسپیشل بیج فارم کھولے گئے اور کپاس جیسی فصلوں کے لئے جہاں بیج کے خراب ہونے اور اس میں ملاوٹ کے خطرات زیادہ ہیں۔ وہاں قانونی اقدام جیسے ۱۹۲۳ء کا کاٹن ٹرانسپورٹ ایکٹ کام میں لائے گئے۔ کئی وجوہات ایسے بھی تھے جن کی بنا پر ترقی یافتہ قسموں کا کام میں لانا آسان ترین کام سمجھا گیا۔ ترقی یافتہ قسموں کے اختیار کرنے کے لئے کاشتکار کی تنظیم اور طریق کار میں کسی بنیادی تبدیلی کی ضرورت نہ تھی، عام طور پر اس کے لئے کسی بڑے خرچ کی بھی ضرورت نہ تھی۔ اس کے علاوہ ترقی یافتہ قسموں کے اختیار کرنے کے نتائج صاف طور پر ظاہر تھے اور یہ آسانی سے دکھائے جا سکتے ہیں۔ دوسری ترقیوں کے سلسلہ میں جیسے بہتر اوزار کا استعمال کھاد اور دوسرے ترقی یافتہ طریقوں کے زیادہ استعمال میں اوسط کاشتکار کے حالات زیادہ سازگار نہ تھے۔ جہاں تک چھوٹے قطعہ زمین اور ہندوستانی کسانوں کی مفلسی اور جہالت موسموں کی تغیر پذیری اور اس پر مہاجن تاجر کے تسلط کا سوال ہے، زیادہ تر جہتوں میں بڑے نتائج کی امید نہیں کی جا سکتی تھی۔ ان سارے اسباب کے ساتھ ہی ساتھ اس

ملک کے زیادہ حصہ میں زراعت کی بنیادی افادیت کا مسئلہ تھا جس کا تعین زرعی پیداوار اور کاشتکار کی تجارت کی شرائط سے ہوتا تھا۔

زرعی مصنوعات کی قیمت اور زراعت کی تجارتی شرائط اقتصادی کارگذاری میں عام کمی بیشی اور تبادلہ کی شرح کے عمل اور دوسرے وابستہ مظاہر سے گہرا تعلق تھا۔ ان سے بعد میں مناسب مقام پر بحث کی جائے گی۔

زرعی پیداوار کی تنظیم کے سلسلہ میں دو مسائل ہماری توجہ کی مستحق تھے۔ پہلا مسئلہ کاشت کا تھا یعنی زمین پر حقوق کا معاملہ اور شرائط جن کے مطابق اصل کاشتکار اس زمین کو اپنے قبضے میں رکھتا تھا، جس کو وہ جوتتا تھا۔ دوسرا مسئلہ اوسط کاشت کار کا قطعہ زمین کے سائز اور اس کے اندرونی انتظام کا تھا یہ عام طور پر مزید تقسیم اور اجزا کاری (SUBDIVISION AND FRAGMENTATION) کے مسئلہ کی حیثیت سے پیش کیا جاتا تھا۔

حکومت نے زمینداری صوبے جیسے بنگال اور یو۔پی میں انیسویں صدی کے آخر میں بھی پہلے مسئلہ سے متعلق قانون بنانا ضروری سمجھا۔ برطانوی حکومت کے دور اوّل میں اس مسئلہ کو تقریباً بالکل نظرانداز کردیا گیا تھا۔ مالگذاری کے بندوبست اور برطانوی حکومت کے آغاز میں مختلف صوبوں کے درمیان کاشت کے انتظام میں جو فرق پایا تھا وہ ایک حد تک پہلے کے حالات اور ایک حد تک مخصوص علاقہ کے برطانوی حکام کے مروجہ خیالات کا نتیجہ تھا۔ جہاں بھی مالگذاری کا بندوبست زمینداروں کے ساتھ پورے اسٹیٹ یا پورے گاؤں کے لئے ممکن اور مناسب ہوتا تھا اس پر عمل کیا جاتا تھا، اور جہاں ایسے درمیانی لوگ دستیاب نہیں ہوتے اور برطانوی حکام ایسے لوگوں کو تیار کرنے میں ہچکچاتے تھے وہاں بندوبست انفرادی کاشت کاروں کے ساتھ ہو جاتا تھا۔

اول الذکر صورت میں حکومت بڑی پریشانی اور بھاری کام سے بچ گئی اس لئے کہ لگان جمع کرنے کی ذمہ داری نسبتاً ایک چھوٹی سی جماعت پر عائد ہوگئی جس کے ساتھ ہی حکومت کا براہ راست تعلق تھا۔ اور اس بات کا لحاظ بالخصوص دور اوّل میں بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ شروع ہی سے برطانوی حکام اس بات سے اچھی طرح واقف تھے کہ زمینداروں کے ساتھ لگان کا بندوبست کردینے سے نچلی سطح پر زمین رکھنے والوں کے حقوق سے متعلق ان کی ذمہ داری ختم نہیں ہوتی مثال کے طور پر لارڈ کارنواس کے استمراری بندوبست کی دفعہ کے مطابق زمیندار کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ رعیت کو لازمی طور پر پٹہ دیدے اور زمیندار کی یہ ذمہ داری کہ وہ گاؤں کا حساب کتاب اور ریکارڈ

رکھے۔ مگر یہ کاغذی تحفظ سے زیادہ نہ تھا۔ ان کو لاگو کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ حقیقت یہ تھی
کہ پٹہ کے اصول تو زمینداروں نے رعیتوں کے حقوق کو پامال کرنے کے لئے استعمال کیا۔ اور چونکہ
حقوق کے دستاویز کے تیار کرنے کا فرض ایسی ایجنسی کے سپرد کیا گیا جس کی تنخواہ زمیندار دیتا تھا اس
لئے یہ ریکارڈ اور گاؤں کے دوسرے ریکارڈ بھی نہ صرف رعیتی حقوق کا پتہ لگانے کے لئے بلکہ اعداد و
شمار کے عام مقاصد کے لئے بھی بیکار تھے۔ زمینداری اور رعیت واری صوبوں کے گاؤں کے
ریکارڈ کے درمیان معیار میں گہرے فرق کا یہ آغاز تھا جو زمینداری ختم ہونے کے بہت بعد بھی قائم
رہا۔ انیسویں صدی کے نصف اول میں زمینداری صوبوں میں لگان کے سسٹم میں جو ترمیم ہوئی
اس کے زیر اثر رعیت کی پوزیشن اور بدتر ہوگئی۔ زمیندار لگان جلد وصول کر دے اس لئے وہ منقولہ
جائداد ضبط کرنے کے اختیارات سے لیس کر دیا گیا اور بعض صورتوں میں تو اُسے رعیت سے لگان
وصول کرنے کے لئے گرفتار کرنے کا بھی اختیار دیا گیا۔ اسی طرح لگان کی خریداری کے مطابق خریدنے
والوں کے مفاد کی خاطر جو قانون پاس ہوا اس سے بھی رعیتوں کے پرانے حقوق برباد ہو گئے۔

۱۸۵۹ء کا بنگال ٹیننسی ایکٹ ایک نئے موڑ کا پتہ دیتا ہے۔ اس کا مقصد جس طرح دوسرے
ہندوستانی قوانین کا حال کے زمانہ تک رہا تھا وہ قدیم اور وراثتی حقوق کو محفوظ رکھنے کا ہی تھا اس
کا فائدہ خاص طور پر اس رعیت کو ہوا جو استمراری بندوبست یا کم از کم بیس برس سے متعین کرایہ
پر زمین رکھے ہوئے تھے اور اس کسان کو بھی فائدہ ہوا جس کے قبضے میں ۱۲۔ برس سے زمین تھی
حفاظتی دفعات میں حق دخیل کاری کی منظوری اور من مانی کرایہ بڑھانے کی روک تھام تھی۔ ۱۸۵۹ء
کے ایکٹ کے بعد کئی ترمیمی ایکٹ آئے جن کا مقصد تھا کہ زمیندار اس سے بچنے کی کوشش نہ کرے
اور حقوق کی مناسب دستاویز مرتب ہو اس کا مقصد یہ بھی تھا کہ غیر دخیل کار اسامی نامناسب اور بار
بار کرایہ کے اضافہ سے محفوظ رہیں۔ بنگال میں جس طرح کا قانون پاس ہوا اسی طرح کا قانون عموماً
یوپی میں بھی کاشت سے متعلق پاس ہوا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ متعین کرایہ دینے والی رعیت کا ایک
طبقہ پیدا ہو گیا جس کے حقوق وراثتی اور قابل تبدیلی ہوتے تھے اور ایک دوسرا طبقہ بھی پیدا ہوا
جسے ۱۲۔ برس تک قبضہ رکھنے کا حق ہوتا تھا۔ بعد میں ۱۸۷۰ء میں سابق مالکوں کا ایک نیا طبقہ
پیدا ہوا اور انہیں اپنی "سیر" کی زمین پر کاشت کا خصوصی حق رکھنے کی اجازت دی گئی۔
'سیر' زمین سے مراد وہ زمین ہے جو مالک کا گھریلو فارم سمجھی جاتی تھی۔

صوبہ متوسط میں لگان کا مالگذاری سسٹم رائج تھا جو زمینداری اور رعیت واری قسموں کی

درمیانی شکل تھی۔ ۱۹۱۴ء سے پہلے صوبہ متوسط کے صرف کاشت سے متعلق قانون ہی میں کاشتکاروں کی بڑی تعداد کو موثر محافظت دینے کی کوشش کی گئی جن کا تعلق دوسرے تمام زمینداری صوبوں میں اس طبقہ سے تھا جسے نہ محافظت حاصل تھی اور نہ حق دخیل کار حاصل تھا۔ صوبہ متوسط میں کاشت سے متعلق جو قانون بنا اس میں یہ دفعات شامل تھیں کہ غیر دخیل کار آسامی کو بے دخل نہ کیا جائے اور نہ ان کے کرایہ کو من مانے طور پر بڑھایا جائے۔ اس میں یہ دفعہ بھی تھا کہ حق دخیل کاری ڈگری کی تعمیل کے لئے فروخت نہیں ہو سکتے ہیں اور اس نے دخیل کار آسامی اور عام رعیت کے حقوق کو ناقابل انتقال بنا دیا۔

مونٹفورڈ اصلاحات کے آجانے کے بعد کاشت سے متعلق قانون سازی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ حکومت میں عوام کی شرکت کے عنصر نے نئے دباؤ داخل کئے اور کاشتکار کی حفاظت کے مسئلہ سے متعلق نیا نقطۂ نظر منظور کیا گیا۔ زیادہ تر صورتوں میں توجہ شکمی آسامی پر دی جا رہی تھی جو صحیح معنوں میں اصلی کاشتکار ہوتے تھے۔ بنگال کے بندوبست استمراری سے یہ ہوا کہ جو لگان حکومت کو ادا کیا جاتا ہے اس میں جو اصلی رقم کاشتکاروں کو ادا کرنا پڑتی تھی ان دونوں کے درمیان فرق برابر بڑھ رہا تھا۔ وراثتی یا دخیل کار آسامی جیسے طبقوں کو جو قانونی تحفظ میسر تھا اس سے ایک درمیانی جماعت ابھری جسے خصوصی حیثیت حاصل تھی چونکہ دخیل کار آسامی یا دوسری حفاظت پانے والی رعیت کے حقوق کا تعلق کاشت کرنے والے درجہ سے نہ تھا اس لئے جب بھی ممکن یا ضروری ہوتا تو وہ مزید پٹہ پر زمین لگا دیتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کئی دہائیوں میں زمیندار جو حکومت کی طرف سے زمین رکھتے تھے ان میں اور اصلی کاشتکار کے درمیان چھوٹے کسانوں کا ایک سلسلہ پیدا ہو گیا۔ بنگال میں جہاں یہ عمل بڑی وسعت رکھتا تھا اور بڑی حد تک کارگر ہوا تھا وہاں یہ (SULERIFENDATION) کہلاتا تھا۔ بنگال کے کچھ ضلعوں میں ۱۹۳۹ء تک ۱۵ سے ۲۰ قسم کے پٹہ دار پائے جاتے تھے[۱]۔ جنگ کے درمیانی برسوں میں بنگال اور بہار کی قانون سازی نے شکمی رعیت کی پوزیشن کو جو ما تحت رعیت، کہلاتی تھی اسے ایک حد تک محفوظ رکھنے کی کوشش کی تھی۔ ان دونوں صوبوں میں قانونسازی نے ناجائز فالتو ٹیکس (CESS) کی برائی کو کم کرنے کی بھی کوشش کی تھی جو زمیندار وصول کیا کرتے تھے۔ پھر بھی کسی بھی صوبہ میں بٹائی داروں کے بڑے طبقہ کی حفاظت کے لئے کوئی

---

[۱] لینڈ ریونیو کمیشن کی رپورٹ، بنگال ج ۱، ص ۳۳ (۱۹۴۰)

کوشش نہیں کی گئی۔ یو۔پی میں ایک طبقہ خاص رعیت کا طبقہ تھا جسے حق دخیل کاری حاصل نہ تھا اس طبقہ کو قانونی طور پر زندگی بھر کا پٹہ دے دیا گیا اس کے ساتھ اس کے وارث کو پانچ برسوں تک حق دخیل کاری دے دیا گیا۔ یہ اقدام پہلے ۱۹۲۶ء میں کیا گیا اس کے ساتھ ہی ساتھ زمینداروں کو خاص مراعات دی گئیں کہ وہ اپنی "سیر" زمینوں کی توسیع کریں یہ قانون بھی بنا کہ اس زمین پر کسی قسم کا مزید حفاظتی حق دخیل کاری حاصل نہیں ہو سکتا۔ ۱۹۳۹ء کے یو۔پی ٹیننسی ایکٹ سے "سیر" زمین سے متعلق زمینداروں کے یہ خاص اختیارات کافی کم کر دئے اور تمام قانونی رعیتوں کو وراثتی حقوق دیدیئے۔ یو۔پی کی کاشت سے متعلق قانون سازی نے اس کے ساتھ بٹائی داروں کو کوئی تحفظ نہیں دیا۔ صوبہ متوسط میں جہاں تمام رعیتوں کو پہلے سے ہی کسی حد تک تحفظ حاصل تھا وہاں جب ۱۹۲۰ء میں قانون بنا تو اس نے عام رعیت کو حقوق دیدیئے جس طرح دخیل کار آسامی کو حق حاصل تھے اور ۱۹۳۹ء کے ترمیمی ایکٹ نے دخیل کار آسامی کو اپنے کاشت کا حق ایک حد تک منتقل کرنے اور اپنے طور پر پھر کرایہ پر اٹھانے کا اختیار دیا۔

جنگ کے درمیانی دور میں کاشت سے متعلق قانون سازی کا عمل خاص طور پر دو مرحلوں میں ہوا۔ پہلا مرحلہ مونٹفورڈ اصلاح اور دوگانہ سسٹم کے ماتحت وزارت کے زمانہ کا تھا۔ اس مرحلہ میں کاشت سے متعلق زیادہ تر قانون ۱۹۳۰ء کے پہلے بنائے گئے۔ دوسرا مرحلہ اس وقت آیا جب ۱۹۳۶ء کے دستور کے ماتحت وزارتیں بنیں۔ اس مرحلہ میں جو قانون پاس ہوا اس پر ۱۹۳۹ء میں عالمی جنگ شروع ہونے سے پہلے ایک یا دو سال کے اندر عمل درآمد ہوا پہلے مرحلہ کے دوران جب کہ کاشت سے متعلق قانون سازی صرف زمیندار صوبوں میں سوچی گئی تھی جہاں پہلے سے ہی اس سلسلہ میں قواعد موجود تھے دوسرے مرحلہ میں اس مسئلہ کی طرف توجہ مدراس اور بمبئی جیسے صوبوں میں بھی دی گئی۔ ان صوبوں میں گرچہ یہاں زیادہ تر رعیت واری سسٹم رائج تھا پھر بھی بعض جگہ زمینداری پٹہ چلتا تھا۔ ان صوبوں میں ۱۹۰۸ء کے مدراس اسٹیٹس لینڈ ایکٹ کے سوا رعیت کے حقوق کی حفاظت کسی خاص قانون سازی سے نہیں کی گئی۔ ۱۹۳۶ء کے بعد ان صوبوں کے زمیندار علاقوں میں رعیتوں کو تحفظ دینے کا مسئلہ زیر غور آیا۔ رعیت واری سسٹم کے علاقہ میں بھی رعیتی محافظت کے مسئلہ پر توجہ دی جانے لگی۔

نظریاتی اعتبار سے رعیت واری سسٹم کے معنی زمین کے ایسے بندوبست کے ہوتے ہیں جس کے مطابق کاشتکار حکومت کو براہ راست لگان دیتا ہے۔ جب ایسا ہوتا ہے تو کاشتکار

آسامی کی روایت قائم ہوئی اس کی پیروی کرتے ہوئے اس کی تعریف کی گئی کہ یہ ایسے آسامی کا طبقہ ہے جو چھ برسوں سے مسلسل قابض ہے۔ بعض پابندیوں کے تحت محفوظ اراضی مستقل اور موروثی بنادی گئی۔ محفوظ اسامی کو یہ حق بھی دیا گیا کہ وہ مالیاتی حکام کے سامنے مناسب کرایہ کے لئے درخواست دے جس کی ادائیگی اس کے ذمہ ہو۔ محفوظ اراضی پر دو طرح کی پابندیاں تھیں ایک یہ کہ یہ چھوٹے زمینداروں کے خلاف نہیں ہوسکتا تھا دوسری یہ کہ زمیندار مخلوط اسامی کی اراضی کو ختم کرسکتا تھا اگر اسے اس زمین پر خود کاشت یا اسے اس زمین کی کسی خاص غیر زرعی کام کے لئے ضرورت پڑتی۔ اس کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے یہ دفعہ شاید زمینداری صوبہ کے خود کاشت یا 'سیر' زمین کی طرح رکھا گیا اس قسم کی زمین زمیندار کی شخصی خود کاشت سمجھی جاتی تھی اور اراضی قانون سازی کے اعتبار سے مختلف سمجھی جاتی تھی۔ جس طرح اوپر میں بتایا گیا ہے یو۔پی میں 'سیر' زمین پر کوئی حق اراضی نہیں پہنچ سکتا تھا اور اس صوبہ کے زمیندار اس کی توسیع میں دلچسپی رکھتے تھے۔ بمبئی ایکٹ میں زمین کو دوبارہ حاصل کرنے کا جو دفعہ رکھا گیا اس نے صوبہ کی پٹہ والی ساری زمین کو 'سیر' زمین ہی سمجھا یعنی اس زمین پر مستقل حق اراضی کبھی بھی نہیں ہوسکتا۔ مخلوط اسامی کے علاوہ دوسرے آسامیوں کو دس سال کے لئے محدود تحفظ دیا گیا اور ان کے معاملہ میں بھی زیادہ سے زیادہ کرایہ کے تعین کا دفعہ شامل کیا گیا۔

۱۹۳۹ء کے بمبئی ٹیننسی ایکٹ نے کاشت کاروں کے نسبتاً چھوٹے طبقہ کے لئے ہی صحیح معنوں میں تحفظ دیا اور اس حفاظت کا اثر بھی محدود تھا۔ تاہم اس ایکٹ کی اس لحاظ سے اہمیت تھی کہ اس نے رعیت واری علاقے اس مسئلہ میں کے وجود کو تسلیم کیا تھا اور اس نے اس کے اہم پہلوؤں اور دشواریوں کی طرف توجہ دلائی تھی۔ ایک دوسرے بڑے رعیت واری صوبہ مدراس میں ایک کمیٹی ۱۹۰۸ء کے مدراس لینڈ اسٹیٹ ایکٹ کی ترمیم پر غور کرنے کے لئے مقرر کی گئی مگر اس کمیٹی کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا کہ ۱۹۰۸ء کے ایکٹ کی ترمیم ہوسکے اور نہ اس صوبہ کے رعیت واری علاقہ میں اراضی سے متعلق کوئی اقدام کیا گیا۔

قطعہ زمین کی مزید تقسیم اور اجزا کاری کا مسئلہ بھی جنگ کے درمیانی دور میں اہم بن گیا۔ مزید تقسیم کا مسئلہ نسلاً بعد نسلٍ مقبوضہ زمین کی مسلسل تقسیم سے پیدا ہوا۔ یہ ٹھیک ہے کہ مروجہ قانون وراثت سے ایسی تقسیم ممکن ہو سکے مگر لوگوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کی بنا پر لازمی ہے جن کی گذر بسر زمین پر ہے۔ موخر الذکر صورت حال سے بھی بہت چھوٹا قطعہ زمین رکھنے والے کسان کے لئے پٹے پر اور زیادہ زمین لینا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ مجموعی کاشت کے علاقہ میں اضافہ کرے

اور ریاست کے درمیان کوئی شخص مداخلت نہیں کرتا اور زمیندار اور رعیت کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ زیادہ تر حصوں میں یہی صورت حال تھی جب ہر علاقہ میں برطانوی حکومت کے آغاز سے رعیت واری علاقہ میں ابتدائی بندوبست شروع ہوا۔ پھر بھی وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ خاص طور پر دو طریقوں سے تبدیلی عمل میں آئی اگر ابتدائی حق واریاں کا وارث کی وجہ سے کھیت جوتنا چھوڑ دیتا ہے اور اسے ضمنی طور پر کرایہ پر اٹھا دیتا ہے تو نئے رعیتی کاشت کار حکومت سے نہ کوئی رشتہ ہوتا تھا اور نہ وہ حقدار کے خلاف کوئی قانونی حق رکھتا تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر قابض کاشتکار اپنے حقوق سے دست بردار ہونا چاہتا ہے مثلاً اپنے قرض کی ادائیگی کے لئے ضروری سمجھتا اور نیا قابض خود کاشت نہیں کرتا بلکہ سابق مقدار (یا کسی دوسرے آدمی) کو رعیت کی طرح کاشت کرنے کی اجازت دیتا تو اس قسم کی صورت حال پیدا ہوتی۔ ۱۹۲۵ء تک مدراس اور بمبئی کے بہت سے حصوں میں تقریباً ایک صدی تک یہ عوامل کار فرما رہے اور ان سے غیر دخیل کار آسامی کی ایک جماعت پیدا ہوئی جو ان دو صوبوں کے بہت سے ضلعوں میں خاصی تھی۔ ان دو صوبوں میں اراضی کی وسعت کا جائزہ لینے کے لئے گرچہ کوئی مفصل جانچ پڑتال نہیں کی گئی تاہم لگان کے بندوبست کرنے کے موقع پر جو وقتاً فوقتاً جانچ پڑتال ہوئی اس سے بڑے مفید اشارے ملے مثلاً ستارا تعلقہ کے چار خاص گاؤں کے لئے جو اعداد و شمار (۲۲-۱۹۲۱ء کے لئے) دیے گئے ان سے ظاہر ہوتا تھا کہ شہر کے پاس ایک گاؤں میں زمین کا تقریباً دو تہائی حصہ رعیت کے ذریعہ کاشت ہوتا تھا، دوسرے دور گاؤں میں زمین کا ۳۰ فیصد رعیت کے ذریعہ کاشت ہوتا تھا جب کہ دور کے دو گاؤں میں تناسب تقریباً ۱۶ فیصد اور ۹ فی صد ہی تھا۔[۱] حالیہ تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹-۱۹۱۸ء میں پچھمی مہاراشٹر کے رعیت واری علاقے میں اراضی کی وسعت ضلع بہ ضلع ۱۵ سے ۳۰ فیصد کے اندر بدلتی رہتی تھی[۲] گرچہ ۱۹۳۹ء کے ٹینینسی ایکٹ کے بعد ۱۰ برسوں کے زمانہ سے متعلق یہ اعداد و شمار ملتے ہیں پھر بھی ان سے جنگ کے درمیانی عرصے کے اس مسئلہ کی وسعت کا مجموعی طور پر پتہ چلتا ہے۔

۱۹۳۹ء کا بمبئی ایکٹ پہلا قانون تھا جو رعیت واری علاقہ میں اسامی کی حفاظت کی خاطر پاس ہوا۔ اس کا خاص دفعہ محفوظ اسامی کا طبقہ پیدا کرنا تھا زمینداری علاقہ میں جس طرح دخیل کار

---

[۱] ڈی۔ آر۔ گیڈگل: بمبئی کا مالگذاری سسٹم ص ۱۲ (۱۹۲۸)

[۲] دندیکر اور کھدانپور، بمبئی ٹینینسی ایکٹ، ۱۹۴۸ (باب سوم) کی کارگذاری

قسم کا قانونی سہارا لے کر اپنی ایجنسی سے اسے روبہ عمل لاسکتی تھی۔ پنجاب میں اس مقصد کے تحت امداد باہمی انجمنیں قائم ہوئیں جن کے ذریعہ چک بندی عمل میں آئی اور رضا کارانہ اقدام کا مظاہرہ ہوا۔ اسی قسم کی پہلی انجمن ۱۹۲۰ء میں قائم ہوئی۔ اس گاؤں کے ۹۰ فیصد زمین رکھنے والے کو جن کے پاس کم سے کم ۵۰ فیصد زمین تھی امداد باہمی انجمن کی تشکیل میں شریک ہونا پڑا۔ چک بندی کے طریق کار سے پرانی سرحدوں اور سڑکوں میں عموماً اہم تبدیلی آگئی۔ سرکار نے اس کام کے لئے مناسب عملہ کی منظوری دی اور اس کے خرچ کو برداشت کیا۔ ۱۹۳۶ء میں ایک خاص ایکٹ منظور ہوا تاکہ اس عمل میں دوچار ہونے والی قانونی اور دوسری مجبوریاں دور کی جائیں۔ ۱۹۳۹ء کے آخر تک چک بندی کی انجمنوں سے ۱۰ لاکھ ایکڑ سے زیادہ زمین کی چک بندی ہوگئی۔ یہ دعویٰ کیا گیا کہ اس طریقہ سے ہونے والی چک بندی سے عوامی مقاصد کے لئے زمین کی فراہمی اور دوسری سہولتیں جیسے فوائد بھی حاصل ہوئے چک بندی کے فوائد سے کاشت کاروں کی واقفیت اور سرکار کی مثبت پالیسی کے علاوہ پنجاب میں امداد باہمی سے چک بندی کی ترقی میں مٹی کی نسبتاً یکسانیت اور خاص علاقوں میں آب پاشی کی دستیابی سے بڑا سہارا ملا۔ ۱۹۲۰ء میں بڑودہ ریاست میں چک بندی کی آسانی کے لئے قانون پاس ہوا۔ اس قانون سے سرکار کو اختیارات مل گئے کہ وہ گاؤں کے زمین رکھنے والوں کی ایک خاص تعداد کی درخواست پر اقدام کرے اور اس کا ایک مفصل طریقہ کار بھی پیش کیا گیا اس خالص اجازت پذیر قانون سازی سے حاصل ہونے والے نتائج بہر حال بہت کم تھے۔ صوبہ متوسط کے چک بندی ایکٹ ۱۹۲۸ء سے بہت زیادہ ترقی ہوئی جو پہلے چھتیس گڑھ ڈویژن میں لاگو ہوا۔

اس ڈویژن میں کھیتوں کے موسمی بٹوارہ کا رواج تھا تاکہ گاؤں کے ہر کاشتکار کو تمام قسموں کی زمین میں حصہ لینے کا موقع مل جائے۔ ایکٹ میں چک بندی افسر کی تقرری کا دفعہ شامل تھا تاکہ وہ جانچ پڑتال کر کے گاؤں کے دو یا زیادہ مستقل زمین رکھنے والوں کی درخواست پر کھیتوں کی تقسیم کے لئے اسکیم تیار کرے۔ مقامی باشندوں کی پنچائت سے مشورہ کر کے اسکیم بنایا کرتی تھی اور دو تہائی زمین کے ساتھ آدھے زمین رکھنے والوں کی رضامندی لیتی تھی۔ بندوبست کمشنر اس اسکیم کی آخری منظوری دیتا تھا۔ اس طرح منظور ہو جانے پر یہ اسکیم تمام مستقل زمین رکھنے والوں پر عائد ہو جاتی تھی۔ اس اسکیم کے تیار کرنے اور اسے عمل میں لانے کا سارا کام چک بندی کے ذمہ ہوتا تھا۔ چک بندی آفیسر کے ماتحت آنے والے سارے امور پر عدالت کا کوئی قانون اختیار

نہیں ہوتا تھا۔ یہ قانون گرچہ اجازت حاصل کرنے پر مبنی تھا تاہم اس کے نتائج چھتیس گڑھ بڑی حد تک اطمینان بخش تھے۔ ۱۹۴۹ء تک ۱۰ لاکھ ایکڑ سے زیادہ کی چک بندی ہوئی اور اس عمل سے غیر تقسیم شدہ پلاٹ کے اوسط سائز میں ۵ سے ۶ تک کا اضافہ ہو گیا۔ اس اسکیم کے خرچ کے لئے چار آنہ فی ایکڑ ہر ایک پر یکساں طور پر عائد کیا گیا۔ اس سے خرچ کا بڑا حصہ پورا ہو گیا اور بقیہ خرچ سرکار نے برداشت کیا۔

پنجاب کی طرح اتر پردیش میں بھی اور باہمی ایجنسیوں کے ذریعہ چک بندی کو عمل میں لانے کی کوشش کی گئی مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلا اس ناکامیابی کی ذمہ دار زمین کی غیر یکسانیت تھی اور اس سے زیادہ اس صوبہ کا پیچیدہ زمینی پٹہ تھا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ موخر الذکر دشواری ملک کے زیادہ تر زمینداری علاقوں میں موجود تھی۔ دوسرے صوبوں میں اس مسئلہ پر کافی غور و خوض ہوا لیکن ۱۹۴۹ء کے پہلے کسی نقشہ عمل یا قانون سازی کا اقدام نہیں کیا گیا۔

مزید تقسیم کا بنیادی مسئلہ اور زیادہ پر فریب ثابت ہوا۔ زراعت سے متعلق رو آئل کمیشن نے بتایا تھا کہ مزید تقسیم سست رفتار ہو جاتی ہے جب کہ زمین کے منتقل کرنے پر بندشیں لگادی جاتی ہیں اور اسے مخصوص حالات میں روکا بھی جا سکتا ہے اگر زمین کے عطیہ پر خاص شرائط لگادی جائیں یا بڑے زمین رکھنے والوں کے معاملہ میں بیٹھاؤ یا بڑے لڑکے کے حق Prunogeniture پر اصرار کیا جائے چونکہ یہ طبقہ اپنے چھوٹے لڑکوں کو گذر اوقات دینے کے لئے کافی دولت مند طبقہ ہے۔ کمیشن نے ناکامیابی کی ایک خاص مثال کی طرف توجہ دلائی۔ یہ بمبئی کی مثال تھی یہاں ایک زمانے میں یہ خیال تھا کہ بٹوارہ رک سکتا ہے اگر اسے مالگذاری کے کاغذات میں نظر انداز کر دیا جائے اگر بٹوارہ سے اراضی ایک خاص حد کے نیچے آجائے۔ یہ توقع پوری نہ ہوئی اور کوشش ترک کر دی گئی کیونکہ تھوڑے ہی عرصہ میں مالگذاری کے ریکارڈ کا حقیقت سے واسطہ نہ تھا[1] بمبئی ہی میں ایک ناکام کوشش اس زمانہ میں ہوئی تاکہ اس مسئلہ کا حل انقلابی طور پر ہو۔ ۱۹۲۷ء کے بمبئی اسمول ہولڈنگس بل (۱۹۲۷ء) Bombay Small holding bill نے قانون وراثت بدلنے کی عام بتائی ہوئی راہ اختیار نہیں کی۔ اس کے بدلہ یہ پتہ لگانے کے لئے کہ کم از کم کتنا بڑا علاقہ ہو جس کی کاشت فائدہ کے ساتھ علیحدہ طور پر ہو سکے اس نے اس کام کے لئے ایک مشینری کا انتظام کیا تاکہ پرانے ٹکڑوں کی اور تقسیم نہ ہو اور نئے

---

[1] ح۔س۔ باب پنجم

ٹکڑے نہ بن جائیں بغل کے کاشتکاروں کو حق شفعہ دیا گیا چھوٹے اراضی کا پتہ کرایا اور زمین کے نئے ٹکڑوں کی کاشت کی مخالفت کی جب تک کہ یہ بغل کے پلاٹ میں شامل نہ کر دیئے جائیں تاکہ مجموعی رقبہ اقتصادی یونٹ بن سکے ۔ اس طرح اس لئے اس کام کو انجام دیا ۔ بلاشبہ یہ طریقہ اچھی طرح سوچا سمجھا ہوا اور منطقی تھا ۔ بہرحال یہ قابل عمل نہ تھا کیوں کہ مزید تقسیم کے مسئلہ سے علیٰحدہ طور پر نبٹا نہیں جا سکتا تھا ۔ جب کہ پہلے بتایا گیا ہے کہ روزگار کے مواقع سے متعلق بڑے سوال کا ایک حصہ تھا ہندوستان جیسے ملک میں مسلسل مزید تقسیم زمین پر وارومدار کرنے والی بڑھتی ہوئی تعداد کو سہارا دیتی تھی گرچہ زندگی کا معیار گھٹا رہا تھا اور روزگار میں کمی کی قدیم صورت حال تھی ۔ ایسے حالات میں اوسط کاشت ہونے والے اراضی کا سائز قانون کے ذریعہ کامیابی سے قائم ہو جانے کے معنی تھے کہ اسی تناسب میں بالکل بے زمین لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہوگا ۔ اس لیے جب تک ان لوگوں کے پہلے سے روزگار کا انتظام نہیں ہو جاتا اس وقت تک اس قسم کی قانون سازی کی راہ اختیار کرنا خطرناک تھا ۔ لیجسلیٹو کانسل میں شدید مخالفت ہونے کی بنا پر گورنمنٹ کو بمبئی بل ترک کر دینا پڑا ۔ زراعت سے متعلق روائل کمیشن کے بمبئی بل کے بارے میں حسب ذیل تبصرے اس مسئلہ پر اس وقت کی عام رائے کا پتہ دیتے ہیں ! "ہم یقین کرتے ہیں کہ لوگوں کے اپنے خاندانی کھیت سے بے دخل ہونے سے متعلق کسی اسکیم میں ان کی رائے اور تعصبات کا جس حد تک ممکن ہو زیادہ سے زیادہ خیال کیا جائے گا"[1]۔

برطانوی حکومت کے اقتدار کے بعد ہی سے ہندوستانی کسانوں کی مقروضیت کے مسئلہ نے نئی اور بعض صورتوں میں سنگین صورت اختیار کر لی تھی ۔ کسان کا قرض بڑھ جانے سے کئی طرح کے حالات پیدا ہو گئے تھے ۔ بنیادی طور پر یہ حالات تھے :

زراعت کا تجارتی ہو جانا ، قیمتوں کی سطح میں اضافہ کا عالمی رجحان ، قرض کی وصولی میں لین دار CREDITAR کو زمین ضبط کرنے کا تسلیم شدہ حق اور منتقل کرنے کے حق زمین کی وسعت میں اضافہ ۔ ۱۹۲۰ء تک اس مسئلہ کے بارے میں سب سے زیادہ اہم اقدام یہ کیا گیا ، کہ ساہوکار کے کاموں پر بعض پابندیاں آگئیں اور عدالتوں کو اس کے سلوک کی ناقدانہ جانچ پڑتال کرنے کا اختیار دیا گیا جس طرح دکن زراعتی ریلیف ایکٹ کے رو سے ملا تھا ، زمین کے انتقال پر بھی رکاوٹ ڈالی گئی ، جس کی کلاسیکی مثال پنجاب لینڈ الائینیشن ایکٹ تھی اور امداد باہمی قرض کا سسٹم قائم ہونا تھا ۔

---

[1] ح ۔ ص ۱۴۱

ان تمام اقدامات کے اثرات محدود رہے۔ ابتدائی برسوں میں اضافی کامیابی مل جانے کے بعد دکن زراعتی ریلیف ایکٹ معطل ہو گیا۔ اس کا خاص سبب یہ تھا کہ اس کے دفعات کو موثر دینے کے راستے اس درمیان میں معلوم ہو گئے تھے۔ The Usurious Loans Act (۱۹۱۸) شروع ہی سے تمام صوبوں میں غیر موثر ثابت ہو چکا تھا۔ زرعی کمیشن نے منظور کیا کہ قانون سازی نے گرچہ قرضداری کی برائی دور نہیں کی پھر بھی اس نے ۱۹۲۷ء کے برطانوی ساہوکار ایکٹ کے نمونہ پر قانون سازی کی تعریف کی تاکہ ہندوستان کے ساہوکاری نظام کی اصلی برائیاں رُک جائیں۔ کمیشن کو بھی یقین ہو گیا کہ موروثی قرض کے برابر بڑھتے ہوئے بوجھ کو دبانے کے لئے صرف دیہی دیوالیہ پن ایکٹ Rural Insolvency Act مفید ثابت ہو۔ اس کے علاوہ ۱۹۳۱ء کی سنٹرل بنکینگ انکوائری کمیٹی نے کافی زور دیا کہ "مقامی حکومت رضاکارانہ طور سے قرض مصالحت کے لئے طاقتور پالیسی کا راستہ اختیار کرے"۔[1]

کسانوں کی قرضداری کے مسئلہ کا مزید تجزیہ کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم صورت حال کی زیادہ اہم قسموں کے درمیانی فرق کو سمجھیں۔ ایک فرق رعیت واری اور زمینداری علاقہ کا ہے اول الذکر میں زیادہ تر کسان کو زمین منتقل کرنے کا حق تھا جب کہ موخر الذکر میں یہ صورت حال نہ تھی۔ زمینداری علاقہ کا عام قاعدہ یہ تھا کہ زمیندار بڑے پیمانہ پر قرض دیتا تھا، البتہ بنگال استثنا کی حیثیت رکھتا تھا جہاں ساہوکار عموماً خود کاشتکار نہ ہوتا تھا۔ جہاں زمیندار قرض دیتا تھا وہاں اس کی رعیت پر گرفت بہت مضبوط ہوتی تھی کیوں کہ اپنے قرض کی وصول کے لئے وہ عموماً مالگذاری وصول کرنے کا اختیار استعمال کرتا تھا۔ جہاں رعیت کو اس طرح کا زمین منتقل کرنے کا قیمتی حق نہیں ہوتا تھا وہاں اس کو قرض بھی محدود ملتا تھا۔ اس پر سود بھی زیادہ ہوتا تھا۔ زمینداری علاقہ میں زیادہ تر کاشتکاروں کی قسمت میں قرضداری کی نسبتاً بالکل نیچی سطح کی وہی پرانی صورت تھی۔ ان کے معاملہ میں بھی قرض کا مسئلہ رعیت کی حیثیت سے تحفظ حاصل کرنے کے سوال سے گہرے طور پر وابستہ تھا۔

رعیت واری علاقہ میں ساہوکاری نظام نے اپنے طور پر زیادہ خالص شکل میں ترقی پائی۔ ان علاقوں میں قابل لحاظ فرق وہ ہے جو غیر اختیاری اور کم آمدنی والے اور نسبتاً زراعت کے محفوظ اور خوشحال علاقے کے درمیان ملتا ہے۔ پہلے علاقہ میں غیر محفوظ ہونے کی وجہ سے کاشتکار پر رکاوٹ بار بار

---

[1] سنٹرل بینکنگ انکوائری کمیٹی کی رپورٹ ص ۶۵ (۱۹۳۱)۔

آتی تھی۔ ڈاکٹر مان نے تخمینہ لگایا تھا کہ ۱۹-۱۹۱۸ء کے قحط سے جاتگاؤں بدرک کی قرضداری میں ۴۴ فی صد کا اضافہ ہوا ہے۔ غیر محفوظ حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ بہت سی صورتوں میں قرض کی سطح برابر اونچی ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ کسان زمین کے حق ملکیت سے محروم ہو جاتا تھا۔ یہ خاص طور پر ایسے وقت میں ہوتا تھا جب کہ کم قیمتوں کے زمانے کے ساتھ یکدم سے خراب موسم آجاتا تھا محفوظ اور نسبتاً خوشحال علاقہ میں ساہوکاری نظام کے اثرات زیادہ شدید نہ تھے۔

اس دور کے ابتدائی حصہ سے متعلق مفصل ترین جائزوں میں سے ایک وہ ہے جو پنجاب کے سلسلہ میں ڈارلنگ نے پیش کیا تھا۔ اس کا خیال ہے کہ ساہوکار کا اختیار ۱۸۸۰ء سے ۱۹۱۰ء تک کے دوران اپنی انتہا کو پہنچ گیا تھا۔ اس عرصہ میں آنے والی دولت کا مغز تو ساہوکار لے رہا تھا اور اس کا چھلکا سرکار اور کسان کے حصہ میں آرہا تھا۔ ۱۹۱۰ء کے بعد جو تبدیلی ہوئی وہ زمین الگ کرنے کے قانون اور امداد باہمی انجمن کے قیام کے نتیجہ میں رونما ہوئی لیکن ان کے علاوہ اس تبدیلی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ پنجاب کے گاؤں سے فوج میں خوب بھرتی ہوئی اور قیمتیں بڑھ گئیں۔ اس کے نتیجہ میں متوسط پنجاب اور نہری آبادیات میں ساہوکار کی طاقت ٹوٹ گئی اور دوسری جگہوں میں بھی وہ کم و بیش کمزور ہو گیا۔ بہرحال اس کے یہ معنی نہیں کہ قرض ادا ہو گیا تھا بلکہ بعض صورتوں میں تو خوشحالی کے ساتھ قرض بڑھ گیا۔ ڈارلنگ نے تو دیکھا کہ جنگ کے خوشحال دور کے آخیر میں مالکان زمین میں صرف ۱۷ فیصد لوگ قرض سے آزاد تھے اور یہ قرض رعیتوں میں جس طرح پھیلا ہوا تھا اسی طرح کسانوں میں بھی عام تھا۔ اس کے علاوہ جب تک ساہوکاری نظام کا اثر قائم رہا اس وقت تک خراب موسم میں یہ خطرہ ہمیشہ لگا رہتا تھا کہ کہیں کاشت کار کی حاصل کی ہوئی اقتصادی ترقی ختم نہ ہو جائے۔ یہ قرض خوشحال علاقوں میں گرچہ اسی طرح پھیلا ہوا تھا جس طرح دوسرے علاقوں میں پھر بھی زیادہ محفوظ اور خوشحال علاقے میں قرض کا بوجھ ہلکا تھا اور اسی طرح ساہوکار کی طاقت بھی اور سود کی شرح کی سطح بھی سود کی شرح کے بارے میں بمبئی کے صوبائی بینکوں کی تحقیقاتی کمیٹی نے کچھ اعداد شمار دیئے تھے۔ اوسط سطح خطہ بہ خطہ جداگانہ تھی۔ جب گجرات میں ۱۲ فی صد تھی تو مہاراشٹر اور کارناٹک کے سوکھے کپاس والے علاقہ میں ۱۸ فیصد تھی اور مہاراشٹر اور کارناٹک کے خشک غیر کپاس والے علاقے اور آدی باسی علاقے ۲۴ فی صد تھی اس کمیٹی نے مزید یہ بتایا تھا کہ ایک ہی علاقہ میں مختلف قسموں میں کافی فرق ہوتا تھا۔ شمالی گجرات میں متعدد کاشتکار جہاں زرعی حالات مستقل نہ تھے ۱۸ سے ۲۴ فی صد کی

---

۵۹ مان، ایک دکنی گاؤں میں زمین اور مزدور، مطالعہ نمبر ۲، ص ۱۳۵ (۱۹۲۱)

کی شرح ادا کرتے تھے جبکہ کیرا ضلع کے بہت سے اچھے پٹہ دار بہت ہی کم شرح پر روپیہ حاصل کرتے تھے[1]

دیہی قرض سے متعلق کمیت اور کیفیت کے اعتبار سے کافی اعداد و شمار صوبائی بینکوں کی تحقیقاتی کمیٹیوں کے ذریعہ جمع کئے گئے۔ ان اعداد و شمار کا تعلق زیادہ تر ۳۰-۱۹۲۹ء سے ہے جیسا کہ حالیہ سرد بازاری شروع ہونے سے پہلے تھا۔ صوبائی کمیٹیوں کی تحقیقات کے طریقوں اور وسعت میں یکسانیت نہ تھی اس لئے اس کی بنیاد پر پورے ہندوستان کی تصویر پیش کرنا ممکن نہیں۔ ان کمیٹیوں کی زیادہ اہم دریافت یہ تھی کہ برطانوی ہندوستانی صوبوں کے درمیان پنجاب اور بمبئی میں فی خاندان قرض سب سے زیادہ تھا جب کہ اڑیسہ، یوپی اور بنگال میں سب سے کم تھا۔

قرض کے مسئلہ کے ساتھ زمین کا کسان مالکوں سے ساہوکار کے ہاتھ منتقل ہونے کا مسئلہ بھی وابستہ ہے۔ بہرحال اس سے متعلق واقفیت تقریباً موجود نہیں ہے۔ اس لئے ہم زرعی کمیشن کا خیال پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ ساہوکار زیادہ تر صوبوں میں اپنی زمینی جائداد میں برابر اضافہ کر رہے تھے"۔[2] زمین کے منتقلی سے متعلق قانونی پابندیوں کا ذکر پچھلے باب میں پہلے ہو چکا ہے اور اس عرصہ میں اضافہ تو صرف صوبہ متوسط کے زمین کی منتقلی کے ایکٹ ۱۹۱۶ء LAND ATENATION ACT 1916.) میں آیا تھا جو چھتیس گڑھ کے صرف آدی باسی قبیلے کے افراد پر ہی لاگو ہو سکتا تھا۔ جہاں تک زرعی طبقہ میں زمین کے منتقل ہونے کا تعلق تھا اس انتہائی مقصد میں پنجاب اور بندیل کھنڈ دونوں ایکٹ نے اطمینان بخش طور پر کام کیا۔ پھر بھی یہ کہنا مشکل ہے کہ اس قانون سازی نے مقروضیت کو روکنے میں کسی حد تک کامیابی حاصل کی۔ غیر کاشتکار ساہوکار جو عموماً اپنا روزگار تجارت کے ساتھ چلاتا تھا وہ ابھی بھی بالخصوص قلیل المدتی مالیات کے سلسلہ میں اہمیت رکھتا تھا۔ یہ قلیل المدتی مالیات زیادہ تر غیر محفوظ ہوتی تھی۔ جب طویل المدت مقاصد کے لئے روپیہ قرض لینے کی ضرورت ہوتی تھی تو زمین کی ضمانت پر ہی بھاری قرض لینا پڑتا تھا۔ اس میدان میں زمین کی منتقلی سے متعلق ایکٹ نے تیزی سے ابھرتے ہوئے زرعی ساہوکاروں کے طبقہ کے لئے ایک خاص پوزیشن پیدا کر دی تھی۔ یہ یہ کہا جاتا ہے کہ اس کا مزید نتیجہ یہ ہوا کہ کاشتکار ساہوکاروں کے ذریعہ لی جانے والی سود کی شرح

---

[1] بمبئی کے صوبائی بنکوں کی تحقیقاتی کمیٹی ص ۵۵

[2] ح۔ س۔ ص ۴۲۱

زمین کے مالکوں یا ورثہ میں آنے والے حق اراضی کے وارثوں میں مسلسل تقسیم سے بھی بالعموم کھیتوں اور پلاٹ کی تقسیم ہوتی ہے۔ مختلف کھیتوں کے محل وقوع اور مٹی کی خاصیت میں فرق ہونے اور ہر حصہ دار کا زمین میں سے اچھے سے اچھا حصہ لینے کی خواہش سے ایسا ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مقبوضہ اراضی میں شامل پلاٹ یا کھیتوں کا بٹوارہ اور اس کے سائز میں کمی واقع ہوتی ہے اور جب تک یہ صورت پٹہ لینے یا پٹہ دینے سے نمایاں طور پر بدلتی نہیں اس وقت تک ملکیت کی کاشت کی خصوصیات زیر کاشت قطعہ زمین میں بھی ظاہر ہوتی رہیں گی۔ پیداواری صلاحیت کے نقطۂ نظر سے زیر کاشت اراضی کا چھوٹا سائز اور اس کی اجزا کاری Fragmentation اہمیت رکھتی ہے۔ زیر کاشت اراضی کی یہ ساری خصوصیات زمین کے سلسلہ میں حقوق کی تقسیم سے متعلق تاریخی ارتقا سے لازمی طور پر آئی ہیں۔

زراعت سے متعلق روآئل کمیشن (۱۹۲۸ء) نے بتایا تھا کہ کاشت کی اجزا کاری کی برائی حقیقت میں بہت ہی زیادہ پھیلی ہوئی تھی اور دائمی حقوق رکھنے والوں کی اجزا کاری کی بہ نسبت یہ زیادہ دور تک جا چکی تھی[۱۵]۔ یہ برائیاں کس حد تک تھیں اس کی تصدیق کسی سرکاری اعداد و شمار سے نہیں ہو سکتی تھی۔ پھر بھی جنگ کے درمیانی مدت میں گاؤں کے کئی جائزے لئے گئے جن سے بعض علاقوں کے بارے میں پتہ چلتا تھا۔ یہ پتہ چلا کہ بندیل کھنڈ، پچھمی مہاراشٹر کے کچھ حصہ اور یو۔پی پنجاب کے بہت غریب اور اختیار سے باہر علاقوں میں اجزا کاری حد سے زیادہ ہو گئی تھی اور کونکان میں شاید بدترین صورت حال تھی جہاں زمین اور دوسرے حالات میں نمایاں فرق ہو وہاں متوازن اجزا کاری کا کچھ جواز ہو سکتا ہے لیکن کسی بھی قابل اجازت حدوں سے بہت زیادہ خراب تھے۔ اس کے نتیجہ میں کاشت کے لیے دستیاب زمین کم ہو جاتی تھی، خرچ بڑھ جاتا تھا اور بہتر طریقے اختیار کرنے اور انہیں استعمال کرنے اور گہری کاشت کرنے میں رکاوٹ پڑ جاتی تھی۔

اجزا کاری ثانوی منظر کی حیثیت رکھتی تھی اور اس کا تواتر اس وقت تک رک نہیں سکتا تھا جب تک کہ اراضی کا اوسط سائز مناسب سطح پر مستقل نہ ہو جائے۔ بہرحال اجزا کاری کے برے نتائج بہت زیادہ تھے اور اس مسئلہ سے فوری اور جزوی طور پر براہ راست نبٹا جا سکتا تھا۔ اس لئے کوشش کی گئی کہ اراضی کی چک بندی کے ذریعہ اجزا کاری کے عمل کو ہٹایا جائے۔ چک بندی رضاکارانہ کوشش کے ذریعہ پلاٹ یا کاشت کے تبادلہ سے ہو سکتی تھی یا حکومت کسی

---

۱۵ زراعت سے متعلق روآئل کمیشن کی رپورٹ، باب پنجم

اور انچی قرض کی وسعت میں اضافہ ہوا۔[۱]

تیسری دہائی کے دوران کسانوں کی مقروضیت کے سلسلہ میں جو تحریکیں ہوئیں ان کا ذکر سرد بازاری کے دوران ہونے والے واقعات کی روشنی میں بڑی آسانی سے ہو سکتا ہے۔ سرد بازاری عالم گیر منظہر کی حیثیت رکھتی تھی۔ ہندوستان کے سلسلہ میں اس کا سب سے بڑا اثر یہ ہوا کہ زرعی مصنوعات کی قیمتوں میں تیزی سے گراوٹ آئی اور یہ مطلق اور اضافی تھی۔ سرد بازاری سے متعلق جس خارجی واقعہ نے ہندستان کی معیشت کو بنیادی طور پر متاثر کیا وہ یہ تھا کہ ستمبر ۱۹۳۱ء میں (برطانوی سکہ) اسٹرلنگ کی شرح کا تعین سونے کی قیمت سے ہو گیا۔ کاشتکاروں کی آمدنی وغیرہ پر سرد بازاری کے اثرات کیا ہوئے ان سے متعلق گرچہ ہمارے پاس کوئی براہ راست اعداد و شمار نہیں پھر بھی کچھ ایسے نشانات ملتے ہیں کہ ان میں بڑی حد تک کمی واقع ہو گئی۔ ان میں سب سے اہم وہ سرکاری تخمینہ ہے جس کا تعلق بعض ہندوستانی صوبوں کی زرعی پیداوار کی قیمت میں گراوٹ سے ہے۔ یہ گراوٹ یکساں نہ تھی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ دوسری قیمتوں کی بہ نسبت کچھ زرعی مصنوعات کی قیمتیں بہت زیادہ تیزی سے گریں۔

ہر صوبہ میں خاص اناج کی مجموعی پیداوار کی قدر و قیمت (لاکھ روپیہ میں)

صوبے	۱۹۲۸-۹	۱۹۳۱-۲	۱۹۳۲-۳	۱۹۳۳-۴
مدراس	۱,۸۰,۷۸	۱,۰۱,۲۵	۹۹,۳۳	۸۳,۱۷
بمبئی	۱,۲۰,۵۲	۶۶۵۶	۸۳,۸۶	۶۰,۵۲
بنگال	۲,۳۲,۵۹	۱,۰۶,۷۱	۹۰,۵۴	۹۵,۵۶
صوبہ متحدہ	۱,۴۰,۵۲	۹۲,۲۱	۹۱,۰۱	۸۵,۶۵
پنجاب	۷۶,۷۸	۳۷,۴۹	۴۸,۵۳	۴۰,۱۱
برما	۶۳,۳۸	۲۹,۲۰	۲۹,۴۵	۲۳,۲۶
بہار اور اڑیسہ	۱,۳۵,۱۷	۷۱۰۵	۵۶,۵۵	۵۴,۶۳
صوبہ متوسط	۶۸,۷۷	۳۲,۴۲	۳۵,۴۰	۳۰,۳۳
کل	۱۰,۱۸,۵۱	۵,۳۶,۸۹	۵,۳۴,۶۷	۴,۷۳,۲۳

[۱] کے۔جی۔ سیوسوامی: قانونی تحفظ اور ہندوستان کے زرعی دین داروں کو ریلیف۔ باب سوم (۱۹۳۹)

مجموعی اعتبار سے غذائی اجناس کا حال سب سے خراب رہا۔ پھر بھی سب سے موافق صورتوں میں بھی دو برسوں کے دوران قیمت میں جو گراوٹ ہوئی وہ بہت ہی زیادہ تھی۔ قیمتوں میں گراوٹ کا حقیقی اثر کاشتکار پر کیا ہوتا ہے اس کا انحصار مختلف عناصر پر ہوگا۔ گراوٹ کا براہ راست اثر مارکٹ میں آنے والی پیداوار پر ہوگا۔ جس حد تک کاشتکار کی معیشت گذر اوقات کی معیشت تھی اس حد تک قیمتوں کے گھٹ جانے سے اس کی حقیقی قدر وقیمت براہ راست کم نہ ہوگی۔ بہر حال گذر اوقات معیشت کے باوجود خرچ کے بعض مد نقد ادا کرنے ہوں گے اور نقد خرچ کے ساتھ بعض گھریلو ضرورتوں کو پورا کرنا ہوگا۔ بہت سے خرچ کے مد مستقل ہوں گے جیسے مال گذاری، کرایہ اور سود کا خرچ جب کہ ان کی ادائیگی نقد صورت میں ہو۔ پہلے کی بہ نسبت اب غلہ کا زیادہ تناسب نقد ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے فروخت کیا جائے گا۔ جو قیمت کاشتکار نے ادا کی ہے اس کے مقابلہ میں قیمتوں کے یکدم گھٹ جانے سے بھی نقد خرچ (CASH OUTLAY) کے سلسلہ میں وہی نتیجہ رونما ہوگا۔ سرد بازاری کے زمانہ میں کاشتکار کی حالت کیا تھی اس کے بارے میں کوئی براہ راست واقفیت دستیاب نہیں۔ پنجاب سے متعلق بعض اعداد و شمار کا پروفیسر برج کشور نے یہ تجزیہ کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح مالگذاری کی ادائیگی کے بے لوچ ہونے سے کاشتکاروں کو مال گذاری ادا کرنے کے لئے زیادہ قرض لینا پڑا اور کس طرح کرایہ کی نقد ادائیگی نے لگان دینے والے کاشتکار کے طبقہ (TENANT CLASS) کو برباد کر دیا[1] سرد بازاری کا کاشتکاروں پر کیا اثر پڑا اس کے بارے میں چونکہ کوئی براہ راست واقفیت دستیاب نہیں اس لئے اس زمانہ میں اس کے حالات سے متعلق دوسرے اعداد و شمار پر غور کرنا ہے۔ ان اعداد و شمار کا مطالعہ کرنے سے پہلے سرد بازاری سے پیدا شدہ صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے ہندوستان کی حکومت نے کون سے مختلف اقدامات کئے ان کا مختصر طور پر جائزہ لینا ضروری ہے۔

سرد بازاری کے اثرات کو روکنے کے لئے حکومت نے جو اقدامات کئے انہیں ہم دو درجوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ (۱) مثبت (۲) منفی۔ مثبت اقدامات میں معیشت کی تنظیم نو یا باز آمد اجزائے زر (REFLATION) پر نظر ہوتی تھی۔ نئے اقدام (NEW DEAL

---

[1] برج نرائن: انڈیا ان دی کرائسس، باب اول (۱۹۳۲ء)

میں دونوں طریقے شامل تھے۔ بعض ملکوں میں کیے گئے مثبت اقدامات میں روپیہ کی قیمت میں کمی مخصوص علاقہ کی آبادکاری یا سرگرمیوں کا پروگرام اور مشترکہ منڈی وغیرہ کی تشکیل شامل تھی۔

ہندوستان میں اس قسم کے کسی اقدام پر غور نہیں کیا گیا اس ملک کے سکّہ اور تبادلہ زر کی پالیسی کا یقین برطانوی مفادات سے ہوتا تھا اور روپیہ کی قیمت میں کمی برطانوی سکہ اسٹرلنگ کے سونا سے غیر متعلق ہونے سے پیدا ہوا اِس حد تک محدود تھی۔ زرعی مصنوعات کی قیمت کو سہارا دینے کے لئے کوئی اقدام نہیں کیا گیا اور نہ اس پر غور ہی کیا گیا۔

مارکٹنگ کے سلسلے میں جو اقدامات اٹھائے گئے وہ محض بازار کے سروے تک محدود تھا۔ حکومت کے عام منفی انداز نظر میں ۱۹۳۴ء میں شمار میں ہونے والی فصل کی منصوبہ بندی کانفرنس Crop Planning Conference ایک دلچسپ استثنا کی حیثیت رکھتی ہے۔ کانفرنس کے سلسلہ میں سرکاری مطبوعہ کے آخری پیراگراف "کانفرنس کے آئینہ میں" کا حسب ذیل اقتباس اس کانفرنس کے آغاز سے متعلق ہمیں کچھ آگہی دیتا ہے۔

چار برس قبل سرد بازاری شروع ہونے کے وقت سے ہندوستان میں زرعی مصنوعات کی قیمت میں جو تیزی سے کمی ہوئی ہے اس سے لوگ اس کے اسباب پر قدرتی طور سے غور کرنے لگے ہیں۔ پہلی پیش گوئیاں کہ سرد بازاری جلد ہی ختم ہو جائے گی جب غلط ثابت ہوئیں تو لوگ سوچنے لگے کہ کیا زرعی اشیا کی قیمت میں کمی کا سبب ہندوستان کی اہم فصل بالخصوص چاول اور گیہوں کی زیادہ پیداوار تو نہیں ہے۔ ایسے خیال کا اظہار اپریل ۱۹۳۴ء کی صوبائی اقتصادی کانفرنس Provincial Economic Conference میں ہوا فصل کی منصوبہ بندی کانفرنس Crop Planning Conference کیلیے جو مواد تیار کیا گیا تھا، اس سے ماہرانہ تفتیش کے بعد یہ نتیجہ نکلا کہ ابھی جوٹ کے سوا کسی دوسرے غلہ کی پیداوار زیادہ نہیں ہے [1]

کانفرنس میں بحث کے دوران صوبوں کے نمائندوں نے ان تجاویز کی شدت سے مخالفت کی کہ خاص فصلوں کے علاقے محدود کیے جائیں جہاں ان کا غلبہ تھا جہاں تک ممکن ہو مختلف قسم کی فصلوں کی کاشت کو تقویت دینے کی ضرورت پر عام اتفاق رائے تھا بلکہ خاص حالات میں حفاظتی محصولات کی سفارشات کی گئیں۔ بہر حال کانفرنس نے فصلوں کے زیر کاشت علاقہ کے

---

[1] شملہ میں ہونے والی فصل کی منصوبہ بندی کانفرنس کی کاروائیاں (ص ۵ ۱۹۳۴ء)

متعلق امور کے علاوہ کسی بات پر بحث نہیں کی۔ زرعی قیمتوں کے مستقل کئے جانے اور مشترکہ منڈی جیسے مسائل اٹھائے بھی نہیں گئے۔ اس لئے یہ بالکل بے سود رہا اور اس وجہ سے حکومت نے بھی کوئی فوری قدم نہیں اٹھایا اور نہ اس سے طویل المدت پالیسی پر اثر پڑا۔

منفی اقدامات میں وہ تمام اقدامات شامل کئے جا سکتے ہیں جن کا مقصد یہ تھا کہ قیمتوں کے گھٹ جانے سے کاشتکاروں کی حالت پر جو اثرات پڑے ان کو کم کیا جائے۔ ہندوستان میں دو خاص قسمیں دور کی گئیں : (الف) مالگزاری اور لگان کا خرچ (ب) قرض جہاں تک مالگزاری مطالبہ کا سوال ہے صرف صوبہ متحدہ ہی میں ایک انقلابی قدم اٹھایا گیا۔ اس صوبہ میں بڑے پیمانہ پر فوری معافی دے دی گئی بلکہ حکومت نے اس پہلو پر بھی غور کیا کہ کیا قیمتوں میں اتنے کافی اختلاف کا مقابلہ کرنے کے لئے کوئی ایسی مستقل اسکیم عمل درآمد ہو سکتی ہے جس سے لگان اور مالگزاری کی رقم میں حالات کے مطابق کمی اور زیادتی کی جا سکتی ہے۔ زیادہ تر دوسرے صوبوں میں اس سلسلہ میں کوئی خاص قدم نہیں اٹھایا گیا صرف قیمتوں کی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے پرانے سسٹم میں کہیں معافی اور کہیں معطل کرنے کا کچھ عمل اختیار کیا گیا۔ زیادہ تر ملکوں میں قرض سے متعلق ابتدائی کام یہ ہوا کہ با ضابطہ التوائے قرض (MORATORIUM) کا اعلان کیا گیا۔ ہندوستان میں با ضابطہ التوائے قرض کے سلسلہ سے ملتا جلتا طریقہ یو۔پی گورنمنٹ کا ۱۹۳۲ء میں وہ اعلان تھا کہ جہاں دیوانی عدالت نے زرعی کھیت کے فروخت کا حکم صادر کیا ہے اس کھیت کے سلسلہ میں ڈگری کی تعمیل کلکٹر کے سپرد کر دینی چاہیئے۔ کلکٹر کو یہ اختیار بھی دیا گیا کہ اگر ملنے والی قیمت مناسب نہ ہو تو وہ تمام فروخت کو ملتوی کر دے۔ صوبہ متوسط میں سرکار نے ۱۹۳۳ء اور ۱۹۳۴ء میں ہدایات جاری کئے کہ ناگزیر صورتوں ہی میں زمین کی فروخت ہونی چاہیئے۔ اس قسم کے دوسرے اقدامات کسی اور صوبہ میں نہیں کئے گئے۔

با ضابطہ التوائے قرض (MORATORIUM) کے بعد قرض کا تصفیہ (ADJUSTMENT) اور تخفیف عمل میں آئی۔ اس سلسلہ میں بھی یو۔پی میں دیگر صوبوں سے زیادہ تیزی سے کام ہوا اور کئی طرح کے کام ہوئے۔ قسط میں ادائیگی کا حکم جاری کر کے زمین کی فروخت کو روکا، سود کی شرح کم کر دی، چھوٹے کاشتکار کو اپنی رہن پر رکھی ہوئی زمین کو پھر سے حاصل کرنے کسی حد تک مدد پہنچائی اور بعض صورتوں میں قیمتوں کے آثار (SLUMP) سے پہلے کی قیمت پر زمین منتقل کرنے کا انتظام کر کے قرض کو لازمی طور پر گھٹا رہا۔ صوبہ متحدہ کے ایکٹ کی ان دفعات کی تعمیل لازمی تھی۔ دوسرے

صوبوں میں ساہوکار اور قرضدار کے درمیان مصالحت کے ذریعہ قرض گھٹانے اور منہا کرنے کی کوشش کی گئی۔

اس طرز عمل کی خاص مثالیں وہ قرض مصالحتی ایکٹ Debt Conciliation Act ہیں جو صوبہ متوسط (۱۹۳۳)، پنجاب (۱۹۳۴) اور بنگال (۱۹۳۶) میں پاس ہوئے۔ ان قوانین کی رو سے چھوٹے مقامی علاقہ کے لئے مصالحتی بورڈ قائم کئے گئے جنہیں یہ اختیار ملا کہ وہ ساہوکار اور قرضدار کے درمیان صلح کرا کر اس کو رجسٹرڈ کر دے۔ ان میں سب سے پہلا سی۔ پی ایکٹ تھا اس کا خاص اختیار جس کے ذریعہ بورڈ ساہوکار کو رضامند ہونے پر اصرار کرتا تھا وہ یہ تھا کہ "جہاں قرضدار ساہوکار کے سامنے مناسب معاہدہ پیش کرتا تاکہ وہ اسے قبول کرے ایسی صورت میں بورڈ قرضدار کو ایک سرٹیفکیٹ دے سکتا ہے۔"[1] یہ سرٹیفکیٹ مل جانے سے ان ساہوکاروں پر چند پابندیاں عائد ہو جاتی تھیں جو قانونی عدالت کی آنے والی پیش کش میں معاہدہ سے انکار کرتے۔ یہ طریقہ بعد کی قانون سازی میں بعض ترمیمات کے ساتھ دوسرے صوبوں میں اختیار کیا گیا۔

مصالحتی قانون سازی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ پنجاب میں اس کے سب سے زیادہ کامیاب اثرات ہوئے قرض کی رضاکارانہ مصالحت کے لئے پنجاب میں حالات بڑے موافق تھے چونکہ وہاں قرضداری اور دوسرے قوانین کے ذریعہ جائداد سے چھٹکارا کا ایک بڑا سلسلہ تھا اور جن سے ان قرضوں کی بازیافت بھی عملی طور پر ناممکن تھی جو ضمانت پر دیے گئے تھے۔"[2] یہ دعوی کیا گیا کہ ۱۹۴۰ء تک مصالحت سے کافی لوگوں نے فائدہ اٹھایا اور مصالحت کے طریقہ سے قرض کے مطالبات ۶۰ فیصد کم ہو گئے۔ ۱۹۳۳ء کے صوبہ متوسط کے ایکٹ کے نتائج جیسا کہ ۱۹۳۹ء کے آخیر میں رپورٹ ہوئی یہ تھے کہ ۱۵٫۶ کروڑ کے قرض مطالبات جن کے لئے ایک لاکھ قرضداروں نے درخواستیں دی تھیں گھٹا کر ۷٫۵ کر دیئے گئے۔[3] صوبہ متوسط میں اس ایکٹ کی تعمیل کے سلسلہ میں بڑا اعتراض یہ کیا گیا کہ اس ایکٹ سے خاص طور پر بڑے کاشتکاروں کو فائدہ ہوا بلکہ کسی حد تک غیر کاشتکار قرضداروں کو بھی فائدہ پہنچا۔ بنگال ایکٹ کی کارکردگی پر بھی کافی

---

[1] سیوسوامی، ج۔ س۔ باب پنجم

[2] آل انڈیا دیہی کریڈٹ سروے رپورٹ، ج ۱، حصہ اول ص ۲۱۱

[3] زرعی فینانس ذیلی کمیٹی کی رپورٹ ۵۔ ۱۹۴۴، ص ۲۲

اعتراضات ہوئے چونکہ گاؤں بورڈ کا کام جو اس کی نمایاں خصوصیت تھی، بڑا ہی ناقص تھا۔ سرکاری اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۴۰ء تک ۵ ر۴۱ لاکھ درخواستیں دیکھی گئیں اور ۲۶ کروڑ کا قرض گھٹا کر ۱ کروڑ کر دیا گیا۔

جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے صوبہ متحدہ کی قانون سازی میں خاص طور پر باضابطہ التوائے قرض (MORATORIUM) اور کاشتکاروں کے حق اراضی کی حفاظت کا دفعہ پیش کیا گیا تھا۔ منہا کرنے کے لئے دفعہ نے اچھے کاشتکاروں کو خاص طور پر متاثر کیا۔ اس لئے یو. پی میں قانون سازی کا اثر خاص طور پر یہ ہوا کہ تیسری دہائی کے اواخر میں انہی قرض میں تخفیف ہوئی اور باقی کرایہ کے مقدموں میں کمی آئی اور سرد بازاری کے برسوں میں جن کی تعداد بہت زیادہ ہوگئی تھی۔ اب روپیہ اور جائداد سے متعلق مقدموں میں کمی واقع ہوئی۔ ایسے عمل کا اثر جس طرح دوسرے صوبوں میں ہوا اس کا کساد بازاری کے دوران واقعات پر بہت ہی کم اثر ہوا۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۳۶-۱۹۳۷ء تک سرد بازاری ختم ہوگئی۔ اس سال میں آئینی ترقی ہندستان میں نمایاں طور پر ہوئی اور صوبوں میں عوام کے منتخب وزرا نسبتاً بڑے اختیارات کے ساتھ اقتدار میں آ گئے۔ ان وزارتوں نے فطری طور پر زرعی مسائل کی طرف توجہ کی۔ اراضی اور چکبندی سے متعلق ان کے اقدامات کا ذکر پہلے ہو چکا۔ سرد بازاری سے ہر جگہ قرض کا مسئلہ سنگین بن چکا تھا اس لئے اس کی طرف خاص طور پر توجہ دی گئی۔ سرد بازاری کے واقعات اور تدابیر کے خاص طریقوں (PATTERN) نے جو اس کے اثرات کا مقابلہ کرنے کے لئے اختیار کئے گئے تھے، نئی وزارتوں کے ابتدائی طرف فکر کو قدرتی طور پر متاثر کیا۔

بمبئی جیسے بڑے صوبوں میں جہاں اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے پہلے کوئی قدم اٹھایا نہیں گیا تھا وہاں اس کام کے لئے قانون بنائے گئے اور مدراس اور یو. پی جیسے دوسرے صوبوں میں اور زیادہ موثر کوشش کی گئی۔ سرد بازاری کے دوران جو قانون پاس ہوئے تھے اس سے جو تجربہ ہوا اس سے ۱۹۳۶ء کے بعد ایک نئی صورت حال پیدا ہوئی۔ یہ قانون قرض کو لازمی طور پر گھٹانے کے لئے تھا۔ ان نئے قوانین کی خاص دفعات یہ تھیں کہ سود میں لازمی تخفیف ہو، ایک خاص ڈھنگ کے پرانے قرض کے اصل اور سود میں تخفیف ہو مناسب قسطوں میں منہا شدہ قرض کی ادائیگی ہو۔ رہن شدہ کی بازیابی اور قرض دار کی زمین اور اس کے دوسرے اثاثہ جیسے غلہ گھر وغیرہ کے کم از کم تناسب کی حفاظت کی جائے۔ ان قوانین میں پہلا قانون مدراس قرض رلیف ایکٹ (۱۹۳۸)

زرعی قرض ریلیف قوانین بھی یو پی اور ۱۹۳۹ء میں بمبئی میں پاس کیے گئے جن میں یہ دفعہ شامل تھا کہ قرض کو لازمی طور پر کم کر دیا جائے۔ بہر حال ان قوانین نے دوسری جنگ عظیم سے پہلے جو صورت حال تھی اس کو حقیقی طور پر متاثر نہیں کیا۔ اس جنگ سے پہلے زرعی قرض سے متعلق جو صورت حال تھی وہ سرد بازاری اور مختلف صوبوں میں بنائے ہوئے قانون کا مشترکہ نتیجہ تھی۔ اس سلسلہ میں عمومی تبصرہ کرنا مشکل ہے کیونکہ سرد بازاری کا عمل اور ریاستی اقدام کی اثر آفرینی خطہ بہ خطہ مختلف تھی۔ اس سلسلہ میں دستیاب اعداد و شمار اور دوسری شہادت پر غور کرنے کے بعد آل انڈیا دیہی کریڈٹ سروے All India Rural Credit Survey حسب ذیل تاثرات پیش کرتا ہے!

بالآخر صوبائی بینکنگ تحقیقاتی کمیٹیوں کے بعد سے اس زمانہ کے دوران قرضداری کا کیا رجحان تھا اس کا خلاصہ پیش کیا جا سکتا ہے سرد بازاری کے دوران اور اس کے بعد مقروضیت کے رجحان سے متعلق جو اعداد و شمار دستیاب ہوئے ہیں وہ یہ بتلاتے ہیں کہ ۳۰-۱۹۲۹ء کی سطح کے مقابلہ میں پوری تیسری دہائی میں قرض کی اونچی سطح قائم رہی۔ بہت سے مبصرین کے مطابق کسی صورتحال کے عام تحریکات کی یہ خصوصیت تھی کہ زیادہ تر صورتوں میں کاشتکار پرانے قرض کے اصل کو چکانے اور کسی حد تک سود کی رقم کی ادائیگی کے بھی لائق نہ تھے۔ اس زمانہ میں نیا قرض لینا کم سے کم ہو گیا تھا۔ ان حالات میں قرض کی سطح میں تغیر ایک طرف جمع شدہ سود کا عمل تھا اور دوسری طرف بکری کے ذریعہ بھی قرض کا زبردستی چکوتا کرنا اور تکمیل رہن کرنا۔ جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ سرکاری اقدام سے قرض میں حقیقی کمی ہوئی اور اس نے بنگال اور پنجاب جیسے دو یا تین صوبوں میں بڑا اہم رول ادا کیا۔ بہت سی ریاستوں میں مختلف قوانین پاس ہوئے جن میں جماعت اور کاشتکار کی گذر اوقات کے لئے اس کی جائداد کے کم سے کم حصہ کی حفاظت کا انتظام کیا گیا اور زیع کر اور قرقی (ATTACHMENT) کر کے بازیابی کے لئے قرض کی رقم کم کر دی گئی، ان سارے قوانین نے قرض کو برقرار رکھنے میں بھی مدد پہنچائی اور ساہوکار اپنی رقم کی وصولی کے لئے موافق وقت کا انتظار کر رہے تھے[1]

قرض کے مسئلہ سے نپٹنے کے لئے سب سے اہم اور مثبت اقدام دیہی امداد باہمی قرض کا سسٹم

---

[1] آل انڈیا رورل کریڈٹ سروے ج ۱، حصہ اول ص ص ۶-۲۲۵

قائم کرنے کی کوشش تھی۔ اس کی ابتدائی تاریخ کا حال پہلے ہی بتایا جا چکا ہے۔ ۱۹۱۲ء کی قانون سازی نے امداد باہمی انجمن ایکٹ کے ماتحت آنے والی تمام انجمنوں کی حدود میں ابتدائی انجمن، یونین اور ابتدائی انجمن کی دوسری تنظیموں کے اعتبار سے توسیع کی۔ ۱۹۱۴ء میں سرکار نے ایک کمیٹی مقرر کی جس کا نام میک لگن کمیٹی تھا تاکہ وہ اس تحریک کے سارے ڈھانچہ پر از سر نو غور کرے ۱۹۱۵ء کے بعد انجمن امداد باہمی کی ترقیاں اس کمیٹی کی سفارشات سے بڑی حد تک متاثر ہوئیں۔

بہرحال ۱۹۱۹ء میں جو آئینی تغیرات ہوئے ان کی وجہ سے امداد باہمی سے متعلق قانونسازی صوبوں میں منتقل ہوگئی اور بہت سے صوبوں نے دوسری دہائی کے دوران اس سلسلہ میں خاص قانون بنائے گئے جن کی دفعات بہت سی صورتوں میں ہر صوبہ میں مختلف تھیں۔ بہرحال امداد باہمی کی بنیادی ہیئت عام طور پر یکساں رہی۔

ہندوستان میں اس تحریک کی تنظیم سہ گانہ ہے۔ اس کی بنیاد ابتدائی سوسائٹی ہے۔ ابتدائی سوسائیٹوں کو روپیہ ضلع سنٹرل بینک سے ملتا ہے اور وہی ان کی نگرانی کرتی ہے اور اس پورے سسٹم کی آخری چوٹی پر صوبائی بینک ہوتا تھا۔ پرائمری سوسائٹی اور سنٹرل بینک کے بیچ میں بہت سی صورتوں میں، درمیانی تنظیم ہوتی تھی، دیکھ بھال کرنے والی جماعت، ضمانت دار یونین۔ یا بینکنگ یونین۔ ضمانت دار جماعتیں انفرادی انجمنوں کے کام کی دیکھ بھال ہی کے لئے ہی نہیں بنائی جاتی تھیں بلکہ انہیں وہ باہمی طور پر قرض کی ضمانت دینے کے لئے بھی وجود میں آئی تھیں۔ اپنے پیدائشی صوبہ، برما کے علاوہ جہاں ان کا آغاز ہوا تھا وہ کہیں کامیاب نہیں ہوئیں صوبہ متوسط میں ضمانت دار یونین کا تجربہ ناکام رہا اور بمبئی پریسیڈنسی میں جہاں اس شکل میں پہلی بار لاگو ہوا یہ کامیاب نہ ہو سکیں اور ۱۹۲۵ء میں اس کے عوض نگراں یونین (SUPER VISING UNION) قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ نگراں جماعت، پرائمری سوسائیٹوں کا مجموعہ ہوتی ہے جو ایک ساتھ ہو کر انفرادی سوسائیٹوں کی دیکھ بھال کرنے کے لئے مل جل کر ایک با صلاحیت اور تربیت یافتہ سپروائزر مقرر کرتی ہیں۔ اس قسم کی سوسائٹی مدراس میں خاص طور پر پائی جاتی ہے۔ بینک کی یونین جو پنجاب کا تجربہ تھی، نگرانی کے ساتھ ساتھ بینکنگ اور کریڈٹ کا کام کرتی ہے، مدراس، بمبئی اور پنجاب کے سوا یہ درمیانی جماعتیں عام نہ تھیں اور دوسری جگہوں میں خود مرکزی بینکوں نے ابتدائی سوسائٹیوں کی پوری نگرانی کا ذمہ لے لیا تھا۔ زرعی کمیشن نے یہ مناسب سمجھا تھا کہ مالیات اور نگرانی کا کام الگ الگ کنٹرول کے ماتحت ہو لیکن یہ ایسا نقطہ نظر ہے جسے عام طور پر قبول

نہیں کیا گیا؎ہندوستان کی تحریک امداد باہمی کی ایک قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس میں ہر صوبہ کا ایک سرکاری رجسٹرار ہوتا ہے۔ انجمن امداد باہمی ایکٹ کے ماتحت اسے رجسٹرڈ سوسائیٹیوں کی جانچ کرنے کے بڑے اختیارات ہوتے ہیں۔ ان کے حالات کی تحقیقات کرا سکتا ہے۔ اندرونی جھگڑوں کو طے کر سکتا ہے اور مخصوص نازک حالات میں انھیں توڑنے کا بھی اسے اختیار ہوتا ہے۔ تمام رجسٹرڈ سوسائیٹیوں کے آڈٹ کرانے کا کام ایک سرکاری شعبہ کرتا ہے۔ اس طرح اس تحریک کی مناسب رہنمائی کی ذمہ داری بڑی حد تک سرکار پر آتی تھی۔

دوسری دہائی کے دوران امداد باہمی کی تحریک کی ترقی غیر معمولی مگر یکساں نہ تھی۔ زرعی کمیشن نے یہ تخمینہ لگایا تھا کہ مختلف صوبوں میں اس تحریک کا کس حد تک اثر ہوا ہے اس کے رو سے زرعی انجمنوں کا دیہی علاقوں کے خاندان کے ساتھ ۲۷-۱۹۲۶ء میں پنجاب میں تناسب ۲ر۱۰ فیصد، بمبئی میں ۷ر۸ فی صد اور مدراس میں ۹ر۷ فیصد تھا۔ دوسرے تمام صوبوں میں تناسب ۵ فیصد سے کم تھا یہاں تک کہ یو، پی میں صرف ۸ر۱ فیصد تھا۔ امداد باہمی انجمن سے اس دور میں ممبروں کے قرض کی ضرورتوں کا صرف ایک چھوٹا حصہ پورا ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ امداد باہمی کے ذریعہ کاشتکاروں کے مجموعی قرض کا لین دین تناسب کے اعتبار سے نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔

چونکہ مناسب شرح پر قرض کی مانگ کاشتکار کی بنیادی ضرورت تھی اس لئے پرائمری زرعی کریڈٹ سوسائٹی ہندوستان میں اس وقت امداد باہمی انجمنوں میں سب سے اہم تھی۔ پھر بھی یہ شروع سے ہی سمجھا گیا کہ کریڈٹ سوسائٹی کے کام کو دوسری سوسائیٹیوں سے سہارا دینا ہے تاکہ کاشتکار کو اپنی پیداوار کی مناسب قیمت مل جائے جسے وہ فروخت کرتا ہے اور وہ اپنی ضرورتوں کی خریداری کفایت شعاری سے کرے۔ بکری اور سپلائی کے لئے سوسائٹیاں بنائی گئیں اور ان کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ ان دوسری سمتوں میں حقیقی نتائج بہت معمولی تھے اور دوسری دہائی کے دوران امداد باہمی مارکٹنگ میں خاص قابل ذکر ترقی یہ ہوئی کہ گجرات اور کرناٹک میں کپاس کی بکری کے لئے انجمنوں کی تشکیل کی گئی۔

دوسرے صفحہ پر ان اعداد و شمار کی فہرست ہے جس کا تعلق ہندوستان میں انجمن امداد باہمی کی اس پیش رفت سے تھا جو ۱۹۱۴ء سے ۱۹۳۹ء تک ہوئی۔ یہ معلوم ہوگا کہ تعداد اور مالیاتی وسائل میں ترقی خصوصاً ۱۹۱۹ء اور ۱۹۳۰ء کے درمیان تیزی سے ہوئی۔ اور تیسری دہائی کے دوران ترقی کی شرح بہت کم ہو گئی۔ ہندوستان میں امداد باہمی تحریک میں بنیادی خامی ہمیشہ سے یہ تھی کہ اس نے بیرونی بالخصوص سرکاری حمایت اور

؎ بی۔ ابدی کولنس : ابتدائی سوسائیٹیوں کی نگرانی کا کام، دی بمبئی کوآپریٹو کوارٹرلی (دسمبر ۱۹۲۸ء)

ہندوستان میں امداد باہمی انجمنوں کی پیشرفت

	۴ برسوں کا اوسط ۱۹۰۷-۱۹۰۶ء سے ۱۹۱۰-۱۹۰۹ء	۵ برسوں کا اوسط ۱۹۱۱-۱۹۱۰ سے ۱۹۱۵-۱۹۱۴ تک	۵ برسوں کا اوسط ۱۹۱۶-۱۹۱۵ سے ۱۹۲۰-۱۹۱۹ تک	۱۹۱۴-۱۵	۱۹۱۹-۲۰	۱۹۲۴-۵	۱۹۲۹-۳۰	۱۹۳۴-۵	۱۹۳۹-۴۰
مرکزی (اور نگران)	۱۷	۲۳۱	۹۴۲	۲۹۷	۱۳۹۴	۱۸۰۸	۱۸۸۰	۱۴۱۵	۱۱۳۱
ارکان کی تعداد	۱,۹۸۷	۲۳,۶۷۷	۱۰۰,۸۹۶	۳۶,۸۰۸	۱۴۴,۳۱۹	۲۱۸,۲۴۳	۲۴۷,۵۲۴	۲۳۱,۸۷۸	۲۲۵,۷۷۹
زرعی	۱,۷۱۳	۱۰,۸۹۱	۲۵,۸۷۳	۱۶,۰۱۶	۳۶,۷۱۶	۵۱,۷۱۶	۹۲,۰۵۱	۹۳,۱۶۰	۱۱۸,۹۸۸
ارکان کی تعداد	۱۰۷,۶۴۳	۴۵۹,۰۹۶	۹۰۲,۹۳۰	۶۶۴,۴۴۶	۱,۱۸۱,۷۱۸	۲,۰۳۱,۳۰۶	۳,۱۲۴,۲۲۴	۳,۰۱۱,۶۹۸	۴,۱۹۰,۹۰۹
غیر زرعی	۱۹۶	۶۶۴	۱,۶۶۲	۹۱۴	۲,۶۶۲	۴,۱۸۳	۴,۱۸۳	۱۱,۴۳۶	۱۶,۷۶۰
ارکان کی تعداد	۵۴,۲۶۷	۸۹,۱۵۷	۲۲۶,۰۳۱	۱۲۳,۲۱۵	۳۳۹,۴۴۴	۵۹۸,۶۲۴	۵۹۸,۶۲۴	۱,۳۹۶,۹۳۹	۱,۸۹۰,۶۶۱
تمام انجمنوں کا کاروباری سرمایہ	۶,۸۱۲	۵۴,۸۴۲	۱۵۱,۸۴۷	۸۹,۶۶۲	۲۱۴,۰۷۱	۴۸۱,۹۲۹	۴۸۱,۹۲۹	۹۶۸,۸۵۲	۱,۰۶,۹۸۹

رہنمائی کے زیر اثر ترقی کی تھی اس تحریک کی بعض قابل ذکر کامیابیاں ان ضلعوں میں ہوئیں جہاں انتظامیہ کے سربراہ نے اس کی ترقی میں ذاتی دلچسپی لی غیر سرکاری ضامن بھی زیادہ تر بیرونی تھے۔ ترقی کبھی کبھی پر فریب ہوتی تھی۔ اور اس کا انتظام مستقل خارجی امداد اور رہنمائی پر منحصر تھا امداد باہمی انجمنوں کے بمبئی کے رجسٹرار کی رپورٹ سے مندرجہ ذیل اقتباس عمومی صورت حال کی وضاحت کرتا ہے۔ یہ یاد رہے کہ یہ بیان اس صوبہ سے متعلق ہے جہاں یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہ تحریک دوسری جگہوں کے مقابلہ میں زیادہ بہتر طور پر چل رہی ہے۔ رجسٹرار لکھتا ہے! مجھے ڈر ہے کہ عام کاشتکار اس مرحلہ سے نہیں گذرا ہے جہاں وہ انجمن کو ساہوکار کا صرف بدل سمجھا ہو۔ گذشتہ زمانہ میں وہ ہمیشہ ساہوکار ہی سے سارا قرض لیتا تھا اور جب انجمن کا قیام ہوگیا ہے اور وہ کھتا ہے کہ وہ اسان شرح سود پر قرض لے سکتا ہے تو وہ پہلے سے زیادہ قرض لیتا ہے اور اسے بدترین شکل میں آسان قرض مل رہا ہے"[1] ممبران کے اس انداز نظر کا ردعمل یہ ہوا کہ انجمن کے انتظامیہ نے قرض کو محفوظ رکھنے کے لئے بڑے تشویش کا اظہار کیا اور انجمن نے ممبران کے قرض لینے پر سخت شرائط اور حدود قائم کردیئے اور سنٹرل بنکوں نے انجمن کے قرض لینے پر پابندیاں لگادیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امداد باہمی ساہوکار تاجر سسٹم کی جگہ کبھی نہیں لے سکی اور امداد باہمی قرض سوسائٹی اس کے ممبر کاشتکار کے لیے صرف مزید کریڈٹ کا وسیلہ بن گئی۔

ہندوستان میں امداد باہمی کی تحریک سرد بازاری کے اثرات کی وجہ سے سخت آزمائش سے گذری۔ ان ملکوں میں بھی جہاں یہ پہلے سے مضبوط بنیاد پر منظم تھی وہاں اس زمانہ میں امداد باہمی کا تجربہ ناکامیاب رہا۔ اس لئے یہ حیرت کی بات نہیں کہ ہندوستان میں اس تحریک کو سخت نقصان ہوا۔ دوسرا خیال یہ تھا کہ جب تقریباً ہر جگہ کاشتکار اور انجمن امداد باہمی کو معیشت کا مقابلہ کرنے کے لئے حکومت کی طرف سے امداد ملی تو ہندوستان میں اس قسم کی کوئی مدد دستیاب نہیں ہوئی اور ہر شخص کو اپنی راہ اختیار کرنے کے لئے چھوڑ دیا گیا نتیجہ یہ ہوا کہ خاص طور پر ایسے صوبوں میں جہاں پہلے سے یہ تنظیم ناقص طریقہ سے بنی تھی یا جہاں مالیاتی پوزیشن کمزور تھی وہاں یہ تحریک گویا ختم ہوکر رہ گئی۔ مثال کے طور پر برار کا یہی حال تھا۔ جہاں یہ تحریک ہمیشہ سرکاری حفاظت میں اچھی طرح رہی یا جہاں اس کے مالیاتی اثاثے کافی تھے وہاں نتائج ایسے تباہ کن نہ تھے۔ بہر حال ہر جگہ کمزور یونٹ ختم کردینے پڑے، بازیابی کم ہوگئی اور بقایا کی رقم خطرناک تناسب میں بڑھنے لگی۔

---

[1] بمبئی پریسیڈنسی میں امداد باہمی انجمنوں کی کارگذاری پر رپورٹ، ۷-۱۹۶۶، ص ۱۸

سرد بازاری اور اس کے مابعد سے ہندوستان میں امداد باہمی کے بارے میں کچھ سبق ملتا ہے پہلا یہ کہ اس سے ظاہر ہو گیا کہ بڑے علاقوں میں اس تحریک کا نقص ابھی تک قائم تھا جو دیہی زندگی کے نمونوں میں مناسب طور پر گھل مل نہیں سکا تھا۔ یہ بیرونی قوت سمجھی جاتی رہی اور بڑی حد تک اس کا یہی حال تھا۔ اس طرح وہ پوری طرح سازو سامان سے لیس نہ تھی کہ وہ بحران کا مقابلہ کرے یا کاشتکار کی امداد کرے دوسرا یہ کہ صاف طور پر معلوم ہو گیا کہ اس جزوی ناکامیابی کے باوجود یہ لوگوں کی واحد امید بنی رہی۔ اس طرح جب عوامی حکومتیں دیہی ترقیاتی پروگرام کو پورا کرنے کے سلسلہ میں ایجنسیوں کے مسئلہ کی جانچ کرنے لگیں تو انھوں نے زیادہ تر صوبوں میں امداد باہمی تنظیم کے مرکز پر بھروسہ کرنے کا فیصلہ کیا جو پہلے سے موجود تھا۔ تیسرا یہ کہ یہ پتہ لگا کہ ان صوبوں میں بھی جہاں یہ تحریک سب سے طاقتور تھی وہاں اس کی موجودہ طاقت اور وسعت اتنی کم تھی کہ وہ ہمہ گیر یا بڑے تعمیراتی پروگرام کو مکمل نہیں کر سکتی تھی۔ اس لئے مسئلہ یہ تھا کہ موجودہ تنظیم کو اس طرح تیز گام کیا جائے کہ یہ قومی دیہی پالیسی کی ضرورتوں کا پورے طور پر مقابلہ کر سکے۔

سرد بازاری نے ہندوستان میں اس تحریک کی دوسری خامی کو واضح کر دیا تھا جو ابھی تک ظاہر نہیں ہوئی تھی۔ یہ دشواری سرکاری پالیسی کی مدد و تقویت کی کمی سے پیدا ہوئی تھی۔ زیادہ تر دوسرے زرعی ملکوں میں حکومت نے باضابطہ التوائے قرض (MORATORIUM) اور کاشتکاروں کے ساتھ قرض کو کم و بیش کر کے مدد پہنچائی تھی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ انجمنوں کو قرض کی بھی امداد کی تھی اس سے زیادہ اہمیت اس ریاستی اقدام کو تھی جس کا تعلق زرعی قیمت اور زرعی مارکٹ سے تھا۔ زرعی قیمت کو سہارا دینے کے لئے جو اقدامات کئے گئے ان سے کاشتکاروں کی آمدنی عموماً مستقل ہو گئی جب کہ مارکٹ کی تنظیم کی ترقی کا بالواسطہ طور پر یہی اثر پڑا خاص طور پر حکومت کی امداد نے امداد باہمی کے مارکٹنگ کی وسعت میں اضافہ کر دیا۔ ہندوستان میں حکومت کی طرف سے انجمنوں کو کوئی مدد نہیں دی گئی زرعی آمدنی مستقل کرنے کے لئے کوئی کوشش بھی نہیں کی گئی اور مارکٹ کے سدھار کے سلسلہ میں سرکار نے جو قدم اٹھایا وہ یہ تھا کہ اس نے الگ الگ اشیا کے مارکٹنگ کے کئی ہندوستان گیر سروے کرائے۔ صوبائی خود مختاری کے آنے کے ساتھ بعض صوبوں میں مارکٹ کی باقاعدگی کے لئے اقدامات سوچے گئے یا ان پر قانونی عمل کیا گیا۔ ان میں سے زیادہ تر طریقے برار کاٹن اور گرین مارکٹ قانون (۱۸۹۷) کے انداز پر تھے تمام اہم جنسوں کے لئے باقاعدہ مارکٹ کا سسٹم اس قانون سازی کے بموجب اختیار کیا گیا

جس کی سفارش زراعت سے متعلق روآئل کمیشن نے کی تھی۔ بہرحال دوسری عالمی جنگ کے شروع تک برار سے باہر اگر کوئی موثر توسیع ہوئی تھی تو وہ ۱۹۲۷ء کے بمبئی ایکٹ سے ہوئی تھی جس نے اس صوبہ میں کپاس کے لئے باقاعدہ مارکٹ قائم کیا تھا۔

زراعت سے متعلق روآئل کمیشن نے یہ بتایا تھا کہ ہندوستان میں ہر جگہ متعدد بازار ہیں لیکن ان میں اہمیت اور نوعیت کے اعتبار سے بہت فرق پایا جاتا ہے ایک طرف پنجاب کی بڑی جدید منڈیاں ہیں اور دوسری طرف گاؤں کے چھوٹے چھوٹے بازار ہیں جن کی حیثیت کھلے میدان سے کچھ زیادہ ہے اور جہاں عارضی طور پر بیٹھنے کا انتظام ہوتا برار میں کپاس کے مارکٹ قائم کئے گئے اور قانون کے ذریعہ ان میں باقاعدگی لائی گئی بہار اور اڑیسہ میں مارکٹ انفرادی لوگوں کے تھے جہاں ان کے مالک کرایہ اور چنگی وصول کرتے تھے مارکٹ کی وسعت، جگہ اور وقت، فصل کے اعتبار سے بدلتا رہتا تھا۔ خاص غذائی اجناس کے معاملہ میں کاشتکار اپنے مصرف کے لئے جو ضروری ہوتا تھا اسے رکھ کر بقیہ کو عموماً فروخت کرتا تھا پھر بھی وہ ہمیشہ ایسا نہیں کرسکتا تھا۔ بہت سے علاقوں میں جہاں زیادہ قدیم معیشتیں تھیں یا جہاں قلت کی پرانی صورت حال چلی آرہی تھی وہاں اوسط کاشتکار پر قرض کا بوجھ اتنا ہوتا تھا کہ وہ فصل کٹتے وقت اپنی فصل کا زیادہ حصہ بیچ دیتا تھا اور سال کے آخری حصہ میں گھریلو مصرف کے لئے وہ جنس یا روپیہ کی شکل میں قرض لیتا تھا۔ تجارتی فصل کا حال یہ تھا کہ کٹائی کے بعد ہی پوری فصل فوراً فروخت ہوجاتی تھی۔ اس زمانہ میں جو سروے ہوئے تھے ان سے یہ جدول ہر ایک صوبہ میں زیر کاشت علاقہ کے تناسب کو بھی ظاہر کرتا ہے یعنی وہ صوبے جو ۹۔۱۹۳۸ء میں سرکاری نہروں کے ذریعہ سیراب ہوتے تھے۔ ان سے عجیب انتظام کا حال معلوم ہوتا ہے۔ مدراس کے سروے نے حسب ذیل بیان پیش کیا ہے: "تمام جوار کی فصلیں اور دلہن مقامی طور پر مصرف میں آجاتے ہیں دھان اور دھنیا کے بیج بیوپاریوں کے ہاتھوں اسی مقام پر خرید لئے جاتے ہیں اور ضلع میں وہ استعمال ہوتے ہیں لیکن کپاس اور سنا اسی مقام پر بکتے ہیں۔ یہ دونوں برآمدی فصلیں تھیں۔

سنا کی فصل اور کچھ کپاس بھی کٹائی سے پہلے بیوپاریوں کے ہاتھوں فروخت ہوجاتے تھے[1] زراعت سے متعلق روآئل کمیشن نے کپاس اور جوٹ جیسی خاص برآمدی فصلوں کے

---

[1] سلیٹر، دکن کی بعض بستیاں، ص ۶۷ (۱۹۱۸)

ہے ۔ مثال کے طور پر خاندیش میں جہاں کاشتکار گرچہ اپنی مرضی کے مطابق اپنی پیداوار بڑی حد تک فروخت کر سکتا تھا پھر بھی فروخت کرنے کا سب سے عام طریقہ گاؤں میں یہ تھا کہ آنے والے بیوپاری کے ہاتھوں بیچتا تھا۔ کچھ بڑے بازار تھے جہاں اصلی پیدا کرنے والے اپنے خام کپاس کو بڑی حد تک گاڑی میں ڈھو کر پہنچاتے تھے ۔ بہرحال ان کے حالات بڑے بے قاعدہ تھے اور کاشتکار تاجروں کے رحم وکرم پر رہتا تھا۔ بنگال میں جوٹ کی کاشت میں اور ایک طرف برآمدی مارکٹ اور دوسری طرف جوٹ مل کے درمیان چار ایجنسیاں کام کرتی ہیں۔ زراعت سے متعلق روآئل کمیشن نے مارکٹنگ کے بارے میں صورت حال کا خلاصہ حسب ذیل الفاظ میں پیش کیا تھا:

"ہم سمجھتے ہیں کہ یہ بات مسلّم ہوگئی ہے کہ جب کاشتکار اپنی پیداوار کو مارکٹ میں فروخت کرتا ہے خواہ وہ مارکٹ کتنا ہی محدود اور ناقص ہی کیوں نہ ہو تو اسے بہتر قیمت مل جاتی ہے ہم مال ڈھونے کے خرچ کو بھی اس میں شامل کرلیں لیکن جب وہ اپنے گاؤں میں بیچتا ہے تو اسے قیمت کم ملتی ہے۔ وہ بیچنے پر مجبور ہو سکتا ہے کیونکہ قریب ترین مارکٹ جانے کے مواصلات تشفی بخش نہیں ہوتے یا اس کے پاس مال پہنچانے کے لیے مویشی یا گاؤں نہیں ہوتے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اکثر اس کی مقروضیت ہی خارج ہوتی ہے کہ وہ گاؤں کے بیوپاری کی شرط پر اپنا مال بیچ دے [۱]"

جنگ کے درمیانی دور میں ان حالات میں کوئی عام تغیر نہیں ہوا۔ پنجاب کی نہری نوآبادیات جیسے خاص حالات میں ڈاکٹر ڈارلنگ نے بتایا تھا کہ نوآبادیات کے رہنے والوں میں مقامی بنیا کو دور کرنے کا رجحان پایا جاتا ہے اور وہ خود اپنا غلہ مارکٹ لے جاتے ہیں [۲] اس سے غیر معمولی سازگار معاشی حالات کا پتہ چلتا تھا جو شاذ و نادر ہی ملتے تھے اور جو تیسری دہائی کے اوائل میں سرد بازاری کے دوران قائم نہیں رہ سکتے تھے۔ مستقبل میں تغیر کے صرف دوسرے اسباب میں وہ قانونسازی آتی تھی جس کا مقصد باقاعدہ مارکٹ قائم کرنا تھا اور جو امداد باہمی کی انجمن برائے فروخت کو پھیلانا چاہتی تھی جس کی سب سے قابل ذکر مثال میں ۱۹۲۹ء کے قبل بمبئی پریسیڈنسی میں کپاس بیچنے والی سوسائٹیاں آتی ہیں ۔

---

[۱] رپورٹ، ص ۳۸۸

[۲] ایم۔ ایل۔ ڈارلنگ، پنجاب کے کسان، خوشحالی اور قرض میں، ص ۱۸۴ (۱۹۲۵ء)

ہندوستانی کاشت کاری معیشت میں مویشی کا بڑا اہم مقام ہے۔ زرعی کمیشن نے مویشی پالنے کے مسئلہ پر اپنی رپورٹ میں مفصل طور پر بحث کی ہے۔ ہندوستان میں مویشی کی صورت حال سے متعلق کمیشن کا تجزیہ مختصر طور پر حسب ذیل الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے۔

بڑھتی ہوئی آبادی کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے ماضی کے بہترین چراگاہ قابل کاشت علاقوں میں بدل دیئے جانے سے مویشی کے معیار کو قائم رکھنے کا مسئلہ بڑا سنگین ہو گیا تھا۔ اس کے نتیجہ میں معیار میں بڑی گراوٹ آگئی تھی جس سے برائی کا چکر پھیل گیا تھا۔ کسی ضلع میں مویشی کی تعداد اور بڑھتی ہے۔ گائیں کم دودھ دینے لگتی ہیں اور ان کے بچھڑوں کا قد کم ہوتا جاتا ہے اور کاشتکاروں کی ضرورتیں پوری نہیں ہوتیں گرچہ وہ اچھے اور کام کے بیل حاصل کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ مویشیوں کی نسل بڑھاتے رہتے ہیں۔ جیسے تعداد بڑھتی ہے یا کاشت بڑھ کر بہتر چراگاہوں کو ختم کر دیتی ہے تو غذا کی سپلائی پر دباؤ بڑھ جانے سے گایوں کی حالت اور زیادہ خراب ہو جاتی ہے اور ایک ایسا مرحلہ آجاتا ہے کہ کاشت کاری میں مدد پہنچانے کے لئے دوسرے صوبوں سے بیل یا بھینسا منگانا پڑتا ہے۔ بنگال میں ایسا مرحلہ آپہنچا ہے۔

کاشت کی توسیع سے دستیاب چراگاہ صرف کم نہیں ہوتی ہے بلکہ جوتنے کے لئے ضروری بیلوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہ مسئلہ سنگین ہے۔ اس کا حل یہ ہے کہ ہم چارہ کی سپلائی کو بڑھائیں اور مقامی نسل میں انتخاب کریں اور ان کو فروغ دیں۔ غذائی مسئلہ حل کر سکتے ہیں اگر ہم خشک چارہ جمع کرلیں، چارہ کا بہتر مصرف لیں اور چارہ کی نئی فصلیں لگائیں ہندوستان کے قدیم خانہ بدوش کے ناپید ہونے کے وقت سے جو مویشیوں کی نسل کی افزائش کرتے تھے کوئی اچھی نسل افزائش کا کام نہیں ہوتا ہے اور اب مقامی نسل کی خوبی کو سدھارنے اور برقرار رکھنے کا کام، پرائیویٹ طور پر افزائش نسل کی غیر موجودگی میں سرکاری مویشی فارم پر عائد ہو جاتا ہے انحطاط اتنا عام ہے اور اس کی برائیاں اتنی ہمہ گیر ہیں اور عام اقتصادی صورت حال سے اس طرح سنگین ہو گئی ہیں کہ محض انحطاط کا عمل روکنے میں بھی کافی وقت لگے گا۔

۱۹۳۹ء تک کوئی موثر اقدام نہیں اٹھایا گیا تاکہ چارہ اور مویشی سے متعلق جس نازک صورتحال کی نشاندہی زرعی کمیشن نے کی تھی اس کا مقابلہ کیا جائے یا مقابلہ کی تیاری ہو۔

مونٹفورڈ اصلاحات کے آجانے کی وجہ سے آبپاشی کے کاموں کی منصوبہ بندی اور انتظامیہ میں بڑی اہم تبدیلی ہوئی آبپاشی اب منصوبوں کے تحت منتقل ہو گئی۔ تبادلہ کے وقت آبپاشی کے

کاموں میں درجہ بندی ہوگئی تھی اب سے تمام کام خواہ وہ بڑا ہو یا چھوٹا اور جس کے لئے سرمایہ اور لگان کا حساب رکھا جاتا ہو وہ صرف دو درجوں میں منقسم ہوتے تھے۔ (۱) پیداواری (ب) غیر پیداواری آخرالذکر قدیم اصطلاح "حفاظت پذیر" سے زیادہ غیر مذکورہ (NON-COMMITTAL) تھی۔

آبپاشی کمیشن (۱۹۰۲) کی سفارشات پر شروع کئے گئے بہت سے پروجیکٹ جنگ کے دوران یا اس کے جلد ہی مکمل ہو گئے۔ مزید بڑی اسکیمیں بھی شروع ہوئیں۔ جنگ سے قبل جو کام زیر تعمیر تھے ان میں پنجاب کے سہ نہری (TRIPLE CANALS) پروجیکٹ سب سے بڑا تھا یہ بہت بڑا پروجیکٹ تھا جس میں نہروں کے تین منضبط سلسلے تھے ان میں اوپری چناب نہر ۱۹۱۲ء میں لوور باری دوآب نہر ۱۹۱۳ء میں اور جہلم نہر ۱۹۱۵ء میں جاری کی گئی باوجودیکہ اس کے مختلف حصے پہلے مکمل ہو گئے مگر ۱۹۱۷ء سے پہلے سارا پروجیکٹ پورے طور پر مکمل نہیں ہو سکا غیر پیداواری تعمیرات میں سب سے اہم بمبئی دکن کے گرنا، گوداوری، پورنا اور نیرا کے کام تھے۔ ان میں سے پہلے دو کی تکمیل جنگ کے دوران یا اس کے جلد ہی بعد ہوئی۔ آخرالذکر دو کی تکمیل دوسری دہائی کے وسط میں ہوئی۔

جنگ کے خاتمہ پر یا اس کے بعد جلد ہی بہت سے اہم اور بڑے آبپاشی کے کام شروع ہوئے۔ ان میں سب سے اہم سندھ کا سکر بیراج پروجیکٹ تھا جس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ "یہ آبپاشی کا سب سے بڑا کام ہے جو اب تک ہوا ہے۔"[1] ستلج گائی پروجیکٹ سے توقع تھی کہ پنجاب کے دکھنی ضلعوں اور بیکانیر اور بھاولپور کے آس پاس کی ریاستوں میں زیر کاشت علاقہ کو بڑے پیمانہ پر محفوظ رکھیں گے اور اس کی توسیع کریں گے۔ اس کے علاوہ کاویری وائر نیا سکیم تھی جب کی ایک خاص بات یہ تھی کہ منیور میں کاویری پر باندھ ہو۔ کاویری منیور پروجیکٹ، کاویری ڈیلٹا میں موجودہ آب پاشی کے سسٹم کے گھٹتے بڑھتے پانی کی سپلائی کو بہتر کرنے اور نئے علاقوں میں آب پاشی کا کام بڑے پیمانے پر بڑھانے کے لئے روبہ عمل آیا تھا۔ صوبہ متحدہ میں دوسری اہم اسکیم سارد انہرں کی اسکیم تھی اس کا مقصد اودھ اور روہیل کھنڈ کے بڑے حصوں میں آبپاشی کی سہولتیں بہم پہنچانا تھا۔ یہ تمام کام ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۵ء کے درمیان مکمل ہو گئے۔

دوسری جنگ عظیم سے چوتھائی صدی پہلے ہندوستان میں سرکاری نہروں کے ذریعہ آبپاشی کے علاقہ میں کافی اضافہ ہوا حسب ذیل جدول سے تقابلی اعداد و شمار (ہزار ایکڑ میں) کا علم ہوگا جو اس دور کے آغاز اور انجام کے برسوں سے متعلق ہیں۔

---

[1] آبپاشی کا سہ برسہ جائزہ، ۲۱-۱۹۲۰ء ص

	۱۹۱۴ - ۱۵ سے ۱۹۱۶ - ۱۷ تک	۱۹۳۸ - ۹ء	۱۹۳۸ - ۹ء میں کل زیر کاشت علاقہ میں سرکار کے ذریعہ سیراب علاقہ کی فیصد شرح
برٹش انڈیا (برما چھوڑ کر)	۲۴,۲۸۶	۳۱,۶۴۸	۱۵.۴۵
جس میں برما	۷,۲۷۹	۷,۳۹۶	۲۰.۲۹
سندھ	۳,۶۵۱	۴,۶۹۳	۸۶.۴۸
صوبہ متحدہ	۳,۱۴۱	۴۶۶۹	۱۴.۹۶
پنجاب	۸,۵۱۰	۱۲,۱۹۶	۴۲.۸۲

مخصوص صوبہ سے متعلق دیئے گئے اعداد و شمار سے یہ معلوم ہوگا کہ برٹش انڈیا دبرما کو چھوڑ کر) کے کل سیراب شدہ علاقہ کا ۹۰ فیصد سے زیادہ حصّہ دونوں عرصہ میں چار صوبوں میں مرکوز تھا۔ ان میں سے تین یعنی پنجاب، سندھ اور صوبہ متحدہ میں سینچائی کی توسیع ہوئی چوتھے صوبہ مدراس میں بڑا کام مکمل ہوگیا، کاویری میتور پروجیکٹ نے اگلی آبپاشی کی صلاحیت کو بڑھادیا لیکن ۱۹۳۹ء تک آبپاشی کے زیر علاقہ کو زیادہ وسیع نہیں کیا۔ یہ جدول ہر ایک صوبے میں زیر کاشت علاقہ کے تناسب کو بھی ظاہر کرتا ہے یعنی وہ صوبے جو ۱۹۳۸ .۳۹ء میں سرکاری نہروں کے ذریعے سیراب کی گئی تھی۔

سرکاری نہروں کے ذریعہ سیراب ہونے والے علاقہ کا زیادہ حصّہ بڑی نہروں سے سیراب ہوتا تھا چھوٹے پیمانے کے معمولی اور محدود اہمیت کے حامل کام سرکاری منصوبوں میں کوئی نہیں رکھتے تھے ۔ زرعی کمیشن نے یہ خیال کیا کہ "ماضی میں چھوٹے کام وہ اہمیت حاصل نہیں کی جو وہ سرکار سے توقع کرتے تھے" اور یہ بھی بتایا کہ انہیں فروغ دینے کے لئے بہت کچھ کیا جاسکتا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بھی یاد رہے کہ تیسری دہائی کے دوران صوبہ متحدہ میں سرکار نے نل کے کنواں تعمیر کرنے کے پروگرام سے تجربہ شروع کیا۔

نجی کوششوں کے ذریعہ کنواں سینچائی کا سب سے اہم وسیلہ ہوسکتا ہے اور جسے ترقی دی جاسکتی ہے زرعی کمیشن نے پتہ لگایا کہ ہندوستان میں کنواں سے سیراب ہونے والے علاقہ میں اضافہ بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی میں نہیں ہوا ہے۔ اس کی کچھ تاویل اس طرح ہوتی ہے کہ جہاں نہریں تعمیر ہوئیں وہاں کنواں کے ذریعہ سینچائی ہونے والے علاقہ

میں کمی واقع ہوگئی۔ اس کا پورا لحاظ رکھنے کے بعد بھی زرعی کمیشن نے بتایا کہ معمولی کنواں کھودنے میں کوئی اضافہ نہیں ہوا ہے یہ مایوس کن بھی ہے اور تحقیق طلب بھی۔ کمیشن نے بہت سے علاقوں میں غیر استعمال شدہ کنواں کے بڑے تناسب کی طرف بھی خاص طور پر توجہ دلائی۔ زرعی کمیشن کے مطابق ۳-۱۹۰۲ میں برٹش انڈیا میں کنواں سے سیراب ہونے والا علاقہ ایک کروڑ ۱۶ لاکھ ایکڑ تھا ۶۰-۱۹۲۵ء میں یہ ایک کرڑوڑ ۱۷ لاکھ ایکڑ تھا۔ درمیانی دور میں بڑا اتار چڑھاؤ ہوتا تھا اور بہت ہی شدید خشک سالی کے زمانہ میں علاقہ ایک کروڑ ۴۰ لاکھ ایکڑ تھا۔ برٹش انڈیا میں کنواں کے ذریعہ سیراب ہونے والا اوسط علاقہ پانچ برسوں میں ۹-۱۹۲۸ء کے ختم ہونے پر ایک کرڑوڑ ہونے پر ایک کرڑوڑ ۲۳ لاکھ تھا۔ زیادہ تر علاقے تین صوبوں یعنی صوبہ متحدہ، پنجاب اور مدراس میں مرکوز تھے۔ ۹-۱۹۲۸ء میں برٹش انڈیا میں کنواں کے ذریعہ سیراب ہونے والا علاقہ ایک کروڑ ۳۲ لاکھ پچاس ہزار ایکڑ تھا جس میں پچپن لاکھ پچاس ہزار ایکڑ صوبہ متحدہ میں، ۴۷ لاکھ ۵۰ ہزار ایکڑ پنجاب میں اور ۱۳ لاکھ ۹۰ ہزار ایکڑ مدراس میں تھے۔

سولھواں باب

صنعتی ترقی

۱۹۱۴ - ۳۹ء

جنگ شروع ہونے کے فوراً بعد ہی بہت سی صنعتوں میں جیسے کپاس، کوئلہ، مینگنیز وغیرہ کی خوشحالی میں رکاوٹ آگئی حالانکہ دوسری صورتوں میں جیسے چائے کا یہ حال نہ تھا۔ یہ رکاوٹ عارضی تھی اور قیمتوں کے عمومی اضافہ سے صنعتوں میں منافع تیزی سے بڑھنے لگا۔ خاص طور پر برآمد کے لیے چلنے والی صنعتیں، جہازوں کی بار برداری کی گنجائش اور بعض صورتوں میں ریلوے ڈبوں کی کمی سے مسلسل دشواریوں کی زد میں آگئیں۔ صنعتی اشیاء یا معدنیات سے زیادہ زرعی پیداوار نے مال برداری کی کمی شدید طور پر محسوس کی اور آخر الذکر جماعت کی پوزیشن کو جنگ کے زمانہ میں زبردست اندرونی مانگ نے خاص طور پر محفوظ رکھا۔ جیسا کہ دوسرے تمام فریق ملکوں کا حال تھا اقتصادی سرگرمیوں پر سرکاری کنٹرول جنگ کے دور کی دوسری اہم خصوصیت تھی۔ اس نے مختلف صنعتوں کو مختلف طریقوں سے متاثر کیا۔ بعض مصنوعات کی برآمد بالکل ممنوع تھی اور متعین قیمت پر سرکار کافی خریدتی تھی۔ کوئلہ کے معاملہ میں روک تھام ہونے اور سرکاری خریداری سے یہ ضروری ہوگیا کہ کوئلہ نقل و حمل کرنے والے آفیسر COAL TRANSPORT OFFICER کے ذریعہ مختلف صنعتوں کو کوئلہ کی سپلائی اور تقسیم پر کنٹرول لگا دیا جائے۔ جوٹ، مینگنیز، ابرک اور چائے جیسی بہت سی دوسری صنعتوں میں سرکار کی کافی خریداری سے ان صنعتوں کی خوشحالی میں اضافہ ہوا۔ زرعی اشیاء کے پیدا کرنے والے کے لیے جنگ کے معنی پرانے برآمدی مارکٹ کے ختم ہونے کے تھے جب کہ صنعت گر کے لیے جیسے کپاس اور کوئلہ میں جنگ کی وجہ سے خارجی مقابلہ ہوگیا یا جوٹ، مینگنیز اور دوسری معدنیات کے لیے جو لڑائی کے سامان کے لیے تھیں، مخصوص مانگ پیدا ہوگئی۔ صنعتی سامان کی قیمتیں مجموعی اعتبار سے بڑھ گئیں جب کہ

خام اشیاء کی قیمت میں اضافہ کم ہوا اور جنگ کے دوران اُجرت اگر بڑھی تو برائے نام۔ اس کے علاوہ مشینری اور دوسرے سامان کی درآمدی دشواریوں سے موجودہ صنعت گروں کی پوزیشن مضبوط ہوگئی اور تمام صنعتوں میں صنعت گروں نے خصوصاً جنگ کے آخری دور میں زبردست منافع حاصل کیا۔ جنگ ختم ہونے پر ہر طرح کی اشیاء کی مانگ میں فوری اضافہ ہوا۔ قیمتوں میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا اور ۱۹۱۸ء ختم ہوتے ہی غیر معمولی صنعتی خوشحالی کا مختصر دور شروع ہوگیا۔ مگر اس کا ردِ عمل فوراً ہی ہوا اور ۱۹۲۱ء کا سال شدید تجارتی سرد بازاری کا سال تھا۔ اس سال کے دوران تجارتی عمل میں انحطاط اتنا واضح تھا کہ ریلوے نے بھی اس کے اثرات اپنے منافع میں محسوس کیے۔ زیادہ تر صنعتوں میں ۱۹۲۰ء کے وسط تک ردِ عمل شروع ہوا لیکن کپاس کی صنعت میں ۱۹۲۲ء تک اس کا احساس نہیں ہوا۔

مبادلہ کے اتار چڑھاؤ نے پورے اس دور کے معاشی واقعات میں اہم حصہ لیا۔ ۱۹۱۷ء تک کی حکومت نے سونے کے معیار مبادلہ اور ۱ شلنگ ۴ پنس کے قدیم تناسب کو برقرار رکھنا ممکن سمجھا۔ چاندی کی قیمت میں اضافہ ہونے کی وجہ سے روپیہ کی فلزی قدر ۱ شلنگ ۴ پنس سے بڑھ گئی اور اگست ۱۹۱۷ء میں سرکار نے اس سطح پر مبادلہ کو برقرار رکھنے کی کوشش چھوڑ دی۔ اب سے روپیہ کے مبادلہ میں اتار چڑھاؤ چاندی کی قیمت کے فرق پر زیادہ منحصر تھا اور ۱۹۱۷ء سے ۱۹۲۰ء تک مبادلہ مستقل طور سے بڑھتا رہا پھر بھی ہندوستان کی بیرونی تجارت پر اس سے فوری طور پر برا اثر نہیں پڑا۔ ہندوستان کی اہم پیداوار کی قیمتیں جو جنگ کے دوران ٹھہری رہی تھیں ۱۹۱۹ء تک بہت زیادہ بڑھ گئیں۔ ۱۹-۱۹۱۸ء کا قحط افراطِ زر اور عظیم الشان تجارتی سرگرمی ان تمام باتوں سے اس اضافہ میں مدد ملی۔ مبادلہ جو اگست ۱۹۱۷ء میں ۱ شلنگ ۵ پنس تک پہنچ گیا تھا۔ وہ اپریل ۱۹۱۸ء میں ۱ شلنگ ۶ پنس تک آگیا اس کے باوجود ۱۹-۱۹۱۸ء کا سال سازگار توازنِ تجارت کا سال رہا۔ اور ہندوستان کی اونچی قیمتوں اور ناموافق شرح مبادلہ کے باوجود ۲۰-۱۹۱۹ء میں برآمدات بہت اونچی سطح پر پہنچ گئیں۔ یہ خاص طور پر مختلف صنعتوں کی خام اشیا جیسے چرم و چرسہ، کچا جوٹ، تلہن، رنگنے اور چرم سازی کی چیزیں، لاکھ وغیرہ کا حال تھا۔ جوٹ کی مصنوعات کی بھی کافی برآمد ہوئی اور چاندی کی قیمت بڑھ جانے کی وجہ سے چین کا سوت مارکٹ چڑھا رہا اس کے مطابق درآمد نہیں بڑھی چونکہ مصنوعات اور دوسری اشیا فوری طور پر حاصل کرنے میں دشواری تھی جن پر ہندوستان کی درآمد کا بیشتر حصہ مشتمل تھا۔ ۱۹۲۰-۱۹۱۹ء کا سال پوری دنیا میں عظیم

تجارتی سرگرمیوں کا سال تھا اور مال کی امید آفرینی، جنگ کے دوران کا منافع قائم رہنے کی امید، قیمتوں کی بڑھتی ہوئی سطح، اچانک بڑھ جانے والی مانگ کی توقع جو جنگ کے دوران پوری نہ ہوسکی ان تمام باتوں سے ہندستانی صنعت گروں کو اپنی پیداوار بڑھانے اور کافی توسیع کا منصوبہ بنانے کے لیے اکسایا۔ نئی کمپنیاں وجود میں آئیں اور باہری ممالک بالخصوص برطانیہ کو مشینری اور دوسرے سامانوں کے لیے آرڈر پیش کیے گئے۔ یہ آرڈر تمام دنیا سے پیش کیے جا رہے تھے اس لیے برطانیہ جیسے ممالک اس غیر معمولی مانگ کو فوراً پوری کرنے سے قاصر تھے۔ سامان کی ڈلیوری کے نہ ملنے کے معنی تھے کہ آرڈر کی اصلی نقل ہوتی تھی اور آرڈر پیش کرنے میں کافی سٹہ بازی ہوتی تھی۔

ہندستان کے معاملہ میں صورت حال اس امر سے اور نازک ہوگئی تھی کہ مبادلہ کی مستقل بڑھتی ہوئی شرح نے درآمد کو مزید تقویت دی تھی مئی ۱۹۱۹ء میں مبادلہ بڑھ کر ا۔ شلنگ ۸ پنس ہوگیا اور پھر ستمبر ۱۹۱۹ء میں ۲۔ شلنگ ہو کر رہ گیا اور اپریل ۱۹۲۰ء میں اپنے انتہائی نقطہ ۲۔ شلنگ ۴۔ پنس تک پہونچ گیا اور اونچے مبادلہ سے درآمد کرنے والوں کو حوصلہ افزائی ہوئی اور وہ یہ توقع کرنے پر مائل ہو گئے کہ مبادلہ کی یہ اونچی شرح جاری رہے گی کیوں کہ فروری ۱۹۲۰ء میں سرکار نے بنگٹن اسمتھ کمیٹی کے روپیہ کا مبادلہ ۲ شلنگ پر ٹھہرانے کی سفارش کو منظور کیا تھا۔ ۲۰-۱۹۱۹ء کے دوران ڈلیوری فوری طور پر نہ ملنے کی وجہ سے درآمد کی قیمت نیچی رہی اور یہ مالیاتی سال ہندوستان کی موافقت میں ادائیگی کے توازن کا سال رہا۔ لیکن اپریل ۱۹۲۰ء تک یہ گرم بازاری ساری دنیا میں ختم ہو رہی تھی۔

۲۰-۱۹۱۹ء کی گرم بازاری قیمت کی گرم بازاری تھی اور اس توقع پر مبنی تھا کہ دنیا کے تمام ملکوں سے مانگ تیزی سے بحال ہو جائے گی اور جنگ کے زمانہ کا منافع قائم رہے گا اس میں شدت سرکار کی افراط زر کی پالیسی سے آگئی اور اس امر سے بھی کہ ۱۹۱۹ء میں دنیا کی پیداواری صلاحیت جنگ سے کافی کم ہوگئی ہے۔ چونکہ یہ تمام توقعات پوری نہیں ہوئیں اس لیے طوفانی شدت تمام ملکوں میں کم ہونے لگی جس کا آغاز جاپان سے ۱۹۱۹ء میں ہوا۔ قیمتوں کے بڑھ جانے سے اجرت اور دوسرے خرچ میں تیزی سے اضافہ ہوا اور یورپ کا بر اعظم خام اشیاء کی تمام مقدار کو مصرف میں لانے سے قاصر تھا چونکہ ان کی صنعتیں اب تک بحال نہیں ہوئی تھیں۔ ۱۹۲۰ء کے شروع کے مہینوں میں انگلینڈ کی وزارت خزانہ کے اقدام نے قیمتوں کو بڑھنے سے روک دیا۔ اس طرح خوشحالی کا مختصر دور ختم ہوگیا ہندوستان میں مبادلہ کی پریشانیوں نے پوزیشن کو اور خراب کر دیا جس

طرح اس نے پچھلے سال گرم بازاری کو تیز تر کر دیا تھا۔ مبادلہ کی شرح میں اضافہ خاص طور پر چاندی کے دام بڑھ جانے سے ہوا تھا۔ فروری ۱۹۲۰ء میں یہ اپنی انتہا کو پہنچ گئی اس کے بعد یہ کم ہونے لگی۔ اس نے قدرتی طور پر مبادلہ پر اثر ڈالا اور اپریل ۱۹۲۰ء سے روپیہ کی قدر مبادلہ میں تیزی سے کمی شروع ہوئی۔ دسمبر ۱۹۲۰ء تک شرح ا شلنگ ۶ پنس تک آگئی اور مئی ۱۹۲۱ء تک وہ اتر کر ا۔ شلنگ ۳ پنس ہوگئی جو کمی کا ایک ریکارڈ تھا۔ ہندوستان کے پرانے یورپین خریداروں میں یہ صلاحیت نہ تھی کہ وہ اس کی پیداوار کی کسی بھی بڑی مقدار کو خرید لیں اس کے ساتھ ہی ساتھ پچھلے سال کی اونچی شرح کے اثرات اور ۲۱-۱۹۲۰ء کے ناموافق زرعی حالات تھے۔ یہ تمام باتیں برآمدات کو نیچی سطح پر لے آئیں جب کہ پچھلے سال میں جو آرڈر پیش کیے گئے تھے وہ حاصل ہو رہے تھے۔ اس طرح ۲۱-۱۹۲۰ میں لوہے کے سامان (HARDWARE) اوزار اور سامان، مشینری اور مل کے کام کی چیزیں، دھات موٹر، سائیکل ریلوے پلانٹ اور ریلوے کا پہیہ دار سامان جیسی اشیاء کی درآمدات، ریکارڈ بلندیوں تک پہنچ گئیں اور ۲۲-۱۹۲۱ء میں بھی اونچی سطح پر جاری رہیں۔ یہ درآمدات ان آرڈرس کا نتیجہ تھیں جو گرم بازاری کے زمانہ میں پیش کیے گئے تھے اور اس کا اثر یہ ہوا کہ صنعتوں کی پیداواری صلاحیت میں مزید اضافہ ہوا جب کہ مانگ گر رہی تھی۔ دوسری درآمدات میں کپاس کے پارچوں کی اعداد ۲۱-۱۹۲۰ء سال کے لئے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ سوتی کپڑوں کی اوسط درآمدات خصوصاً لنکاشائر سے جنگ کے دوران اس حد تک گھٹ گئیں جو جنگ سے پہلے کی سطح سے بہت کم تھیں اس لئے مانگ جنگ کے اختتام پر قائم تھی اور درآمد کرنے والوں نے اونچی شرح مبادلہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بہت ہی بھاری آرڈر باہر بھیجے۔ یہ قیمتی سامان ۱۹۲۰ء میں بڑی مقدار میں پہنچنے لگے جن کا آرڈر گرم بازاری کے زیر اثر اور سازگار مبادلہ کی توقع میں پیش کیا گیا تھا مبادلہ نیچے کی طرف آنے لگا، خوشحالی ختم ہوگئی اور درآمد کرنے والوں نے اپنے آپ کو سنگین ترین مشکلات میں پایا۔ یہ دشواریاں دسمبر ۱۹۲۰ء تک اپنے منتہا کو پہنچ گئیں جب بمبئی کی جماعت NATIVEPRICE GOOD ASSOCIATION نے فیصلہ کیا کہ درآمد کرنے والا کوئی معاہدہ روپیہ کی ۲ شلنگ کی شرح سے کم پر طے نہ کرے بمبئی کے تاجروں کی مثال دہلی، امرتسر اور دوسرے مراکز کے کپڑے درآمد کرنے والوں نے جلد ہی اختیار کی۔ اس اقدام سے ہندوستان کے زیادہ تر تجارتی مرکزوں میں "عدم اعتماد" کا جذبہ اور گہرا ہوگیا۔

ہندوستان گیر اہمیت رکھنے والی صنعتی تحریکوں میں امید کی ایک کرن نظر آرہی تھی جو ۱۹۰۷ء

میں ہندوستانی صنعت پر حاوی تھی اور جو بڑی حد تک سودیشی تحریک کا نتیجہ تھی۔ ہندوستان میں بہت سی صنعتیں شروع کرنے اور تجارت اور صنعت کو سرمایہ بہم پہنچانے کی بہت سی اسکیمیں عمل میں آئیں۔ اس زمانہ میں جو بینک قائم ہوئے ان کی عمومی ناکامی خصوصاً پنجاب اور بمبئی پریسیڈنسی میں ۱۹۱۳ء سال کی نمایاں خصوصیت تھی۔ ان ناکامیوں کے ظاہری اثرات بہرحال زیادہ تر عارضی تھے اور اس کا ملک کی صنعتوں پر مستقل اثر نہیں ہوا۔ متفرق مصنوعات جو ۱۹۰۷ء میں اور اس کے بعد شروع ہوئیں، وہ زیادہ تر پہلے ہی ناکام ہو گئیں۔

جنگ نے نئے حالات پیدا کر دیئے تھے جو ہندوستانی صنعتوں کی ترقی کے لئے عموماً سازگار رہے۔ اور جنگ کے اختتام پر ہر چیز گویا، پوری گرم بازاری (BOOM) کے لئے تیار تھی۔ اس گرم بازاری کی وسعت بالکل بے مثال تھی۔ کمپنی کی ابتدا کے اعداد و شمار سے اس کا پتہ چلتا ہے۔ ۲۰-۱۹۱۹ میں ہندوستان میں ۹۰۵ نئی کمپنیاں رجسٹرڈ ہوئیں جن کا کل منظور شدہ سرمایہ تقریباً ۲۷۵ کروڑ روپیہ کا تھا۔ اسی طرح ۲۱-۱۹۲۰ میں ۹۶۵ کمپنیاں رجسٹرڈ ہوئیں جن کا کل منظور شدہ سرمایہ تقریباً ۱۴۶ کروڑ روپیہ کا تھا۔ ہندوستان میں ۱۴-۱۹۱۳ء میں کل رجسٹرڈ کمپنیاں ۲۶۸۱ تھیں جن کا ادا کیا ہوا سرمایہ تقریباً ۷۶ کروڑ روپیہ تھا، ۱۹-۱۹۱۸ء میں اس کی تعداد ۲۷۱۳ تھی اور اس کا ادا کیا ہوا سرمایہ تقریباً ۱۰۶ کروڑ روپیہ کا تھا اور ۲۲-۱۹۲۱ء میں تعداد ۴۸۰۸ تھی اور ادا کیا ہوا سرمایہ ۲۲۳ کروڑ روپیہ کا تھا۔[1] جنگ کے دوران معدودے چند کمپنیاں جاری ہوئیں لیکن موجودہ کمپنیوں کے سرمایہ میں کافی اضافہ ہوا۔ جنگ کے بعد تین برسوں کے دوران کمپنیوں کی تعداد ۷۵ فیصد بڑھ گئی اور ادا کیا ہوا سرمایہ دُگنے سے زیادہ ہو گیا۔ دراصل یہ زیادہ تر ترقی ایک صحت مند مشترک سرمایہ کی مہم نہ تھی اور آنے والے برسوں میں ان میں سے زیادہ تر ختم ہو گئیں۔ لیکن ابھی غیر معمولی رجائیت کی وجہ سے حصے آسانی سے لے لئے جاتے تھے۔ کمپنیاں دھوکہ اور غیر محتاط طریقہ سے زیادہ جاری ہوئی تھیں۔ صنعتی ضمانت بالخصوص جوٹ اور کپاس کی ملوں اور مینگنیز اور سیمنٹ کمپنیوں کی قدر غیر معمولی طور پر بڑھ گئی۔ سرمایہ لگانے والوں کے ذہن کا پتہ حسب ذیل اقتباس سے صاف طور پر ہوتا ہے "ٹاٹا بینک کے حصے ۹۰ روپیہ کی پریمیم پر تھے جب کہ صرف ۱۵ روپیہ ادا کیا گیا تھا اور کوئی محفوظ فنڈ (RESERVE FUND) بھی نہ تھا۔ مل چالو کرنے کے لئے مشینری کھڑی ہونے سے پہلے ہی ۱۰۰ روپیہ کی عرفی قدر

---

[1] ان اعداد کا تعلق صرف برطانوی ہندوستان سے ہے۔

کے ٹاٹا تیل مل کا نرخ ۵۷۵ روپیہ پریمیم تھا۔[1] اس سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ ٹاٹا کمپنی میں سرمایہ لگانے والوں کو غیر معمولی اعتماد تھا بہت سی صورتوں میں پوشیدہ طور پر چالبازی ہوئی تھی جس سے مجبور ہوکر (NATIVE SHARE ASSOCIATION) نے اپنی شہادت میں اعلان کیا: یہ بڑی آرزو ہے کہ کمپنیوں کے ڈائرکٹر اور ایجنٹ ان کمپنیوں کے حصوں میں سٹہ بازی سے بے حد محتاط طور پر گریز کریں، جن کمپنیوں کا انتظام ان کے سپرد ہے۔"[2] اپریل ۱۹۲۰ء میں ہندوستان میں گرم بازاری عام طور سے اپنے نقطہ عروج پر تھی۔ یہ پھر ختم ہوگیا اور پھر زیادہ تر صنعتوں میں سرد بازاری کا زمانہ آیا اور تجارت کے لئے عموماً "عدم اعتماد" کا طویل دور شروع ہوا۔

ایک خاص حد تک سرکار کی طلائی پالیسی سرد بازاری کے جنگ کے مابعد دور کو طول دینے کی ذمہ دار تھی روپیہ، جو دسمبر ۱۹۲۰ء میں جنگ کے قبل کی سطح سے نیچے آگیا تھا وہ ۱۹۲۱ء کے اوائل سے ۱۹۲۳ء کے اوائل تک نیچی سطح پر قائم رہا۔ تب یہ آہستہ آہستہ اٹھنے لگا اور ستمبر ۱۹۲۴ء میں ۱ شلنگ ۶ پنس داسٹرلنگ تک پہنچ گیا جو تقریباً ۱ شلنگ ۴ پنس کے مونا کے برابر تھا اور یہ جنگ کے قبل کے برابر تھا۔ اسٹرلنگ کے متوازی، بلندی کی طرف کا رجحان قائم رہا اور اس طرح ستمبر ۱۹۲۴ء اور اپریل ۱۹۲۵ء کے مہینوں کے درمیان ۱ شلنگ ۶ پنس کا تناسب گرچہ برائے نام قائم رکھا گیا پھر بھی آخر الذکر تاریخ تک مبادلہ کی شرح بڑھ کر ۱ شلنگ ۶ پنس کے سونا کے برابر ہوگئی جب برطانیہ میں طلائی معیار آگیا۔ اس طلائی پالیسی کے اثرات ان تمام اور آنے والے برسوں میں واضح تھے اور تقریباً ہر صنعت یا ٹیرف بورڈ نے تقریباً ہر صنعتی جانچ پڑتال میں اونچے مبادلہ کے اثرات کی شکایت کی۔ سرکار سے مبادلہ کو جنگ کے قبل کی شرح سے بلند تر برابری پر قائم رکھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ کے بعد کی سرد بازاری کا دور اور طویل ہوگیا۔

ہندوستان کی کپاس کی صنعت نے بیسویں صدی کے شروع کے سالوں میں ترقی کی تھی اور اس نے جنگ کے زمانہ میں اپنی پیش رفت جاری رکھی۔ جنگ کے موقع پر اس صنعت کا حال اچھا نہ تھا کیونکہ یہ ۱۹۱۳ء کے بینک کی ناکامی کی دہشت سے ابھی سنبھل ہی رہی تھی۔ اور جنگ کے شروع کے سال کی کتائی اور بنائی دونوں شعبوں کے لئے ناموافق تھے پھر بھی کپاس کی صنعت

---

[1] بمبئی کے اسٹاک ایکسچینج کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ، ضمیمہ ۵ (۱۹۲۴)

[2] ایضاً

۱۹۱۶ء کے آغاز تک اچھی خاصی خوشحالی تھی لنکاشائر کی صنعت کا حال خراب تھا چونکہ کرایہ کافی اونچا تھا اور ہندوستان میں درآمدات پر ٹیکس بہت زیادہ تھا۔ گھریلو مارکٹ میں ہندوستانی صنعت نے اچھی مانگ، اونچی قیمت اور کم بیرونی مقابلہ کے حالات دیکھے یہی حال قرب وجوار کے ممالک ایران، میسوپٹامیہ، مشرقی افریقہ وغیرہ میں تھا جہاں ہندوستانی صنعت گروں نے اپنے بازار پھیلتے ہوئے دیکھا تھا کچھ دشواریاں بھی تھیں جیسے سامان اور رنگ وغیرہ کی اونچی قیمت، اور کوئلہ حاصل کرنے کی دشواری، لیکن اجرت میں اضافہ کا کوئی رجحان نہ تھا اور مجموعی اعتبار سے لاگت، سوت اور خوردہ اشیا کی قیمت کی سطح سے نیچے رہی جس طرح دوسری صنعتوں کا حال تھا، مشینری وغیرہ حاصل کرنے کی دشواریوں سے پیداواری یونٹ میں کوئی بڑا اضافہ نہ ہوسکا۔ اسپنڈل کی تعداد میں کچھ بھی اضافہ نہیں ہوا، جب کہ کرگھ کی تعداد ۱۹۱۴ء اور ۱۹۲۰ء کے درمیان تقریباً ۱۵ فیصد بڑھ گئی۔ جنگ کے قبل ہندوستانی سوت کی برآمد پہلے سے ہی ٹھہری ہوئی تھی اور جنگ کے دوران نقل حمل کی دشواریوں اور جاپان کے مقابلہ اور ہندوستان کے خاص مارکٹ، چین میں نئی قائم ہونے والی کاتنے کی مشین کی وجہ سے سوت کی برآمدات بہت ہی نیچی سطح پر آگئیں۔ ہندوستان مارکٹ میں سوت کے لئے شدید مانگ سے بھی ہندوستان کے سوت تیار کرنے والوں نے باہری مارکٹ کی طرف بھی کوئی توجہ نہیں دی۔ اس کے باوجود سوت کی کل پیداوار دراصل جنگ کے دوران کسی قدر بڑھ گئی کیونکہ ہندوستان کی ملیں خود وہ اشیا کی بھاری مقدار زیادہ تیار کر رہی تھیں۔

۱۹۱۴ اور ۱۹۲۰ء کے درمیان ہندوستانی ملوں کے ذریعہ تیار کردہ بنے ہوئے سامان کی پیداوار ۴۶ فیصد بڑھ گئی خوردہ اشیا کی درآمد اوسطاً ۲۶۳ کروڑ بیس لاکھ گز فی سال جنگ کے قبل کے زمانہ سے گھٹ کر جنگ کے برسوں میں ۱۰۴ کروڑ ۱۰ لاکھ گز اوسط ہوگئی۔ خوردہ اشیا کی درآمد عموماً اچھے معیار کی ہوتی تھی اور ان میں گراوٹ آجانے سے ہندوستانی صنعت میں بہتر درجہ کا سامان تیار کرنے کا رجحان بڑھ گیا جیسا کہ پہلے دیکھا گیا تھا۔

خاص طور پر رنگے ہوئے سامان کی پیداوار جنگ کے قبل کی اوسط کے مقابلہ میں جنگ کے دوران ۵۰ فیصد سے زیادہ ہوگئی۔ بٹے ہوئے سوت اور سوت سے زیادہ پارچوں کی تیاری کی طرف زیادہ توجہ اور اعلیٰ معیار کے سامان کی پیداوار کے رجحانات کو جن کا پچھلے دور میں پتہ چلا تھا زمانۂ جنگ کے حالات سے مزید تقویت ملی۔

جنگ کے دوران اور جنگ کے بعد پانچ سالوں کی مدت میں کپڑے کا مجموعی صرفہ اور

ہندوستان میں اوسط معیار کا کپڑا جو مصرف میں آیا وہ جنگ کے قبل کی سطح سے نیچے رہا۔ جنگ سے پہلے اچھے معیار کے کپڑوں کی مانگ تقریباً درآمد سے پوری ہوتی تھی جو بہت کافی تھی۔ جنگ کے دوران یہ درآمدات بڑی حد تک رک گئیں اور اس طرح جو کمی رہ جاتی تھی اس کی تکمیل ہندوستانی پیداوار سے ہوتی تھی۔ یہ زیادہ تر موٹے کپڑوں سے اور بہتر قسم کے سامان کی نسبتاً زیادہ پیداوار سے پوری ہوتی تھی۔ جنگ کے دوران ۲۰ سے کم نمبر کے سوت کی پیداوار گرچہ جنگ کی سطح سے بہت نیچی تھی اور سوت کی برآمد بھی اس سطح سے اور گھٹ گئی تھی پھر بھی ان نمبروں کا کل سوت جو ملک کے اندر جمع ہو گیا تھا وہ دراصل جنگ کے قبل کی سطح سے زیادہ تھا۔

جنگ کے بعد کپاس کی صنعت میں جو گرم بازاری آئی وہ دوسری صنعتوں کے گرم بازاری سے زیادہ طویل مدت کی تھی کپاس کی صنعت میں گرم بازاری کی بنیاد کم از کم جزوی طور پر کپڑے کی اصلی اضافہ شدہ مانگ پر قائم تھی۔ ہندوستان میں ہینڈلوم مصنوعات کے علاوہ مصرف کے لئے کپڑے کی جو اصل مقدار جنگ کے ماقبل پانچ برسوں کے دوران دستیاب تھی وہ اوسطاً ۵۶، ۳ کروڑ ۶۰ لاکھ گز سالانہ تھی جب کہ جنگ کے دوران ہاتھ کرگھ کی پیداوار بھی گھٹ گئی تھی۔ جنگ کے ماقبل دور میں جب کہ ہندوستانی اور برطانوی سامان کے مارکٹ خاص طور پر علیحدہ تھے، اس صنعت کی توسیع اور اعلیٰ قسم کا سامان پیدا کرنے کے رجحان سے مقابلے کے گوشے بڑھ رہے تھے۔

جنگ نے جاپانی صنعت کو اصلی موقع دیا اور اس موقع سے اس نے خوب فائدہ اٹھایا ۱۷ - ۱۹۱۶ء سے جاپان سے ہندوستان میں سوتی سامان کی درآمد بہت تیزی سے بڑھنے لگی۔ ہندوستانی صنعت نے درآمد میں اس اضافہ کو اس وقت محسوس نہیں کیا چونکہ ان درآمدات کی تعداد بہت زیادہ نہ تھی اور لنکا شائر سے درآمدات کی کمی نے بھی سپلائی میں بڑا خلا پیدا کر دیا۔ اس صنعت کے لئے مبادلہ مناسب موقع پر گھٹ گیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں سوتی مصنوعات دوسری اشیاء کے دام کے ساتھ نہیں گھٹا ہندوستان میں درآمد ہونے والی خوردہ کا دام گرچہ گھٹ رہا تھا پھر بھی زر مبادلہ میں مسلسل گراوٹ سے یہ اضافہ بے اثر ہو رہا تھا۔ اور یہاں تک کہ ۱۹۲۱ء میں کپڑوں کا دام ہندوستان میں گھٹنے لگا۔

جنگ کے درمیانی دور میں پیداواری صلاحیت میں مسلسل توسیع ہندوستانی کپاس کی صنعت کی تاریخ کی نمایاں خصوصیت تھی۔ حسب ذیل جدول سے متعلقہ اعداد و شمار معلوم ہوتے ہیں۔

	مل کی تعداد	اسپنڈل کی تعداد (۰۰۰،)	لوم کی تعداد (۰۰۰،)	مصرف میں آیا ہوا کپاس (۳۸۲ پونڈ کے ہر... گانٹھ ہر ایک)
۱۹۱۴	۲۷۱	۶۷،۷۸	۱۰۴	۲۱،۴۳
۱۹۲۰	۲۵۳	۶۷،۶۳	۱،۱۹	۱۹،۵۲
۱۹۲۵	۳۳۷	۸۵،۱۰	۱،۵۴	۲۲،۲۶
۱۹۳۰	۳۴۸	۹۱،۲۴	۱،۷۹	۲۵،۷۳
۱۹۳۵	۳۶۵	۹۶،۸۵	۱،۹۹	۳۱،۲۲

اس پیشرفت کی اہم خصوصیت اسپنڈل سے زیادہ لوم کی تعداد میں بہت ہی زیادہ اضافی ترقی تھی۔ جب کہ پیداواری صلاحیت میں ترقی برابر اوپر کی طرف معلوم ہوتی ہے سال بہ سال پیداوار شدید طور پر گھٹ بڑھ رہی تھی۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دو دہائیوں میں اس صنعت نے بدلتی ہوئی تقدیر کا تجربہ کیا۔ ملک میں دوسری قابل توجہ تبدیلی پیداواری یونٹ اور پیداواری صلاحیت میں ہوئی؛ ۱۹۱۴ء میں بمبئی شہر اور جزیرہ میں دونوں کا زبردست ارتکاز تھا۔ ایسی ترقی جو بمبئی شہر کی صنعت میں اگلے پچیس سال رونما ہوئی وہ سست رفتار تھی لیکن احمد آباد اور بقیہ ہندوستان میں ترقی کی یہ رفتار تیز تھی۔ اسی دور میں ایک صنعت کی آخری مصنوعات کی خصوصیات میں بھی کچھ تبدیلی رونما ہوئی۔

ہندوستان کی کپاس مل صنعت کی ترقی کا عام طور پر یہ رخ رہا ہے کہ گھریلو اور باہری استعمال کے لئے خاص طور پر موٹے سوت تیار کرنے والی صنعت اب تمام قسم کے کپڑے اور سوت کی کل داخلی مانگ کو پورا کرنے والی صنعت بن گئی بالآخر یہ کپڑے کی خاص برآمد کرنے والی صنعت ہوگئی۔ ان تغیرات کے مختلف مراحل یہ تھے (الف) اسپنڈل کے مقابلہ میں لوم کے تناسب کا بڑھنا اور کتائی اور بنائی کے ملے جلے مل کا نمایاں قسم کی حیثیت سے ظہور۔ (ب) سوت کے لئے بیرونی مارکٹ کا خاتمہ (ج) سوت اور کپڑے کی گھریلو پیداوار کا مختلف النوع ہونا (د) ہندوستان میں بیرونی کپڑے کی درآمد کا گھٹنا اور (ہ) ہندوستانی کپڑے کے لئے بیرونی مارکٹ کی توسیع

بیسویں صدی کی پہلی دہائی کے دوران اس تبدیلی کے ساتھ کچھ ترقی ہوئی تھی۔ ان برسوں کے دوران لوم کی تعداد تیزی سے بڑھی اور ہندوستان ملوں میں بنائی گھروں میں کی مل پیداوار بڑی مقدار میں استعمال ہو رہی تھی۔ یہاں تک کہ ۱۴-۱۹۱۳ء میں ہندوستانی ملوں میں تیار ہونے والے کپڑے درآمدات کی تہائی سے کچھ ہی زیادہ تھے اور یہ درآمدات زیادہ تر برطانیہ سے ہوتی تھیں۔ ۱۴-۱۹۱۳ کے اعداد و شمار یہ تھے (۱۰ لاکھ گز میں)؛ ہندوستانی ملوں کی پیداوار ۱۱۶۴۰، درآمدات ۳۱۹۷۰، جس میں سے ۲۱۰۴۰ برطانیہ سے تھے بٹے ہوئے سوت اور سوت کی درآمد کے مقابلہ میں سوت کی گھریلو پیداوار کمیت کے اعتبار سے بہت زیادہ تھی (۱۴-۱۹۱۳ء میں پیداوار ۶۸۲،۷۷۰، درآمدات ۴۴،۱۷۱۰، ہزار پونڈ میں) بہرحال ۳۱ اور اس سے اوپر کے نمبر کی گھریلو پیداوار اس زمانہ میں درآمدات کی نصف سے کچھ زیادہ تھی۔ جنگ کے دوران چین کا سوت مارکٹ رفتہ رفتہ جاپان اور چین کی گھریلو پیداوار کے ہاتھوں ختم ہوگیا اور دوسری دہائی کے دوران سوت کی برآمد تیزی سے گھٹنے لگی۔ ہندوستان سے جنگ کے ماقبل پانچ برسوں میں سوت کی اوسط برآمد ۱۹ کروڑ ۲۰ لاکھ پونڈ تھی جس میں چین تقریباً ۱۷ کروڑ پونڈ لیتا تھا جنگ کے زمانہ میں سوت کی اوسط برآمد ۱۳ کروڑ پاؤنڈ تھی۔ جنگ کے مابعد اوسط ۸ کروڑ ۲۰ لاکھ پونڈ تھی اور جنگ کے خاتمہ پر ایک دہائی میں یہ گھٹا کر ۲ کروڑ ۵۰ لاکھ پونڈ سے کم ہوگئی۔ تیسری دہائی کے اوائل میں مزید گراوٹ آئی لیکن اس دہائی کے خاتمہ پر رجحان کسی قدر بدل گیا اور دوسری جنگ عظیم کے موقع پر اوسط برآمد تقریباً ۳ کروڑ ۵۰ لاکھ پونڈ ہوگئی۔ جنگ کے درمیانی دور میں سوت کی پیداوار میں کیفیت کے اعتبار سے جو نمایاں تبدیلی ہوئی اس کا پتہ حسب ذیل جدول کرچلتا ہے۔ (ہزار پاؤنڈ میں)

	۱۴-۱۹۱۳		۳۰-۱۹۲۹ء		۴۰-۱۹۳۹ء	
	درآمدات	پیداوار	درآمدات	پیداوار	درآمدات	پیداوار
۱ سے ۲۰ نمبر	۱۲۵۴	۴۹۲,۶۹۳	۱۰,۴۷	۴۹۳,۳۸۲	۸۴۴	۶۶۸,۵۳۷
۲۱ سے ۲۵ نمبر	۸۹۶	۱۲۳,۹۹۵	۲۹۰	۱۸۱,۲۴۵	۸۶	۱۷۳,۰۹۶
۲۶ سے ۳۰ نمبر	۳,۶۸۶	۴۲,۹۹۹	۳۹۵	۹,۵۷۹	۱۲۳	۱۳۷,۷۱۱
۳۱ سے ۴۰ نمبر	۲۳,۹۵۷	۱۹,۷۱۲	۲۰,۰۵۰	۴۶,۳۶۵	۳,۱۹۹	۱۵۷,۱۳۰
۴۰ سے اوپر	۷۸,۵۹	۲۶,۹۹	۹,۰۱۳	۱۵,۲۷۹	۷۳۱۸	۸۱,۷۵۵
دو دھاگہ	—	—	—	—	۲۹۵۴۷	—
غیر مخصوص	۶,۸۱۹	۶۷۹	۳۴	۹۷۱۰	۱۵	۱۵,۴۵۸
کل	۴۴,۱۷۱	۶۸۲,۷۷۲	۴۳,۸۸۲	۸۳۳,۵۶۰	۴۱,۱۳۲	۱۰۲۳۳,۶۸۷

۱۴-۱۹۱۳ء میں ہندوستان سے سوت کی برآمد ہندوستان کی پیداوار کی تقریباً ۳۰ فیصد تھی، ۴۰-۱۹۳۹ء میں گھریلو پیداوار کی مقدار کو دیکھتے ہوئے برآمدات بالکل ناقابل نظرانداز تھیں۔ دوسری دہائی کے دوران ملک کے اندر موٹے سوت کی پیداوار بالکل نہیں بڑھی۔ بہرحال برآمدات گھٹ جانے سے گھریلو پیداوار کا بہت زیادہ حصہ ہندوستانی صنعت کے استعمال سے دستیاب ہوگیا۔ تیسری دہائی میں موٹے نمبروں کی پیداوار بھی خوب بڑھ گئی۔ ۲۶ سے اوپر والے نمبروں کے لئے زیادہ اونچے نمبر والے ہر گروپ کے ساتھ اضافہ کی زیادہ اونچی شرح کا مسلسل رجحان نظر آتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے موقع پر درآمدات سب سے اونچے نمبر والے گروپ میں بھی ناقابل نظرانداز تھیں اور یہ صرف ایک نئی مخصوص جماعت یعنی دوہرے (دو گنے) میں نمایاں رہیں۔ سوت کی پیداوار میں اضافہ اور اونچے نمبروں کی تیاری میں خاص ترقی کا آخری اثر یہ ہوا کہ ۱۴-۱۹۱۳ء کے مقابلہ میں ہندوستانی صنعت کے لئے بہت ہی زیادہ سوت بالخصوص اچھے نمبروں کا ۴۰-۱۹۳۹ء میں دستیاب ہونے لگا۔ اس دور کے آخر میں ہندوستان کے اندر مل اور ہینڈلوم کے کپڑوں کی زیادہ مختلف النوع پیداوار کی یہی بنیاد تھی۔ ہندوستان میں کپاس کی گھریلو پیداوار تقریباً تمام چھوٹے دھاگہ والی قسموں کی تھی۔ ناگزیر طور پر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں لمبے دھاگہ والے خام کپاس کی درآمد بالخصوص مصر اور مشرقی افریقہ سے ترقی پذیر صورت میں بڑھنے لگی تاکہ اونچے نمبروں کی کتائی اور عمدہ کپڑوں کی پیداوار برقرار رہے۔

ہندوستانی کپڑوں کی پیداوار اور برآمدات و درآمدات کی اضافی پوزیشن کا پتہ حسب ذیل جدول سے چلتا ہے:

	۱۴-۱۹۱۳	۲۰-۱۹۲۹	۳۰-۱۹۲۹	۴۰-۱۹۳۹
کل درآمدات	۳۱۹۷	۱;۸۱	۱,۹۱۹	۵۷۹
جن میں سے برطانیہ سے	۳۱۰۴	۹۷۶	۱۲۴۸	۱۴۵
جاپان سے	۹	۷۶	۵۶۲	۳۹۳
ہندوستانی ملوں کی پیداوار	۱,۱۶۴	۱,۶۴۰	۲,۴,۹۹	۴,۰۱۳
ہندوستان سے برآمدات	۸۹	—	—	۲۰۸

ان اعداد و شمار سے ہندستان میں کپڑے کی درآمد پر جنگ کے اثر کا پتہ چلتا ہے، دوسری دہائی میں بہت زیادہ بڑھتی ہوئی گھریلو پیداوار کے ساتھ درآمد کی تجدید اور ۴۰-۱۹۳۹ء تک درآمد میں ناقابل نظر انداز شخصیت کا بھی علم ہوتا ہے یہ جدول جنگ کے درمیانی دور میں جاپانی درآمدات کی بڑھتی ہوئی اہمیت کی طرف بھی توجہ دلاتا ہے۔ برآمدات سے کچھ مقداری اضافہ ظاہر ہوتا ہے لیکن یہ ہندوستان کے اندر پیداوار کی کمیت کے لحاظ سے اہم نہیں۔

اعداد و شمار سے نمایاں ہونے والے عمومی ڈھانچے کے اندر رہ کر تحریکات اور واقعات کی کچھ تفصیل اب پیش کی جا سکتی ہے۔ سرد بازاری کے حالات جو ۲-۱۹۲۱ کے بعد رونما ہوئے پیداواری صلاحیت میں وقتی اضافہ سے شدید تر ہو گئے وجہ یہ تھی کہ مشینری اور ساز و سامان جن کا آرڈر جنگ اور جنگ کے مابعد گرم بازاری کے زیر اثر دیا گیا تھا وہ آگئے۔ اس صنعت میں بیکار صلاحیت کے پیدا ہو جانے سے صلاحیت میں اضافہ کے یہ معنی نہیں ہونے کہ اسی تناسب سے پیداوار بھی بڑھے گی۔ نئے یونٹ کے قیام کے ساتھ ساتھ پرانے یونٹ کی صلاحیت کی توسیع اور نمایاں پیمانہ پر قائم شدہ مشین اور کارخانہ کا غیر استعمال جنگ کے مابعد برسوں کے فوراً ہی بعد بھی دیکھا گیا۔ جنگ کے درمیانی دور میں کپاس کی صنعت کے اندر جو صورت حال تھی اس کی ایک اہم خصوصیت کا یہ نتیجہ تھا۔ ملک کے اندر یہ صنعت پھیل گئی اور ملک کے مختلف مراکز میں اس صنعت کی دولت کے درمیان کافی فرق پیدا ہوا۔

سرکاری پالیسی میں اہم تبدیلی جس نے دوسری دہائی اور اس کے بعد صنعتوں کے ارتقا پر نمایاں طور پر اثر ڈالا وہ نئی محصولی Fiscal پالیسی تھی جو ہندوستان کی حکومت نے اختیار کی۔ حفاظتی محصول لگانے کی اب اجازت مل گئی اور باضابطہ طور پر جو ٹیرف بورڈ بنایا گیا تھا اس نے ان تمام صنعتوں کے حالات کو مفصل تحقیقات کا کام شروع کیا، جنھوں نے حفاظت کے لیے درخواست کی تھی بالخصوص بمبئی اور احمد آباد کی کپاس کی صنعت کی درخواستیں سب سے پہلے آئیں۔ کاٹن ٹکسٹائل انڈسٹری میں جانچ پڑتال کرنے کے لئے ایک ٹیرف بورڈ ۱۹۲۶ء میں تشکیل ہوا اور دوسرے سال کے دوران اس نے رپورٹ کی۔ جنگ کے مابعد آئینی انتظامات کے تحت ہندوستان نے مالی خود اختیاری میں جو ترقی کی تھی اس کا پتہ قابل نفرت کاٹن چنگی کے خاتمہ سے پہلے چل گیا تھا۔ کپڑے کی صنعت نے جب خوب ہنگامہ کیا تو یہ چنگی دسمبر ۱۹۲۵ء میں معطل ہو گئی اور مارچ ۱۹۲۶ء میں ختم ہو گئی۔

ٹیرف بورڈ نے کاٹن ٹکسٹائل انڈسٹری کی صورت حال کا مفصل تجربہ پیش کیا۔ بورڈ نے یہ دریافت کیا کہ ہندوستان کی صنعت خاص طرح کی سردبازاری کے چکر سے گذر رہی ہے اور یہ بھی بتایا کہ اس کا خاص طور پر احساس ان ملوں کو تا ہے جس کے پاس صرف کاتنے کے شعبے ہوتے ہیں اور یہ بھی کہا کہ دوسرے مرکزوں سے بہت ہی زیادہ بمبئی میں اس کی شدت محسوس کی جاتی ہے۔ اس صنعت میں سردبازاری کے دیرپا اسباب میں سے ایک سبب یہ تھا کہ سوت کا چینی مارکٹ ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ اس کا اثر خاص طور پر بمبئی میں محسوس کیا گیا۔ ٹیرف بورڈ کے لئے واضح طور پر رائے پیش کرنا ناممکن تھا کہ کس حد تک بیرونی مقابلہ سردبازاری کا مستقل سبب سمجھا جا سکتا ہے حالانکہ اس نے صاف طور پر دریافت کیا کہ جاپانی سوت کے مقابلہ نے ہندوستانی سوت کی قیمت پر بہت خراب اثر ڈالا۔ ٹیرف بورڈ نے جو ٹھوس تجاویز دیں ان سے بورڈ کے نظریہ کا اظہار ہوتا ہے۔ خاص تجاویز یہ تھیں کہ ۳۲ اور اس سے اونچے نمبر کے کتائی سوت کو سرکاری امداد ملے، مشینری اور مل اشیا پر چنگی کی دوبارہ جانچ ہو۔ بمبئی میں ایک ساتھ صاف کرنے اور رنگنے وغیرہ کے کارخانہ کے قیام کے لئے مدد دی جائے اور کپڑے کے سمندر پار مارکٹ کو ترقی دینے میں مدد بہم پہنچائی جائے۔ ان تجاویز پر جو خرچ ہونا تھا وہ درآمد شدہ کپڑے پر تین برسوں کے لئے ۴ فیصد خاص ٹکیس لگا کر پورا کیا جانا تھا۔ اس طرح یہ بات ظاہر تھی کہ ٹیرف بورڈ نے بیرونی مقابلہ کو ہندوستانی صنعت کے لئے خطرناک نہیں سمجھا۔ بلاشبہ بیرونی مقابلہ کا اثر شدید طور پر بمبئی میں محسوس کیا گیا لیکن دوسرے ہندوستانی مراکز کی ملوں کا مقابلہ بھی یکساں طور پر بمبئی پر اثرانداز ہوا اور اس بورڈ نے بمبئی کی صنعتوں کی نئی تنظیم اور ان میں داخلی کفایت شعاری پر زور دیا۔ جب یہ صنعت ہندوستان کے دوسرے حصوں میں پھیل گئی تو مقامی مارکٹ سے قربت نے اوپری ملک کے مرکزوں UP CONNTRY CENTRES کی ملوں کو نفع پہنچایا اور ان میں بہت سے مرکزوں کو خام اشیا کی سپلائی کے سلسلہ میں مقابلتہً فائدہ حاصل تھا۔ بمبئی کی صنعت کی یہ بنیادی دشواریاں بمبئی کو زیادہ رکاوٹ مزدوری کی زیادہ اونچی لاگت اور زیادہ سرمایہ کاری ہونے کی وجہ سے جو جنگ کے فوراً بعد ہی واقع ہوئی تھی اور بڑھ گئیں۔ بورڈ نے یہ سمجھا تھا کہ بمبئی میں ملوں کے صاف کئے ہوئے رنگین اور چھاپ والے سامان کی پیداوار میں کافی توسیع ہونے سے یہ صنعت سردبازاری سے نکل گئی اور اس سمت میں تنظیم نو اور کفایت شعاری میں عروج حاصل کرنے کے لئے ہمہ جہت کوشش کی ضرورت تھی۔

بمبئی میں زیادہ سرمایہ کاری ہونے (OVER CAPITALISATION) کا سبب یہ تھا کہ غیر معمولی طور پر بڑھی ہوئی قیمتوں پر ساری ملوں کی بکری سے پوری قیمت (BLACK VALUE) اوپر کی طرف مادی طور پر متوازن ہوگئی۔ بمبئی میں پوری قیمت (BLACK VALUE) ۱۹۱۷ء میں ۹۸ لاکھ تھی جو ۱۹۲۲ میں بڑھ کر ۲۹۴۴ لاکھ ہوگئی اور اس اضافہ کا صرف ایک جزو جنگ کے مابعد ملیں دور کی قیمت پر نئی مشینری کی خریداری کے حساب میں لگا اس صورت حال کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ موجودہ ایجنسیوں کے لئے بڑے ہی موافق شرح پر انتظامی ایجنسی کا ایک فرم سے دوسری فرم میں تبادلہ ہو رہا تھا۔ اس کے نتیجہ میں نئے مینیجنگ ایجنٹ کو نارمل حالات میں بھی اجرت ملتی تھی ان کی سرمایہ کاری کا مناسب حاصل نہ تھا۔ ایسے لین دین سے بمبئی کی ۸۰ ملوں میں ۳۰ ملیں براہ راست متاثر ہوئیں[۵]۔ بمبئی کی صنعت نے اس سے نپٹنا مشکل سمجھا اور خاص طور پر تیسری دہائی کے اوائل کی شدید سرد بازاری کے حالات کے تحت اس سلسلہ میں مطابقت پیدا کی جانے لگی۔ اسی طرح محنت کی اونچی قیمت بھی کسی قدر جامد تھی۔

بمبئی کے مل مالکوں نے اجرت گھٹا کر اور کفایت شعاری کی اسکیم سے محنت کی لاگت کم کرنے کی کوشش کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۲۷، ۱۹۲۸ اور ۱۹۲۹ء میں ہڑتالوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ ان ہڑتالوں کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ بمبئی میں مزدوروں کی منظم نمائندگی ختم ہوگئی اس لئے اجرت کے معیاری ہونے اور کفایت شعاری کی اسکیم کے باضابطہ طور پر عمل میں آنے میں کوئی ترقی نہ ہوسکی۔

جب تقریباً جنگ کا سارا درمیانی دور سرد بازاری اور بمبئی کی صنعت کیلئے جبری مطابقتوں کا دور دورہ تھا ملک کے دوسرے حصّوں کے صنعتی مراکز کے ساتھ یہ صورت نہ تھی۔ احمد آباد جو دوسرا سب سے بڑا مرکز تھا دوسری دہائی کے دوران تیزی سے بڑھتا رہا اور تیسری دہائی کے زمانہ میں اس کی رفتار ذرا دھیمی ہوگئی۔ جنگ کے درمیانی دور میں یہ اس صنعت کا ملک میں سب سے زیادہ ترقی پذیر مرکز بن گیا۔ ۱۹۲۰ کے بعد کارخانہ اور سامان میں جو اضافی طور پر بڑی توسیع ہوئی اس سے جدید ساز و سامان سے لیس ہوکر ملیں کھڑی ہوگئیں۔ احمد آباد میں انتظامی ایجنٹ نے ان ملوں کے انتظام و بند و بست میں جو ذاتی دلچسپی لی اس سے انتظام میں کفایت شعاری ہوئی اور چونکہ ان میں سے بعض نے اور مستعدی دکھائی اس لئے احمد آباد اعلیٰ قسم کے سامان

---

[۵] ایس۔ ڈی۔ مہتا: ہندوستان کی سوتی ملیں، ۱۹۵۴-۱۸۵۴ء ص ص ۱۶۱-۲ (۱۹۵۴)

پیدا کرنے میں آگے بڑھ گیا۔ احمد آباد میں مزدوروں کی صورت حال بھی زیادہ موافق تھی اور پر امن طور پر جھگڑوں کے نبٹانے اور مطابقت پیدا کرنے کے اس صنعت میں انتظامات ہوگئے تھے۔ دونوں مرکزوں کے درمیان مجموعی صورت حال میں فرق کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ تیسری دہائی کے آغاز تک احمد آباد میں ٹیکسٹائل انڈسٹری میں اجرت کی سطح بمبئی کی سطح سے اونچی تھی[1]

کپاس کی پارچہ بافی صنعت جنگ کے درمیانی دور میں بہت سے مرکزوں اور علاقوں میں محدود ہوگئی۔ کانپور، ناگپور، دہلی اور مدراس جیسے قدیم مرکزوں میں توسیع ہونے کے علاوہ بہت سے چھوٹے پیمانے کے یونٹ مرکزی ہندوستان کی ریاستوں میں اور کانپور کے علاوہ سنٹرل انڈیا کی ریاستوں اور بمبئی اور احمد آباد کے علاوہ بمبئی پریسیڈنسی اور ملحقہ ہندوستانی ریاستوں میں قائم کیے گئے۔ نئی ترقیوں میں شاید سب سے زیادہ قابل ذکر فروغ کتائی کی صنعت کو ہوا ۱۹۳۱ اور ۱۹۳۹ء کے درمیان کپڑور میں چھوٹے اوسط سائز کے یونٹ کے ساتھ اس کی ترقی ہوئی۔ اس طرح تقریباً مسلسل دشواریوں کے باوجود اس صنعت نے بمبئی کے سوا زیادہ تر مرکزوں میں مسلسل ترقی کی۔

عالمی سرد بازاری نے اس صنعت کو دو طریقوں سے متاثر کیا اول یہ ہے کہ زراعت کی پست حالت کی وجہ سے گھریلو مانگ کم ہوگئی اور دوم یہ کہ بیرونی بالخصوص جاپانی مقابلہ نے شدت اختیار کی۔ سیاسی میدان میں ابھرنے والے واقعات سے سرد بازاری کے ابتدائی برسوں میں ان عناصر کے اثرات کمتر ہوگئے۔ ۱۹۳۰ء میں سودیشی تحریک کی زبردست تجدید ہوئی اس وقت یہ تحریک پورے طور پر منظم تھی اور اس نے مل مالکوں کی انجمنوں کو اپنے ساتھ کر لیا۔ بیرونی کپڑوں کا بائیکاٹ کرنے کی کوشش کی گئی اور ہندوستانی ملوں کو بیرونی سوت استعمال کرنے سے روکا گیا۔ سودیشی تقاضوں کو جو ملیں پورا کرتی تھیں ان کی فہرست شائع کی گئی اور ان کی سوت اور کپڑے کی پیداوار پر منظوری کے لیبل لگائے گئے۔ ۱۹۳۲ء کے ٹیرف بورڈ کو معلوم ہوا کہ ۳۱-۱۹۳۰ میں سودیشی تحریک بدیسی کپڑے کی درآمد میں بڑی کمی کی ایک حد تک ذمہ دار ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ ۳۱-۱۹۳۰ کے دوران اس نے ہندوستانی ملوں کو کافی مدد پہنچائی۔ تاکہ مخصوص نمبروں کی پیداوار میں قابل لحاظ اضافہ ہوا اور اس نے میڈیم اور عمدہ نمبر کے ہندوستانی کپڑے کی قیمتوں میں زیادہ گراوٹ کو روکنے میں بھی مدد کی گرچہ حفاظتی ٹیکس نے بھی اس سلسلہ میں ہاتھ بٹایا[2]

---

[1] ہندوستانی ٹیرف بورڈ کی رپورٹ۔ کاٹن ٹکسٹائل انڈسٹری کو تحفظ کی منظوری باب سوم (۱۹۳۲)

[2] ٹیرف بورڈ۔ ج۔ س۔ ص ص ۴-۳۔ ۱۷ (۱۹۳۲)

کپاس کی صنعتِ پارچہ بافی، سرد بازاری اور بیرونی مقابلہ سے پیدا شدہ مسائل سے خاص طور پر دوچار تھی۔ اس مسئلہ میں جو اقدامات کئے گئے وہ خاص طور پر حفاظتی ٹیکس کے لئے شورش تھی اور خاص کر بدیسی مقابلہ کرنے والے یعنی برطانوی اور جاپانی مقابلہ بازوں سے مصالحت کی کوشش تھی۔ ٹیرف بورڈ نے جو بڑی سفارشات کیں اور جن کی رپورٹ ۱۹۲۷ء میں آئی انھیں حکومتِ ہند نے قبول نہیں کیا اور اس صنعت نے ٹیرف بورڈ کی جانچ کے نتیجہ سے جو واحد محصولی ریلیف حاصل کیا وہ مل کے درآمد شدہ سامان پر درآمدی ٹیکس کا خاتمہ تھا۔

بہرحال بعد میں ۱۹۲۷ء میں حکومت نے سوت پر ۵ فیصد قیمت واری ٹیکس سے ۵ فیصد ٹیکس کر دیا ۱½ آنہ فی پونڈ یا اس میں سے جو بھی زیادہ ہو۔ بمبئی کی صنعت نے مکمل تحفظ کے کے لئے ہنگامہ جاری رکھا اور حکومت نے کلکتہ کے کسٹم کلکٹر، مسٹر جی۔ ایس۔ ہارڈی کو مقرر کیا تاکہ وہ قیمت پر موجودہ ٹیکس کے بدلہ خاص قسم کا ٹیکس لگانے کے سوال پر واضح رپورٹ پیش کرنے درآمدہ سوتی مصنوعات کے مقابلے کے سوال سے متعلق بھی عام رپورٹ پیش کرنے کا کام دیا گیا مسٹر ہارڈی کو پتہ چلا کہ جاپانی کپڑے کی درآمد تیزی سے بڑھی ہے اور مسلسل بڑھتی ہے اور مسٹر ہارڈی کو رپورٹ کی بنیاد پر اس صنعت کو تحفظ دینے کیلئے ہندوستان کی حکومت پر زور ڈالا گیا۔ سرکار نے ۱۹۳۰ء میں اقدام کیا اس نے سوتی کپڑے کے تھان پر اسے ۱۵ فی صد محصولی ٹیکس بڑھا دیا اور برطانیہ کے علاوہ دوسرے ملکوں سے درآمد شدہ کپڑے کے تھان پر ۵ فیصد فاضل ٹیکس لگایا اور سادہ خاکی کپڑے کی تمام درآمد پر ۳½ فی پونڈ کے حساب سے کم از کم مخصوص ٹیکس بھی عائد کیا۔ حکومت کی مالیاتی ضرورتوں کی وجہ سے یہ سارے ٹیکس ۱۹۳۱ء میں اور بڑھائے گئے اور اس سال کے آخیر میں برطانوی سامان پر ۲۵ فیصد اور غیر برطانوی پر ۳۱½ فیصد قائم رہے اور مصنوعی ریشم کے کپڑے کے تھان پر خاص حفاظتی ٹیکس لگایا گیا۔ ان اقدامات کے باوجود جاپانی کپڑوں کی درآمد خاص طور پر تخفیف شدہ مبادلہ کی وجہ سے بڑھتی رہی مل مالکوں کے کہنے پر ٹیرف بورڈ کو غیر برطانوی درآمد کے مقابلہ کے مخصوص مسئلہ پر رپورٹ پیش کرنے کو کہا گیا جب وہ پہلے سے ہی کپاس کی صنعت کو تحفظ دینے کے سوال پر غور کر رہا تھا۔ فوری جانچ کے نتیجہ میں بورڈ نے ۱۹۳۲ کے وسط میں یہ سفارش کی کہ غیر برطانوی اشیاء پر ٹیکس بڑھا کر عارضی طور پر ۵۰ فیصد کر دیا جائے۔ عمومی مسئلہ سے متعلق جو رپورٹ اس نے ۱۹۳۲ء کے آخر میں کی اس میں ٹیرف بورڈ نے طویل المدتی تصور سے کام لیا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ تحفظ دس برسوں کے لئے دیا جائے اور یہ بھی بتایا کہ اس صنعت کو مؤثر تحفظ موجودہ قیمت

مارکٹ کے ختم ہونے کا ڈر تھا لنکاشائر کے معاملہ میں پالیسی پر مزید غور و خوض کرنے کی ضرورت برطانیہ کے پرانے سیاسی دباؤ سے ہوئی۔ لنکاشائر کے ساتھ گفت وشنید کی پہلی کوشش غیر سرکاری بنیاد پر کی گئی، بمبئی کے مل مالکوں کی انجمن اور برطانوی کاٹن ٹکسٹائل انڈسٹری کے نمائندوں کے درمیان مصالحت سے اس کی نیابت ہوئی۔ اس مصالحت کی رو سے جو مودی۔ لیس معاہدہ (MODY LEES PACT) کے نام سے مشہور ہے ہندستانی مفاد کو برطانیہ سے کپاس کے سوت اور کپڑے کے تھان کی ہندستان میں درآمد پر منظور شدہ سطح سے زیادہ محصول کا مطالبہ نہیں کرتا تھا اور برطانوی صنعت گروں کو برطانیہ میں ہندستانی کپاس کے استعمال کو مقبول بنانا اور سمندر پار مارکٹ میں ہندستانی ملوں کے لئے رابطہ قائم کرنے کے لئے اپنی ساکھ کو استعمال کرنا تھا۔

مودی لیس معاہدہ کے بعد جس کی ہندستانی رائے عامہ نے مذمت کی کہ اس نے مبہم وعدوں کے بدلہ ٹھوس مراعات دی ہیں، حکومت کے درمیان گفت وشنید ہوئی اس کے نتیجہ میں جنوری ۱۹۳۵ کا ہند و برطانیہ معاہدہ ہوا۔ اس معاہدہ میں ایک عجیب و غریب اصول یہ تھا کہ برطانوی صنعت کو ہندستانی ٹیرف بورڈ کے سامنے اپنا حال بیان کرنے کا موقع ملنا چاہیے جو ہندوستانی صنعت کے حفاظتی مطالبہ کی جانچ کر رہا تھا۔ اس نے یہ شرط رکھی تھی کہ برطانوی اشیا کی ہندستان میں درآمد پر محصول اس سے زیادہ نہ ہونا چاہیے جو اس کی قیمت ہندوستان میں پیدا ہونے والے اسی قسم کے مال کی قیمت کے برابر کرنے کے لئے ضروری ہو اور یہ کہ برطانوی اشیا پر جب کبھی ممکن ہو کمتر محصول لگایا جائے۔ ہندوستان کی دستور ساز مجلس نے اس معاہدہ کو نامنظور کیا لیکن حکومت اس پر اڑی رہی اور ہندوستان کاٹن ٹکسٹائل انڈسٹری کو ملنے والے تحفظ کے کارگر ہونے کا جائزہ لینے کے لئے ستمبر ۱۹۳۵ء میں جو ٹیرف بورڈ مقرر ہوا تھا اس کے حوالہ کی شرائط کا سہارا لیا۔ اس بورڈ کی جانچ کی خاص سفارش یہ تھی کہ برطانیہ سے درآمد شدہ اشیاء پر محصول میں ۵ فیصد کمی ہو۔ یہ سفارش منظور کی گئی اور جون ۱۹۳۶ء میں سرکار نے اس پر عملدرآمد کیا۔ ۱۹۳۵ کا ہند و برطانیہ معاہدہ ختم ہونے پر نئی گفت وشنید ۱۹۳۷ء میں شروع کی گئی۔ یہ چلتی رہی اور آخری مصالحت پر عمل درآمد اپریل ۱۹۳۹ء میں ہی ہوا اس نئے ہند و برطانوی مصالحت کی رو سے جاپانی مصالحت کی طرح برطانیہ سے کپڑے کے تھان کا ہندوستان میں درآمد کا کوٹہ ہندوستان کے خام کپاس کی برطانیہ میں برآمد کے کوٹہ سے ملحق کر دیا گیا۔ پھر بھی اس کا دوسرا سلسلہ بھی تھا۔ یہ ایسا تھا کہ برطانیہ سے کپڑے کے تھان کی درآمد کی سطح، برطانوی

واری ٹیکس کے بدلہ مخصوص ٹیکس کے اس سسٹم سے ہی دیا جا سکتا ہے جو وزن پر مبنی ہو۔ مخصوص ٹیکس کے سسٹم کی بنیاد کے لئے بورڈ نے کپڑے کی چہار گانہ درجہ بندی پیش کی۔ ٹیرف بورڈ نے جس مخصوص ٹیکس کی تجویز دی تھی وہ ایسا کم از کم ٹیکس ہو جس سے اور نیچے درآمدی ٹیکس تحفظ کے دوران اترنا چاہیئے اور یہ مشورہ دیا گیا کہ محصول قیمت واری ٹیکس سے محفوظ رہنا چاہیئے جو حکومت کی محصولی ضرورتوں کے مطابق وقتاً فوقتاً بدلتا رہے۔ ٹیرف بورڈ کی سفارشات پر گورنمنٹ نے کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ جاپانی مبادلہ کا قیمت میں گھٹنا اور جاپانی درآمد کا بڑھنا ۱۹۳۲ کے وسط کے بعد جاری رہا۔ ٹیرف بورڈ کی عام سفارشات آنے کے کچھ مہینوں بعد یعنی ۱۹۳۲ کے وسط میں حکومت نے دوسرا عارضی اقدام کیا اور غیر برطانوی اشیاء پر ٹیکس ۵۰ سے ۷۵ فیصد بڑھا دیا۔

اسی درمیان صورت حال پر دوسرے اسباب اثر انداز ہونے لگے ہندوستان کی کپاس کی صنعت کو تحفظ دینے کے سوال پر اب غور نہیں کیا گیا۔ اس زمانہ میں ہندوستانی صنعت کو بالخصوص جاپانی کپڑے کے تھان کی بڑھتی ہوئی درآمد کے مقابلہ میں حفاظت درکار تھی پھر بھی ۱۹۰۴ء کے ہند جاپانی تجارتی دستور کے پیش نظر حکومت ہند جاپان سے درآمد کے خلاف کوئی خاص قدم اٹھا نہ سکی ایسے اقدام کے لئے زمین ہموار کرنے کی خاطر حکومت ہند نے جاپان کو ۱۹۰۴ء کا معاہدہ ختم کرنے کا نوٹس دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جاپان نے ہندوستان کے خام کپاس کی خریداری بند کرنے کی انتقامی دھمکی دی۔ تب بات چیت شروع ہوئی اور اس کے نتیجہ میں ہند جاپان کی سمجھوتہ ہوا جس کی تکمیل جنوری ۱۹۳۴ء میں ہوئی اور طے پایا کہ یہ تین برسوں تک نافذ رہے گا۔ اس سمجھوتے کی رو سے دونوں ملکوں کے درمیان خصوصی تعلقات برقرار رہے مگر اس کے ساتھ انہیں مجاز حاصل تھا کہ وہ شرح مبادلہ میں مخصوص کمی کو روکنے کے لئے کسٹم ٹیکس میں مناسب ردوبدل کر سکیں۔ جاپانی کپڑے کے تھان کی ہندوستان میں درآمد پر جو کسٹم ٹیکس عائد ہونا تھا وہ ۵۰ فیصد قیمت واری محصول تک ہی محدود تھا۔ اس سمجھوتے کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ جاپانی کپڑے کے تھان کی ہندوستان میں درآمد کا کوٹہ سال میں محدود تھا اور یہ کوٹہ ہندوستان کے خام کپاس کی جاپان میں برآمد سے ملا ہوا تھا۔ اس مصالحت کے دو بنیادی کوٹے ہندوستانی خام کپاس کے ۱۰ لاکھ گانٹھ کی جاپان میں برآمد کے مقابلہ میں جاپانی کپڑے کے تھان کی ہندوستان میں برآمد ۳۲ کروڑ ۵۰ لاکھ گز تھی۔

جاپان کے ساتھ نئی صورت حال کا بڑا پہلو ہندوستانی خام کپاس کے لئے جاپانی

درآمدات پر لگائے گئے محصول کی سطح سے ملحق تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غیر مستقل کوٹہ کے علاوہ برطانوی درآمدات پر محصول اس طرح لگایا جائے جو حالات کے مطابق گھٹتا بڑھتا رہے۔

۱۹۳۴ء کے ہندو جاپانی معاہدہ کی، ۱۹۳۷ء میں تجدید ہوئی یہ تقریباً اسی پرانی بنیاد پر تھا تبدیلی یہ ہوئی کہ بر بار جو الگ ہوگیا تھا، کے علاوہ ہندوستان میں درآمد کا کوٹہ متعین ہوگیا اور درآمدی اشیا میں کپڑے کے تھانوں کی تقسیم اور زیادہ واضح ہوگئی۔

ہندوستان کے ٹیکسٹائل انڈسٹری پر کپڑے کے تھانوں کی بیرونی درآمد کا اثر اتنا شدید نہ تھا جتنا اس صنعت کے رہنما اس معاملے میں دلچسپی لے رہے تھے۔ اس اثر کا احساس خاص طور پر قیمتوں کی سطح سے ہوا۔ تیسری دہائی کے نصف اول کے دوران قیمت تیزی سے گر گئی پھر بھی اس دور میں درآمد کا حجم دوسری دہائی کے مقابلے میں تقریباً نصف تھا۔ تجارتی سمجھوتوں نے درآمد کو زیادہ نچلی سطح پر برقرار رکھا اور ۱۹۳۱ء میں جاپان کے منچوریا میں مداخلت کرنے کے بعد درآمد کی سطح اور نیچی ہوگئی۔ جاپان تیسری دہائی کے دوران ہندوستانی صنعت کا حقیقی اور پُر زور مقابلہ کرنے والا تھا۔ قیمت کا معاملہ لنکاشائر کے لئے بہت زیادہ سخت تھا۔ ۱۹۳۴ء کے بعد قیمتیں ٹھہر گئیں اور ہندوستانی ملوں کی پیداوار میں اضافہ ہوا چونکہ نئے یونٹ قائم ہوگئے تھے اور پرانے یونٹ میں توسیع ہوئی تھی اور رات کی ڈیوٹی پر کام ہونے سے موجودہ صلاحیت کا بھرپور استعمال ہوا تھا۔ پھر بھی یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اس دہائی میں سال بہ سال اتار چڑھاؤ کافی ہوتا تھا اور دولت میں مقامی فرق بھی زیادہ تھا۔ زیادہ بڑے مرکزوں میں ملوں کی تکنیکل اعتبار سے ترقی ہوتی رہی ملوں کے ذریعہ سارے ہندوستان میں دھلائی، رنگائی اور نوک پلک درست کرنے والے شعبے پھیل گئے اور کیلیکو پرنٹنگ مشین بالخصوص احمد آباد اور بمبئی میں قائم کی گئی۔

اس دہائی کے دوران بنیان اور پاور لوم کے شعبوں میں توسیع ہونے سے سوت کی صنعت کا مارکٹ وسیع تر ہوگیا ماہرین کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوا اور اس دہائی میں اس صنعت کی توسیع بہت ہی کم سرمایہ کی لاگت سے ہوئی ہندوستان میں ایسی صنعتوں کو بھی فروغ ہوا جو کپاس کی صنعت کی اشیا اور کیمیاوی اجزا کی ضرورتوں کا ایک حصہ بہم پہنچاتی تھیں۔ کامیاب ملوں کے حاصل شدہ منافع کی شرح اس دہائی میں کم ہی رہی۔

سرد بازاری کے شروع ہونے سے بمبئی میں اس صنعت کے اندر شدید بحران پیدا ہوا۔ ۱۹۳۲ء کے آخر تک بمبئی کی ملوں میں اسپنڈل کا ۳۲ فیصد اور لوم کا ۲۵ فیصد بیکار رہا

اور مزدوروں کا بھی تناسب بے روزگار ہوگیا۔ یہ تخمینہ لگایا گیا کہ ۱۹۲۳ء کے آخر میں بمبئی کی ملیں ایک شفٹ میں اپنی صلاحیت کا ۶۰ فی صدی کام میں لا رہی تھیں۔ اس بحران کے نتیجہ میں شہر کی ۸۲ ملوں میں سے ۱۱ ملیں بند کردی گئیں اور ۱۹ کو ختم کردینا پڑا۔ کریم بھائی گروپ کی ملوں میں سب سے زیادہ ناکامی ہوئی جو ایک درجن سے زائد ملوں پر مشتمل تھیں۔ پھر بھی یہ صنعت ۱۹۲۷ تک سنبھلنے لگی اور اس کی حالت جنگ کے موقع پر کافی تشفی بخش تھی۔

جنگ نے ہندوستان کی جوٹ صنعت کی پوزیشن کو بڑی حد تک مضبوط بنا دیا تھا۔ خام جوٹ کی دوسرے ملکوں میں برآمد کے امکانات کم کرکے اس نے جوٹ کی قیمت میں اضافہ ہونے سے روک دیا تھا۔ جب کہ جنگ کے زمانہ میں بالو کے بورے، غلہ کے بورے اور ٹاٹ وغیرہ کی ضرورت کی وجہ سے اس صنعت کے مال کی مانگ کافی بڑھ گئی۔ اس کے علاوہ امتناعی کرایہ اور مشینری اور سامان کی سپلائی حاصل کرنے کی دقت کی وجہ سے نئے مقابلہ کرنے والے کے میدان میں آنے کا امکان بہت بعید ہوگیا تھا۔ اس دہائی میں گرچہ کئی نئی کمپنیاں جاری کی گئی تھیں تاہم کل چالو لوم میں صرف ۲۰۰ لوم کا اضافہ ہوا[۱] اس زمانہ میں جوٹ کی صنعت بڑی حد تک گورنمنٹ کے آرڈروں پر چلتی تھی اور زیادہ پیداوار کو متعین کرنے کے لئے سرکار نے فیکڑی ایکٹ کی خاص دفعات تعمیل کو اس صنعت کے معاملہ میں موقوف کردیا۔ جنگ کے بعد کے مرحلوں میں لائسنس کے سوا دوسری صورتوں میں خام جوٹ کی برآمد ممنوع ہوگئی اور خام جوٹ کا ہندوستانی ملوں میں استعمال تیزی سے بڑھ گیا۔ اس دور میں جوٹ کی قیمت ذرا بھی نہیں بڑھی اور اجرت کی سطح بھی پیچھے رہی۔ ایسے حالات میں جوٹ ملوں نے کافی منافع کمایا۔ محفوظ سرمایہ میں عظیم الشان اضافہ اور ٹوٹ پھوٹ کی قیمت کے منہا کرنے کے باوجود منافع کی حاصل ہونے والی سطح ناقابل یقین تھی۔ شماریات کے ڈائرکٹر کے تخمینہ کے مطابق جوٹ ملوں کے اصلی منافع اور بھگتان سرمایہ میں تناسب ۱۹۱۵ء میں ۵۸ فیصد، ۱۹۱۶ء میں ۷۵ فیصد، ۱۹۱۷ کے لئے ۴۹ فیصد اور ۱۹۱۸ء کے پہلے نصف کے لئے ۳، فیصد تھا[۳]

---

[۱] مہتا، ح۔س۔ باب دوازدھم

[۲] ڈی۔ آر ولیس، رومانس آف جوٹ (۱۹۲۸)

[۳] ریویو آف دی ٹریڈ آف انڈیا، ۱۸-۱۹۱۷، ص ۲۱

جنگ کے خاتمے کے فوراً بعد جوٹ کی صنعت بحران سے دوچار ہوئی۔ جنگ کے آرڈر ختم ہوگئے جس کے معنی تھے کہ مانگ میں کافی کمی ہوگئی حالاں کہ حکومت نے جنگ ختم ہونے پر جنگ کے باعث جواسٹاک جمع ہوا تھا وہ جنگ کے مد میں سارے کا سارا لے لیا۔ خام جوٹ کی قیمت اور اجرت نیچی سطح پر ہمیشہ برقرار نہ رہ سکی اور وہ بڑھنے لگی۔ جنگ کے منافع کی اونچی سطح سے نئی کمپنیاں جاری ہوگئیں اور جیسے ہی مشینری وغیرہ کی سپلائی دستیاب ہوئی پرانی کمپنیوں میں بڑی توسیع ہوئی۔

جنگ کے دوران برسوں میں پیداوار بہت زیادہ تھی۔ ۱۶-۱۹۱۵ تا ۱۸-۱۹۱۷ء کے تین برسوں کے دوران ہندستانی جوٹ ملوں نے ۵۶ لاکھ گانٹھ سالانہ جوٹ اپنے کام میں لائے۔ اور تمام موجودہ ملوں میں پوری طرح کام ہوتا رہا۔ جنگ ختم ہونے کے بعد ہی پیداوار کی رفتار کسی قدر سست ہوگئی اور ۲-۱۹۲۱ء میں تو اور زیادہ گراوٹ آگئی ہندستانی جوٹ ملوں کی انجمن جو ۱۸۸۴ء میں قائم تھی وہ بڑی منظم جماعت بن گئی اور اس نے تعطل کا مقابلہ کام کے وقت کو گھٹانے کے سمجھوتے سے کیا۔ ہفتہ میں صرف چار دن کام کرنے کا سمجھوتہ ۱۹۲۱ء میں آیا اور یہ مسلسل کئی برسوں تک چلتا رہا ۲۲-۱۹۲۱ تا ۲۴-۱۹۲۳ء کے تین برسوں میں کام بہت ہوا۔ مگر ۲۵-۱۹۲۴ء میں پیداواری سرگرمیاں پھر بڑھ پھر بڑھ گئی اور اس دہائی کے آخری تین برسوں میں یعنی ۲۸-۱۹۲۷ تا ۳۰-۱۹۲۹ء میں ہندوستانی جوٹ ملوں کا خام جوٹ کا استعمال پہلی جنگ عظیم کے دوران سے بھی زیادہ تھا۔ اسی درمیان اس صنعت کی پیداواری صلاحیت بڑی حد تک بڑھ گئی تھی۔ پیداواری صلاحیت میں توسیع دوسری دہائی کے دوران ہوئی اور یہ خاص طور پر دو ادوار میں ہوئی پہلی توسیع ۲۱-۱۹۲۰ ۱۹۲۰ تا ۲۴-۱۹۲۳ء کے عرصہ میں ہوئی یہ توسیع کے منصوبوں یا جنگ کے دوران یا بعد میں قائم ہونے والی نئی بنیادوں کا نتیجہ تھی۔ پیداواری صلاحیت میں یہ اضافہ اس وقت حاصل ہوا جب ملیں ہفتہ میں چار دن پہلے سے ہی کام کر رہی تھیں اور جب کہ جوٹ کی مصنوعات کی مانگ مسلسل کم تھی۔ اس لئے جوٹ مل کی انجمن نے ۱۹۲۴ء میں توسیع نہ کرنے کا معاہدہ کیا جس کے نتیجہ میں ۲۵-۱۹۲۴ء کے بعد تین چار برسوں کے دوران اس کی صلاحیت میں اضافہ بہت محدود تھا۔ بہر حال ۱۹۲۵ء کے بعد کاروبار کی حالت بہتر ہوگئی اور اس صنعت کے موجودہ یونٹ نے جو بہت زیادہ منافع حاصل کیا اس کی کشش استوار ثابت ہوئی اور اس انجمن سے ہٹ کر یونٹ قائم ہونے لگے۔ یہ غیر انجمنی ملیں نہ تو مختصر مدتی کام کی

پابند تھیں اور نہ توسیع نہ کرنے کے سمجھوتے کی، اور اس انجمن کی بہت ہی استوار مالیاتی پوزیشن اور اس کے اندر ملوں اور نئے کاروبار کرنے والوں کو روکنے کے مختلف اقدامات کے باوجود غیر انجمن ملوں کی کارگذاری اور فروغ کو روکنا نا ممکن تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۹-۱۹۲۸ء سے لے کر ۳۱-۱۹۳۰ء تک مل، لوم اور اسپنڈل کی تعداد میں تیزی سے توسیع ہوئی۔ دوسری دہائی کے نصف آخر میں جوٹ اور جوٹ کی مصنوعات میں قیمتوں کی سطح اونچی ہوگئی، جوٹ کے زیر کاشت علاقہ میں تیزی سے توسیع ہوئی، خام جوٹ اور جوٹ کی مصنوعات کی برآمد میں اضافہ ہوا اور ہندوستان کی جوٹ ملوں کی پیداوار بڑے اونچے پیمانے پر ہوئی۔ ۱۹۲۸ء کے آخر میں جوٹ ایسوسی ایشن کی نظر میں پوزیشن اتنی اطمینان بخش تھی کہ معاہدے کے تحت جو ملیں کام کررہی تھیں انہیں چالو لوم میں اضافہ کرنے کی اجازت دے دی گئی۔

۱۹۲۹ء میں شروع ہونے والی سرد بازاری نے بنگال کے جوٹ کی معیشت کو متاثر کیا جب کہ یہ بلندی پر جارہی تھی جوٹ کے کاشتکاروں کو سب سے زیادہ نقصان سہنا پڑا۔ خام جوٹ کی قیمت کا انڈکس نمبر ۱۹۲۸ء میں ۱۰۰ اور ۱۹۲۹ء میں ۹۵ گر کر ۱۹۳۰ء میں ۶۳ اور ۱۹۳۱ء میں ۴۹ ہوگیا یہ برابر گھٹتا گیا یہاں تک کہ ۱۹۳۴ء میں ۳۹ کی سطح پر آگیا۔ جوٹ کے زیر کاشت علاقہ جو ۲۷-۱۹۲۶ تا ۳۱-۱۹۳۰ء کے دوران بہت زیادہ بڑھ گیا تھا وہ ۳۲-۱۹۳۱ اور ۳۳-۱۹۳۲ء میں اچانک بہت نیچی سطح پر آگیا اور بعد میں اس نے رفتہ رفتہ سنبھالا لیا۔ کسانوں کی حالت اتنی نازک تھی کہ بنگال کی حکومت نے جوٹ کے مسئلہ میں جانچ پڑتال کرنے کے لئے ۱۹۳۲ اور پھر ۱۹۳۴ میں کمیٹیاں مقرر کیں۔ دونوں کمیٹیوں نے کاشتکار کی حالت پر خاص توجہ دی۔ اور اس پر غور کیا کہ کس طرح جوٹ پیدا کرنے والوں کو منظم کیا جائے اور کس طرح جوٹ کی کھیتی باقاعدہ طور پر ہوسکے انھوں نے بہرحال جوٹ مل کے حالات کا بھی جائزہ لیا۔

سرد بازاری شروع ہونے پر جوٹ کی ملوں میں دشواریاں بہت زیادہ تھیں۔ گرچہ وہ کاشتکاروں کی دشواریوں کی حالت اتنی زیادہ نہ تھیں۔ یہ دشواریاں شدید ہوگئیں کیونکہ پیداواری صلاحیت بالخصوص غیر انجمنی ملوں میں اس وقت اضافہ ہوگیا تھا۔ ۱۹۳۰ء میں اس انجمن نے ممبر مل پر ہفتہ میں ۵۴ گھنٹے کام کرنے کا اصول عائد کرکے صورت حال کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی، اسے پھر گھٹا کر ۱۹۳۱ کے شروع میں ۴۰ گھنٹہ فی ہفتہ کردیا گیا اس کے ساتھ ۱۵ فی صد لوم بند کردینے کا بھی دفعہ شامل کیا گیا۔ اس بے ہودہ تخفیف نے خصوصاً ملوں کے اندر بددلی پیدا کردی کیونکہ

غیر انجمنی ملیں کسی تخفیف کے لئے تیار نہ تھیں۔ بڑھتے ہوئے اسٹاک اور گھٹتی ہوئی مانگ کی وجہ سے پوزیشن اس وقت تک بدتر ہوتی گئی جب تک کہ بنگال کے گورنر کی مداخلت سے انجمن اور غیر انجمن ملوں میں مئی ۱۹۳۲ میں مصالحت نہ ہوئی۔ اس مصالحت کی رو سے انجمن سے ملحقہ ملیں ۴۰ گھنٹہ فی ہفتہ پر عامل رہیں اور لوم کا ۱۵ فی صد بند کر دیا جب کہ غیر انجمن والی ملوں کو پوری مشینری کے ساتھ ۵۴ گھنٹہ فی ہفتہ کام کرنے کی اجازت مل گئی۔ پھر بھی بعض مخصوص مشینیات کے ساتھ غیر انجمن ملیں بھی مستقبل میں یعنی مصالحت جاری رہنے تک توسیع نہ کرنے کے لئے رضامند ہوگئیں اس مصالحت کا خوشگوار اثر اس صنعت کی اقتصادیات پر پڑا اور جوٹ مل کے منافع میں اضافہ ۱۹۳۳ اور اس کے بعد ہوا۔ قیمتوں اور جوٹ کی مصنوعات کی برآمد سے متعلق یہ سدھار اور زیادہ اچھے حالات سے ۱۹۳۲ء کی سخت دفعات کا جاری رہنا مشکل ہوگیا۔ انجمن نے جن لوموں کو بند کر دیا تھا انہیں رفتہ رفتہ نومبر ۱۹۳۴ء اور فروری ۱۹۳۶ء کے درمیان کھول دیا گیا اور انجمن اور غیر انجمن ملوں کے درمیان جو مصالحت ہوئی تھی وہ اپریل ۱۹۳۶ء سے ختم ہوگئی اور انجمن والی ملوں کے کام کے اوقات ۴۰ سے ۵۴ گھنٹے ہو گئے۔ رضاکارانہ اسکیم کے خاتمہ کا سبب ان ملوں کا بڑھتا ہوا مقابلہ بھی تھا جو اس کے فریق نہ تھے اور یہ خوف بھی تھا کہ موجودہ ملوں کی تعداد میں مزید اضافہ نہ ہو جائے۔ یہ خوف مضبوط بنیاد پر قائم تھا۔ اور ۳۵-۱۹۳۴ء کے پانچ سال کے بعد مل، اسپنڈل اور لوم کی تعداد میں مزید اضافہ نہ ہو جائے۔ یہ خوف مضبوط بنیاد پر قائم تھا اور ۳۵-۱۹۳۴ء کے پانچ سال کے بعد مل، اسپنڈل اور لوم کی تعداد میں نمایاں اضافہ ہوا۔ ۱۹۳۶ء میں رضاکارانہ مصالحت ختم ہونے کے پہلے جوٹ مل کی انجمن نے کوشش کی تھی کہ اس سے لگائی گئی پابندیوں کی دستوری ضمانت مل جائے اور یہ بھی چاہا تھا کہ یہ پابندیاں سارے ملک پر عائد کی جائیں۔ مگر ہندوستان کی حکومت نے اس تجویز کو قبول نہیں کیا۔ ۱۹۳۵ء کے بعد کے سالوں میں ہندوستانی ملوں کی پیداوار کا حجم اور خام جوٹ اور جوٹ کی مصنوعات کی برآمد اور ان کی قیمت کی سطح اطمینان بخش نہ تھی۔ پھر بھی ملوں کے درمیان شدید مقابلہ سے ان کی منافع کمانے کی صلاحیت محدود ہو کر رہ گئی اور اس کے نتیجہ میں پیداوار ضرورت سے زیادہ ہوگئی۔ کثرت پیداوار ۳۷-۱۹۳۶ء میں خاص طور پر نمایاں ہوگئی اور ملوں میں جوٹ کی مصنوعات کا ذخیرہ بہت بڑھ گیا۔ پیداوار کی پابندی کے متعلق کسی قسم کی رضامندانہ مصالحت نہ ہو سکی اور ستمبر ۱۹۳۸ء میں بنگال کی حکومت نے کام کے اوقات کو ۴۵ گھنٹہ فی

ہفتہ باقاعدہ بنانے اور مشین پر کنٹرول رکھنے کے لئے ایک آرڈیننس جاری کیا۔ یہ آرڈیننس چھ مہینے کے لئے لاگو تھا۔ مگر جنوری ۱۹۳۹ء میں کام کے اوقات کو پابند کرنے اور پیداوار پر قابو رکھنے کے لئے ایک رضاکارانہ اسکیم ہندستانی جوٹ مل اسوسی ایشن کے تمام ممبروں نے قبول کی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ جوٹ کی صنعت کی صورتحال بہت بدل گئی۔ جنگ کی تیاری شروع ہوگئی اور ۴۰-۱۹۳۹ء کے دوران اس صنعت نے برطانیہ سے بالو کے بوروں کا پہلا آرڈر پایا۔

بنگال کی جوٹ تحقیقاتی کمیٹی (۴۰-۱۹۳۸) نے اس صنعت کے بنیادی ڈھانچہ سے پیدا ہونیوالے مسائل کا مطالعہ کیا۔ اس صنعت کو یہ فائدہ تھا کہ بنگال کو جوٹ کی کاشت کا اجارہ حاصل تھا یہ کلکتہ کے گرد بہت زیادہ مرکوز تھا اور اس کی انجمن بہت ہی مضبوط اور منظم تھی۔ ملوں نے تقریباً ایک ناقابل تسخیر اقتصادی پوزیشن تعمیر کرنے کے لئے اپنے مواقع کا دانشورانہ استعمال کیا اور زیادہ تر حالات میں اچھے منافع دیئے۔ لہٰذا وہ مصنوعات کی تسلیم شدہ قیمتوں سے مطمئن رہیں اور انھوں نے پیداوار کے تنوع یا کارکردگی کی بنیاد کی توسیع کی طرف کوئی کوشش نہیں کی۔ دوسری اور تیسری دہائیوں کے خاتمہ پر دو یا تین برسوں کے سوا ہندستانی جوٹ ملوں کے خام جوٹ کا استعمال جنگ کے دوران (۱۸-۱۹۱۴ء) کی اوسط سے کمتر تھا اور جوٹ ملوں نے اس سے پیدا ہونے والے مسئلہ کا مقابلہ ہمیشہ کم وقت کام کرنے کے سمجھوتوں سے کیا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ جوٹ مل کا اونچا منافع، ان کی مضبوط اقتصادی پوزیشن اور پابند کرنے والے سمجھوتے بیرونی سرمایہ داروں کے لئے بڑی کشش رکھتے تھے۔ اور انجمن کی ساری کوششوں کے باوجود نئے لوگ داخل ہوئے اور صلاحیت میں مسلسل اضافے ہوتے رہے۔ جوٹ ملوں میں لوم کی تعداد جنگ کے درمیانی دور میں ۷۰ فیصد بڑھ گئی جب کہ پیداوار گھٹتی بڑھتی رہی اور اوپر کی طرف کوئی نمایاں رجحان نظر نہ آیا۔ جیسا کہ بنگال کی جوٹ تحقیقاتی کمیٹی نے بتایا تھا، انجمن والی ملوں کے قلیل المدتی سمجھوتوں نے جوٹ کی مصنوعات کی قیمتوں کو مستقل بنانے میں ایسے نتائج ظاہر کئے، جو فوری طور پر تشفی بخش تھے۔ پھر بھی وہ آخرکار غیر تشفی بخش ثابت ہوئے۔ کیوں کہ ایک طرف انھوں نے جوٹ اور جوٹ کی مصنوعات کی مانگ میں مستقل اور مسلسل اضافہ کے امکانات کو محدود کر دیا تھا اور جوٹ نے کاشتکار کی پوزیشن کو اور زیادہ کمزور بنا دیا تھا اور خام جوٹ کی قیمتوں میں اتار چڑھاؤ اس سے بھی زیادہ تھا جو دوسری صورت میں ہوتا۔ اس کے علاوہ، محفوظ اور پابند کرنے والے طریق فکر کی وجہ سے اس صنعت کے مسائل کا

پائدار حل دریافت نہیں ہوسکا اور کثرت صلاحیت (Over Capacity) کا پرانا بوجھ پیدا ہوگیا جس کے معنی تھے کہ قوم کے لئے مستقل طور پر سرمایہ کی لاگت کا زیادہ بوجھ بنا رہے گا۔

ہندوستان کی جوٹ ملیں

سال	ملوں کی تعداد	اسپنڈل	لوم
۱۹۱۸-۱۹ء	۷۶	۸۳۹,۹۱۹	۴۰,۰۴۳
۱۹۲۳-۴ء	۸۹	۱۰۴۳,۴۱۷	۴۹,۰۳۸
۱۹۲۷-۸ء	۹۳	۱,۱۰۵,۶۳۴	۵۲,۲۲۱
۱۹۳۰-۱ء	۱۰۰	۱۲۲۴۹۸۲	۶۱,۸۳۴
۱۹۳۴-۵ء	۱۰۰	۱۲۲۱,۷۸۶	۶۱۳۸۷
۱۹۳۹-۴۰ء	۱۱۰	۱۲۶۹,۸۲۱	۶۸,۵۲۸

ماخذ: برٹش انڈیا کا شماریاتی خلاصہ

ہندوستان کے معدنی وسائل کو فروغ دینے کے لئے سازگار حالات پیدا کرنے کی بڑی حد تک ذمہ دار جنگ تھی۔ جنگ کے سامان کی مانگ نے حکومت اور عوام کی توجہ کلیدی "صنعتوں کی دھات سازی Metallurgical اور کیمیاوی گروپ کی طرف مبذول ہوئی اور بہت سی نئی صنعتوں نے اہمیت حاصل کرلی جنگ کے سامان کی ضرورتوں کی وجہ سے کرومائیٹ اور ولفرام کو اچانک تقویت مل گئی۔ ان دونوں صورتوں میں جنگ کے حالات کی وجہ سے پیداوار اور برآمد میں بہت زیادہ اضافہ جنگ کے مابعد دور میں برقرار نہ رہ سکا شورہ کی دولت کی تجدید بھی بس بہت تھوڑے عرصہ کے لئے رہی۔ جنگ کے موافق سال لوہے اور فولاد کی صنعت کے لئے زیادہ دیرپا اہمیت کے حامل رہے۔ جنگ کے مابعد عرصہ میں برما میں مختلف معدنی منصوبے کی پیداوار کا آغاز بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ لوربرما میں ٹن کے منصوبہ سے خوب فائدہ اٹھایا گیا۔ اور اپر برما میں سیسہ، جستہ اور چاندی کے خزینہ سے کام لیا جا رہا تھا اور جہاں تانبا بھی ملتا ہے۔ بعض اہم معدنیات جیسے کوئلہ اور پٹرولیم

کا استعمال اس طریقہ سے ہوتا تھا جسے" براہ راست طریقہ" کہتے ہیں۔ لوہے کا ملغوبہ دھات سازی کی اہم صنعت کی بنیاد بن گیا لیکن پھر بھی کئی دوسری معدنیات بھی تھیں جیسے مینگنیز، ابرک، سیسہ، جستہ، ٹن اور تانبا جو تمام خام ملغوبے کی شکل میں برآمد کئے جاتے تھے۔ ابرک، بلاک یا اجزا کے فارم میں برآمد کیا جاتا تھا اور ابرک کے چورے کا کوئی استعمال نہیں ہوتا تھا اور نہ میکا نائٹ کی تیاری کی کوشش کی گئی حالاں کہ ہندوستان عمدہ معیار کا ابرک پیدا کرتا تھا اور اسے لاکھ کی پیداوار میں بھی گویا اجارہ داری حاصل تھی۔ سیسہ، جستہ اور چاندی کے ملغوبے کچی شکل میں صاف کرنے کے لئے برآمد کئے جاتے تھے۔ ۱۹۲۰ء میں ریفائنری کھولنے کی جمشید پور میں کوشش کی گئی تاکہ برما کے ملغوبوں سے جستہ اور سلفرک ایسڈ (گندھک کا تیزاب) حاصل ہو لیکن یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی اور جست کی قلعی کا فولاد Galvanised Steel اور دھات کی اشیاء Hardwar کی پیداوار کے لئے باہر سے جست Speter درآمد کیا گیا۔ اسی طرح ٹن کا ملغوبہ اسٹریٹ آبادیات (اب ملیشیا ہے) صاف ہونے کے لئے برآمد کیا جاتا تھا اور پھر ہندوستان کی ٹن پلیٹ انڈسٹری اس ٹن کی درآمد کرتی تھی۔ یہ ظاہر تھا کہ ہندوستان کے پاس دھات سازی کی مختلف صنعتوں کے قیام کے لئے خام وسائل موجود تھے۔ اور ہندوستان کی ٹن پلیٹ کی صنعت کا کامیاب تجربہ یہ بتا رہا تھا کہ پیداوار کی ٹکنیکل دشواریاں ناقابل حل نہیں ہیں۔ گھریلو مانگ کی وسعت ہی حدود متعین کرتی تھی[1]

اس جنگ کا ہندوستان کے کوئلہ کی صنعت پر فوری اثر یہ ہوا کہ مانگ میں کمی واقع ہو گئی کیوں کہ اس کا صنعتوں پر برا اثر پڑا تھا لیکن یہ عارضی تھا اور مانگ اول تو ریلوے کی وجہ سے اور پھر صنعتوں کی بنا پر سنبھل گئی۔ پھر بھی حمل ونقل کی دشواریاں اب خاص طور پر شدید ہو گئیں۔ سمندری راستہ سے ڈھونا بہت ہی زیادہ مشکل ہو گیا اور ۱۹۱۵ء ختم ہوتے ہوتے تقریباً تمام کوئلہ ریل کے ذریعہ ہی ڈھویا جاتا تھا۔ اتفاق سے جنگ نے کوئلہ کی درآمد کو روک دیا تھا اور ملک کے سارے حصوں میں کوئلہ بنگال کی کانوں سے بھیجنا پڑتا تھا۔ ۱۹۱۶ء میں حکومت نے ایک بڑے خریدار کی حیثیت سے قدم آگے بڑھایا اور تمام اچھے کوئلہ کے لئے آرڈر دے دیا۔ ان تمام ترقیوں سے کوئلہ کی نقل وحرکت پر کنٹرول ہو گیا اور ۱۹۱۷ء میں اس کے لئے اور دوسری ضرورتوں

---

[1] ٹیرف بورڈ نے ہندوستان کی ایسڈ کی کل مانگ گندھک کے تیزاب کی اصطلاح میں تقریباً ۱۲۰۰۰ ٹن تھی۔
رپورٹ آف دی ٹیرف بورڈ آن دی ہیوی کیمیکل انڈسٹری (۱۹۲۹ء)

کے لئے کوئلہ کے کنٹرولر کا دفتر قائم ہوا۔ چونکہ حکومت نے اچھے کوئلہ کا بڑا حصہ خود خریدنے کا آرڈر دیدیا تھا اس لئے عام پبلک کے لئے محدود اور معمولی درجہ کا کوئلہ باقی رہ گیا اور کوئلہ کا دام تیزی سے بڑھنے لگا۔ ۱۹۱۱ء کے بعد کچھ برسوں کے لئے برابر کوئلہ کی مانگ سپلائی سے زیادہ رہی اس صنعت کی توسیع کوئلہ ڈھونے والے ڈبے اور کان کنی کے لئے مزدور کی سپلائی تک ہی محدود رہی۔ معمولی کوئلے کی مانگ جن کی مارکٹ میں پوزیشن عموماً نازک تھی وہ بھی بہت بڑھ گئی۔ اور ان کا دام بہتر کوئلہ سے بھی زیادہ ملا جب تک حکومت خود خریدتی رہی۔

جنگ کے دوران ہندوستانی کوئلہ کی برآمد تقریباً بند رہی جب جنگ ختم ہوئی اور ۱۹۱۹ء میں پیداوار بہت زیادہ بڑھ گئی تو برآمد پھر شروع ہونے لگی۔ اسی زمانہ میں کوئلہ کی داخلی مانگ پوری نہیں ہوئی (حکومت کا کوئلہ خریدنے کا حکم اپریل ۱۹۲۰ء ہی میں ختم ہوا تھا) اور کوئلہ کی برآمد کو روکنے کے لئے شور بپا تھا۔ ہندوستان کی حکومت نے جولائی ۱۹۲۰ء میں لائسنس کے سوا کوئلہ کی تمام برآمد پر روک لگادی اور یہ ممانعت جنوری ۱۹۲۳ء تک جاری رہی۔ اس وقت تک داخلی مانگ اور قیمتیں دونوں گر گئی تھیں اور یہ صنعت بیرونی مارکٹ پر پھر سے قبضہ جمانے میں لگ گئی۔ ان تمام مارکٹ پر جو جنوبی مشرقی ایشیا میں واقع تھے، جنوبی افریقہ کی کوئلے کی صنعت حاوی ہوگئی تھی۔ اس سلسلے میں جنوبی افریقہ کی حکومت نے بڑی مدد دی تھی۔ ہندوستان کی کوئلہ کمیٹی (۱۹۲۵ء) نے برآمدی مارکٹ کو پھر سے حاصل کرنے کے مسئلہ کا جائزہ لیا اور وہ اس نتیجہ پر پہنچی کہ یہ مارکٹ خاص طور پر معیار اور قیمت کا مارکٹ ہے۔ اس کمیٹی نے سفارش کی تھی کہ ۱۹۲۴ء میں ایسٹ انڈیا اور بنگال۔ ناگپور ریلوے سے منظور شدہ تمام برآمد کئے ہوئے کے کرایہ پر ۲۵۔ فی صد چھوٹ کے بجائے ۱/۲ ۳۷ فیصد چھوٹ کردی جائے کمیٹی کو یقین تھا کہ درآمدی مارکٹ پھر سے حاصل ہو سکتا ہے اگر اول درجہ کا کوئلہ بھیجا جائے اور اس نے سفارش کی کہ ایک گریڈنگ بورڈ قائم کیا جائے جو غیر ملکی خریدار کو اس کے معیاری ہونے کا سرٹیفکیٹ جاری کرے۔ اس سلسلہ میں کمیٹی کی سفارشات پر فوری عمل کیا گیا۔ فاضل چھوٹ دی گئی اور کول گریڈنگ بورڈ ایکٹ ۱۹۲۵ء میں پاس ہوا۔ آنے والے برسوں میں ہندوستان سے کوئلہ کی برآمد میں تیزی سے اضافہ ہوا حالانکہ دوسری دہائی کے کسی بھی سال میں جنگ سے پہلے کے برسوں کی سطح تک یہ کبھی نہیں پہونچ سکی۔

ہندوستان میں کوئلہ کی درآمد جس نے جنگ سے پہلے کے سالوں میں تشویش پیدا کردی تھی۔ صرف جنگ کے فوری مابعد برسوں میں ۱۹۲۱ تا ۱۹۲۳ء اونچی تھی جب کہ گھریلو مانگ اونچی جارہی

تھی۔ اس مدت کے بعد یہ تیزی سے گر گئی اور ۱۹۲۶ اور اس کے بعد تمام برسوں میں ہندوستان میں کوئلہ کی درآمد ہندوستان سے کوئلہ کی برآمد سے زیادہ نیچی سطح پر تھی۔ اس سلسلہ میں یہ بات بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ بیرونی تجارت گھریلو پیداوار اور استعمال کے مقابلہ میں مختصر تھی۔ دوسری دہائی کے کسی بھی سال میں ہندوستان میں ہندوستانی کوئلہ کا استعمال گھریلو پیداوار کے ۹۶ فیصد سے کم نہ تھا۔ برآمد جس نے دوسری دہائی کے دوران بڑی اہمیت اختیار کر لی تھی وہ اب گھریلو استعمال کے مقابلہ میں قابل نظر انداز تھی۔

ہندوستان میں کوئلہ کی پیداوار جنگ کے دوران اور اس کے فوراً بعد بہت بڑھ گئی تھی اور ۱۹۲۴ء تک اس کی پیداوار ۲ کروڑ ٹن سے بھی بڑھ گئی تھی۔ جمود کے چند برسوں کے پیداوار میں پھر اضافہ ہوا اور ۱۹۳۰ء میں یہ بڑھ کر ۲ کروڑ ۳۸ لاکھ ٹن ہو گیا۔ سرد بازاری کے زمانہ میں پیداوار میں تیزی سے کمی واقع ہوئی۔ ۱۹۳۲ء میں یہ ۲ کروڑ ٹن سے بھی کم ہو گئی تھی اور ۱۹۳۷ء تک تمام برسوں میں ۱۹۳۰ کی سطح سے کم ہی رہی۔ بہرحال یہ ۱۹۳۷ء تا ۱۹۳۹ء کے برسوں میں بڑھ گئی اور ۱۹۳۸ء میں ۲ کروڑ ۸۳ لاکھ ٹن تک پہنچ گئی۔ ۹-۱۹۳۷ء کا زمانہ ملک کے اندر عظیم الشان صنعتی سرگرمی اور برآمد کی اونچی سطح کا نمایاں دور تھا۔ کوئلہ کی برآمد ۸-۱۹۳۷ء میں ۱۰ لاکھ ٹن سے بڑھ گئی اور ۴۰-۱۹۳۹ء میں ۳۰ لاکھ ٹن سے بھی زیادہ ہو گئی ۱۹۳۷ اور اس کے بعد کے سالوں کے علاوہ ملک کے اندر صنعتی سرگرمی سے کوئلہ کی مانگ جنگ کے درمیانی دور میں زیادہ نہیں بڑھی۔

کوئلہ کی صنعت کے اعتبار سے اس دور کا سب سے نمایاں واقعہ یہ ہوا کہ لوہے اور فولاد کی صنعت نے اہمیت اختیار کر لی۔ اس کا اور کوئلہ کے مختلف داخلی استعمال کرنے والوں کی اضافی اہمیت کا پتہ اس جدول سے چل جاتا ہے جو اگلے صفحہ پر ہے اور جو کوئلہ کی کان کنی کمیٹی (۱۹۳۷) کی رپورٹ میں دیئے گئے اعداد و شمار سے مرتب ہوئی ہے[1]

اس صنعت نے ۱۹۲۵ء میں اپنے تحفظ کے لئے درخواست دی تھی مگر تحفظ کے لئے اس کا مطالبہ درآمد کی نیچی سطح کے پیش نظر پورا نہیں ہو سکا اور ٹیرف بورڈ کی اکثریت نے یہ رائے دی کہ کوئلہ کی صنعت نے کوئلہ کی کسی حفاظتی ٹیکس کے مقابلے میں فولاد کو ملنے والے تحفظ سے زیادہ بڑی حد تک فائدہ اٹھایا ہے۔ داخلی مانگ کو تقویت دینے کے لئے حکومت نے

---

[1] رپورٹ ج۔۱۔ ص ۲۱

خاص طور پر یہ قدم اٹھایا کہ اس نے انڈین سوفٹ کوک کمیٹی **India Soft Coke Committee** مقرر کی تاکہ وہ بجھے پتھر کے کوئلہ **Soft Coke** کی تیاری کے طریقہ کو فروغ دے اور بہتر بنائے یہ نسبتاً کمتر درجہ کے کوئلہ سے تیار ہوتا تھا اور یہ کوشش کی گئی کہ یہ ہندوستان کے شہروں میں گھریلو ایندھن کی حیثیت سے مقبول ہوجائے۔

ہندوستان میں کوئلہ کی پیداوار لازماً چھوٹے پیمانہ پر ہوتی تھی۔ جنگوں کے درمیانی برسوں کے دوران اس سلسلہ میں دو رجحانات قابل لحاظ تھے۔ اوّل تو یہ کہ بڑھتی ہوئی مانگ کے ہر دور میں چھوٹی کانوں کی تعداد میں بہت اضافہ اور مشکل حالات آتے ہی چھوٹی کانوں کی تعداد میں تیزی سے کمی واقع ہوئی۔ دوسرا یہ کہ دو دہائیوں کے اندر چھوٹی کانوں کی تعداد اور ان سے حاصل ہونے والی کل پیداوار کے تناسب میں اضافہ سے ہوئی۔ جب کہ سالانہ ۲۵۰۰۰ ٹن سے کم پیدا کرنے والی کانیں جنگ کے مابعد گرم بازاری کے آخر یعنی ۱۹۲۳ء میں کل کوئلہ کی پیداوار کے ۲۰ فیصد سے زیادہ پیدا کرنے لگیں اس وقت اس کے مقابلہ میں ۱۹۲۹ کا تناسب ۱۰ فی صد سے کم تھا۔ اس کے برعکس سالانہ ایک لاکھ ٹن سے زیادہ پیدا کرنے والی کانیں کل پیداوار کا ۴۴ فیصد ۱۹۲۲ میں

مختلف استعمال کرنے والوں کے ذریعہ ہندوستان کوئلہ کا استعمال

ہزار ٹن میں

	۱۹۲۲ء میں استعمال کا اندازہ	۱۹۳۵ء میں استعمال کا اندازہ
ریلوے	۶,۱۸۶	۶,۲۹۳
کپاس، جوٹ، کاغذ کی ملیں اور چائے کے باغات	۲,۴۲۴	۲۵۴۱
لوہے کی صنعت (انجینئرنگ کے کام لوہے اور فولاد شامل ہیں)	(تقریباً ۸۰۰) ۲۴۱۵	۵۵۸۳ (۲,۴۵۷)
بحری فوج، بندرگاہوں کے ٹرسٹ بنکر کوئلہ اور ملک کے اندرونی حصہ کی اسٹیمریں	۱,۶۲۸	۱,۷۳۵
اینٹ کے بھٹے، کمہار کے آوا، سیمنٹ کے کام وغیرہ	۴۳۷	۷۹۲
کوئلہ کی کھان اور برباد شدہ	۲,۴۷۱	۱۲۲۰
صنعتی اور گھریلو استعمال کی دوسری قسمیں	۴,۵۲۱	۳,۷۲۱
کل	۲۰۰۸۲	۲۲,۸۸۵

ان کی پیداوار ۶۳ فی صد سے زیادہ تھی۔ کانوں کی تعداد کے مفصل اعداد و شمار، مختلف درجے اور ان برسوں میں کل پیداوار میں ان کے حصّے کیا تھے۔ یہ ساری چیزیں اس جدول میں پیش کی گئی تھی۔

مختلف درجوں کی کانوں سے کوئلہ کی پیداوار

	۱۹۲۰	۱۹۲۳	۱۹۲۸	۱۹۳۴	۱۹۳۹
۵۰,۰۰۰ ٹن تک کانوں کی تعداد	۲۴۸	۳۸۸	۱۷۱	۱۳۵	۱۹۰
مجموعی پیداوار کی فی صد (٪)	۲٫۹	۳٫۵	۱٫۴	۵٫۹	۱٫۲
۵۰,۰۰۰ سے ۲۵۰,۰۰۰ ٹن تک کانوں کی تعداد	۲۵۴	۱۸۷	۱۵۱	۱۴۶	۱۶۲
مجموعی پیداوار کی فی صد	۱۹٫۹	۱۷٫۷	۹٫۰	۸٫۹	۸٫۱
۲۵۰,۰۰۰ سے ۱,۰۰۰,۰۰۰ ٹن تک کانوں کی تعداد	۱۵۰	۱۷۵	۱۴۹	۱۳۷	۱۵۶
مجموعی پیداوار کی فیصد	۴۱٫۴	۴۴٫۶	۳۲٫۶	۳۰٫۰	۲۷٫۶
۱,۰۰۰,۰۰۰ سے ۲,۰۰۰,۰۰۰ ٹن تک کانوں کی تعداد	۲۵	۲۰	۳۸	۴۱	۴۹
مجموعی پیداوار کی فیصد	۱۶٫۵	۱۳٫۴	۲۳٫۴	۲۵٫۲	۲۲٫۸
۲,۰۰۰,۰۰۰ ٹن سے زیادہ کانوں کی تعداد	۱۰	۱۲	۱۸	۲۲	۳۰
مجموعی پیداوار کی فیصد	۲۰٫۲	۲۰٫۶	۳۳٫۶	۳۵٫۰	۴۰٫۴
کوئلہ کھانوں کی کل تعداد	۶۸۷	۸۸۲	۵۲۷	۴۸۱	۵۸۷
کل پیداوار (ہزار ٹن میں)	۱۷,۹۶۲	۱۹,۶۵۶	۲۲,۵۴۳	۲۲,۰۵۷	۲۷,۷۶۹

ماخذ: ہندوستان کی کوئلہ کانوں کی کمیٹی (۱۹۴۶) ضمیمہ ۷۔

جنگ کے بعد کے دور کی اونچی قیمتیں ۱۹۲۲ء تک جاری رہیں۔ اس کے اگلے سال قیمت میں تیزی سے کمی واقع ہوئی۔ ۱۹۲۷ء سے لے کر ۱۹۳۰ء تک کے برسوں میں کوئلہ کی قیمتیں نیچی سطح پر نسبتاً مستقل رہیں۔ ۱۹۳۱ء کے ساتھ کمی کا دور شروع ہوا جو ۱۹۳۶ء تک جاری رہا۔ ۱۹۳۷ء قیمت اچانک بڑھ گئی۔ اور بعد میں زیادہ اونچی سطح پر برقرار رکھی گئی۔ بڑی کمپنیوں کا منافع قیمتوں کی رفتار کے ساتھ چلتا رہا۔ بہرحال اتار چڑھاؤ کا اصلی صدمہ کوئلہ کی چھوٹی کانوں نے برداشت کیا۔ ان کی کارگذاریوں نے قیمتوں اور پیداوار کے اتار چڑھاؤ کو تیز کر دیا۔ ان کے زیادہ سنگین اثرات بھی ہوئے۔ ہندوستان کی کول فیلڈس کمیٹی (۱۹۴۶) نے جب جنگ کے درمیانی برسوں کی پیداوار کا جائزہ لیا تو اس نے حسب ذیل تاثرات پیش کئے: "خوشحالی کے دور میں کوئلہ کی کانوں کا کھلنا اور بُرے دنوں میں ان کا بند ہونا۔ ان دونوں کا ملک کے وسائل کے مناسب استحصال پر خراب اثر پڑا کوئلہ کی یہ کانیں سازوسامان کے اعتبار سے برے حال میں تھیں اور ان کا مقصد آسانی سے کوئلہ حاصل کرنا تھا اکثر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کوئلہ پیدا کرنے والے علاقے داغدار (POCKED MARKE) ہو گئے تھے اور کام چھچھلا ہوا جس سے علاقہ میں غیر صحت مند ترقی ہوئی اور خطرناک طور پر آگ لگ سکتی تھی جیسا کہ جھریا کی کوئلہ کانوں میں ہوا"۔ [1]

اس دور میں کئی بار جانچ پڑتال ہوئی جس سے یہ ظاہر ہوا کہ ملک کی مفاد یا مزدوروں کی حفاظت کا لحاظ کئے بغیر کوئلہ حاصل کرنے کا آسان ترین طریقہ کوئلہ کی چھوٹی کانوں ہی تک محدود نہ تھا بلکہ بڑی کانوں کے مالک یکساں طور پر قصوروار ہیں۔ تحفظ اور کان کنی کے بہتر طریقوں پر کوئلہ کی کان کنی کمیٹی میں تفصیل سے بات ہوئی جس کی رپورٹ ۱۹۳۷ء میں آئی اور جس کی تقرری کا خاص سبب یہ تھا کہ کوئلہ کی اہم کانوں میں شدید طور پر آگ پھیل گئی تھی۔ اس کمیٹی نے پتہ لگایا کہ خوشحالی اور بدحالی دونوں حالات میں تباہ کن طریقے استعمال کئے گئے اس نے یہ بھی کہا کہ منیجنگ ایجنٹوں اور ان کے رویوں کی بنا پر یہ طریقے اختیار کئے گئے اور جاری رکھے گئے۔ اس کا ایک اور سبب یہ تھا کہ کوئلہ گریڈنگ بورڈ کی تصدیق کا طریقہ اندرونی تجارت کے لئے بھی استعمال ہونے لگا گرچہ یہ خاص طور پر کوئلہ کی برآمد کے لئے ۱۹۲۵ء میں قائم کیا گیا تھا۔ کوئلہ گریڈنگ بورڈ سے جاری کی جانے والی سرٹیفکیٹ تہوں سے متعلق حوالہ دیتی تھی اور اس طرح صرف تہہ والے حصوں کی کان کنی سے تباہ کن استحصال کی حوصلہ افزائی ہوتی تھی۔ ۱۹۳۷ء کی کمیٹی کی خاص سفارشات یہ تھیں کہ حفاظت

---

[1] رپورٹ ص ۲۳

اور بقا کے لئے لازمی طور پر فرینے سے رکھنے Stowing کا سلسلہ شروع کیا جائے اور کان کے گڑھوں کے گرد باو رکھنے کے خرچ کی حد تک مدد پہنچائی جائے ترتیب سے رکھنے Stowing کے کام کو مالی مدد دینے کے لئے اس کمیٹی نے سفارش کی کہ ریل سے بھیجے جانے والے تمام کوئلہ اور کوک پر ٹیکس لگانا چاہئے اور یہ بھی کہا کہ محصول Cess کے انتظام اور تمام لازمی اور رضا مندانہ طور سے ترتیب سے رکھنے Stowing اور کان کنی کے دوسرے کاموں پر نگرانی رکھنے کے لئے ایک دستوری اقتدار Authority قائم کیا جائے۔ حکومت نے ترتیب سے رکھنے Stowing کے سلسلہ میں اس کمیٹی کی سفارشات منظور کیں اور ۱۹۳۰ء میں ترتیب سے رکھنے کے لئے Stowing بورڈ قائم ہوا۔ اس اقدام کے علاوہ حکومت نے کوئلہ کے وسائل کو باقی رکھنے کے مسئلہ سے متعلق کوئی توجہ نہیں دی۔ یہ مسئلہ کوئلہ کی کان کنی کمیٹی میں کسی قدر زیر بحث آیا اور اس کے ممبروں کی اقلیت نے اس پر خاص طور سے روشنی ڈالی لیکن جنگ اور اس کے مابعد زمانہ میں اس پر مخصوص توجہ دی گئی۔

ہندستان میں لوہے اور فولاد کی صنعت کا قیام ایک رومان انگیز تاریخ رکھتا ہے۔ صحیح معنوں میں یہ ایک صنعتی رئیس، جمشید جی ٹاٹا کی تیز نظر اور پیش بینی کا نتیجہ ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ دوسرے راہنما بھی ہوئے تھے جدید طریقوں کے مطابق لوہا اور فولاد تیار کرنے کی پہلی کوششوں میں مسٹر ہیتھ کی کوشش مدراس میں پورتو نوبو مقام پر ہوئی تھی یہ کام ۱۸۳۰ء میں شروع ہوا اور چھٹی دہائی تک اچھی طرح چلتا رہا۔ دوسری کمتر کوششیں بھی ہوئی تھیں مگر وہ ناکام رہیں۔ ڈھلے ہوئے لوہے Pig Iron کے تیار کرنے کی پہلی کامیاب مہم براکر میں ۱۸۷۵ء میں شروع ہوئی جسے بنگال آئرن کمپنی نے ۱۸۸۹ء میں اپنے ذمہ لے لیا تھا۔ بہت عرصہ تک یہ کمپنی منافع بخش فولاد بنانے میں ناکام رہی چونکہ ملغوبہ کی خراب قسم استعمال ہوتی تھی لیکن بیس سال کی محنت کے بعد بہتر درجہ کا ملغوبہ مل جانے سے یہ کمپنی منافع پر چلنے لگی۔ ۱۹۰۷ء میں مسٹر واٹسن نے اس کمپنی کی پیداوار کا تخمینہ تقریباً ۵۰۰۰۰ ٹن ڈھلا لوہا سالانہ تھا[۱] اگلے دس برسوں میں اس کام میں توسیع ہوئی اور نئے طریقے اپنائے گئے اور صنعتی کمیشن نے اس کی پیداوار کا تخمینہ عام حالات میں تقریباً ۱۰۰۰۰ ٹن ڈھلا لوہا ماہانہ لگایا تھا۔

---

[۱] واٹسن۔ آئرن اینڈ اسٹیل: بنگال، مونوگراف

مسٹر ٹاٹا ہندوستان میں لوہے اور فولاد کی پیداوار کے پروجیکٹ کی طرف اس وقت متوجہ ہوئے جب انھوں نے صوبہ متوسط کے چاندہ ضلع میں لوہا کے کچھ ذخیروں سے متعلق ایک جرمن ماہر کی رپورٹ پڑھی۔ حکام کے ہمت شکن رجحان اور لائسنس کی منظوری سے متعلق پریشان کن قوانین کی وجہ سے وہ اس پروجیکٹ کو آگے بڑھانے میں اس وقت قاصر رہے۔ کچھ برسوں کے بعد جب مسٹر ٹاٹا نے پھر ہندوستان میں لوہا کے منصوبہ سے فائدہ اٹھانا چاہا تو وہ لارڈ جارج ہیملٹن کو جو اس وقت ہندستان کے سکریٹری آف اسٹیٹ تھے، اس پروجیکٹ میں دلچسپی دلانے میں کامیاب ہوئے تو حکومت کی بے توجہی بڑی حد تک ختم ہوگئی۔ مسٹر ٹاٹا ریاستہائے متحدہ سے دھات ساز انجینیر مشیر کے طور پر لائے اور انھوں نے صوبہ متوسط کے جانے پہچانے ذخیروں کا جائزہ لیا۔ چاندہ ضلع کا پہلا متعین مقام لوہارا ناکافی ملغوبہ اور قرب وجوار میں کوئلہ کی کمی کی وجہ سے چھوڑ دینا پڑا۔ اس کے بعد دُرگ کا جائزہ لیا گیا جو صوبہ متوسط کا زیادہ مشرقی ضلع تھا۔ یہاں ملغوبہ کثرت سے تھا۔ لیکن کوئلہ بہت دور تھا۔ اس لئے بہار کے کوئلہ اور دُرگ کے ملغوبہ کے درمیان جگہ کی تلاش کی گئی۔ اس مرحلہ میں ہندستان کا ارضیاتی سروے کے ایک ریٹائرڈ حاکم مسٹر پی۔ ایف بوس کی اطلاع پر سروے کی جماعت میور بھنج ریاست میں داخل ہوئی اور آخر کار لوہا کے ملغوبہ کا عظیم الشان ذخیرہ دریافت ہوا جب کا ایک حصّہ اب ٹاٹا کمپنی کے ذریعہ کام میں آتا ہے[۱] ٹاٹا آئرن اسٹیل کمپنی ۱۹۰۷ء میں بنائی گئی، سارا سرمایہ ہندوستان ہی سے فراہم کیا گیا۔ کارخانہ کی تعمیر کا پہلا فولاد تیار ہوا جیسا کہ پہلے کارخانہ بنا تھا اسے ۱۶۰،۰۰۰ ٹن ڈھلا لوہا اور ۱۰۰،۰۰۰ ٹن فولاد سالانہ تیار کرنے کی پوری صلاحیت تھی۔ کمپنی جیسے ہی اپنے مال کو مارکٹ میں بھیجنے لگی اس کے فوراً بعد ہی جنگ شروع ہوگئی اور اس صنعت کے فروغ کے لئے بڑے سازگار حالات پیدا ہو گئے۔ فولاد کو درآمد کرنا بہت مشکل ہوگیا اور ہندستانی کمپنیوں نے اپنی پیداوار بڑھانے کی حتی المقدور کوشش کی۔ ۱۹۱۶-۱۷ء تک پرانا کارخانہ اپنی پوری طاقت سے کام کر رہا تھا۔ ٹیرف بورڈ سے دیئے گئے اعداد وشمار کے مطابق ۱۴۹۷،۱۴۱ ٹن ڈھلا لوہا ۲۳۴۴،۱۳۹ اٹن فولاد اور ۲۶،۹۸ ٹن تیار فولاد، خصوصاً بھاری پٹریاں اور ترکیب وساخت کے سامان اور ہلکا سامان تیار ہوتا تھا۔ جنگ کے دوران بھاری مانگ سے کمپنی کو اپنے اصل کارخانہ میں بڑے پیمانے پر توسیع کرنے میں حوصلہ افزائی ملی۔ ۱۹۱۶-۱۷ء میں توسیع کی ایک

---

[۱] یہ مرحلہ ۱۹۰۶ء میں پہنچ گیا تھا۔ مسٹر جے۔ این۔ ٹاٹا اسی درمیان فوت کر چکے تھے (۱۹۰۴)

بڑی اسکیم تیار ہوئی۔ اصل توقعات کے مطابق ان ساری توسیعات کو ۱۹۲۱ء تک مکمل ہو جانا چاہئے تھا لیکن شروع میں جنگ کی مشکلات اور اس کے بعد جنگ کے مابعد گرم بازاری کے باعث ڈلیوری ملنے کی ناممکن صورت سے اس پروجیکٹ کی تکمیل کے کام میں دیر ہوگئی اور یہ ۱۹۲۴ء میں پورا ہوا اور اسی سال سے کام کرنے لگا۔

اسی درمیان وہ تمام حالات بدل گئے جن کے تحت یہ صنعت کام کر رہی تھی۔ جنگ کے دوران لوہا اور فولاد کا درآمد کرنا بہت مشکل ہوگیا تھا اور اس لئے قیمتیں اونچی ہوگئیں۔ جنگ کے خاتمے پر قیمت ۱۹۱۹ء میں ہی تیزی سے گر گئی لیکن گرم بازاری جب شروع ہوگئی قیمتیں پھر بڑھنے لگیں اور ۱۹۲۰ء میں وہ ریکارڈ سطح پر آگئیں۔ ۱۹۲۱ء میں کساد بازاری اس حد تک قابل غور تھی جس طرح پچھلے سال اضافہ رونما ہوا تھا اور ۱۹۲۱ء کے بعد قیمتوں میں مزید کمی ہوئی۔ جب کہ فولاد کی قیمت اور اجرت میں نمایاں اضافہ کی وجہ سے پیداوار کی لاگت ۲۳-۱۹۲۱ء بھی کافی بڑھ گئی۔

اس لئے ٹاٹا آئرن اینڈ اسٹیل کمپنی نے ۱۹۲۱ء کے بعد اپنے آپ کو بہت ہی مشکل پوزیشن میں پایا۔ اس صنعت کی حالت کی طرف ہندوستانی محصولی کمیشن (Indian Fiscal Commission) کی توجہ مبذول ہوئی جس نے اپنی رپورٹ میں اس کا خصوصی حوالہ دیا۔ اور جب کمیشن کی سفارشات پر ایک ٹیرف بورڈ کا قیام عمل میں آیا تو سب سے پہلے ٹاٹا آئرن اینڈ اسٹیل کمپنی کی درخواست پیش کی گئی تاکہ اس پر غور کیا جائے۔ ٹیرف بورڈ نے محسوس کیا کہ یہ صنعت گرچہ ہندوستان میں کسی تحفظ کے بغیر پرامن طریقہ سے گزرنے کی توقع نہیں کی جا سکتی ہے۔ ٹاٹا آئرن اینڈ اسٹیل کمپنی کی اریجنل مشین کفایت شعاری سے نہیں چلتی تھی اور ٹیرف بورڈ کا خیال تھا کہ ۱۹۱۶ء کے توسیعی منصوبہ کی تکمیل کے بعد ہی اس کی لاگت کو کفایت شعارانہ بنایا جا سکتا ہے اس کے علاوہ کمپنی کو تربیت یافتہ مزدور باہر سے بلانے پڑتے تھے اور یہ توقع کی جاتی تھی کہ جب ان کی جگہ ہندوستانی ملازمین رہیں گے تو اجرت کا خرچ کم ہو جائے گا اس کے علاوہ مختلف ریلوے کے ساتھ لائنوں کے لئے جو معاہدے ۱۹۱۹ء میں اور اس کے بعد ہوئے تھے وہ نسبتاً کم قیمتوں پر ہوئے تھے اور اس میں کمپنی کو کافی نقصان تھا۔ اس لئے ٹیرف بورڈ اس نتیجہ پر پہنچا کہ ۱۹۲۴ء میں ٹاٹا کمپنی کے لئے اگرچہ منافع بخش قیمت پر فولاد تیار کرنا ممکن نہیں پھر بھی کام کی لاگت میں کمی کے مستقبل میں امکانات ہیں اور اس کی پوری گنجائش ہے کہ یہ صنعت کسی تحفظ کا سہارا لئے بغیر کام کر سکے گی۔ بورڈ نے جس طرح کے تحفظ کی سفارش کی تھی اس کا تخمینہ اس فرق سے لگایا گیا جو ہندوستان

میں فولاد کی درآمدی قیمت کے درمیان تھا جس پر ہندوستانی صنعت گر معقول منافع لے کر اسے بیچ سکتے تھے یہ تحفظ صرف تین برسوں کے لئے ہو سکتا تھا کیونکہ خاص طور پر مستقبل کی قیمتوں کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ یہ تحفظ اس طرح کیا گیا تھا کہ تمام درآمد شدہ فولاد کی قسموں اور کوٹ کر ٹھیک کئے ہوئے لوہے (Wrought iron) پر عام محصولی ٹیکس کے علاوہ فاضل شمار واری ٹیکس لگایا تھا۔
جسے ٹاٹا آئرن کمپنی بھی تیار کرتی تھی کیوں کہ اس کی معمولی قسموں کا استعمال بہت سے کاموں میں ہو سکتا تھا۔ جن کے لئے فولاد استعمال ہوتا تھا۔ ریل کی پٹریوں اور فش پلیٹ (Fish Plate) کو تیار کرنے کے لئے مخصوص سرکاری امداد تین برسوں کے لئے تدریجی طور پر بھی دی جانے کو تھی۔ ان سفارشات کے نتیجہ کے طور پر بورڈ نے یہ بھی سفارش کی کہ تیار کئے ہوئے (Fabricated) فولاد پر ٹیکس میں اضافہ ہو تاکہ وہ دشواری دور ہو جائے جو فولاد کو حفاظت دینے سے ہندوستان کی انجینیرنگ صنعت پر آجائے گی حکومت نے اس سفارش کو منظور کر لیا اور اسٹیل انڈسٹری (تحفظ) ایکٹ ۱۹۲۴ء میں پاس ہوا۔

تقریباً فوراً ہی ٹیرف بورڈ نے اسی سوال پر پھر رپورٹ پیش کی کیونکہ دنیا کی فولاد کی صنعت میں مسلسل سرد بازاری اور بر اعظمی تبادلہ کے ٹوٹ جانے کی وجہ سے قیمت کے اندازہ میں گڑبڑی ہوگئی جس پر ہندوستان میں، فولاد کی درآمد ہو سکتی تھی۔ فولاد کی قیمت بہت نیچے اتر گئی اور کافی درآمد ہوئی۔ اس لئے ٹاٹا کمپنی نے حفاظتی ٹیکس میں اضافہ طلب کیا تاکہ قیمتوں کی نئی صورتحال میں تحفظ کی پرانی سطح قائم رہے۔ اکتوبر ۱۹۲۴ء میں رپورٹ کرتے ہوئے ٹیرف بورڈ نے کئی ٹیکس کے مشورے دیئے تاکہ اس کے اثرات دور ہو جائیں جن کے بدلہ گورنمنٹ نے ایک سال کے لئے مخصوص امداد دی جو کم سے کم ۵۰ لاکھ تھی۔ ۱۹۲۵ء میں مزید جانچ پڑتال ہوئی اور حکومت نے اگلے دو برسوں کے لئے زیادہ سے زیادہ ۶۰ لاکھ روپیہ تک سرکاری امداد کے طور پر دینا منظور کر لیا۔ ۱۹۲۷ء میں تین برسوں کی پہلی مدت ختم ہوگئی اور ٹیرف بورڈ نے ایک دوسری جانچ پڑتال کی کہ فولاد کی صنعت کو حفاظت جاری رکھنے کے مسئلہ پر غور کیا جائے۔

ہندوستان میں تجارتی طور پر فولاد کی تیاری میں پہلی کامیاب ہونے والی کمپنی بنگال آئرن کمپنی تھی جس نے دوسری دہائی کے دوران بڑی ترقی کی۔ جنگ کے زمانہ میں اس کی پیداوار میں اضافہ ہوتا رہا اور جنگ کے آخری برسوں میں اس نے (Ferromagnese) لوہا مینگنز کی کافی مقدار برآمد کے لئے پیدا کی۔ اس کمپنی کے پاس بڑا ڈھلائی گھر تھا اور اس کمپنی نے ڈھلا لوہا میں خاص مقام

پیدا کر لیا تھا۔ جنگ کے بعد کی سرد بازاری کے زمانے میں ڈھیلے لوہے (Pig iron) کی صنعت کو زیادہ نقصان نہیں ہوا۔ اس صنعت میں ہندوستان کو خاص فوائد حاصل تھے اور ٹیرف بورڈ نے ۱۹۲۴ء میں لکھا تھا کہ "ہندوستان دنیا کے تمام ملکوں سے اس وقت بھی زیادہ سستا ڈھلا لوہا پیدا کرتا ہے۔" ۱۹۲۴ تک ڈھلے لوہے کی پیداوار خاص طور منافع بخش تھی۔ بہرحال یہ صنعت فولاد کی صنعت میں سرد بازاری سے متاثر ہوئے بغیر رہی اور ۱۹۲۵ء تک مانگ ڈھیل پڑ گئی اور قیمتیں بہت گر گئیں اور بنگال آئرن کمپنی کو کلٹی میں اپنے کام کا ایک حصہ تھوڑے عرصہ کے لئے بند کر دینا پڑا۔ اس زمانہ میں دراصل قیمتیں اتنی کم ہو گئیں تھیں کہ ٹیرف بورڈ نے تخمینہ لگایا تھا کہ تحفظ کی اسکیم کے تحت خام لوہا بیچنے کے بدلہ ڈھلے لوہا کو فولاد میں جتنا زیادہ منتقل کر دیا جائے اتنا ہی زیادہ منافع بخش ہوگا لوہا کی صنعت میں یہ سرد بازاری جلد ہی ختم ہو گئی اور اس کے بعد چند برسوں کے لئے ہندوستانی کی پیداوار تیزی سے بڑھنے لگی۔ دوسری دہائی میں بنگال آئرن ورکس ۲۰۰۰۰۰ ٹن ڈھلا لوہا سالانہ پیدا کرتا تھا اور اس کا زیادہ حصہ کمپنی کے ڈھلائی گھر اور دوسرے ہندوستانی ڈھلائی گھر میں استعمال ہوتا تھا۔

جنگ کے فوراً بعد ہی انڈین آئرن اینڈ اسٹیل کمپنی کا ایک اہم لوہے کا کارخانہ قائم ہوا جو اسنسول کے پاس ہیراپور میں واقع تھا اور نومبر ۱۹۲۲ء میں پہلی انجن بھٹی (Blast Furnace) نے کام کرنا شروع کیا۔ پہلا پلان فولاد تیار کرنے کا بھی تھا۔ لیکن فولاد کی صنعت کے جنگ کے مابعد حالات کے پیش نظر اس کمپنی نے اس وقت صرف ڈھلا لوہا ہی تیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کارخانہ کی صلاحیت ۲۵۰۰۰۰ ٹن ڈھلا لوہا سالانہ تیار کرنے کی تھی۔ یہ تمام فروخت کرنے کے لئے تھا جس کا زیادہ حصہ ہندوستان سے باہر بھیجا جاتا تھا۔

۱۹۲۷ء میں ٹیرف بورڈ نے دریافت کیا کہ تحفظ کے زمانے میں بہتر طریقے استعمال میں لائے گئے اور اس کے نتیجہ میں نئی توسیعات ہوئیں اور کوئلہ کی کم قیمت سے لاگت میں کمی آئی۔ بہتر حالات کے اثرات کا پورے طور پر احساس نہ ہوا تھا۔ پرانی مشین بیکار ہو گئی تھی اور تمام کارخانے جس طرح قائم تھے آپس میں مناسب طور پر مربوط نہ تھے۔ ان تمام خامیوں کو دور کرنے کے لئے کمپنی نے توسیع کی ایک دوسری اسکیم پیش کی جسے بورڈ نے منظور کر لیا۔ اس سے چند برسوں میں سالانہ پیداوار تقریباً ۶۰۰۰۰۰ ٹن ہو گئی اور کام کی لاگت میں بھی اس سے کافی کمی ہو گی بورڈ کو یہ بھی پتہ چلا کہ اگرچہ غیر ملکی تربیت یافتہ مزدوروں کی جگہ ہندوستانی مزدوروں نے لے لی تھی۔

نیم تربیت یافتہ اور غیر تربیت یافتہ مزدوروں کی تعداد ہنوز بہت زیادہ تھی۔ انھوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ اس صنعت کی حالت گرچہ بہتر ہوگئی ہے پھر بھی پہلے کی بہ نسبت چھوٹے پیمانہ پر تحفظ کی ضرورت ہے۔ سات برس کی مدت کے لیے تحفظ دینے کی سفارش کی گئی اور ٹاٹا کمپنی نے یہ اندازہ لگایا کہ ۴-۱۹۳۳ تک کسی تحفظ کے بغیر اپنا کام پورا کرے گی تحفظ کی مد کا تخمینہ اس طرح ۱۹۲۴ میں کیا گیا تھا جس طرح ۱۹۲۴ء میں کیا گیا تھا۔ سرکاری امداد ختم ہونے والی تھی اور کم ٹیکس لگانے کی تجویز پیش کی گئی۔ حالاں کہ جمشید پور کے حالات کا جائزہ لینے کے بعد ہی تحفظ کا اقدام کیا گیا تھا پھر بھی ہندوستان میں نئے فولاد تیار کرنے والے کے لیے یہ کافی سمجھا گیا۔ بورڈ نے مزید اس بات پر زور دیا کہ ریلوے کے تعاون کے بغیر ہندوستان میں تحفظ کی کوئی اسکیم کامیاب نہیں ہوسکتی، جو ہندوستان میں فولاد تحفظ ایکٹ (Steel Protection Act) پاس ہوا گرچہ مجلس دستور ساز نے بورڈ کی سفارشات کی کافی مخالفت کی کیونکہ بورڈ نے برطانوی فولاد میں امتیاز کیا تھا۔

۴-۱۹۳۳ء میں سات سال کی مدت ختم ہونے پر ٹیرف بورڈ نے ہندستانی لوہے اور فولاد کی صنعت کی پوزیشن کی دوسری جانچ پڑتال کی۔ بورڈ نے یہ معلوم کیا کہ فولاد کی مصنوعات کے لیے مانگ میں کمی آنے کے باوجود اس صنعت نے بڑا فروغ حاصل کیا ہے اور اپنی پیداوار کو برقرار رکھا ہے اور پیداوار کی لاگت کو کم کیا ہے۔ ٹاٹا کمپنی کے حاصل شدہ ہندوستانی مارکٹ کا حصہ ۸-۱۹۲۷ء میں ۳۰ فیصد تھا جو ۳-۱۹۳۲ میں ۲۷ فی صد ہوگیا۔ بورڈ نے تخمینہ لگایا کہ سرمایہ کی تجویز شدہ بہتری اور متوقع پیداوار میں اضافہ سے لاگت میں مزید کمی ہو جائے گی۔ ٹیرف بورڈ نے بتایا تھا کہ کمپنی کی توقعات ۱۹۲۰ء کی ہڑتال، قیمتوں کے گرنے، زیادہ دور مارکٹ کے لیے بڑھا ہوا کرایہ اور ریلوے انجینئرنگ فرم سے متوقع مانگ کے خاتمہ کے سبب سے اپنے اندازے سے کم ہوگئیں۔ اس نے دیکھا کہ تحفظ ہی (Rerolling Industry) پیدا کرنے کی ذمہ دار ہے اور بورڈ نے سفارش کی تھی کہ اس حوصلہ افزائی ہونی چاہیئے۔ بورڈ نے سوچا کہ ڈھلے ہوئے لوہے کے سلسلہ میں اٹاوہ معاہدہ مفید رہا ہے اور اس نے یہ بتایا کہ برطانیہ میں اس کے مسلسل نرمی داخلہ کا انتظام برطانیہ کے جست کی قلعی کی لوہے کی (GALVANISED SHEETS) چادروں پر تیز روی ترجیحی ٹیکس کے بدلہ میں ہونا چاہیئے اس نے یہ بھی سوچا کہ صنعت کے ایسے شعبوں کا ۱۹۴۱ء تک تحفظ جاری رکھنا ضروری ہے جو انھیں اب تک حاصل تھا اور اس نے بتایا کہ اس مدت تک دوسرے شعبوں کو بھی تحفظ دینا چاہیئے۔

لوہے اور فولاد کی صنعت کو تحفظ دینے کے سلسلہ میں ٹیرف بورڈ کی سفارشات ۱۹۳۴ء میں پاس

ہونے والے قانون کے ذریعہ عمل میں آگئیں ۔ چونکہ بعض اہم صورتوں میں ان کے ذریعہ درآمدی ٹیکس میں بہت کمی ہوئی تھی اور اس کے نتیجہ میں کسٹم کے محصول میں تخفیف ہوئی تھی اس لئے حکومت نے ہندوستان میں پیدا ہونے والے فولادی اشیاء پر محصول کی حیثیت سے اکسائز ڈیوٹی کے برابر لوہے اور فولاد جیسی اہم چیزوں پر کسٹم ڈیوٹی لگائی گئی ۔

۱۹۳۴ء کے بعد لوہے اور فولاد کی صنعت کے مارکٹ میں نمایاں ترقی ہوئی اور ٹاٹا کمپنی کی پیداوار برابر سال بہ سال بڑھتی گئی ۔ دنیا کے زیادہ تر ملکوں میں پھر سامان جنگ سے لیس ہونے کے رجحان کی وجہ سے لوہے اور فولاد کی صنعت میں گرم بازاری کی صورتیں ہندوستان کی صنعت بھی شریک ہوئی اس کا اثر ۳۶-۱۹۳۷ء میں محسوس ہونے لگا اور یہ کچھ ردوبدل کے ساتھ ۱۹۳۹ء میں جنگ چھڑنے تک جاری رہا۔ ان حالات سے فائدہ اٹھا کر ٹاٹا آئرن اینڈ اسٹیل کمپنی نے اپنے کام کو بڑھایا اور فولاد کی ایسی بہت سی مصنوعات تیار کرنے کا منصوبہ بنایا جو پہلے درآمد کی جاتی تھیں ۔ انڈین آئرن اینڈ اسٹیل کمپنی نے بنگال آئرن ورکس کو اپنے اندر ضم کر لیا اور ۱۹۳۷ء میں فولاد بنانے کے لئے اسٹیل کارپوریشن آف بنگال کی کمپنی جاری کی ۔ کارپوریشن نے فولاد بنانے کام دراصل نومبر ۱۹۳۹ء میں شروع کیا۔ ڈھلا لوہا تیار کرنے کے لئے میسور آئرن اینڈ اسٹیل ورکس ۱۹۲۰ء میں بھدراوتی میں قائم کیا گیا۔ اس کارخانہ میں ایک فولاد کی مشین کا بھی اضافہ کیا گیا جس کی انجن بھٹی (BLAST FURNACE) لکڑی کوئلہ سے کام کرتا تھا اس خصوصیت کی وجہ سے لازمی طور پر اس یونٹ کی پیداواری صلاحیت محدود تھی تھا شروع کے برسوں میں ٹاٹا آئرن اینڈ اسٹیل کمپنی بڑی حد تک ریلوے کی مانگ کے سہارے چلتی تھی ۔ یہ غلبہ سرد بازاری تک جاری رہا اس دوران میں پٹریوں اور فش پلیٹ کی مانگ بہت کم ہوگئی ۔ اس کے نتیجہ کے طور پر پیداوار کی نوعیت میں اضافہ ہوا اور اس میں تیزی بھی آگئی جس کا اظہار پہلے ہی دوسری دہائی کے دوران ہو گیا تھا، ۱۹۳۶ء کے بعد اس میں مزید تیزی آئی ۔ ۱۹۲۹ء میں ریل پٹریاں اور فش پلیٹ ٹاٹا کمپنی مجموعی پیداوار کا تقریباً تہائی حصہ ہوا کرتے تھے مگر دس برس کے بعد یہ تناسب گھٹ کر تقریباً دسواں حصہ رہ گیا ہندوستان سے ڈھلے لوہے کی برآمد ۳۰-۱۹۲۹ء میں اپنی انتہا کو پہنچ گئی تھی لیکن بعد کے برسوں میں یہ تیزی سے گر گئی ۔ ملک میں ڈھلے لوہے کی پیداوار سرد بازاری کے باعث گھریلو مانگ کے گر جانے اور برآمد میں کمی ہو جانے سے متاثر ہوئی ۔ ۳۴-۱۹۳۳ء کے بعد بیرونی اور اندرونی دونوں مانگیں بتدریج

ہوگئیں اور ۴۰-۱۹۳۹ء میں ڈھلے لوہا کی برآمد پھر ۳۰-۱۹۲۹ء کی سطح پر آگئی۔ ہندوستان کے ڈھلے لوہا کی برآمد کا خاص خریدار جاپان تھا۔

لوہا اور فولاد کی گھریلو پیداوار سرد بازاری سے متاثر نہیں ہوئی کیونکہ فولاد کی تحفظ یافتہ صنعت حالانکہ دشواریوں کا سامنا کررہی تھی تاہم یہ اپنی پیداوار کی بلند سطح برقرار رکھنے اور اسے توسیع دینے کے لئے مسلسل منصوبہ بنارہی تھی پھر بھی فولاد کا کل داخلی صرفہ تیسری دہائی کے دوران گھٹ گیا۔ سرد بازاری کے برسوں میں یہ بہت ہی نیچے نقطہ تک پہنچ گیا اور ۴۰-۱۹۳۹ء میں ہنوز اس سطح سے بہت ہی نیچے تھا جو ۳۰-۱۹۲۹ء میں آگئی تھی [1]۔

جنگ کے بعد گرم کے برسوں میں جب کہ ہر صنعتی عمل کی امید روشن تھی یہ توقع کی گئی کہ جمشید پور کے آس پاس، امعاون صنعتیں قائم ہوجائیں گی۔ ان میں سے زیادہ تر ابتدائی مرحلے سے آگے نہ بڑھیں۔ ان میں سب سے اہم ختم ہونے والا برما کارپوریشن کا پروجیکٹ تھا جو جستہ کے ملغوبہ کو گلایا کرتا تھا اور جس پر ہندوستان میں سلفیورک ایسڈ تیار کرنے کا اہم امکان منحصر کرتا تھا۔ مگر دوسری صنعتیں بھی تھیں جو قائم ہوگئیں۔ ان میں وہ کمپنیاں شامل تھیں جو ریلوے ڈبے، ریل کے انجن، زرعی اوزار، تار کی چیزیں، ٹن پلیٹیں، لوہے کے قلعی شدہ سامان اور کیبل تیار کرتی تھیں۔ ٹاٹا کمپنی نے ان میں سے بہتوں کے ساتھ جیسے اسٹیل وائرس لمیٹڈ، انامیلڈ آئرن ویرس لمیٹڈ اور انڈین ٹن پلیٹ کمپنی فولاد سپلائی کرنے کا خاص انتظام کیا تھا۔ ان میں سے زیادہ تر صنعتوں کو سرد بازاری کے دوران نقصان اٹھانا پڑا اور ان کے تحفظ کے لئے مختلف مطالبات پر ٹیرف بورڈ نے غور کیا۔

اس کے برعکس ہندوستان میں ٹن پلیٹ کی ایک تاریخ تھی۔ انڈین پلیٹ کمپنی ٹاٹا آئرن اینڈ اسٹیل کمپنی اور برما تیل کمپنی کے اشتراک کے نتیجے کے طور پر قائم ہوئی۔ یہ کام دسمبر ۱۹۲۲ء میں شروع ہوا۔ بہت عرصہ تک یہ صنعت ساتھ ساتھ ویلز کی گویا خاص چیز تھی اور یہ ڈر تھا کہ آب و ہوا کے حالات اور ماہر مزدوروں کی کمی اس صنعت کے ہندوستان میں قیام کی منافی ہو۔ دوسری طرف

---

[1] آئرن اینڈ اسٹیل (میجر) بینل نے اس امر کی طرف خاص توجہ دلائی کہ ہندوستان میں ۱۹۳۹ء میں لوہے اور فولاد کا استعمال نہ صرف ۱۹۲۹ء سے کم ہے جب کہ ۱۹۱۴ء سے بھی کم ہے۔ گورنمنٹ آف انڈیا، پلاننگ اینڈ ڈیولپمنٹ ڈپارٹمنٹ فرسٹ رپورٹ آف دی آئرن اینڈ اسٹیل (میجر) بینل، ۱۹۴۰ء، باب اول

اس صنعت کو تھرمیلو مانگ کا فطری فائدہ حاصل تھا۔ ۱۹۲۴ء میں اس صنعت کو تحفظ دینے کی سفارش کی گئی اور اس کے نتیجہ میں اگلے تین برسوں میں بڑی تیزی سے ترقی ہوئی، پیداوار میں اضافہ ہوا اور کام کی لاگت بھی گھٹ گئی۔ دراصل ۱۹۲۷ء میں ٹیرف بورڈ نے سوچا تھا کہ یہ صنعت امتیازی تحفظ کی پالیسی کے تحت نسبتاً مختصر دور میں ممکن صنعتی ترقی کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔ اس صنعت کی ترقی سے مزید یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستانی مزدور آسانی سے تربیت پا سکتے ہیں چونکہ چھ برسوں کے اندر غیر ملکیوں کی تعداد گھٹ کر نصف ہو سکتی تھی۔ ٹیرف بورڈ نے ۱۹۲۷ء میں سات برسوں کے لئے تخفیف شدہ پیمانہ پر مسلسل تحفظ کی سفارش کی تھی اور رولیز کے صنعت گروں کے اس دعوی کو رد کر دیا تھا کہ یہ صنعت کبھی بھی اپنے پیروں پر کھڑی نہیں ہو سکتی ہے۔

جنگ کے درمیانی دور میں ہندوستان کی پٹرولیم صنعت نے کسی توسیع کی علامت ظاہر نہیں کی۔ برما ابھی بھی سب سے زیادہ معدنی تیل پیدا کرتا تھا۔ جنگ کے دوران برما کی کانوں نے اپنی پیداوار بڑھائی تھی لیکن ۱۹۲۱ء کے بعد اس سرچشمہ سے پیداوار میں کمی ہو رہی تھی۔ پھر بھی آسام اور اٹک کی کانوں میں توسیع کے واضح امکانات روشن ہو رہے تھے

دنیا کی پٹرولیم صنعت نے پہلی جنگ عظیم کے بعد کمیت کے اعتبار سے بڑی ترقی کی پھر بھی جنگ کے درمیانی دور میں ہندستانی صنعت میں کوئی توسیع نہیں ہوئی جب کہ اس کے ساتھ برما کافی تیل پیدا کرتا تھا۔ جب اس عرصہ میں برما کی پیداوار تقریباً ساکت تھی، پنجاب اور آسام کی کانوں نے بالخصوص آخر الذکر نے تناسب کے اعتبار سے کافی اضافہ کیا۔ پھر بھی ان دونوں سرچشموں سے پیداوار ۱۹۳۹ء میں نسبتاً مختصر تھی۔ مختلف ریاستوں میں پٹرولیم کی کل پیداوار منتخب ریاستوں میں کیا تھی، اس کا اندازہ (ہزار گیلن میں) حسب ذیل جدول سے ہوتا ہے۔

	۱۹۲۰	۱۹۲۹	۱۹۳۵	۱۹۳۸
برما	۲۷۹,۷۰۷	۲۵۳,۴۰۱	۲۵۱,۳۳۹	—
پنجاب	۵۱	۱۹,۲۰۹	۳,۴۳۷	۲۱,۱۱۳
آسام	۱۳,۳۵۸	۳۳,۵۳۹	۶۷,۸۸۷	۶۵,۹۶۹

داخلی پیداوار کے نصف حصہ سے زیادہ مٹی کا تیل اور چوتھائی سے زیادہ پٹرول تھا۔ ۱۹۱۴ء کے پہلے معدنی تیل کی خاص مانگ جو زیادہ تر درآمد کے ذریعہ پوری ہوتی تھی وہ مٹی کے تیل کی تھی۔ یہ مانگ ۱۹۱۴ء کے قبل دہے میں تیزی سے بڑھ گئی لیکن درآمد کی دشواریوں کی وجہ سے جنگ کے دوران کم ہوگئی۔ جنگ کے مابعد برسوں میں مٹی کے تیل کی درآمد جنگ سے پہلے کی سطح پر پھر آگئی اور ۱۹۲۹-۳۰ء تک برابر بڑھتی گئی۔ سرد بازاری کے برسوں میں یہ شدید طور پر کم ہوگئی اور مٹی کے تیل کا ۱۹۳۸-۹ء میں کل صرفہ ۱۹۲۹-۳۰ کے کل تک نہیں پہنچا۔ جنگ کے مابعد زمانہ میں پٹرولیم انڈسٹری کی دوسری مصنوعات بالخصوص پیٹرول اور جلانے کے تیل کے لئے ہندوستان مانگ اہم بن گئی اور دوسرے دہے کے دوران تیزی سے بڑھ گئی۔ پیٹرول کی مانگ خاص طور پر داخلی پیداوار سے پوری کی جاتی تھی اور درآمد مختصر تھی۔ جلانے کے تیل کی داخلی پیداوار بہرحال قابل نظر انداز تھی اور اور درآمد کے ذریعہ ہی زیادہ مانگ پوری ہوتی تھی۔ یہ درآمد ۱۹۱۸-۱۹ء میں ۲ کروڑ ۸۰ لاکھ گیلن تھی جو بڑھ کر ۱۹۲۷-۸ء میں ۱۰ کروڑ گیلن ہوگئی۔ ۱۹۳۴-۵ء تک یہ جامد رہی اور بعد کے برسوں میں ۱۹۳۹-۴۰ء تک ۱۳ کروڑ گیلن کی سطح کے اوپر پہنچی۔

پہلی اپریل ۱۹۳۷ء میں برما ہندوستان سے الگ ہوگیا۔ اس سے پیداوار خصوصاً پٹرولیم انڈسٹری کی مصنوعات کے سلسلہ میں تجارتی اعداد پر سخت اثر پڑا۔ بہرحال برما کی پیداوار اور تجارت حالانکہ ۱۹۳۷ء کے بعد داخلی نہیں کی جاتی تھی پھر بھی انتظامیہ کے ردوبدل ہونے سے پیداوار کی سطح اور مبادلہ پر اثر نہیں پڑا۔ حسب ذیل جدول سے ۱۹۳۸-۹ء کے اعداد و شمار اس تبدیلی کو ظاہر کرتے ہیں جو برما کے الگ ہونے سے رونما ہوئی۔

درآمد (ہزار گیلن)	جنگ کے ماقبل کا اوسط	جنگ کے مابعد کا اوسط	۱۹۲۹-۳۰ء	۱۹۳۴-۵ء	۱۹۳۸-۹ء
مٹی کا تیل	۶۶,۹۰۹	۶۳,۴۱۸	۱۰۶,۴۵۷	۶۸,۶۴۶	۱۸۲,۰۵۴
دوسرے معدنی تیل	۲۴,۰۵۶	۷۵,۵۱۵	۱۴۶,۳۱۱	۱۳۲,۶۸۶	۲۵۶,۹۵۷
جن میں: پیٹرول			۴,۶۵۵	۱,۴۸۳	۸۵,۸۲۱
جلاون کا تیل			۱۱۰,۲۰۳	۱۱۱,۲۶۳	۱۳۶,۷۸۸

مینگنیز کی صنعت کو جنگ کے ابتدائی برسوں میں نقصان سہنا پڑا لیکن جب متحدہ ملکوں (ALLIED COUNTRIES) میں جنگی سامان تیار کرنے کی زبردست مانگ محسوس ہونے لگی تو وہ ۱۹۱۶ء میں دوبارہ بحال ہوئی۔ جہازرانی کی دشواریوں کی وجہ سے جنگ کے دوران برآمد کم رہی۔ جنگ کے مابعد تریب دور میں یہ کسی قدر جنگ کے قبل کی سطح سے زیادہ تھی اور دوسری دہائی کے اواخر میں یہ زیادہ اونچی سطحوں تک پہنچ گئی۔ مینگنیز کے ملغوبہ کی عالمی مانگ کا گہرا تعلق فولاد کی صنعت کی دولت سے ہے۔ تیسری دہائی کے اوائل میں اس صنعت میں شدید سرد بازاری سے مانگ گھٹ گئی اور برآمد میں بھی سخت کمی واقع ہوئی۔ اس دہائی کے اواخر میں گرم بازاری کے حالات سے صورت حال تیزی سے سنبھل گئی اور برآمد نے ۸-۱۹۲۷ء میں بلندی کا ریکارڈ قائم کیا۔ بعد کے برسوں میں یہ سطح برقرار نہ رہی۔ گھریلو پیداوار تقریباً تمام تر برآمد کے لئے تھی اور خارجی مانگ کے حساب سے بدلتی تھی۔ زیادہ تر پیداوار صوبہ متوسط کی کانوں سے حاصل ہوتی تھی۔ جاپان تیسری دہائی میں ہندوستانی مینگنیز کے ملغوبہ کا اہم درآمد کرنے والا ملک ہوگیا تھا۔ جنگ کے درمیانی دور کے بڑے حصہ میں روس جو ہندوستان کا خاص حریف تھا اس دوڑ سے الگ رہا۔ گھریلو لوہے اور فولاد ۱۹۲۹ء تک فولاد کی اعلیٰ قسم کی تیاری میں کام نہیں آئے تھے جس کے لئے مینگنیز کی ضرورت ہوتی ہے۔ ۱۸-۱۹۱۷ کے دوران برآمد کے لئے لوہا۔ مینگنیز (فیرو مینگنیز) تیار کرنا منافع بخش تھا۔ اور یہ برآمدات ۱۹۱۸ء میں ۱۱۰۰۰ ٹن ہوگئیں مگر دوسری دہائی کے دوران یہ کم ہوگئیں، ۲ اور ۵ ہزار ٹن کے درمیان تھیں اور ۱۹۳۰-۱ء کے بعد بالکل ہی ختم ہوگئیں۔ مقدار کے اعتبار سے ہندوستان میں مینگنیز کے ملغوبے کی پیداوار دوسری دہائی میں تقریباً [illegible] ۱۰ لاکھ ٹن کی سطح پر رہی اور ۳-۱۹۳۲ء میں یہ گھٹ کر ۲ لاکھ ٹن سے کچھ زیادہ رہی اور ۳۶ [illegible] میں [illegible] پھر اپنی پچھلی سطح پر آگئی۔ اس کے مقابلہ میں برآمد دوسری دہائی میں ۶ اور ۹ [illegible] کے درمیان تھی، ۳-۱۹۳۲ء میں ۲ سے کم تھی اور ۱۹۴۰ء میں ۱۰ لاکھ کی حد تک پہنچ گئی۔

ابرک بھی جنگ کے درمیانی دور میں تقریباً تمام برآمد کے لئے ہی پیدا کیا جاتا رہا۔ ابرک خاص طور پر بہار کے ضلعوں میں پیدا ہوتا ہے اور اس کے بلاک براہ راست برآمد کئے جاتے ہیں جنگ چھڑ جانے پر یہ صنعت برآمدی مانگ کے ختم ہو جانے سے نقصان اٹھانے لگی پھر بھی جنگی سامان کی ضرورتوں کے لئے حکومت نے ابرک کی تمام قسموں کو خریدنا شروع کیا اور یہ صنعت جنگ کے دوران خوشحالی کے دور سے گذری۔ یہ جنگ کے مابعد سرد بازاری سے متاثر ہوئی لیکن اس کے

بعد وہ برابر ترقی کرتی گئی تیسری دہائی کے اوائل کی سرد بازاری سے پیداوار متاثر ہوئی اور برآمد بھی کسی قدر اس کی زد میں آئی پھر دونوں کی حالتیں سنبھل گئیں۔ یہاں تک کہ ۱۹۳۶ سے لے کر ۱۹۳۹ء تک اس کی مقدار دوسری دہائی کی سطح کی تقریباً دوگنی ہوگئی۔ ابرک کی برآمدات کی جنگ کے ماقبل اور جنگ کے مابعد کی اوسطیں بالترتیب ۴۹ اور ۶۰ ہزار ہنڈرویٹ تھیں۔ دوسری دہائی میں سب سے زیادہ برآمد ۳۰-۱۹۲۹ء میں ایک لاکھ ۱۵ ہزار ہنڈرویٹ ہوئی، جب کہ ۴۰-۱۹۳۹ء میں برآمد ۲ لاکھ ۱۷ ہزار ہنڈرویٹ پہنچ گئی تھی۔

چائے کی صنعت اپنے آغاز سے برابر ترقی کرتی رہی اور تقریباً مسلسل دولت کماتی رہی اور جب جنگ چھڑ گئی تو اس کا حال اور بہتر ہوگیا۔ جنگ کے فوراً بعد ہی قیمتیں اونچی ہوگئیں اور چائے کی اور زیادہ پیداوار کے لئے تقویت مل گئی۔ پیداوار اور برآمد کے ریکارڈ جلد ہی ٹوٹ گئے۔ جنگ کے اواخر میں بہرحال ٹن کے حساب سے محصول کی دشواری محسوس کی گئی۔ اور ۱۷-۱۹۱۶ کے درمیان قیمت کی اونچی سطح برقرار نہ رہ سکی۔ بہرحال جنگ کے آخری سالوں میں برطانیہ کی وزارت غذا کی طرف سے جب بڑے پیمانے پر خریداری عمل میں آئی تو ہندستانی صنعت کو کافی سہارا ملا۔ ۱۹-۱۹۱۴ء کے سال نخل بندیوں کے لئے خوب اچھے سال تھے ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۷ء تک قیمتیں جنگ کے ماقبل کی سطح پر تھیں مگر مزدوروں کی اُجرت ٹھہری ہوئی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اچھے منافع کا دور آگیا اور نئے باغات کی توسیعات کے منصوبے بنائے گئے اور پرانے باغات نے اپنی پیداوار تیزی سے بڑھالی۔ ۱۹۱۹ میں وقفہ آگیا اور اگلے دو برسوں تک سخت بازاری کا زمانہ رہا۔ چائے کی کمپنیوں کے لئے ۱۹۲۰-۲۱ء کا سال بدترین سال تھا۔ دوسری صنعتوں کے برعکس صورتِ حالات تیزی سے سنبھل گئی اور ۱۹۲۱-۲ سے بڑھتی ہوئی قیمتوں اور پیداوار کا دوسرا دور شروع ہوا۔

چائے کی صنعت میں نسبتاً ترقی برقرار رکھنے کا ایک اہم سبب یہ تھا کہ اس کے پیدا کرنے والے برآمد اور پیداوار کو محدود رکھنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ تیسری دہائی کے اوائل میں جو بڑی سرد بازاری رونما ہوئی اس میں یہ خاص طور پر اہم ثابت ہوا۔ اسی وقت بین الاقوامی مصالحت حاصل کرنے کی ابتدائی کوشش کامیاب نہیں ہوئی اور ۱۹۳۱ اور ۱۹۳۲ء میں اس صنعت نے ناموافق حالات کا سامنا کیا۔ نئی کوششیں بھی ہوئیں اور ۱۹۳۳ سے ہی تین پیدا کرنے والے ملک ہندستان، لنکا اور انڈونیشیا پانچ برسوں کے لئے برآمد کو محدود کرنے پر راضی ہوئے، باغات کی توسیع

کو محدود کرنے پر تیار ہوئے پانچ برس کی مدت میں پیداوار اور تجارت کے تمام عالمی حالات کی روشنی میں ہر ملک کو بنیادی سال کے مطابق کوٹہ ملنا تھا۔ برآمد کے بین الاقوامی کنٹرول کی اسکیم ۱۹۳۸ء میں مزید پانچ برسوں کے لئے توسیع کردی گئی۔ اس بین الاقوامی اسکیم کا انتظام بین الاقوامی چائے کمیٹی International Tea Committee سے ہوتا تھا اور حکومت نے بین الاقوامی چائے مصالحت کی دفعات کو روبہ عمل لانے کے لیے ۱۹۳۸ء میں انڈین چائے کنٹرول ایکٹ پاس کیا چائے کی برآمد اور کاشت کی توسیع پر کنٹرول رکھنے کی خاطر اس ایکٹ کے تحت ایک انڈین ٹی لائسنگ کمیٹی کی تشکیل ہوئی۔ اس مصالحت کے عمل سے ہندوستان چائے کی برآمد اوسطاً دوسری دہائی کے اواخر کی سطح سے تیسری دہائی میں کسی قدر نیچی سطح پر تھی۔ تیسری دہائی میں پیداوار اور ایکڑی رقبہ میں بھی متوازن طور پر اضافہ ہوا۔ ۱۹۲۰ء کے قبل دس برسوں تک برآمد، پیداوار اور ایکڑی رقبہ میں تیزی سے ترقی ہوئی۔ جنگ اور جنگ کے بعد اوسط برآمد ۲۲ کروڑ پونڈ کے گرد تھی اور دوسری دہائی کے ختم ہونے والے برسوں میں یہ ۳۶ کروڑ تک پہنچ گئی۔ دوسری دہائی کے دوران ۷۰۰ ہزار ہزار ایکڑ سے ۸۰۰ ہزار ایکڑ ہو گیا اور پیداوار تقریباً ۲۵ کروڑ پونڈ سے بڑھ کر ۴۰ کروڑ سے زیادہ ہو گئی۔ ۱۹۱۵ کے بعد والے دور میں ایکڑی رقبہ میں اضافہ کا تقریباً نصف حصہ دکھن میں ہوا۔ اس نے اس صنعت میں دکھن کی اضافی اہمیت کو بڑھا دیا حالاں کہ آسام کو ابھی بھی غلبہ حاصل رہا اور کل ایکڑی رقبہ اور پیداوار کا نصف سے زیادہ حصہ اسی کا تھا۔ جنگ کے بعد ہندوستان نے چائے کے روسی بازار کو کھو دیا تھا جو جنگ سے پہلے بڑھ رہا تھا اور جنگلوں کے پورے درمیانی دور میں برطانیہ ہی ہندوستانی چائے کا خاص درآمد کرنے والا ملک تھا۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں ربر کی کھیتی تجارتی پیمانہ پر ۱۹۰۲ء میں شروع ہو گئی تھی۔ ۱۹۱۰ء تک ربر کے زیر کاشت رقبہ بڑھ کر ۲۹٫۵۰۰ ایکڑ ہو گیا اور ۱۹۱۴ء تک تقریباً ۴۶٫۰۰۰ ہو گیا۔ جنگ کے دوران اور اس کے بعد ربر کے استعمال اور ربر کے مارکٹ میں تیزی سے توسیع ہوئی اور ساری دنیا میں پیداوار تیزی سے بڑھنے لگی ہندوستان میں ربر کا ایکڑی رقبہ ۱۹۱۹ء میں ۱۱۸٫۵ ہزار ایکڑ پہنچ گیا تھا۔

۱۹۳۲ء تک کے دور میں نئے کھیتوں میں تیزی سے اضافہ ہوا اور اس کی خاص خصوصیت یہ تھی کہ نسبتاً بڑا حصہ چھوٹے قطعہ کاشت یعنی ۱۰۰ سے اوپر ایکڑی رقبہ والی جائداد کے مقابلہ میں ۱۰۰ ایکڑ سے کم رقبہ والے کھیت کا تھا۔ ۱۹۳۰ اور اس کے بعد میں قیمتوں کے گرنے سے نئی کھیتیوں

بالخصوص چھوٹے کاشت کرنے والوں کی ہمت شکنی ہوئی۔ ۱۹۳۴ء میں ایک بین الاقوامی ربر ریگولیشن ایگریمنٹ وجود میں آیا جس کی رو سے ربر کی پیداوار اور نئی کھیتیاں محدود اور باقاعدہ ہوگئیں۔ اس سمجھوتے کے عمل میں آنے سے ربر کی قیمتیں بڑھنے لگیں۔ بعد کے برسوں میں نئی کھیتیاں اور باقاعدہ ہوگئیں۔ اس سمجھوتے کے عمل میں آنے سے ربر کی قیمتیں بڑھنے لگیں۔ بعد کے برسوں میں نئی کھیتیاں ہندوستان میں اس حد تک بڑھ گئیں جس حد تک کی اجازت بین الاقوامی سمجھوتے نے دی تھی۔

۱۹۳۶ء تک برما ربر کے اعداد و شمار میں شامل تھا۔ ۱۹۳۶ء میں ختم ہونے والی دہائی میں مدراس اور کوچین میں ربر کا ایکڑی رقبہ جامد رہا اور یہ خاص طور پر برما اور ٹراونکور میں بڑھا تھا۔ ۱۹۲۶ اور ۱۹۳۶ء کے درمیان مختلف علاقوں میں ربر کے ایکڑی رقبہ کا فرق حسب ذیل جدول سے ظاہر ہوتا ہے:

ربر کے تحت ایکڑی رقبہ

	برما	ٹراونکور	مدراس	کوچین	ہندوستان گیر
۱۹۲۶	۶۹,۱۸۴	۴۳,۵۹۲	۱۴,۲۰۴	۸,۹۸۶	۱۲۹,۴۹۱
۱۹۳۳	۱۰۵,۰۸۶	۹۵,۸۳۲	۱۱,۶۰۴	۹,۵۳۰	۲۲۴,۱۷۸
۱۹۳۶	۱۰۶,۲۱۸	۹۶,۷۷۲	۱۲,۴۳۹	۹,۵۳۰	۲۲۸,۸۴۱

ہندوستان (برما چھوڑ کر) میں ربر کے تحت ایکڑی رقبہ ۱۹۳۳ء میں ۱۱۹ ہزار ایکڑ تھا جو بڑھ کر ۱۹۴۰ء میں ۱۳۸ ہزار ایکڑ ہوگیا۔

ہندوستان میں ربر تیار کرنے کی صنعت ۱۹۲۰ء میں شروع ہوئی جب کلکتہ میں ربر کے عام سامان کا کارخانہ قائم کیا گیا تھا۔ اس صنعت کا حقیقی آغاز اس وقت ہوا جب بین الاقوامی ربر ریگولیشن ایگریمنٹ (۱۹۳۴ء) عمل میں آیا۔ اس سمجھوتے کے مطابق برآمد کے کوٹہ سسٹم کے نتیجہ کے طور پر ملک میں خام ربر کا کافی حصہ بچ جاتا تھا۔ یہ ہندوستان کی مصنوعات انڈسٹری کو عالمی قیمت سے کم قیمت پر دستیاب ہو جاتا تھا۔ اسی دور میں سمندر پار ربر کے سامان بنانے والوں

نے اپنی پیداوار کو غیر مرکزی بنا دیا اور کچھ لوگوں نے ہندوستان میں کارخانے قائم کیے۔"[1]

۱۹۳۰ء سے پہلے ہندوستان میں خام ربر کی تقریباً پوری پیداوار باہر بھیجی جاتی تھی مگر ۱۹۳۹ء تک اس کا تہائی حصہ ملک میں مصنوعات کے لئے چھوڑ دیا جاتا تھا۔ اس کے نتیجہ میں ربر کی مصنوعات کے چھوڑ دیا جاتا تھا۔ اس کے نتیجہ میں ربر کی مصنوعات کی درآمد جو خاص طور پر موٹر، سائیکل کے ٹائر پر مشتمل تھی۔ ۵-۱۹۲۴ء کے بعد مقدار میں گھٹنے لگی۔

صنعتی کمیشن نے بتایا تھا کہ بھاری کیمیاوی اشیاء کا استعمال میں نہ آنا ہندوستان کا سب سے بڑا صنعتی نقص ہے۔ جنگ کے حالات اور جنگ کے سامان کے لئے مختلف کیمیاوی اشیا کی تیز مانگ نے اس صنعت کو قومی اہمیت کو واضح کر دیا اور یہ توقع کی جاتی تھی کہ مواقع اور جنگ کے دوران ملنے والی مخصوص حوصلہ مندی سے ہندوستان میں کیمیاوی انڈسٹری قائم ہوگی۔ بہرحال یہ توقعات پوری نہیں ہوئیں۔ کیمیاوی اشیاء کے لئے ہندوستانی مانگ مختصر تھی چونکہ کافی مقدار میں بھاری کیمیاوی چیزیں استعمال کرنے والی صنعتیں جیسے گلاس اور صابن یا رنگ اور دوائیں، نہ تھیں۔

جنگ کے بعد ہندوستان میں کیمیاوی اشیا کے لئے مانگ بڑھ گئی اور اس صنعت میں اس حصہ کو کافی فروغ حاصل ہوا جو سلفیورک تیزاب پر مبنی تھا۔ بہرحال سلفیورک تیزاب درآمد شدہ گندھک سے تیار ہوتا تھا اور اس کی لاگت اونچی تھی پیداوار کے یونٹ مختصر تھے اور مقامی مانگ کو پورا کرنے کے لئے بڑی صنعتوں کے مراکز کے پاس کارخانے بنائے گئے۔ ٹیرف بورڈ جس نے اس صنعت کے تحفظ کی درخواست پر رپورٹ پیش کی تھی اس نے بتایا کہ جب بھاری کرایہ کی وجہ سے ایسڈ کی تیاری ہندوستان میں عموماً منافع کے ساتھ ہو رہی تھی، اس کے تحفظ کے نہ ہونے سے سلفیورک ایسڈ سے حاصل ہونے والے نمک کی تیاری چھوٹے پیمانہ کے علاوہ نہیں ہوتی ہے۔ ٹیرف بورڈ کا خیال تھا کہ گندھک کی مقامی سپلائی ہونے کی وجہ سے کوئی بڑی رکاوٹ نہیں ہے اور اس کی رائے تھی کہ اس کی خاص قومی اہمیت کی وجہ سے اس صنعت کو تحفظ دینا ضروری ہے اپنی ٹھوس تجویز پیش کرتے ہوئے ٹیرف بورڈ عجیب و غریب دشواری سے دوچار ہوا۔ یہ کسی کارخانہ کی اصل لاگت کی بنیاد پر ان تجاویز کو پیش نہیں کر سکتا تھا چونکہ جانچ پڑتال کے وقت تمام کارخانے بڑے ہی چھوٹے پیمانہ پر چل رہے تھے۔ ہندوستان میں بھی کیمیاوی اشیاء کا سب سے

---

[1] رپورٹ آف دی ٹیرف بورڈ آن دی ربر پلانٹیشن انڈسٹری (۱۹۵۱ء) پیراگراف ۶

بڑا بازار تھا اور ٹیرف بورڈ نے ایک ایسے کارخانہ سے کم از کم سائز کی بنیاد پر تجاویز رکھی تھیں جو پورے بمبئی کی ضرورتوں کو پورا کر رہا تھا۔ بورڈ کا یہ بھی خیال تھا کہ سارے ہندوستان کی ضرورتوں کو پورا کرنے والے یونٹ کی بنیاد پر ہی مصنوعات کی نئی تنظیم زیادہ مناسب ہوگی۔ بہرحال اس انضمام یا جزوی انضمام کے لئے کوئی تدابیر پیش نہیں کی گئیں۔ حکومت نے گرچہ اپنی تجویز میں (ستمبر ۱۹۳۱) یہ تسلیم کیا تھا کہ ٹیکس لگانے سے موجودہ تنظیم میں ردوبدل ہونے کے بدلہ یہ ہمیشہ قائم رہے گی اس نے ٹیرف بورڈ کی تجویز کردہ ٹیکس کو مناسب سمجھا اور اسے زیادہ تر جماعتوں کی مصنوعات کی درآمد پر عائد کیا۔

حکومت کے ٹیکس لگانے کے بعد ٹیرف بورڈ کے بتائے ہوئے راستوں پر اس صنعت میں یونٹ کی کوئی نئی تنظیم نہیں ہوئی۔ ٹیرف بورڈ نے تخمینہ لگایا تھا کہ ہندوستان میں سلفیورک ایسڈ کا مارکٹ تقریباً ۱۲۰۰۰ ٹن کا ہے۔ اصلی پیداوار بہت زیادہ کم تھی اور بورڈ نے بتایا تھا کہ کلکتہ اور بمبئی کے نزدیک دو یونٹوں میں سے کوئی بھی پورے مارکٹ کو سپلائی کر سکتا تھا مگر یہ باہمی انتظام سے اپنی ممکن پیداوار کا صرف ایک معمولی حصہ کافی لاگت پر پیدا کر رہے تھے۔ تیسری دہائی میں صنعتی ارتقا نے ہندستانی مارکٹ کے سائز کو بہت ہی بڑھا دیا۔ بہرحال بورڈ کے بتائے ہوئے حالات قائم رہے۔ اس صنعت میں یونٹ کی تعداد ۱۹۴۰ء میں ۴۲ تھی یہ تمام منتشر تھیں اور ان کی کل پیداواری صلاحیت ۵۰۰۰۰ ٹن تھی۔ بہرحال تیسری دہائی کے اواخر میں گرچہ اندرونی مانگ بڑھ گئی تھی تاہم ۱۹۴۰ء کے پہلے کسی بھی سال میں پیداوار ۲۸۰۰۰ ٹن سے زیادہ نہ تھی

تیسری دہائی کے دوران ایسی ہندستانی صنعتیں بھی ترقی پائیں جن میں سلفرک ایسڈ کے علائی کیمیاوی مصنوعات کی اہم خام اشیاء تھیں۔ ۱۹۲۹ء کے قبل دہائی میں اس کا اظہار مختلف قسم کی کیمیاوی اشیا کی درآمد کے اضافہ سے ہوتا ہے۔ پھر بھی اس زمانہ میں کیمیاوی اشیاء کی مقامی تیاری میں کوئی اہم ترقی نہیں ہوئی۔ اپنی رپورٹ (۱۹۲۹) میں ٹیرف بورڈ نے ملک کے اندر چٹان فاسفیٹ کی بنیاد پر سوپر فاسفیٹ تیار کرنے کے کارخانہ کو تقویت دینے کی سفارش کی تھی۔ حکومت نے اس سفارش کو منظور نہیں کیا اور جنگ سے پہلے ہندوستان میں اس قسم کا کوئی یونٹ مصنوعات کے لئے قائم نہیں ہوا۔

ہندوستان میں گنا کا ایکڑی رقبہ جو نویں دہائی میں کچھ انحطاط کا شکار ہوا تھا وہ بیسویں صدی کی پہلی دہائی کے دوران ٹھہرا رہا۔ خاص طور پر گڑ کے دام کافی بڑھ جانے کی وجہ سے جنگ کے مابعد دور میں اس نے ترقی کی۔ دوسری دہائی کے اخیر میں درآمد شدہ چینی کی قیمت کافی گھٹ جانے سے

گنا کا ایکڑی رقبہ گھٹ کر پرانی سطح پر آگیا۔ گڑ ہندوستان کے گنا کی خاص پیداوار تھی۔ اس کی پیداوار ۲۵ اور ۳۰ لاکھ ٹن کے درمیان بدلتی رہتی تھی۔ تمام طریقوں سے سفید چینی کی پوری پیداوار کا تخمینہ دوسری دہائی میں ۳ لاکھ ٹن کے لگ بھگ تھا۔ جنگ کے مابعد میں ہندوستان میں گنا کے زیر کاشت ایکڑی رقبہ کا تین چوتھائی صوبہ متحدہ (۵۰ فیصد)، پنجاب (۱۵ فیصد)، بہار اور اڑیسہ (۱۰ فیصد) میں تھا۔ جنگ کے دوران ہندوستان میں چینی کی درآمد میں کمی واقع ہوگئی تھی لیکن جنگ کے پہلے کی سطح پھر ۱۹۲۵ء تک آگئی صارفین کی مانگ بڑھ جانے سے بعد کے برسوں میں درآمد کی سطح میں مزید اضافہ ہوا۔ درآمد شدہ چینی کی قیمت جو جنگ کے فوراً بعد برسوں میں بہت اونچی سطح پر آگئی تھی، ۲-۱۹۲۱ء میں تیزی سے گرگئی اور اس کے بعد مسلسل گرتی رہی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ درآمد شدہ چینی پر محصولی ٹیکس کئی بار بڑھایا گیا۔ اس زمانہ میں چینی کی عالمی پیداوار میں برابر اضافہ ہوتا رہا اور چونکہ بہت سے ملکوں میں چینی کی درآمد پر پابندیاں تھیں اس لئے آزاد عالمی مارکٹ میں ۹-۱۹۲۸ء کے بعد چینی کی قیمت تیزی سے گرگئی۔ ۱۹۳۰ء میں اپریل کانسل آف ایگری کلچرل ریسرچ نے حکومت سے درخواست کی کہ ہندوستان کی چینی کی صنعت کے لئے تحفظ کا سوال ٹیرف بورڈ کے سامنے پیش کیا جائے اور اس اقدام کے ساتھ کاؤنسل نے بتایا کہ صوبہ متحدہ، پنجاب اور بہار اور اڑیسہ کی صوبائی حکومتوں نے اس کے لئے خاص طور پر کہا ہے۔

اس سوال کا جائزہ لینے پر ٹیرف بورڈ عجیب و غریب حالات سے دوچار ہوا۔ چینی کی صنعت کو تحفظ دینے کے معنی تھے کہ مختلف قسم کے پیدا کرنے والوں کا خیال کیا جائے۔ ہندوستان کے کچھ حصّوں میں بعض ایسے کاشتکار تھے جن کی معیشت میں گنا اہم رول ادا کرتا تھا۔ پھر گڑ تیار کرنے والے مختلف لوگ تھے، دیہات کے کھانڈ بنانے والے تھے جو بھورے رنگ کی چینی تیار کرتے تھے، پھر مقامی بل، طریقہ سے سفید چینی تیار کرنے والے تھے ان کے علاوہ گڑ صاف کرنے والے کارخانے تھے جو گنے سے براہ راست چینی تیار کرتے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا جب ٹیرف بورڈ کے سامنے زرعی مفاد کے تحفظ کا سوال پیدا ہوا اور بورڈ نے طے کیا کہ ہندوستان میں زرعی معیشت میں گنے کی اہمیت کے پیش نظر گنے پیدا کرنے والے کاشت کاروں کا خیال رکھا جائے۔ بورڈ اس نتیجہ پر پہنچا کہ "قومی مفاد کے لئے یہ ضروری ہے کہ گنا کی کاشت کا علاقہ کم نہ ہو اور سفید چینی کی صنعت میں توسیع کی تقویت دے کر گنے کے لئے نئی راہ نکالنی چاہئے اگر سفید چینی کی صنعت کو فروغ دینے کا اقدام نہیں کیا گیا تو خدشہ ہے کہ گڑ کے مارکٹ میں خطرناک

قسم کا آثار پیدا ہو جائے گا جس سے زرعی جماعتیں شدید طور پر متاثر ہوں گی، زرعی نظام غیر منظم ہوگا اور بڑے علاقے میں اچھے گنا کی کاشت ختم ہو جائے گی۔

حالانکہ ٹیرف بورڈ کو پتہ چلا کہ سفید چینی کی درآمدات نے چینی کی قیمتوں کو متاثر نہیں کیا ہے پھر بھی یہ خطرہ ہے کہ جاوا گڑ کی درآمد اور درآمد شدہ چینی سے نقلی گڑ کی تیاری چینی کی صنعت کو تباہ و برباد کر دے گی۔ اس لئے انھوں نے چینی کی درآمد پر ڈیوٹی لگانے کی سفارش کی۔ سفید چینی کے سلسلہ میں انھوں نے ڈیوٹی کے ایسے پیمانہ کی سفارش کی جو جدید کارخانوں اور گھریلو طریقوں سے چینی تیار کرنے والوں کی ضرورتوں کو پورا کر دے۔ حفاظت کی اس اسکیم کے لئے ۱۵ برس کی مدت کے لئے سفارش کی گئی اور بورڈ کا خیال تھا کہ اس مدت کے آخیر میں ہندوستان کی قیمتیں گرچہ کیوبا یا جاوا کی قیمتوں کا مقابلہ نہ کر سکتی تھیں پھر بھی وہ کم از کم دنیا کے دوسرے چینی پیدا کرنے والوں کی قیمتوں کے برابر ہوں۔ حکومت نے ستمبر ۱۹۳۱ء میں ان تجاویز کو بڑی حد تک منظور کر لیا۔

چینی کی اندرونی پیداوار کو بڑھانے اور بیرونی چینی کو کم کرنے میں چینی کی صنعت کے سلسلہ میں امتیازی پالیسی توقع سے زیادہ کامیاب ثابت ہوئی۔ گنے کا ایکڑی رقبہ ۱۹۳۰ء کے بعد تیزی سے بڑھا اور ۶۔۱۹۳۵ء میں بہت اونچی سطح پر آگیا اس سال کے بعد اس میں کچھ کمی ہوئی۔ گنے کی کوالٹی میں بھی کافی ترقی ہوئی۔ ملک میں گنے کی پیداوار ۱۔۱۹۳۰ء سے میں ۳½ لاکھ ٹن تھی جو بڑھ کر ۷۔۱۹۳۶ء میں ۱۲½ لاکھ ٹن ہو گئی۔ اس میں زیادہ تر حصہ جدید کارخانوں کا تھا جو گنے سے براہ راست چینی تیار کر رہے تھے۔ ان کی تعداد ۱۔۱۹۳۰ء میں ۲۹ تھی جو بڑھ کر ۷۔۱۹۳۶ء میں ۱۴۰ ہو گئی اور ملک کی مجموعی پیداوار میں ان کا حصہ ۵۴ سے بڑھ کر ۸۶ فیصد ہو گیا۔ اسی دور میں ہندوستان چینی کا درآمد ۸ لاکھ ۹ ہزار ٹن سے گھٹ کر ۲۲ ہزار ٹن ہو گئی۔ گڑ کی پیداوار بھی ۱۔۱۹۳۰ء اور ۷۔۱۹۳۶ء کے درمیان دوگنی ہو گئی۔ ۱۹۳۱ء اور ۱۹۳۲ء میں لگنے والے محصول اور حفاظتی ٹیکس سے حاصل ہونے والے کافی منافع کی وجہ سے حکومت نے ۱۹۳۴ء میں ہندوستان میں تیار ہونے والی چینی پر اکسائز ڈیوٹی لگائی جو ۱۹۳۷ء میں بڑھا دی گئی۔ حفاظت ملنے یا ٹیکس لگنے پر چینی کی قیمت میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ ۱۹۳۱ء کے درمیان مسلسل گھٹنے کا ہی رجحان رہا۔ اس وجہ سے ٹیرف بورڈ نے کہا کہ صارفین کو تحفظ کی پالیسی سے مطمئن رہنا چاہیے۔ وہ تحفظ کے پہلے کی بہ نسبت اب چینی کے لئے کم قیمت ادا کر رہے ہیں[1] اس کے علاوہ ملک میں فی کس چینی کا خرچ جو محصول

---

[1] چینی کی صنعت سے متعلق انڈین ٹیرف بورڈ کی رپورٹ (۱۹۳۸ء) ص ۱۶۷

اور حفاظتی ڈیوٹی لگنے کے چند برسوں تک ۱۹۳۰ء میں آنے والی سطح سے نیچے آگیا تھا اس نے ۱۹۳۶ء تک اس سطح کو پالیا۔ تیسری دہائی میں چینی کے نئے کارخانے اور چینی کی پیداوار میں توسیع صوبہ متحدہ اور بہار میں مرکوز رہی بہرحال بمبئی اور مدراس میں بھی نئے کارخانوں اور پیداوار کو بڑی تقویت ملی۔

جنگ کے موقع پر ہندوستان میں صرف ایک سیمنٹ کی تین کمپنیاں جاری کی گئیں جنھوں نے جنگ چھڑنے کے بعد سیمنٹ پیدا کرنا شروع کردیا۔ پوربندر، کٹنی اور بندی کے کارخانے تھے۔ وہ بڑے اچھے وقت میں قائم ہوئے تھے، حکومت کو ایسا محسوس ہوا اور جنگ کے آخری برسوں کے دوران وہ سرکاری کنٹرول کے تحت کام کرتے رہے اور یہ سلسلہ ۱۹۱۹ء کے وسط تک جاری رہا۔ جنگ کی وجہ سے اس کا آغاز اچھا ہوا اور گرم بازاری کے تعمیراتی کاموں سے اسے مزید تقویت ملی۔ دنیا کے دوسرے ملکوں کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں پورٹ لینڈ سیمنٹ کا استعمال تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ ہندوستان میں عمدہ چونا پتھر کا ذخیرہ کافی تھا جو پورے ملک میں پھیلا ہوا تھا، جنگ اور جنگ کے مابعد برسوں کی خوشحالی سے اس صنعت کو نمایاں فروغ حاصل ہوا ۱۹۲۲ اور ۱۹۲۵ کے درمیان سات نئی کمپنیوں نے ملک کے مختلف حصوں میں سیمنٹ تیار کرنا شروع کردیا جس سے کثرت پیداوار (OVER PRODUCTION) کا دور آگیا اور قیمت کی سخت جنگ شروع ہوئی۔ ۵-۱۹۲۳ء کے سال خاص طور پر خراب تھے، اس صنعت نے تحفظ کے لئے حکومت کے پاس درخواست کی۔ ٹیرف بورڈ نے پتہ لگایا کہ داخلی مارکٹ میں آپسی مقابلہ اس صنعت کی پریشانیوں کا ذمہ دار ہے اور اس نے یہ بھی بتایا کہ اس صنعت کو کلکتہ اور بمبئی کے بندرگاہوں میں خاص طور پر زک پہنچتا ہے جو اس زمانہ میں پورٹ لینڈ سیمنٹ کے ہندوستان میں خاص صارفین تھے۔ بندرگاہوں میں درآمد شدہ سیمنٹ ہندوستانی سیمنٹ سے واضح طور پر سستا تھا اور بورڈ سے سفارش کردہ تحفظ ان دو بندرگاہوں میں فروخت ہونے والے ہندوستانی سیمنٹ پر سرکاری کی شکل اختیار کرلیتا تھا۔ حکومت نے اسے قبول نہیں کیا۔

بہرحال حکومت نے ۱۹۲۶ء میں درآمد شدہ سیمنٹ پر محصولی ٹیکس بڑھادیا اور اس نے بندرگاہ کے مارکٹ میں درآمدات کی قیمت کے فائدہ کو کم کردیا۔ اس صنعت نے صنعت گروں کے درمیان امداد باہمی کی ضرورت سے متعلق ٹیرف بورڈ کی سفارش بھی منظور کرلی۔ ۱۹۲۶ء میں انڈین سیمنٹ مارکٹنگ اسوسی ایشن کی تشکیل عمل میں آئی اس نے ایک مشترکہ فروخت کی قیمت متعین کرکے

اس صنعت کے اندر مقابلہ کو کم کردیا۔ ۱۹۲۷ء میں کنکریٹ اسوسی ایشن آف انڈیا کا قیام عمل آیا تاکہ وہ سیمنٹ کے نئے استعمال کی تحقیقات کرے اور ان کو مقبول بنائے۔ مختلف کمپنیوں کی خرید و تقسیم پر اختیار رکھنے کے لئے سیمنٹ مارکٹنگ کمپنی آف انڈیا کی تشکیل ہوئی جس سے باہمی اشتراک میں بہت زیادہ ترقی کا پتہ چلتا ہے۔ تمام موجود کارخانے اس کمپنی کے ممبر بن گئے یا اس سے مفاہمت کرلی۔

مارکٹنگ کمپنی کی تشکیل سے پیداوار میں باہمی تنظیم پیدا نہیں ہوئی جو کارخانوں کی مرضی کے مطابق جاری رہی بہرحال ۱۹۳۶ء میں پیدا کرنے والوں کے خاص چار گروپ جو اس وقت کے موجودہ کارخانوں میں ۱۰ کے مالک تھے وہ مل کر اسوشیٹیڈ کمپنیز لمیٹڈ نام کا یونٹ بنانے کے لئے رضامند ہوگئے۔ ۱۹۲۵ء کے بعد باہمی اشتراک بڑھنے سے شدید داخلی مقابلہ کے برے اثرات کا ازالہ ہوگیا اور سرد بازاری کے برسوں کو چھوڑ کر پیداوار میں مستقل اضافہ ہوتا رہا۔ مصنوعاتی صلاحیت میں توسیع ہونے سے ممکن ہوسکا۔

سرد بازاری کے اٹھنے اور داخلی مقابلہ کے ختم ہونے سے ایسے حالات پیدا ہوئے جن سے سیمنٹ انجمن کی نئی تشکیل سے باہر کارخانے قائم ہونے، ۱۹۳۷ء میں پانچ کارخانوں کے ساتھ دالمیا گروپ وجود میں آیا۔ اے۔سی۔سی میں کچھ یونٹ کا اضافہ ہوا اور دوسری مہم جوئی بھی ہوئی۔ ۱۹۳۹ء میں ۲۱ کارخانے تھے جن میں اے۔سی۔سی کے بارہ، دالمیا گروپ کے ۵ اور دوسروں کے ۴ تھے، ۱۹۳۷ء میں متوقع صلاحیت ۵ لاکھ ٹن سیمنٹ کی سطح تک پہنچ گئی تھی اور اصلی پیداوار ۱۱ لاکھ ٹن تھی۔ ۱۹۴۰ء کے لئے یہ اعداد و شمار ۲۵ لاکھ ٹن اور ۱۵ لاکھ ٹن تھے۔ گھریلو صنعت گری میں اضافہ ہوجانے سے درآمدات ۱۹۳۹-۴۰ء تک حقیقی معنوں میں ختم ہوگئیں۔ جنگ کے ماقبل کی درآمدی اوسط اندازاً ۱ لاکھ ۳۰ ہزار ٹن تھی اور جنگ کے مابعد کی اوسط تقریباً ۱ لاکھ ۲۰ ہزار ٹن تھی۔ دوسرے دہے کے آخیر میں درآمدات ہنوز اندازاً ۱۵ ہزار ٹن تھیں لیکن آنے والے دہے میں تیزی سے گھٹ گئیں اور ۱۹۳۹-۴۰ء میں یہ ۱۱ ہزار ٹن تک پہنچ گئیں۔

ہندوستان کی دیا سلائی کی صنعت محصولی ٹیکس کی عجیب و غریب مثال پیش کرتی ہے جس سے تحفظ یافتہ صنعت کو فروغ ہوا ۱۹۲۲ء میں محصولات کی غرض سے حکومت نے درآمد شدہ دیا سلائیوں پر ایک روپیہ ۸ آنہ فی گروس کے حساب سے زیادہ اونچی مخصوص ڈیوٹی لگائی جس کا یہ نتیجہ تھا۔ اس سال کے قبل ہندوستان میں دیا سلائیوں کی کوئی کامیاب

تیاری نہیں ہوتی تھی لیکن اونچی ڈیوٹی کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند برسوں کے دوران ایک بڑی اور کامیاب صنعت وجود میں آگئی۔ چونکہ دیا سلائی کی تیاری میں تقریباً سارے عوامل ہاتھ سے انجام پاتے تھے یا مشین سے اس لئے اس صنعت میں مال تیار کرنے والوں کی نوعیت میں بہت بڑا تنوع ہوتا تھا ایک طرف پوری مشین سے بھرپور کارخانے ہوتے تھے جو بڑے پیمانہ پر دیا سلائیاں کرتے تھے تو دوسری طرف گھریلو صنعت تھی جو کسی مشین کو استعمال کئے بغیر دیا سلائیاں تیار کرتی تھی۔ داخلی صنعت کے فروغ پانے سے قدرتی طور پر درآمدات اور ڈیوٹی سے ملنے والے محصول میں برابر کمی ہوتی گئی۔ حکومت نے اس صورتِ حالات کا جائزہ لینے کو ۱۹۲۶ء میں ٹیرف بورڈ سے کہا اور اس بورڈ نے سفارش کی کہ محصولی ڈیوٹی اسی رقم کی حفاظتی ڈیوٹی میں بدل دی جائے۔ جنگ کے ماقبل کی اوسط درآمد ایک کروڑ ۴۶ لاکھ گروس تھی اور جنگ کے بعد کی اوسط درآمد ایک کروڑ ۲۷ لاکھ گروس تھی۔ ۱۹۳۱ء-۲ تک یہ درآمد گھٹ کر ایک لاکھ گروس ہوگئی۔ ویسٹرن انڈیا دیا سلائی کمپنی کے ذریعہ سویڈن والوں نے پہلے ۱۹۲۶ء میں دیا سلائی کی صنعت میں بڑے پیمانہ کے یونٹ قائم کئے یہ کمپنی اور اس کی شریک کار آسام دیا سلائی کمپنی ۱۹۴۰ء تک پانچ کارخانے چلاتی تھی۔ ان کارخانوں کی پیداوار ملک میں کل دیا سلائیوں کی پیداوار کے ۴/۵ حصہ سے زیادہ تھی۔ اس صنعت میں گھریلو قسم کی پیداوار انتہائی جنوب کے ضلعوں میں مرکوز تھی۔ ہندوستان میں دیا سلائی کی صنعت کی حفاظت کا نتیجہ یہ تھا کہ غیر ملکی مفادات نے ملک میں پیداواری یونٹ قائم کئے جو دنیا کی صنعت پر پہلے سے ہی حاوی تھے۔

جدید طریقوں کے مطابق ہندوستان میں کاغذ کی تیاری ہگلی میں بالی ملوں کے قیام کے ذریعہ ۱۸۷۰ء میں شروع ہوئی اگلے دو دہے کے اندر ملک میں کاغذ کے کئی دوسرے کارخانے قائم ہوگئے۔ پھر بھی پیداواری صلاحیت کلکتہ کے نزدیک ٹیٹاگڑھ گروپ میں مرکوز رہی۔ بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی کے دوران کوئی نمایاں اضافہ نہ تو ملوں کی تعداد میں ہوا اور نہ پیداواری صلاحیت میں حالاں کہ ملوں کے ذریعہ کاغذ کی واقعی پیداوار جنگ کے دوران اور اس کے فوراً بعد نمایاں طور پر بڑھ گئی۔ ۱۹۲۴ء-۵ کے دوران ٹیرف بورڈ نے اس صنعت کے حفاظتی دعویٰ کی جانچ پڑتال کی اور اس نے سفارش کی کہ کاغذ کے بعض درجوں کو تحفظ دیا جائے۔ ایسا کیا گیا۔ اس کے نتیجہ میں پیداوار کو تقویت ملی اور کچھ موجودہ یونٹ نے اپنی صلاحیت میں توسیع کا کام اٹھایا۔ سرد بازاری کے دوران پیداوار جامد ہوکر رہ گئی لیکن ۱۹۳۲ء-۳ کے بعد اس نے

پھر ترقی کرنی شروع کی جیسا کہ توقع کی جاتی تھی کہ پیداوار میں اضافہ خاص طور پر تحفظ یافتہ قسموں میں ہوا، تیسرے دہے کے آخیر میں ملک کی مجموعی پیداوار کا تقریباً ۴/۵ حصہ ان سے حاصل ہوتا تھا۔ ان قسموں کی درآمد بھی تیزی سے گر گئی۔ سرد بازاری کے بعد موافق حالات سے ملک کے بہت سے حصّوں میں کئی نئے یونٹوں کے قیام کی حوصلہ افزائی ہوئی۔

۱۹۲۵ کے بعد جو اہم تبدیلی رونما ہوئی وہ یہ تھی کہ درآمد شدہ گودا (PULP) کے بدلے جس پر پہلے پورا بھروسہ کیا جاتا تھا اب کچے مال کی حیثیت سے بانس کا بہت زیادہ استعمال ہونے لگا۔ اس نے نئے یونٹ کے قیام کو بھی متاثر کیا جو خام اشیا کے سرچشمہ کے پاس عام طور پر ہوتے تھے۔ جس طرح اس صنعت کے قدیم یونٹ برطانوی ملکیت تھی اسی طرح تیسری دہائی میں قائم ہونے والے نئے کارخانے زیادہ تر ہندوستانیوں کے تھے۔

بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی کے زیادہ حصّہ میں ہندوستان میں کاغذ کے کل ۹ یونٹ تھے۔ پہلی عالمی جنگ کے موقع پر سالانہ اوسط پیداوار تقریباً ۲۷ ہزار ٹن تھی۔ کیوں کہ ۱۹۱۵ء سے ۱۹۲۰ء تک کے برسوں میں اوسط سالانہ پیداوار بڑھ کر تقریباً ۳۱ ہزار ٹن ہوگئی لیکن ۵-۱۹۲۴ء میں جنگ کے ماقبل کی سطح پر لوٹ آئی۔ ۱۹۳۰ء میں یونٹ کی تعداد بڑھ کر ۱۱ اور پیداوار تقریباً ۴۰ ہزار ٹن ہوگئی ۱۹۳۳ء کے بعد اوپر کی طرف بڑھنے کا رجحان پھر شروع ہوا اور ۱۹۳۹ء میں ملوں کی تعداد ۱۶ - اور پیداوار ۷۰ ہزار ٹن تھی۔ مقامی پیداوار میں فروغ ہوا اس کے ساتھ ہی ساتھ درآمد میں بھی اضافہ ہوا۔ ظاہر ہے کہ ۱۹۲۵ء کے بعد گھریلو مانگ میں اضافہ خاص طور پر تیزی سے ہوا۔ جب کاغذ اور پیسٹ بورڈ کی اوسط درآمد جنگ کے مابعد زمانہ میں ۱۲ لاکھ ۹۵ ہزار ہنڈرویٹ تھی تو ۹-۱۹۲۸ء میں درآمد ۳ لاکھ ۷۳ ہزار ہنڈرویٹ تھی۔

جنگ کے نتیجہ میں چرمہ اور چرم ساز صنعت نے کچھ تقویت حاصل کی۔ گاؤں کے روایتی چرم کار کے علاوہ چرم کاری خاص طور پر ان متعدد ٹینریز کے ذریعہ ہوتی تھی جو چھوٹے پیمانہ پر کام کرتی تھی اور جو جنوبی ہندوستان میں مرکوز تھیں اور وہ سبزیوں سے صاف کر کے چمڑے تیار کرتی تھیں یہ ایسٹ انڈیا کپس (KEPS) کے نام سے مشہور تھا یہ زیادہ تر انگلستان بھیجی جاتی تھیں۔ خاص طور پر، کلکتہ کے گرد چھوٹے پیمانہ پر کام کرنے والی ٹینریز تھیں اور ان میں چینی کام کرتے تھے اور بڑے پیمانہ پر کام کرنے والی تقریباً ۲۵ ٹینریز بمبئی اور مدراس پریسیڈنسی میں مرکوز تھیں جو خاص طور پر گائے کے چمڑے سے چھال کے ذریعہ صاف کر کے چرم تیار کرتی تھیں۔ اس صنعت میں مشین کا

استعمال نہیں ہوتا تھا جنگ کے قبل جدید قسم کے چرم کے کارخانے کانپور میں قائم ہوئے تھے۔
جنگ سے حوصلہ افزائی ملنے کے باعث دوسرے کارخانے بھی قائم ہوئے لیکن وہ صرف واجبی
حد تک کامیاب رہے۔ خاص پیداوار ایسے جوتے کی تھی جو زیادہ مغربی انداز کے ہوتے تھے کانپور
کی صنعت کے لئے مانگ کا زیادہ حصّہ فوج سے ملتا تھا۔ اس دور کی اہم بات یہ تھی کہ تیسرے
دہے کے اوائل میں باٹا شو کمپنی کا کلکتہ میں قیام ہوا۔

سترھواں باب

مزدور ۱۹۱۴ - ۳۹ء

حکومت نے ۱۹۰۸ء کی فیکٹری کمیشن رپورٹ پر ڈائرکٹر نائر کے خیالات خاص طور پر منظور کرتے ہوئے۔ ۱۹۰۹ء میں ایک بل پیش کیا تھا جو آخر کار ۱۹۱۱ء میں پاس ہوا۔ ٹیکسٹائل کارخانوں کے درمیان جو امتیاز تھا وہ اس ایکٹ میں برقرار رہا۔ اس ایکٹ میں یہ دفعہ مندرج تھا کہ لڑکوں اور عورتوں کے اوقات کار بالترتیب سات اور گیارہ گھنٹے ہی ہوں گے اور تمام کارخانوں میں دن کے وسط میں آدھے گھنٹہ کے لئے لازمی وقفہ ہوگا لڑکوں کی عمر کی پرانی حدیں (۹ سے ۱۴ تک) برقرار رکھی گئیں حالانکہ عمر کی تصدیق کرانے کی دفعات لگائی گئیں بالخصوص ٹیکسٹائل کارخانوں کے معاملہ میں لڑکوں کے اوقات کار چھ تک محدود کئے گئے اور بالغ مردوں کے بارہ کئے گئے انہیں مشین اور بجلی کی قوت دن میں ۱۲ گھنٹہ سے زیادہ استعمال کرنے کی ممانعت کی گئی کام کرنے والوں اور حفاظت سے متعلق دفعات بھی داخل کی گئیں۔ ۱۸۹۲ء ایکٹ کی دفعات جیسا کہ اوپر بتایا گیا بڑی حد تک بے جان حروف بن کر رہ گئیں کیونکہ نگرانی اور جانچ کی مشینری کافی نہ تھی نئے حالات کے تحت اس کی اصلاح کی گئی اور نگرانی کا کام بہت تیز کیا گیا۔ ۱۹۱۲ء کے تحت ایک ہی قابل ذکر برائی پیدا ہوئی وہ یہ تھی کہ لڑکوں کو دو مختلف کارخانوں میں روزگار دینے کی رسم آگئی اس طرح آدھے وقت سے پورے وقت کام کرنے لگے۔

کارخانہ کے مزدور کے حالات میں چھان بین ۱۹۰۵ء میں شروع ہوئی چونکہ بجلی کی روشنی آجانے سے بمبئی ملوں میں بعض نمایاں برائیاں آگئیں یہ بھی درست ہے کہ مزدوروں سے متعلق زیادہ قانون سازی جس میں ۱۹۱۲ء کا قانون بھی شامل ہے بڑی حد تک لنکا شائر اور ڈنڈی کے دباؤ سے وجود میں آئی۔ کسی حال میں یہ کہا نہیں جا سکتا کہ حالات کو بہتر بنانے کی

تحریک خود کام کرنے والوں سے ہی شروع ہوئی۔ ایک متعین حد تک یہ صورتحال جنگ میں بدل گئی۔
پہلی بار ہندوستان میں مزدور تحریک رونما ہوئی عام بیداری اس کی ذمہ دار تھی جو جنگ کے عالمگیر
نتائج میں سے تھی اور اس کے ساتھ اونچی قیمت اور جامد اجرت آئی جس کے معنی بدتر رہائشی
حالات کے تھے ہندوستان میں پہلا معقول ٹریڈ یونین ہونے کا فخر حسب معمول مدراس لیبر یونین
کو حاصل ہے جو مسٹر بی۔ پی واڈیا نے ۱۹۱۸ میں بنایا تھا۔ ایسی انجمنیں زیادہ تر صنعتی مرکزوں
میں تیزی سے قائم ہوگئیں ہڑتال ہونے لگی اس کا خاص مقصد زیادہ اجرت حاصل کرنا تھا قدرتی
اعتبار سے پیش رفت کے یہ تمام اقدامات منظم نہ تھے لیکن جنگ کے بعد کے دور میں مزدوروں
نے تنظیم کی قدر وقیمت اور اسٹرائک کے حربہ کی تاثیر کو پہچان لیا۔ ہندوستان میں نئی مزدور تحریک
کے لئے ۱۹۱۹ سے ۱۹۲۱ تک کے سال کامیاب ترین سال تھے صنعتیں عام طور سے اچھی
طرح کام کر رہی تھیں اور گرم بازاری کے زمانہ میں صنعت گر کام کرنے کے زیادہ دنوں کے ہاتھوں
سے جانے دینا نہیں چاہتے تھے اُجرت کی سطح قیمت کی عام سطح سے بہت دور جا پڑی تھی۔ اس لیے اضافہ کے
لئے بڑی گنجائش تھی اس لئے یہ دور مختصر اور مجموعی طور پر کامیاب ہڑتالوں کا دور تھا۔

اسٹرائک کی کامیابی سے اس تحریک کی نشو و نما میں مدد ملی اور یہ پورے ہندوستان میں تیزی
سے پھیل گئی ۱۹۲۰ء کے سال کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں کئی مختصر مگر کامیاب ہڑتالیں ہوئیں۔
کلکتہ کی ملوں میں، جمشید پور کی کوئلہ کی کانوں میں بمبئی اور احمد آباد کے کاٹن ملز میں، اسٹرائک کا
سلسلہ چلتا رہا، ریل، جہاز، گودی اور ڈاک خانہ وغیرہ میں ملازمین نے ہڑتالیں کیں۔ ان کے نتیجہ
میں زیادہ تر صورتوں میں اُجرت میں اضافہ ہوا۔ اور بمبئی اور احمد آباد کے مزدوروں نے اپنے
مالکوں سے دن میں دس گھنٹے کام کرنے کا حق حاصل کیا۔ گرم بازاری زیادہ تر صنعتوں کے
لئے ۱۹۲۰ء میں ختم ہوگئی اور ۱۹۲۱ء کی پہلی چوتھائی میں پہلے ہڑتالوں کی تعداد میں مستقل
تخفیف اور ان کی مدت اور ناکامیاب اسٹرائک کے تناسب میں اضافہ کافی رجحان
قابل دید تھا کپاس کی صنعت کے سوا یہ رجحانات ہر جگہ نمایاں تھے۔ کپاس کی صنعت ابھی
بھی خوشحال تھی اور جہاں ۱۹۲۱ء کی آخری چوتھائی میں بونس کے سوال سے متعلق بہت
ہی کامیاب اسٹرائکوں کا سلسلہ چلا ۱۹۲۲ء سے کامیاب اسٹرائکوں کا دور کپاس کی صنعت
میں بھی فی الواقعی ختم ہوگیا اور مزدور تحریک شدید دشواریوں کے دور سے دوچار ہونے لگی۔
۱۹۲۲ء میں واحد سنگین اسٹرائک ایسٹ انڈین ریلوے میں بھی ہوئی۔ احمد آباد میں

۱۹۲۳ءمیں اسٹرائک سے اُجرت میں ناگزیر تخفیف اُجرت کے خلاف نبرد آزمائی کا الٹا عمل شروع ہوا کچھ برسوں تک اسٹرائک کا حربہ کم سے کم استعمال ہوا۔ یہاں تک کہ سرد بازاری کے آغاز کے سارے اثرات محسوس ہونے لگے اور ۱۹۲۸ء میں ہڑتالوں کا روگ پھر شروع ہوا۔ اس سلسلہ میں جمشید پور کا تلخ جھگڑا اور ۱۹۲۸ء اور ۱۹۲۹ء میں بمبئی کے کپاس مزدوروں کی طویل جدوجہد سب سے نمایاں تھی۔

اس وقت تک ٹریڈ یونین کی تنظیم زیادہ ہم آہنگ اور بامقصد بن گئی زیادہ تر یونین اسٹرائک کمیٹیوں سے ذرا کچھ ہی بہتر تھیں۔ تجارتی گردش کے بالائی جھکاؤ کے دوران کئی کامیاب ہڑتالوں کے آغاز سے ٹریڈ یونین، تعداد اور قوت میں تیزی سے ترقی کرنے لگیں۔ ناموافق دور کے آجانے سے بہت ساری برساتی مینڈھک جیسی جماعتیں ناپید ہوگئیں اور ایک وقت تک ٹریڈ یونین کی تحریک ممبرشپ اور فنڈ کے معاملے میں بہت ہی نیچی سطح پر تھی۔ ۱۹۲۰ء میں گرچہ آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگرس کا قیام عمل میں آیا تھا پھر بھی ابتدائی برسوں میں اس کی خاص طاقت ریلوے والوں، جہازرانوں، ڈاک اور تار کے مزدوروں اور سرکاری اور میونسپل ملازموں کی یونین تک محدود تھیں صنعتی مزدوروں میں خاص یونٹ مدراس احمد آباد اور بمبئی کی ٹکسٹائل انڈسٹری اور جمشید پور کی لوہے اور فولاد کی انڈسٹری میں تھے، ۱۹۲۸ء تک ٹریڈ یونین کی تنظیم بمبئی کی ٹکسٹائل مزدوروں میں نسبتاً کمزور تھی۔

ابتدائی برسوں میں ٹریڈ یونین کے قانون ہندوستان میں نہ ہونے کی وجہ سے ٹریڈ یونین کو دشواریاں پیش آئیں۔ یہ اس وقت معلوم ہوا جب مدراس ہائی کورٹ نے ۱۹۲۱ء میں مدراس ٹیکسٹائل لیبر یونین کے لیڈروں کے خلاف ایک مقدمہ میں ٹریڈ یونین ازم کو ایک غیر قانونی سازش قرار دیا۔ اسی سال ہندوستان کی حکومت نے اس تجویز کے اصول کو تسلیم کیا جس کی تحریک مسٹر این۔ ایم جوشی نے قانون ساز مجلس ٹریڈ یونین کے قانونی رجسٹریشن اور حفاظت کے لئے پیش کی تھی مالکوں کی مخالفت کی وجہ سے قانون سازی میں بہرحال تاخیر ہوگئی اور انڈین ٹریڈ یونین ایکٹ ۱۹۲۶ء میں جاکر پاس ہوا۔

اس ایکٹ کے تحت رجسٹرڈ ہونے والے ٹریڈ یونین سے متعلق اعداد و شمار ۱۹۲۷ء اور اس کے بعد کے لئے دستیاب ہیں ۲۹-۱۹۲۸ء کی اسٹرائک قابل ذکر تھی کیونکہ مزدوروں کی بڑی تعداد شریک تھی، یہ کافی دنوں تک چلتی رہی اور بہت سی جگہوں میں یہ رونما ہوئی کچھ عام ہڑتالوں کی شکل میں تھی اور اُجرت اور چھٹنی سے لے کر معقول تنظیم (RATISNALISATION) تک گئی۔

حکومت نے ان اسٹرائکوں میں مداخلت کرنا بہت ہی ضروری سمجھا۔ ان برسوں میں ایک اور خصوصیت جو نمایاں ہوئی وہ ٹریڈ یونین کی لیڈر شپ میں کمیونسٹوں کا داخلہ تھا۔ اس سے ۱۹۲۹ء کی ہڑتال کی ساخت اور اس کے کردار اور طرز فکر و عمل میں شدت پیدا ہوئی اور اسی سے اسی سال کے آخیر میں آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس منقسم ہوگئی بہرحال اسٹرائک کا موجب بنیادی طور پر مزدوروں کے رہنے سہنے اور کام کرنے کے حالات تھے۔ جس طرح مزدور سے متعلق روائل کمیشن نے تحریر کیا "حالاں کہ مزدور قومی، کمیونسٹ یا تجارتی مقاصد رکھنے والے اشخاص سے متاثر ہوئے ہوں گے تاہم یہ یقین کرتے ہیں کہ شاید ہی کوئی ایسی نمایاں اسٹرائک ہوئی ہو جس کا معاشی سبب نہ رہا ہو"۔[1]

ٹریڈ یونین کی تحریک کمزور ہوتے ہی سرد بازاری کا آغاز ہوا سرد بازاری کے زمانہ میں مالکوں نے کھلم کھلا چھٹنی اور اُجرت میں تخفیف کی اور مزدوران کا سدّباب نہ کرسکے حکومت نے بھی اسٹرائک جیسی مزدوروں کی بے چینی کے اظہار کی طرف سخت اور غیر ہمدردانہ طرز فکر کا ثبوت پیش کیا۔ ان برسوں کے دوران مزدوروں سے متعلق صورت حال میں جو کچھ سدھار ہوا وہ زیادہ تر روائل کمیشن کی سفارشات پر حکومت کا اقدام کا نتیجہ تھا۔ مزدوروں کے لئے ناموافق حالات کے دور کا خاتمہ صوبائی خود مختاری کے ظہور سے ہوا۔ آئینی تبدیلیوں نے مزدور کے مفاد کے لئے بھی راہ پیدا کی صوبائی مجالس اور مراکز میں مزدور کی نمائندگی مزدور حلقۂ انتخاب یا رجسٹرڈ ٹریڈ یونین کے حلقۂ انتخاب کے ذریعہ محفوظ کی گئی۔ ۱۹۳۳ء کے بعد مستقل کوششیں ہوئیں جن کے نتیجہ میں آخر کار آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس کی دراڑ ۱۹۳۸ء تک مندمل ہوگئی نئی وزارتوں کی آمد سے مزدوروں کی جانب حکومت کے خیالات میں نمایاں تبدیلی ہوئی۔ اس سے مالکوں کے خیالات میں بھی کچھ تبدیلی آئی۔ مالک اب تک قاعدہ کے اعتبار سے یونین کو تسلیم کرنے کے لئے رضامند نہ تھے اور چاہتے تھے کہ ان کی طرف سے حکومت کاروائی کرے یہ بڑی حد تک بدل گیا۔ جس کا ثبوت ایک کانگریسی وزیر (وی۔ وی۔ گری) سے ملتا ہے۔ جس نے فوجداری طرز کا ایکٹ (رکمیں پروسیڈیر ایکٹ) کی دفعہ ۱۴۴ کے تحت ایک حکم مزدوروں کے خلاف نہیں بلکہ ایک مالک کے خلاف جاری کیا تھا۔[2]

---

[1] آف دی روائل کمیشن آف لیبر اِن انڈیا ص ۳۳۵ (۱۹۳۱ء)

[2] دی۔ بی۔ کارنک، اسٹرائکس اِن انڈیا۔ ص ۲۸۱ (۱۹۶۷ء)

۱۹۳۷ء سے شروع ہوتے ہی ٹریڈ یونین کے عوامل زیادہ بڑھنے لگے اور پھر اسٹرائک کا روگ شروع ہوا صنعت میں دولت بڑھ جانے سے بھی یہ تبدیلی پیدا ہوئی۔ بہت سی صورتوں میں مزدوروں نے کھویا ہوا میدان پھر کچھ حاصل کر لیا۔ بہت سی وزارتوں نے مزدوری کے عام مسائل یا ان کے مخصوص پہلوؤں کی چھان بین کرنے کے لئے کمیٹیاں مقرر کیں۔ مختصر مدتی کانگریسی وزارتوں نے جو ایک مزدور سے متعلق ایک اہم قانون بنایا وہ بمبئی انڈسٹریل ڈسپوٹس ایکٹ (۱۹۳۸) تھا۔ ٹریڈ کے جھگڑوں کے معاہدہ سے متعلق ہندوستان میں ابتدائی قانون سازی بہت سرسری تھی۔ ٹریڈ ڈسپوٹس ایکٹ (۱۹۲۹) جو پورے برٹش انڈیا پر لاگو تھا وہ مقصدی اعتبار سے تحقیقاتی عدالت اور مصالحتی بورڈ کے قیام کا حامل تھا تاکہ تجارتی جھگڑوں کی جانچ پڑتال کرے اور ان کا حل پیش کرے۔ بمبئی ٹریڈ ڈسپوٹس کونسی لیئشن ایکٹ (۱۹۳۴) نے حکومت کو اختیار دیا کہ وہ معقول لوگوں کو ثالث مقرر کرے اور ثالثوں کو یہ اختیار دیا کہ وہ مصالحتی طرز کار شروع کریں جہاں بھی جھگڑا موجود ہو یا اس کا خطرہ لاحق ہو۔ اس نے مزید سرکاری لیبر آفیسر کی تقرری کی ہدایت کی تاکہ وہ صنعت میں مزدوروں کے مفادات پر نظر رکھے۔ بمبئی انڈسٹریل ڈسپوٹس ایکٹ (۱۹۳۸) نے بالکل نئے میدان سر کئے اور نیا طریقہ قائم کیا جو بعد میں ہندوستان کے لئے بڑی اہمیت کا حامل بن گیا۔ اس ایکٹ کی رو سے ہر مالک کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ اپنے کارخانہ میں ڈسپلن اور کارکردگی سے متعلق واضح آرڈر مرتب کر کے پیش کرے۔ اگر کوئی مالک ان احکامات میں تبدیلی کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے لازم تھا کہ وہ ملازم اور حکومت کو اس کی اطلاع دے۔ کام کرنے والے اگر کوئی تبدیلی چاہتے تھے تو انھیں صرف اعلان کرنا پڑتا تھا۔ اس ایکٹ کے مطابق فریقین کے لئے یہ لازم ہو گیا کہ تجویز شدہ تبدیلی یا دوسرے طریقہ سے پیدا ہونے والے جھگڑے میں وہ کوشش کریں تاکہ وہ اسٹرائک یا تالابندی جیسے اقدام کرنے سے پہلے مصالحت کے ذریعہ بات طے کر لیں۔ جھگڑے کو طے کرنے کے لئے مشتہری ثالثی تھی جب دونوں فریقین اس کے لئے رضامند ہوں۔ ایکٹ یونین میں ورکرس کی جانب سے نمائندگی کے سلسلہ میں حقوق عطا کرتا تھا یونین کے لئے شرط تھی کہ وہ ممبرشپ کے متعلق بعض لوازم جیسے ممبرشپ کو پورا کرے یا جو مالکوں کے ذریعہ تسلیم شدہ ہو۔

بمبئی انڈسٹریل ڈسپوٹس ایکٹ (۱۹۳۸) سے تیار کردہ راستہ بڑی حد تک احمد آباد کے مزدور تعلقات کے تجربہ پر مبنی تھا۔ احمد آباد کا ٹیکسٹائل لیبر اسوسی ایشن جو ۱۹۲۰ء میں قائم ہوا، چند برسوں کی مدت ہی میں ایک بڑی عمدہ تنظیم بن گیا جو اپنے ارکان کے چھوٹے بڑے مفادات

کی دیکھ بھال کرتی رہی اور کئی فلاحی کاموں کو چلاتی رہی۔ اس کی کارکردگی اس اصول پر مبنی تھی کہ پہلی صورت میں تمام جھگڑوں اور شکایتوں کو گفت گو سے یا ثالثی کے ذریعہ طے کریں گے۔
اس کا نصب العین تمام اسٹرائکوں اور تالابندی کو دور کرنا تھا۔ گرچہ ایسا مکمل ازالہ احمد آباد کے مخصوص حالات اور مہاتما گاندھی کی رہنمائی اور رسوخ سے ممکن نہ ہوسکا پھر بھی یہ طریقہ احمد آباد میں بڑا کامیاب رہا۔ ۱۹۳۸ء تک احمد آباد یونین نے ہندوستان کو مزدور تحریک کے خاص دھارے سے اپنے آپ کو الگ رکھا۔ جب کانگریس کی وزارتیں بن گئیں تو اس کے خیالات بہت وزنی ہوگئے کیونکہ ان کی وکالت کانگریس کے انتہائی تجربہ کار مزدور رہنما کررہے تھے۔
مخصوص برسوں میں رجسٹرڈ یونین کی تعداد ان کے ارکان سے متعلق اعداد و شمار کا پتہ حسب ذیل جدول سے چلتا ہے۔

سال	رجسٹرڈ یونین کی تعداد	یونین کی تعداد جس کے اندراجات پائے گئے	اندراجات بتانے والے کل یونین کے کل ارکان
۸-۱۹۲۷ء	۲۹	۲۸	۱۰۰,۶۱۹
۳۰-۱۹۲۹ء	۱۰۴	۹۰	۲۴۲,۳۵۵
۵-۱۹۳۴ء	۲۱۳	۱۸۳	۱۸۴,۹۱۸
۸-۱۹۳۷ء	۴۲۰	۳۴۳	۳۹۰,۱۱۲
۴۰-۱۹۳۹ء	۶۶۷	۴۵۰	۵۱۱,۱۳۸

اندراجات تیار کرنے والے ۴۵۰ ٹریڈ یونین میں جن کے ارکان کی تعداد ۴۰-۱۹۳۹ء میں ۵۱۱ ہزار تھی یہ اہم گروپ تھے۔

اقتصادی سرگرمی	یونین کی تعداد	ارکان کی تعداد (ہزار میں)
ریلوے	۸۶	۱۷۹
ٹکسٹائلز	۸۵	۱۳۷
سمندری لوگ	۸	۵۳
بندرگاہ، ڈاک اور تارگھر	۲۳	۲۳
میونسپل	۳۷	۲۰

مزدوروں کی دنیا میں ۱۹۱۹ء سے جو ہنگامہ شروع ہوا اس نے ہندوستان میں مزدوروں کے حالات کار کی طرف بہتوں کی توجہ دلائی لیکن فیکٹریز ایکٹ میں مزید ترمیم کی خاص تحریک اس بار بھی باہر سے آئی۔ ہندوستان انجمن اقوام کا ابتدائی رکن تھا اور واشنگٹن میں لیبر کانفرنس کے اختیار کردہ دستور اور سفارشات کے مسودات کا تقاضا تھا کہ مزدور کی قانون سازی میں ترمیم ہو اور اس سے حکومت ہند گریز نہیں کر سکتی تھی۔ ۱۹۲۱ء میں دستور ساز مجلس نے کنونشن کی توثیق کرنے کیلئے تجویز پاس کی اور اگلے سال نیا فیکٹریز ایکٹ پاس ہوا۔ نئے ایکٹ کے مطابق ایک کارخانہ کی تعریف وسیع ہوگئی ایسا ادارہ جہاں ۲۰ آدمی سے کم نہ کام کرتے ہوں اور جہاں مشینی طاقت کا استعمال ہو رہا ہو وہ اس کی حد میں آگیا۔ ٹیکسٹائل کارخانوں کے درمیان کا قدیم امتیاز ختم کر دیا گیا جو تمام پچھلے قوانین میں برقرار رکھا گیا تھا۔ لڑکوں کو روزگار دینے کی کم از کم عمر ۹ سے ۱۲ کر دی گئی اور زیادہ سے زیادہ ۱۴ سے ۱۵ کر دی گئی اور ڈاکٹر کی سرٹیفکیٹ کے بغیر کسی لڑکے کی تقرری نہیں ہو سکتی تھی۔ بالغوں کے اوقات کار فی ہفتہ ۶۰ گھنٹے تک محدود کر دیئے گئے اور دوپہر کا وقفہ آدھا گھنٹہ بڑھا دیا گیا۔ اوور ٹائم کام کرنے کے لئے اجرت کا بھی قاعدہ بنایا گیا۔ یہ خاص دفعات تھیں۔ اس ایکٹ کی ترمیم کسی قدر ۱۹۲۳ء میں ہوئی اور پھر ۱۹۲۶ء میں ترمیمات اس ایکٹ کی ترمیم کسی قدر ۱۹۲۳ء میں ہوئی اور پھر ۱۹۲۶ء ترمیمات اس ایکٹ کی نرم تر کارکردگی کے لئے اختیار کی گئی اور یہ مختلف صوبوں کے چیف انسپکٹر آف فیکٹریز کی کانفرنس کی سفارشات کا نتیجہ تھیں۔ ان ترمیمات میں اہم ترین ترمیم وہ تھی جس کی رو سے اگر والدین یا سرپرست لڑکے کو دو کارخانوں میں کام کرنے کی اجازت دیں تو یہ جرم قرار دیا گیا اس دفعہ کا مقصد متذکرہ بالا برائی کو روکنا تھا جو بعض صنعتی ادارے بالخصوص احمد آباد میں ۱۹۱۲ء عام ہوگئی تھی اس نئے ایکٹ کی وسعت پرانے والے سے زیادہ تھی اور اس کے تحت نگراں مشینری بھی بہت زیادہ واضح تھی۔

ہندوستان میں مزدور سے متعلق روائل کمیشن نے دوسری باتوں کے علاوہ ہندوستان کی لیبر قانون سازی کا مفصل جائزہ لیا تھا اس ایکٹ میں ترمیمات سے متعلق کئی سفارشات میں اہم ترین یہ تھی کہ مستقل کارخانوں میں فی ہفتہ اوقات کار کی حد گھٹا کر ۵۴ کر دی جائے اور ایک دن کی حد ۱۰ گھنٹے کر دی گئی اس نے یہ کہا کہ ایسا قانون بنایا جائے جس سے ایک فرد کے اوقات کار دن میں اتنے پھیلے ہوئے نہ ہوں کہ مرد یا عورت مناسب اور مسلسل آرام سے محروم ہو جائے اس کی سفارش کی گئی کیوں کہ کمیشن نے شفٹ سسٹم کے طریق کار بالخصوص جوٹ ملوں میں بڑی

برائیاں دیکھیں۔ ان سفارشات میں یہ دفعہ بھی رکھا گیا کہ ۱۵ اور ۱۶ کے بیچ کی عمر والے ڈاکٹری سرٹیفکٹ کے بغیر بالغ کی حیثیت سے روزگار پر نہ لگائے جائیں تاکہ اوورٹائم کے قاعدہ کو زیادہ سختی سے پابندی ہو اور سارے ہندوستان میں مناسب یکساں معیار پر چھوٹ دینے کی بنیاد تیار ہو۔ موسمی کارخانوں کے معاملہ میں نئے اوقات کی سفارش کی گئی لیکن قانون کی پابندی پر زیادہ زور دیا گیا اور چھوٹ دینے کے یکساں معیار کو ترقی دینے کے لئے ترغیب دی گئی۔ مصنوعی رطوبت کاری کو روکنے کی خاص سفارش کی گئی جہاں اس سے شدید تکلیف ہوتی ہے اور مزدوروں کے لئے پانی کی فراہمی پناہ گاہ، پیشاب، پاخانہ کے لئے جگہ، فوری امداد کے ساز و سامان وغیرہ مہیا کرنے کا کم از کم آئینی انتظام ہوا۔ کمیشن نے یہ بھی سفارش کی کہ ابھی کچھ کارخانے جو باضابطہ نہیں ہیں وہ قانون کے تحت لازمی طور پر لائے جائیں۔ قوت استعمال کرنے والے چھوٹے کارخانہ کے لئے یہ سفارش کی گئی کہ مقامی حکومت کو فیکٹری ایکٹ کو بعض دفعات کو ایسی جگہ لاگو کرنے کا اختیار ملنا چاہئے جہاں کام کرنے کے حالات خطرناک ہیں جو کارخانے بجلی استعمال نہ کرتے تھے اور جو باضابطہ نہ تھے ان کے بارے میں کمیشن نے رائے ظاہر کی کہ ان کے لئے ایک علیحدہ، مختصر اور سادہ ایکٹ لازمی ہے۔

کمیشن پر بیڑی اور دری کے کارخانوں میں لڑکوں کے حالات اور اُون صاف کرنے والے ادارے، چوڑی کارخانے اور ٹینریز میں موجودہ حالات کار مزدور کی صحت کے لئے مضر اور نہایت ہی گندہ، کا خاص طور پر اثر ہوا اس لئے انھوں نے قانون سازی کی سفارش کی جس میں لڑکوں کی عمر کی حد مقرر کرنے، ملازم لڑکوں کے اوقات کار میں باقاعدگی لانے اور ان صنعتوں میں کام کرنے والے کی صحت اور تحفظ کا انتظام کرنے کا لحاظ رکھا گیا تھا۔

۱۹۳۴ کے فیکٹریز ایکٹ نے مزدوروں سے متعلق روائل کمیشن کی زیادہ تر سفارشات شامل کر لیا۔ اس کے مطابق بالغوں کے اوقات کار ہفتہ میں ۵۴ ہو گئے اور موسمی کارخانوں میں ۱۱ گھنٹے فی روز ہو گئے۔ اس نے ہفتہ میں چھٹی کا لحاظ رکھا اور اوورٹائم کام کرنے کے لئے شرح ادائیگی بڑھا دی گئی۔ اس نے لڑکوں کے لئے اوقات کار دن میں ۵ گھنٹے اور عورتوں کے لئے ایک دن میں ۱۰ گھنٹے کی حد مقرر کر دی اور دونوں کے لئے رات کو کام کرنے کی ممانعت کر دی۔ یہ ایکٹ مشینی قوت استعمال کرنے والے اور ۲۰ مزدور یا زیادہ کو روزگار دینے والے کارخانوں پر لاگو ہوتا تھا۔ حکومت ایسے بے ضابطہ کارخانوں سے متعلق علیحدہ قانون سازی کے لئے روائل کمیشن کی سفارشات عمل میں نہیں لائی جو بجلی استعمال نہیں کرتے تھے

خواہ ان میں کام کرنے والے کی تعداد کچھ بھی ہو۔ بہرحال اس نے صوبائی حکومتوں کو اس ایکٹ کی دفعات کو ان اداروں تک توسیع کرنے کا اختیار دیدیا جن میں ۱۰ سے کم ملازمین نہ ہوں اور وہ مشینی قوت کا استعمال کریں یا نہ کریں بمبئی اور صوبہ متحدہ کی حکومتوں نے اس ضابطہ کا استعمال کرتے ہوئے اس ایکٹ کو ایسے ورکشاپ پر لاگو کیا جو بالترتیب بیڑی اور گلاس تیار کرتے تھے۔ ۱۹۲۷ کا سنٹرل پرونسیز انریگولیٹڈ انڈسٹریز ایکٹ کے ذریعہ ورکشاپ میں کام کے حالات کو باقاعدہ بنانے کی ہندوستان میں پہلی کوشش تھی اس ایکٹ کا اطلاق ایسے ورکشاپ پر ہوتا تھا جو ۵۰ یا زیادہ ملازمین اور جو بیڑی چپڑا بناتے اور چمڑے تیار کرتے ہوں۔

کارخانہ کے مزدور خصوصاً ٹکسٹائل مزدوروں کے حالات سے متعلق ضابطے جنگ کے قبل نسبتاً زیادہ واضح تھے۔ اس کے برعکس کانوں میں حالات بڑے ہی بے ضابطہ تھے۔ ۱۹۰۱ کا مائنس ایکٹ ایک غیر مؤثر قانون تھا ۱۹۲۳ کے مائنس ایکٹ نے اس خامی کو دور کر دیا۔ اس نے حد وسیع کردی کہ سطحی کارخانے بھی شامل ہو گئے اس نے ۱۳ سال سے کم عمر والے لڑکوں کو کام کرنے کی ممانعت کردی اس نے زمین پر بالغ مزدور کے اوقات کار فی ہفتہ ۶۰ گھنٹے اور زیر زمین ۵۴ گھنٹے محدود کر دیئے اور اس نے ہفتہ میں ایک دن کی چھٹی کی تجویز رکھی۔ کان کے مالکان مزدور کی قانونی باقاعدگی کے زیادہ عادی نہ تھے اور ظاہر ہے کہ وہ اس ایکٹ پر روبہ عمل آنے کے لئے فوری طور پر تیار بھی نہ تھے اور اپنی رپورٹ (۱۹۲۵) میں چیف انسپکٹر آف مائنس نے لکھا کہ لڑکوں کی ملازمت کلیتہً بند نہیں ہوئی حالانکہ یہ ایکٹ جولائی ۱۹۲۴ء سے لاگو ہوا۔ لیبر کمیشن کا خیال تھا کہ زمین کے اوپر فی ہفتہ اوقات کار ۵۴ گھنٹے محدود ہونے چاہئیں اور ۱۴ سے کم عمر کا کوئی لڑکا کان میں یا اس کے گرد کام کرنے نہ دیا جائے انھوں نے سفارش کی کہ زمین کے نیچے کام کے اوقات کے سوال کا پھر سے جائزہ لیا جائے، مائننگ بورڈ میں مزدوروں کی نمائندگی اور زیادہ ہو اور کان کنی کے علاقوں میں فلاحی سرگرمیوں کی طرف اور زیادہ توجہ دی جائے۔

۱۹۲۳ء کے ایکٹ سے ہونے والی تبدیلیاں بہت تھیں مگر اس ایکٹ نے ایک مسئلہ کو حل کئے بغیر چھوڑ دیا تھا اور یہ مسئلہ عورتوں کے زمین کے نیچے کام میں لگائے جانے کا تھا۔ ہندوستان میں اس کے مسلسل برقرار رہنے کا سبب کانوں میں کارکردگی کا فیملی سسٹم تھا۔ اس کے مکمل خاتمہ کی پے درپے وکالت کی گئی لیکن صنعت نے اس کی پوری طاقت سے مخالفت کی کہ اس اقدام کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کی ساری معیشت درہم برہم ہو جائے گی۔ ۱۹۰۱ کے

مائنس ایکٹ نے گورنر جنرل کو عورتوں کے زمین کے نیچے کام کرنے کو روکنے کے اختیارات دیئے تھے لیکن اس اختیار کا استعمال کبھی بھی نہیں ہوا۔ ۱۹۲۲ء کے بعد بھی یہ مسئلہ پھر سامنے آیا اور رائے پیش کرنے کی دعوت دی گئی تو بنگال اور بہار کی کوئلہ کانوں سے شدید مخالفت کا مقابلہ کرنا پڑا اس میں پنجاب کے نمک کانوں میں ہی خاص طور پر عورتیں کافی تعداد میں کام کرتی تھیں۔ اس روک تھام کے خلاف جو دلیلیں پیش کی گئیں وہ یہ تھیں کہ چونکہ مزدور عورتیں جماعت کا ایک بڑا حصہ ہیں اس لئے کسی قسم کی فوری روک تھام سے مزدوروں کی شدید قلت ہو جائے گی اور یہ کہ زمین کے نیچے کے حالات عورتوں کے لئے جسمانی طور پر مضر نہیں ہیں بلکہ یہ نارمل ہیں کیونکہ کام خانگی طریقہ کار سے ہوتا ہے اس آخری سوال پر چیف انسپکٹر آف مائنس نے کافی زور دیا اس نے لکھا تھا "فیملی سسٹم ہمیشہ قائم نہیں رہتا جیسا کہ معلوم ہوتا ہے کیونکہ اکثر ڈھونے والی عورت دوسرے کی بیوی ہوتی ہے" یہ تسلیم کیا گیا کہ مکمل ممانعت کبھی ضرور ہو جائے گی لیکن حکومت کا خیال تھا کہ اچانک ممانعت کوئلہ کی صنعت کے لیے مضر ثابت ہوگی۔ اس لئے ضابطے جاری کئے گئے جن کی روسے عورتوں کا کانوں میں زیر زمین کام پر لگانا تمام صوبوں میں ممنوع ہو گیا سوائے کوئلہ اور پنجاب کی نمک کانوں کے جہاں مزدور عورتوں کی تعداد میں بتدریج کمی ہونے کو تھی۔ ہندوستان نے جب زیر زمین عورتوں کے کام سے متعلق بین الاقوامی دستور کی توثیق کر دی تو ۱۹۳۸ء میں مکمل خاتمہ ہو گیا۔

ایک دوسرا قانون مزدور کے متعلق ۱۹۲۳ء میں ورکمینس کمپنسیشن ایکٹ Workman's Compensation Act کے نام سے پاس ہوا اس کی روسے مزدور معاوضہ کا مستحق ہوتا اگر کام سے یا کام کرتے وقت وہ زخمی ہو جائے اسی طرح بعض صنعتی امراض کے لئے بھی وہ معاوضہ کا حقدار ہوتا۔ اس کا اطلاق ریل، ٹرام میں کام کرنے والے، کان کے مزدوروں جہاز رانوں، گودی مزدوروں عمارت بنانے والے مزدور لائنس مین Linesman مہتر اور فائر بریگیڈ کے ارکان پر ہوتا تھا۔ حکومت ہند کو مزید اختیارات دیئے گئے کہ وہ خاص علاقہ کے ذریعہ کسی بھی خطرناک روزگار پر یہ ایکٹ لاگو کرے مزدور کو ملنے والے معاوضہ کی شرح کا پیمانہ کیا ہوگا اس کی تشریح اس ایکٹ میں کر دی گئی اور جھگڑے کا فیصلہ کرنے کے لئے اس ایکٹ کے تحت اسپشل ٹریبونل قائم کئے گئے۔ اس ایکٹ کے متعلق لیبر کمیشن کی اہم ترین سفارش یہ تھی کہ یہ تمام منظم صنعت کے سارے مزدوروں کا احاطہ کرے خواہ اس کا پیشہ خطرناک ہو یا نہیں اور یہ کہ بتدریج اس کی توسیع

کم منظم صنعت کے مزدوروں تک ہو اور اس کی شروعات سب سے خطرناک روزگار سے ہو۔ انھوں نے اس ایکٹ میں کئی معمولی ترمیمات کے لئے بھی مشورہ دیئے تاکہ مزدوروں کے نقطۂ نگاہ سے نظم و نسق زیادہ موزوں ہو جائے۔ اس کمیشن کی سفارشات کی بنیاد پر بڑی حد تک ایک بل تیار کیا گیا اور ۱۹۳۴ء کے ترمیمی ایکٹ کی حیثیت سے پاس ہوا۔

ایک دوسرا اصلاحی اقدام جو بہر حال تمام صوبوں میں اختیار نہیں کیا گیا، میٹرنیٹی بینیفٹ، ایکٹ تھا پہلا ایکٹ جو ۱۹۲۹ء میں پاس ہوا وہ بمبئی میں پاس ہوا جس کی تقلید صوبہ متوسط نے ۱۹۳۰ء میں کی۔ مزدور سے متعلق روائل کمیشن کی سفارشات کے نتیجہ میں مدراس اجمیر میرواڑ، دہلی، صوبہ متحدہ اور بنگال کی حکومتوں نے ایسے ایکٹ ۱۹۴۰ء تک پاس کئے۔ اس کی دفعات صوبہ بصوبہ مختلف تھیں۔ زنانہ مزدور کے لئے زچہ امداد کی مطلوبہ مدت ۶ سے ۹ مہینہ تک تھی عام طور سے سات آٹھ ہفتوں کی امداد دستیاب تھی اور امداد کی رقم عموماً عورتوں کی روزانہ اُجرت کی اوسط شرح یا ۸ سے ۱۲ آنہ فی روز تھی، ان میں سے جو کم ہو۔ بالعموم مفت طبی امداد کا کوئی انتظام نہ تھا۔

پیمینٹ آف ویجیز ایکٹ (۱۹۳۶ء) کا مقصد یہ تحفظ کرنا تھا کہ مزدوروں کو اجرت باقاعدہ طور طور پر ملتی رہے اجرت سے من مانی کٹوتی نہ ہو اور غیر مناسب جرمانہ عائد نہ کیا جائے۔ مزدور کے متعلق روائل کمیشن نے ایسی قانون سازی کا مشورہ دیا تھا۔ اس کا اطلاق ریل کے تمام ملازمین اور ان تمام کارخانوں پر ہوتا تھا جو قانونی ضابطہ کے تحت آتے تھے۔

مزدوروں سے متعلق روائل کمیشن کی رپورٹ کے نتیجہ میں ہندوستان کی حکومت اور کچھ صوبائی حکومتوں نے مزدوروں کے بارے میں کئی چھوٹے اور بڑے قانون تیار کئے۔ بہر حال ان کو روبہ عمل لانے کی پوری کوشش نہیں کی گئی۔ اس کا خاص سبب یہ تھا کہ مختلف صوبوں میں فیکٹری انسپکٹروں کی تعداد ناکافی تھی۔ ایک دوسرا سبب جس پر مزدور سے متعلق روائل کمیشن نے زور ڈالا تھا، وہ یہ تھا کہ اس ایکٹ سے اغماض کرنے پر عدالت معمولی جرمانہ لگایا کرتی تھی۔ "پورے طور پر کوئی اس نتیجہ کی تشدید نہیں کر سکتا کہ برٹش انڈیا میں گرچہ کارخانہ کی قانون سازی میں قابل تعریف ترقی ہوئی پھر بھی قوانین کے نظم و نسق میں اس کے موافق کوئی سدھار نہیں ہوا ہے۔"[1] یہ ایک فاضل ماہر کا جائزہ

---

[1] سراتول چٹرجی، آئی۔ ایل۔ او میں حوالہ شدہ۔ جنگ کے دوران مزدوروں کے حالات اور ہندوستان کے اندر تعمیر نو کی منصوبہ بندی (۱۹۴۶)

ہے۔ اور اس کا اطلاق یکساں طور پر ان تمام قوانین پر ہوتا تھا جو مزدوروں کے کام اور اجرت کا تحفظ کرتے تھے۔

قیمتوں کے بڑھنے کے برے اثرات پورے ہندوستان میں محسوس کئے جارہے تھے کیونکہ اجرتوں کے اضافہ سے مزدوری کے ذریعہ کی تلافی نہیں ہوئی تھی چائے کے باغات میں حالات مستثنیٰ طور پر بدتر تھے۔ کیونکہ یہاں کے مزدور آزاد نہ تھے۔ زیادہ تر صورتوں میں مزدور طویل المدتی معاہدہ پر کام کرتے تھے اور مالکوں کو اپنے مزدوروں پر غیر معمولی اختیارات ہوتے تھے اور بہت سے معاملات ۱۹۲۲ء میں آسام کے مزدوروں کے حالات کی جانچ پڑتال کی گئی اس نے یہ دریافت کیا تھا کہ بعض باغات میں اجرت تقریباً پچیس برسوں میں بھی نہیں بدلی تھی۔ یہاں تک کہ خود نخل کاروں نے بھی ۱۹۱۸ء تک تسلیم کرلیا تھا کہ اضافہ لازمی طور پر ضروری ہے پھر بھی ۱۹۲۰ء کے بعد تک نہیں کیا گیا۔ کپڑے اور غلے کی اونچی قیمت نے مزدوروں کی پوزیشن نازک بنادی تھی اور جہاں دھان کا حصہ دیا گیا وہاں یہ ناکافی تھا اور چاول بھی خراب تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ باغات کے مزدوروں کا معیار زندگی واضح طور پر بد سے بدتر ہوگیا۔ مزدوروں کی بھرتی گارڈن سرداروں کے ذریعہ ہوتی تھی جو خاص طور پر صوبہ متحدہ، بہار، اڑیسہ کے گنجان ضلعوں میں مقرر ہوتے تھے۔ مزدوروں کو ہجرت کی تحریک زیادہ اونچی اجرت سے ہی ہوسکتی تھی پھر بھی ۲-۱۹۲۱ء میں باغات کے مزدوروں کی اُجرت ایسی تھی کہ باغات کے بہت سے قلی جو حالات سے بیزار ہوکر باغات کو چھوڑ دیتے تھے وہ اپنے ضلع میں آکر آسانی سے زیادہ اجرت پر کھپ جاتے تھے۔ بعض حصوں میں مصیبت اتنی شدید تھی کہ کہ ہنگاموں اور اسٹرائک کا سلسلہ چلتا رہا اور بعض علاقہ سے مکمل ہجرت ہوئی۔ ۱۸۵۹ء سے ہی قلی اور نخل کاروں کے درمیان تعلقات خاص قانون کے ذریعہ ہموار ہوتے تھے جس سے نخل کاروں کو اپنے مزدوروں پر کنٹرول رکھنے کے نامناسب اختیارات حاصل تھے۔ ۱۹۰۱ء کا ایکٹ جس سے خاص قسم کے طویل المدتی معاہدے جاری ہوتے تھے، ۱۹۱۵ء میں منسوخ ہوگیا اور ۱۸۵۹ کے ایکٹ کی مزید ترمیم ۱۹۲۰ء میں ہوئی۔ ۱۹۲۰ء میں جاری ہونے والی ترامیم میں وہ دفعہ تھی جس کی رو سے ایک سال سے زیادہ مدت کا معاہدہ غیر قانونی قرار دیا گیا۔ اس کی شدید مخالفت چائے اسوسی ایشن سے ہوئی اور جس کی بہت سی صورتوں میں کھلے طور پر خلاف ورزی ہوئی جیسا کہ ۱۹۲۲ء کی کمیٹی نے پتہ لگایا تھا۔ معاہدہ بہرحال تعزیراتی رہا یہاں تک کہ ۱۹۲۴ء کے ایکٹ نے اسے پھر منسوخ کردیا۔ نخل کاروں اور مزدوروں کے تعلقات کو متعین

کرنے والی ایسی دفعات مدراس پریسیڈنسی میں ۱۹۲۹ء تک جاری رہیں۔ ۱۹۲۲ء کی کمیٹی کی اکثریت کا خیال تھا کہ آسام میں مزدوروں کو ملازمت میں لینے اور کنٹرول کرنے کا طریقہ "دوارس" Doars میں رائج "فری" مزدور کے طریقہ سے بالکل ناموافق ہے۔ یہ لیبر کمیشن کا بھی پرزور خیال تھا۔ یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ بااختیار جبری بھرتی فی الفور ختم نہیں کی جاسکتی اس لئے کمیشن نے ۱۹۰۱ کے ایکٹ کو ختم کرنے کی سفارش کی اور اس کے بدلہ ایسے ایکٹ کی نشاندہی کی جو کم پابندیاں لگائے اور جو مناسب مدت میں اپنے آپ کو معدوم کرنے کا راستہ رکھے۔ کمیشن کا خیال تھا کہ امداد یافتہ نو واردوں کے بھیجنے پر خاص قانونی کنٹرول ہونا چاہیئے انھوں نے آسام لیبر بورڈ کے خاتمہ اور نوواردوں کے محافظ کے دفتر کے قیام کی سفارش کی۔ کمیشن نے ایک بڑا اہم مشورہ دیا کہ تمام امداد یافتہ نوواردوں کو تین سال کی ملازمت کے بعد یہ حق ملنا چاہیئے کہ وہ مالک کے خرچ پر واپس بھیجے جائیں۔

حکومت نے ۱۹۳۲ء میں ٹی ڈسٹرکٹ امیگرنٹس لیبر ایکٹ صرف آسام کے چائے باغات میں بھرتی کو باقاعدہ بنانے کے لئے پاس کیا۔ نووارد مزدور کے کنٹرولر Controller of Immigrant Labour کی تقرری کا دفعہ مندرج تھا تاکہ مزدوروں کی بھرتی ان کی مرضی سے ہو اور وہ ملازمت کی شرائط سے آگاہ ہوں اور انہیں آسام سے گھر بھیجنے کا معقول انتظام ہو۔ اس ایکٹ نے ہر نووارد مزدور کو یہ حق دیا کہ آسام میں داخل ہونے کے تین سال بعد ہی مالک انھیں گھر واپس بھیج دے گا۔ لیکن کام کے حالات کو سدھارنے یا باقاعدہ بنانے یا باغات کے مزدوروں کی رہائش کو بہتر بنانے کے سلسلہ میں کوئی اقدام نہیں کیا گیا۔ کمیشن نے یہ بھی سفارش کی کہ مزدوروں کی مخصوص جداگانہ پوزیشن اور نخل کاروں کے درمیان مستحکم تنظیم اور مروجہ "اجرت معاہدے" کے پیش نظر آسام کے چائے کے باغات میں اجرت متعین کرنے کی آئینی مشینری قائم کرنا لازم ہے حکومت نے اسے منظور نہیں کیا۔

اجرت کی سطحوں اور ان کی نقل و حرکت سے بحث کرتے وقت ان بڑے اختلافات کا ذکر کرنا ضروری ہے جو ہندوستان میں ایک صنعت سے دوسری صنعت، ایک مرکز سے دوسرے مرکز اور ایک یونٹ میں موجود تھے۔ بہار کی کوئلہ کانوں میں جس قسم کے مزدور کام کرتے تھے اور اجرت کی جو سطح تھی وہ جمشید پور کی لوہے اور فولاد کی صنعت سے بہت مختلف تھے۔ کپاس کی صنعت میں ایک ہی درجہ کے ملازموں کی آمدنی کی اوسط سطح ایک مرکز سے دوسرے مرکز میں بالکل الگ

تھی۔ تیسری دہائی کے دوران اس صنعت میں سب سے زیادہ آمدنی کے مراکز جیسے احمد آباد میں مختلف درجوں کے کاریگروں کی آمدنی کمبتور جیسے سب سے کم آمدنی والے مراکز میں کام کرنے والوں کی آمدنی سے ڈھائی گنی سے تین گنی تھی۔ ایک ہی صنعت اور مرکز میں مختلف یونٹ مختلف اجرت دیا کرتے تھے۔ کانپور کی لیبر انکوائری کمیٹی نے ۱۹۳۷ء میں بتایا تھا کہ ایک ہی پیشہ میں ورکروں کی آمدنی ایک مل سے دوسرے مل میں بہت مختلف تھی۔ سب سے کم فرق سوت کاتنے والے حلقے Ring Spinners کے بڑے گروپ میں تھا یعنی ۱۲ روپیہ ۵ آنہ سے ۲۳ روپیہ ۱۰ آنہ فی ماہ تھا۔ کلکتہ کی جوٹ ملوں میں صورت حال بدترین صورتحال میں سی تھی۔ فرق کی سطح ایک یونٹ سے دوسرے یونٹ میں بہت مختلف تھی یہاں تک کہ ایک ہی نواح اور ایک ہی تنظیم میں مختلف سطح ہوا کرتی تھی۔ مزدوروں سے متعلق روائل کمیشن کے سامنے حکومت بنگال نے جو میمورنڈم پیش کیا تھا اس میں یہ بات درج تھی "دنیا میں شاید ہی کوئی ایسی صنعت ہو جو محدود علاقہ میں رہتے ہوئے بھی اتنی مختلف اجرت دیتی ہو"۔[1]

زیر نظر زمانے کے دوران اجرت کی نقل و حرکت کا جائزہ لینا مشکل ہے کیونکہ اعداد و شمار گویا مفقود ہیں۔ عام طور سے ۱۹۱۸ء تک اجرت میں کوئی اضافہ نہیں ہوا تھا۔ صنعتی مرکزوں میں اجرت تقریباً ۱۹۲۱ء تک برابر گھٹتی گئی۔ اضافہ کی فیصد شرح ایک صنعت سے دوسری صنعت میں بہت مختلف تھی۔

بمبئی[2] کے مزدور گزٹ میں دیئے گئے تفصیلی اعداد و شمار سے بمبئی پریسیڈنسی کی ٹیکسٹائل صنعت کی اجرت کا مقابلہ ہوتا ہے جو ۱۹۱۴ء اور ۱۹۲۳ء میں تھی۔ اس صنعت میں کام کرنے والوں کی حقیقی ماہانہ آمدنی میں مئی ۱۹۱۴ سے مئی ۱۹۲۱ء تک کا اضافہ بمبئی اور شولاپور کے دو چند سے کچھ کم تھا اور احمد آباد اور دوسرے چھوٹے مرکزوں کے دگنے سے کسی قدر زیادہ تھا جب کہ مئی ۱۹۲۱ء سے اگست ۱۹۲۳ء تک کے اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ بمبئی میں اجرت جامد رہی، احمد آباد میں کسی قدر کم ہوگئی اور شولاپور اور دوسرے مرکزوں میں کافی کم ہوگئی۔ کوئلہ کانوں کی اجرت میں اضافہ ۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۰ء میں ہوا تھا[3] اور ۱۹۲۵ء میں کم ہونا شروع ہوگئی لیکن اس نقل و حرکت کی وسعت

---

[1] آر۔ کے۔ مکھرجی کی کتاب "ہندوستان کا مزدور طبقہ" ص ۱۰۰ (۱۹۵۰) میں حوالہ شدہ

[2] مئی ۱۹۲۵ء

[3] ۱۹۱۹، ۱۹۲۰ اور ۱۹۲۵ء کے برسوں کے لئے کانوں کے چیف انسپکٹر کی رپورٹ

کا پتہ لگانا مشکل ہے۔ لیبر کمیشن نے اپنا خیال پیش کیا کہ ۱۹۲۵ء تک مزدور جنگ کے قبل کی نسبت عموماً بہتر تھے[۵]

تیسری دہائی کے دوران متعدد جا بجا ہڑتال ہوئی جس کی وجہ سے بعد کے دور کے اعداد وشمار زیادہ کثرت سے دستیاب ہیں۔ بہرحال بہت سی قسموں کے بڑے اختلافات کے باعث جیسا کہ ابھی بتایا گیا اجرت کی نقل وحرکت سے متعلق عمومی بات کرنا مشکل ہے۔ دوسری دہائی کی وسط میں حاصل شدہ اجرت کی سطح میں نمایاں گراوٹ ۱۹۲۹ء میں شروع ہوئی۔ عمومی طور پر یہ تحریک اجرت کے طریقہ کی موجودہ معقولیت Rationalisation اور مزدور کی تنظیمی طاقت سے وابستہ ہوتی جارہی تھی۔ اس دور میں آمدنی میں تخفیف احمد آباد میں شاید کم سے کم تھی جہاں کمی کی بھاری اوسط Weighed Average ۱۹۲۶ء اور ۱۹۳۷ء کے درمیان ۴ء۸ فی صد بتائی جاتی ہے۔ بمبئی میں اس کے مطابق فیصد شرح ۴ء۲۸ تھی۔ یہ یاد رہے کہ یہ مزدور تحریک گرچہ ۱۹۲۹ء کے بعد بمبئی میں بہت کمزور تھی تاہم بمبئی کی مل مالکوں کی جماعت نے کم ازکم اجرت کی جدول بنائی تھی جو بڑی کٹوتی نہ ہونے دیتی تھی۔ ہم یہ فرض کرسکتے ہیں کہ یہ کمی ایسے مرکزوں میں زیادہ ہوتی تھی جہاں مزدور اور مالک دونوں کم منظم تھے یا جہاں جیسے کلکتہ میں نہ تو مالکوں کی انجمن اور نہ سرکار اس سوال میں دلچسپی لیتی تھی۔ چیف انسپکٹر آف مائنس کی رپورٹ میں دیئے گئے اعداد وشمار سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۲۷ اور ۱۹۳۶ء کے درمیان جھریا کی کوئلہ کانوں میں مختلف جماعتوں کے مزدوروں کی آمدنی میں کمی ایک تہائی سے نصف تک ہوتی تھی۔ آسام کے چائے باغات کے مزدوروں کی آمدنی کا تخمینہ لگایا تھا کہ یہ ۱۹۲۹ اور ۱۹۳۶ء کے درمیان تقریباً آدھی ہوگئی تھی۔

۱۹۲۷ء کے بعد قیمتیں گرنے لگیں۔ یہ گراوٹ ۱۹۲۹ء اور ۱۹۳۳ء کے درمیان شدید تھی اور ۱۹۳۷ء میں یہ نمایاں طور پر اوپر بڑھنے لگیں۔ قیمتوں میں اس گراوٹ کی وجہ سے مزدور کی اجرت میں تخفیف کے باوجود اپنے آپ کو سنبھال سکے۔ روزگار کے حجم اور تحفظ میں کمی سے قیمتوں میں گراوٹ کا اثر کسی قدر زائل ہوگیا۔ تیسری دہائی میں مزدوروں کی حالت کسی حد تک سدھر سکی یا کس قدر خراب ہوئی اس کا اندازہ لگانا ممکن نہیں۔ یہ بہت اہم نہیں کیونکہ مزدوروں کی بھاری اکثریت بڑی مشکل سے زندگی گذار رہی تھی۔ اس کا پتہ اس بات سے چلتا ہے کہ ہندوستان

---

[۵] رپورٹ، ص ۱۹۶

کے تمام مرکزوں میں صنعتی مزدور قرض کے شکار تھے۔ مستثنیات میں کانوں اور باغات کے مزدور آتے تھے۔ یہ سب سے کم مشاہرہ پانے والوں میں تھے اور ان کا معیار زندگی پست تھا۔ وہ بہرحال زیادہ تر قبائلی تھے اور ایسے علاقوں میں رہتے تھے جہاں نہ تو خرچ کرنے کا امکان تھا اور نہ ساہوکار ہی قریب تھے۔

محنت سے متعلق روائل کمیشن نے تخمینہ لگایا تھا کہ زیادہ تر صنعتی مرکزوں میں ایسے خاندان یا صنعتی مرکزوں میں ایسے خاندان یا افراد کا تناسب جو قرض میں جکڑے تھے کل کے دو تہائی سے کم نہ تھا اور یہ بھی بتایا کہ زیادہ تر صورتوں میں قرض کی رقم تین مہینوں کی اجرت سے زیادہ تھی اور اکثر اس سے بہت زیادہ ہوتی تھی۔ انھوں نے یہ بھی دریافت کیا کہ مزدوروں کو ملنے والے قرض کی عام شرح سود ۷۵ فیصد ہے[1] ۱۹۳۵ء میں مدراس میں کی گئی جانچ پڑتال سے معلوم ہوا کہ مزدوروں کے ۹۰ فیصد خاندان قرض میں مبتلا ہیں اور ہر خاندان کا اوسط قرض ۲۶۲ روپیہ ہے۔ ۲-۱۹۴۱ء میں ناگپور میں ہوئی تحقیقات سے ظاہر ہوا کہ ان کے خاندان کا ۸۲ فیصد قرض میں مبتلا ہے اور اوسط قرض ۱۸۹ روپیہ ہے جو اوسط ماہانہ آمدنی کا چار گنا تھا۔ مقروضیت اور مزدوروں کے معیار زندگی کے دوسرے پہلوؤں سے متعلق مفصل اعداد و شمار مزدور چھان بین کمیٹی کی رپورٹ میں دستیاب ہیں مگر ان کا تعلق ۱۹۴۴ء سے ہے۔

مزدور سے متعلق روائل کمیشن نے مزدوروں کے قرضے سے نپٹنے کے لئے کئی اقدامات کی سفارش کی۔ اس کمیشن نے بتایا کہ صنعتی ادارے ساہوکاروں سے بھرے پڑے ہیں اور اسے روکنے کے لئے قانون سازی کی سفارش کی۔ اس سلسلہ میں مرکزی حکومت نے کوئی قانون پاس نہیں کیا حالانکہ بنگال کی حکومت نے ۱۹۳۴ء میں بنگال ورکس مینس پروٹکشن ایکٹ پاس کیا تاکہ کام کرنے کی جگہوں کے آس پاس قرض کی وصولی کے لئے چکر لگانے والوں کو سزا دی جائے، ۱۹۳۷ء میں اسی طرح کا ایک ایکٹ صوبہ متوسط کی حکومت نے پاس کیا۔ روائل کمیشن نے مزدوروں کے غیر محفوظ قرض کو نپٹانے کے لئے قانون سازی کی سفارش کی۔ اس سفارش پر واحد آئینی اقدام یہ کیا گیا کہ صوبہ متوسط نے ۱۹۳۶ء میں صنعتی مزدوروں کو منہا اور ختم کرنے کے لئے ایکٹ پاس کیا۔ مزدوروں کی اجرت کو محفوظ رکھنے کے لئے دوسرا اقدام یہ تھا کہ

---

[1] رپورٹ، ص ص ۵-۲۲۴

۱۹۳۷ء میں کوڈ آف سول پروسیڈر میں ترمیم ہوئی تاکہ مشاہرہ کا پہلا ۱۰۰ روپیہ اور باقی کا نصف ضبط ہونے سے محفوظ رہے۔

مزدور کو روزگار دینے اور سپلائی کرنے اور مستقل صنعتی مزدور طاقت کے ابھرنے سے متعلق حالات زیر نظر دور کے دوران فی الواقعی نہیں بدلے درمیانی لوگ جو نوکری دینے والے، سردار، مقدم یا دوسرے مقامی ناموں سے مشہور تھے انہی لوگوں کے ذریعہ روزگار عام طور پر ملتا تھا۔ آسام کے چائے باغات کے پاس کام دینے کی ایک واضح مشینری تھی چونکہ وہ ایک بڑے فاصلہ سے اپنے مزدوروں کو روزگار دیتے تھے اس لئے مشینری کو کچھ قانونی کنٹرول کے تحت رکھنے کی ضرورت تھی۔ دکھن میں جو باغات تھے وہ اپنے مزدوروں کو روزگار نواح کے علاقوں سے مقامی ایجنٹوں کے ذریعہ دیتے تھے۔ کوئلہ کانوں میں مزدور کو روزگار ٹھیکہ داروں کے ذریعہ ملتا تھا جو مزدوروں کو متقرر کرنے اور وہ کوئلہ نکالنے کے بعض پہلوؤں کے بھی عموماً ذمہ دار تھے۔ منظم شہری صنعت میں بھی مزدوروں کی بھرتی اگر کارخانہ کے گیٹ پر بھی ہوتی تھی تو وہ نوکری دینے کے ذریعہ ہی عموماً ہوتی تھی۔ چند صورتوں ہی میں سدھار کی بالارادہ کوشش کی رپورٹ ملی تھی۔ کانپور میں ایمپلائرس اسوسی ایشن نے الگ الگ کارخانوں میں مزدور کو روزگار دینے کے لئے ایک بیورو قائم کیا تھا۔ بمبئی اور شولاپور میں ٹیکسٹائل ملوں نے رواں اور غیر مستقل تبادل مزدور جو 'بدلی' کہلاتے تھے ان کی بھرتی پر قابو رکھ کر اسے باقاعدہ بنانے کی کوشش کی۔ 'بدلی' کنٹرول سسٹم کے مقاصد دو تھے ایک یہ کہ 'بدلی' کو باقاعدہ روزگار دیا جائے اور مزدور کو روزگار دینے میں نوکری دہندہ کے اثر ورسوخ کو ختم کیا جائے۔

ہندوستان کے مزدور باہر سے آتے تھے اس لحاظ سے کہ بڑی حد تک اس جگہ کی آبادی سے ان کو روزگار نہیں ملتا تھا جہاں کام کا یونٹ ہوا کرتا تھا۔ ایسی مہاجرت صنعتی نشو ونما کے ابتدائی مرحلے میں ناگزیر تھی۔ بہرحال اگر مہاجرت کے قائم ہوجانے کے بعد بھی کسی مرکز میں بہت عرصہ تک جاری رہے اور کافی مزدوروں کے لئے مسلسل مانگ قائم ہو تو یہ مخصوص اسباب کی وجہ سے ہے۔ آسام کے چائے باغات میں مقامی مزدور دستیاب نہ تھے اور نخل کاروں نے آنے والے مزدوروں کو دھان کا کھیت یا گارڈن پلاٹ دینا مناسب سمجھا تاکہ وہ جزوی طور پر کاشتکاری کریں اور اس طرح ان کی خدمات تقریباً مستقل بنیاد پر برقرار رہیں۔ بہار اور بنگال کی کوئلہ کانوں میں مقامی قبائلی مزدور کی اچھی سپلائی موجود تھی۔ اس کے باعث ان علاقوں میں اجرت کی سطح نیچی تھی جو بہت سے دوسرے مستقل تکملہ کے لئے سازگار ہوں

وہ درمیانی سائز کے ایسے صنعتی مراکز میں پیدا ہو گئے جو زرعی علاقہ سے گھرے تھے اور جہاں بے زمین مزدوروں کی بہتات تھی ۔ یہی حال شولاپور، ناگپور اور کمبتور جیسے مرکزوں کا تھا۔ بمبئی، کلکتہ اور کانپور جیسے زیادہ بڑے مراکز میں بہت سے عناصر مستقل طور پر سکونت پذیر مزدور طاقت کے ابھرنے کے مخالف تھے ۔ اجرت کم ہو سکتی ہے، کام تھکا دینے والا ہو سکتا ہے یا رہائشی حالات بالخصوص مکان کی صورت حال سنگین ہو سکتی ہے ۔ کلکتہ کی جوٹ ملوں میں جو اجرت ملتی تھی وہ مقامی مزدوروں کے لئے باعث کشش نہیں ہو سکی حالاں کہ بہار اور یوپی سے مزدور کھنچ کر چلے آتے تھے ۔ کام کرنے اور رہنے کے حالات دونوں مل کر مزدور پر بڑا بوجھ ڈالتے تھے اور وہ اس کے ردعمل کا اظہار کام سے وقتی طور پر غائب ہو کر کرتے تھے اور جب بھی ممکن ہوتا وہ سال میں ایک بار گاؤں جاتے تھے ۔ اس سے اس رجحان کی وضاحت ہوتی ہے جسے غیر حاضر باشی Absenteeism کہتے ہیں ۔ ایک معاصر مبصر نے یہ لکھا تھا: "ہندوستان میں وقت تو ملحوظ رکھنے کا مسئلہ بہت ہی اہم ہے اس سے بہت سی صورتوں سے پیدا ہونے والی تکان کی کیفیت کا پتہ چلتا ہے ۔ جہاں اجرت اچھی ہوتی ہے وہاں معمولی باتوں کے لئے لوگ کام کو نہیں چھوڑتے وہ خاص طور پر ایسا اس لئے کرتے ہیں کہ وہ کام میں اپنی کھوئی ہوئی قوت کو پھر سے پیدا کرلیں"۔[۹]

مزدور کی مستقل جماعت کے قیام کی رکاوٹ کا شاید اہم ترین سبب مکانوں کا ناکافی ہونا تھا ۔ زیادہ تر بڑے صنعتی مرکزوں میں حالات بہت ہی خراب تھے اور زیادہ تر مبصرین اس امر پر متفق تھے کہ ان مرکزوں میں جس طرح کی رہائشی حالت ہے اس میں کنبہ کی زندگی بسر کرنے کا کوئی امکان نہ تھا ۔ ہندوستانی شہروں میں زائد گنجان آبادی کی صورتیں تشویش ناک تھیں جن کا پتہ ۱۹۲۱ء کی مردم شماری کے اعداد و شمار سے چلتا ہے ۔ ان کے مطابق بمبئی کی کل آبادی کا ۷ فیصد ایک کمرہ کے مکان میں رہتا تھا اور ہر کمرہ میں اوسطاً چار آدمی سے زیادہ رہتے تھے ۔ اس شہر کے ایک حلقہ میں ۹۶ فیصد لوگ ایک کمرہ والے مکان میں رہتے تھے اور ایک کمرہ میں پانچ آدمی رہتے تھے ۔ کراچی میں حالات اور بدتر تھے ۔ کانپور میں آبادی کا ۳۴ فیصد ایک کمرہ والے مکان میں رہتا تھا ۔ مزدور سے متعلق روائل کمیشن نے بنگال کی بستی، بمبئی کے چال اور مدراس

---

۹ براوٹن، ہندوستان کی صنعتوں میں مزدور، ص ۸۸ (۱۹۲۴)

کے چیری کے حالات بڑے واضح طور پر بیان کئے تھے۔ اس نے لکھا تھا: بالخصوص ہوڑہ کے بعض حصوں میں زائد گنجان آبادی اور بھیڑ بھاڑ اتنی ہے جو شاید ہندوستان کے کسی دوسرے صنعتی علاقہ میں نہیں"۔ [1] زیادہ تر صورتوں میں چالوں کی ایسی حالت ہے کہ ان کی مرمت نہیں ہو سکتی لہٰذا وہ گرا دینے کے قابل ہیں"۔ [2] "مدراس میں ایک کمرہ والے مکانات ۲۵ ہزار ہیں جن میں ڈیڑھ لاکھ آدمی رہتے ہیں جو آبادی کا چوتھائی حصہ ہے"۔ [3] احمد آباد کے ان علاقوں میں جہاں مزدوروں جماعتیں رہتی ہیں وہاں تقریباً ۹۲ فیصد مکانات ایک کمرہ کے ہیں، ان کی تعمیر خراب طریقہ سے ہوئی ہے، وہ ہوادار نہیں، صاف ستھرے نہیں اور بہت ہی گنجان ہیں"۔ [4] جنگ کے درمیانی دور میں مدراس اور ناگپور جیسے مقامات میں کچھ مالکوں نے اپنے مزدوروں کے بہتر مکانات تعمیر کرائے تھے اور بمبئی جیسے بعض مرکزوں میں حکومت اور مقامی حکام نے اس قسم کے اقدامات کئے تھے۔ پھر بھی یہ اس مسئلہ کا محض ایک چھوٹا سا گوشہ ہے۔ تیسری دہائی کے اواخر میں جو جانچ پڑتال ہوئی اس سے معلوم ہوتا تھا کہ بمبئی، احمد آباد، کانپور اور مدراس جیسے شہروں میں زیادہ تر کام کرنے والے مکانات میں رہا کرتے تھے اور انہی حالتوں میں رہتے تھے جن کا مزدور سے متعلق رو ائل کمیشن نے کیا ہے۔

ہندوستان میں مزدور زیادہ تر دیہی علاقوں سے ترک وطن کر کے صنعتی مراکز میں جایا کرتے تھے اس طرح زیادہ تر مزدوروں کا تعلق کھیت اور گاؤں سے ہوتا تھا۔ صنعتی مراکز میں مستقل مزدور جماعت کے نہ ابھرنے کا مطلب تھا کہ یہ رابطہ ہمیشہ قائم رہا۔ بعض حالتوں میں ارتباط کے معنی زرعی سرگرمیوں میں دلچسپی لینے کے تھے اور اس کے مطابق گاؤں میں جانے کا وقت متعین ہوتا تھا۔ بمبئی جیسے شہر میں بہر حال اس کا مطلب اس سے زیادہ نہ تھا کہ ورکر اپنے گاؤں میں واپس جائیں گے۔ بیروزگاری اور علالت، اپنے بچوں کی پیدائش اور بڑی سماجی سرگرمیوں کے لئے انہیں یہ رابطہ برقرار رکھنا ضروری تھا کیونکہ ان تمام حاجتوں کے لئے شہر میں کوئی انتظام نہ تھا۔ یہ واضح ہے کہ اس صورت سے وابستہ مصارف بھی تھے لیکن مروجہ حالات میں مزدور سے متعلق رو ائل کمیشن نے یہ رائے دی کہ کارخانہ کے مزدوروں کے لئے گاؤں سے رابطہ برقرار رکھنا مناسب ہے اور جہاں تک ممکن ہو اسے باقاعدہ طور پر قائم رکھنا سود مند ہے۔

---

[1] رپورٹ، ص ۲۷۲ [2] رپورٹ، ص ۲۷۳

[3] رپورٹ، ص ۲۷۴ [4] رپورٹ ص ۲۷۷

اٹھارھواں باب

روایتی اور چھوٹے پیمانہ کی صنعت ۳۹-۱۹۱۴ء

جدید کان کنی اور مصنوعات کی تیاری سے الگ صنعتی پیداوار کا میدان بڑا اور متنوع تھا۔ مردم شماری میں جو لوگ صنعت میں لگے ہوئے مندرج ہیں ان میں سے زیادہ تر جدید سیکٹر سے باہر ہیں۔ پیداوار کے قدیم ٹیکنالوجیکل طریقوں کے ضمن میں صنعتی پیداوار خاص طور پر عام استعمال کیلیے سامان پیدا کرنے میں لگی رہتی تھی۔ ان تمام چیزوں میں بہر حال مصنوعات کی قسم اور تنظیم کے فارم میں فرق بہت ہوتا تھا ٹیکسٹائل پیداوار میں ایک طرف احمد آباد کے عمدہ فنی کمخواب یا بنارس کی ساڑیاں تھیں تو دوسری طرف گاؤں کے گھروں میں موٹی چادریں تیار ہوتی تھیں اسی طرح پھیلاؤ کا پتہ دھات کے کاموں سے بھی چلتا تھا کیوں کہ نقاشی یا بدری کا کام بھی ہوتا تھا اور گاؤں کے لوہار ہل بھی تیار کرتے تھے۔

صنعت کا جدید منظم سیکٹر جس کی ترقی کی تفصیل پیش کی گئی ہے بالکل نیا تھا۔ صنعتی ڈھانچہ کا باقی حصہ زیادہ تر پھیلا تھا یا صنعتی عمل کی ابتدائی اور روایتی قسموں کی نئی شکل تھی۔ بدلے ہوئے سیاسی اور معاشی حالات کے زیر اثر بعض قدیم قسموں کی سرگرمیاں تیزی سے کم ہو رہی تھیں شہری آرائشی دستکاریوں کی طرح اعلیٰ ہنرمندانہ فنون کا حشر کیا ہوا اس کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ دوسری طرف ہاتھ کی کتائی اور لوہے کی ڈھلائی کی طرح کی سرگرمیاں بھی تیزی سے ماند پڑنے لگیں۔ جن کی ترقی یافتہ ٹکنالوجی کی برتری نمایاں تھی دوسری جگہوں میں بہت قسم کی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ عموماً پیداوار اور مانگ پورا کرنے کا میدان سمٹ گیا۔ مصنوعات کی مطابقت اوزار اور ٹکنک میں سدھار اور خام اشیا کی نئی قسموں یا سرچشموں کی دستیابی کے ذریعہ ہی کچھ حصے محفوظ رہ گئے اس عمل میں تقویت محفوظ مارکیٹ سے ملی تھی کیونکہ صارفین نئی اشیاء کی مخالفت کرتے اور ان کے

مقابلے میں پرانی اشیا کو ترجیح دیتے تھے۔ ایسے گوشوں میں جہاں مانگ اور پیداوار دونوں وسیع طور پر پھیلے ہوئے تھے جیسے ٹیکسٹائلز، دھات کا کام، لکڑی کا کام، چرمی مصنوعات وہاں طبقہ بندیاں تھیں مثلاً شہر کی آرائشی دست کاریاں، شہری افادیت کی صنعت اور دیہی افادیت کی پیداوار۔

بعض صنعتی کاریگروں کی خدمات اور مصنوعات کی ایسی عالمگیر اور مسلسل مانگ تھی کہ وہ عام طور پر گاؤں کی جماعت کے ڈھانچہ میں اُجرت یافتہ کاریگر کی طرح شامل رہتے تھے۔ لوہار، بڑھئی، چمار اور کمہار بھی عموماً شامل ہوتے تھے، بنکر اتنا اہم کاریگر ہوتے ہوئے بھی اس طرح شامل نہیں ہوتا تھا اس لئے کہ ہاتھ کرگھا صنعت میں تخصیص ہوا کرتی تھی اور یہ خاص خاص علاقوں میں مرکوز ہوتی تھی ایسی صنعتی سرگرمی جس کا تعلق وسائل سے اتفاقی الواقعی مقامی حلقہ میں مرکوز ہوتی تھی۔ معدنی کان کنی، ڈھلائی اور جنگل مصنوعات کا یہ حال تھا کاغذ اور شیشہ کی پیداوار بھی علاقائی طور پر محدود تھی۔ قدیم تر صنعتی سرگرمی میں تبدل و تغیر کا انحصار جزوی طور پر سائنٹفک ترقی کے اوپر تھا کیونکہ لوہے کی ڈھلائی، شورہ کا اہتمام اور دیسی رنگ کا خاتمہ ہوگیا لیکن لاکھ اور ابرک کی صنعتیں کام کرتی ہیں آسان ابتدائی عوامل میں عموماً اخراج (Displacement) مکمل ہوا لیکن یہاں بھی حالات نے مختلف نتائج پیدا کئے۔ مثال کے طور پر کپاس کا اونٹنا اور کاتنا تقریباً پورے طور پر مشین سے ہونے لگا مگر دھان کا ہاتھ سے کوٹنا بہت سے علاقوں میں خوب جاری رہا۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی تھی کہ شروع میں مشینی مصنوعات قابلِ قبول نہیں تھیں اس لئے بعد میں بھی دستی صنعت زندہ رہی۔ بنکر مل کا سوت استعمال کرنے لگا، رنگنے والے مصنوعی رنگ کام میں لانے لگے پیتل اور تانبا کے کام کرنے والے بدراسے کام کرنے لگے اور لوہار مناسب شکلوں میں ڈھلے لوہے سے کام کرنے لگا۔ درزی اب سلائی مشین سے کام کرتے ہیں اور شہر کے کاریگر یورپی یا امریکی کاریگری کے ترقی یافتہ آلات استعمال کرتے ہیں۔"[۲]

ان تمام تبدیلیوں اور مطابقتوں کے نتائج صنعتی سرگرمی کے تمام پہلو جیسے مصنوعات کی

۱۔ بہرحال ۱۹۴۵ء میں کئے گئے سروے سے معلوم ہوا تھا کہ "خوندمل میں گاؤں کے لوہار ابھی منافع بخش طور پر لوہا ڈھالتے ہیں اور ایسے سامان تیار کرتے ہیں جو مضبوطی کے نقطۂ نظر سے درآمد شدہ سامان سے مقابلہ کرسکتے ہیں۔" ڈاکٹر ایچ۔ پی۔ مہنتی:۔ اڑیسہ کا صنعتی سروے، ص ۱۳ (۱۹۴۶ء)

۲۔ ہندوستان کے صنعتی کمیشن کی رپورٹ، ص ۱۶۲ (۱۹۱۸ء)

اقسام، پیداوار کے طریقے پیداواری اور بازاری سرگرمی کی تنظیم اور مارکٹ کی وسعت اور کردار میں منعکس تھے۔ ایک خاص مدت میں بنکروں کے مختلف درجوں کی تعداد میں کتنا فرق ہوا اس کا پتہ لگانا ممکن نہیں۔ آبادی کے پیشہ ورانہ درجہ بندی سے متعلق واقفیت دس سالہ مردم شماریوں میں موجود ہے لیکن درجہ بندی اور نمبرداری کے طریقے ایک مردم شماری سے دوسری مردم شماری میں جداگانہ ہوتی تھی۔ بتواتر مردم شماریوں میں مخصوص علاقہ یا خطہ میں مندرج مخصوص اہم قسموں کے تقابلی اعداد و شمار کا تجزیہ تاریخی تحریک کے اظہار کی افادیت کے سلسلہ میں شکوک پیدا کرتا ہے۔ ہینڈلوم انڈسٹری سے متعلق اعداد و شمار جو مردم شماریوں میں موجود ہیں وہ قابلِ اعتماد نہیں جیسا کہ حقیقت دریافت کرنے والی کمیٹی (Fact Finding Committee) نے ان کے دقیق مطالعہ کے بعد اپنا تاثر بیان کیا تھا بہرحال مردم شماریوں کے اعداد و شمار کا استعمال ایک زمانہ میں ملک کی صنعتی سرگرمی کی مختلف قسموں کی عددی اہمیت معلوم کرنے کے لئے ہو سکتا تھا۔ ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے پیشہ سے متعلق اعداد و شمار پورے طور پر جدول میں پیش نہیں کئے گئے تھے۔ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری حسب ذیل نمایاں تصویر پیش کرتی ہے اس مردم شماری میں درج ہونے والی مزدوروں کی پوری تعداد ۱۵۳۹ لاکھ تھی جس میں ۱۵۴ لاکھ یعنی ۱۰ فیصد سے کچھ زیادہ صنعتی مزدور کی حیثیت سے پیش کئے گئے تھے۔ صنعتی مزدوروں میں زیادہ تعداد ٹیکسٹائل مزدوروں کی تھی۔ ان کی تعداد ۴۱ لاکھ تھی جس میں ۲۹ لاکھ کپاس کی بُنائی اور اس کے ابتدائی مرحلہ میں مشغول تھے۔ بڑھئی کی تعداد ۹ لاکھ سے کچھ زاید تھی اور کمہار تقریباً ۸ر۷ لاکھ تھے۔ دوسرے اہم طبقوں میں درزی اور ٹوپی بنانے والے وغیرہ ۶ر۵ لاکھ تھے۔ ٹوکری بنانے والے اور اس قسم کے دوسرے مزدور ۶ر۴ لاکھ تھے راج مزدور پینٹ کرنے والے، پتھر کاٹنے والے اور تعمیر کی صنعت میں دوسرے مزدوروں کی تعداد ۶ر۳ لاکھ تھی، دھات کا کام کرنے والے (خاص طور پر لوہار) ۷ لاکھ تھے، چاول کوٹنے والے وغیرہ ۶ر۵ لاکھ، تیلی ۵ر۵ لاکھ، رسی، دھاگہ وغیرہ بنانے والے ۳ر۲ لاکھ (ٹیکسٹائل مزدوروں میں شامل تھے) اور چمڑے کا کام کرنے والے ۳ لاکھ تھے صنعتی مزدوروں میں تقریباً ۱۱ لاکھ دھوبی اور ۷ لاکھ مہتر بھی شامل تھے۔

حقیقت دریافت کرنے والی کمیٹی (Fact Finding Committee) (ہینڈلوم اینڈ ملز) کی رپورٹ جسے حکومت ہند نے ۱۹۴۰ء میں مقرر کیا تھا ہاتھ کرگھا صنعت کی وسعت اور خصوصیات سے متعلق پورے اعداد و شمار پیش کرتی ہے اور بالخصوص ۱۹۱۴ تا ۱۹۳۹ کے دوران اس صنعت کی بدلتی ہوئی حالت پر کافی روشنی ڈالتی ہے۔ تاریخی اعداد و شمار سے متعلق جائزہ کے بعد

یہ کمیٹی اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ ۱۸۸۵ء کے بعد ہندوستان میں ہینڈلوم انڈسٹری میں کوئی انحطاط نہیں ہوا۔ ۱۸۹۵ء تک ہندوستان کو دستی بنائی کی صنعت ہاتھ کے کاتے سوت کے بدلہ مل کے بٹے سوت استعمال کرنے لگی اس طرح یہ تغیر مکمل ہوگیا۔ یہ سوت کی درآمد میں اضافہ اور ہندوستانی ملوں کے ذریعہ سوت کی پیداوار سے وقوع پذیر ہوا۔ انیسویں صدی میں پانچویں دہائی اور آخری نویں دہائی کے درمیان سوت کی درآمد برابر بڑھتی گئی اور اسی زمانہ میں ہندوستان کی سوتی مل انڈسٹری نے سوت تیار کرنے والی صنعت کی حیثیت سے خاص طور پر ترقی کی۔ بیسویں صدی کے پہلے دہے میں سوت کی درآمد میں کمی اور بنائی میں ہندوستانی مل صنعت کا بڑھتا ہوا زور اس بات کا پتہ دیتا تھا کہ اس وقت تک ہینڈلوم انڈسٹری میں ہاتھ کے بنے سوت کی جگہ مل کے تیار کردہ سوت نے لے لی تھی۔ اس مفروضہ کی بنیاد پر ہاتھ کرگھا سے تیار شدہ کپڑے کا اندازہ ہینڈلوم کو دستیاب ہونے والے کل مل سوت (ہندوستانی اور درآمد شدہ) سے ہوسکتا ہے۔ ان اعداد و شمار کے جائزہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۱۴ء کے قبل پندرہ برسوں کے دوران ان کی پیداوار میں کچھ اضافہ ہوا تھا پیداوار میں اضافہ بہر حال یہ ظاہر نہیں کرتا کہ اس صنعت میں مزدوروں کی تعداد کم نہیں ہوئی۔ ٹکنک میں سدھار بالخصوص بعض علاقوں میں ماکور (Fly Shuttle) کے استعمال سے فی مزدور پیداوار بڑھ گئی اور پیداوار میں کچھ اضافہ سے مزدوروں کی تعداد میں کچھ کمی فطری تھی۔

جنگ کے زمانہ میں پیداوار کو نقصان ہوا۔ یہ ہینڈلوم کے مل سوت پر انحصار کرنے کا نتیجہ تھا۔ جنگ کے حالات سے سوت اور کپڑے دونوں کی درآمد محدود ہوگئی اور ہندوستان میں کپڑے کا دام بہت بڑھ گیا اس لئے ہندوستانی ملوں کیلئے یہ منافع بخش ہوگیا کہ وہ زیادہ سے زیادہ سوت کو کپڑے میں منتقل کردیں۔ لہذا ہینڈلوم کے لئے مل سوت کی سپلائی بہت کم ہوگئی اور کپڑے کی پیداوار گھٹ گئی۔ تخفیف کے اثرات کی تلافی کسی حد تک اونچے دام سے ہوگئی لیکن ہینڈلوم کی معیشت بہت سے مرکزوں میں بگڑگئی۔ جنگ کے مابعد زمانہ میں مل سوت زیادہ آسانی سے دستیاب تھا اور ہینڈلوم کے کپڑے کی پیداوار میں پھر کسی قدر اضافہ ہونے لگا۔ اس صنعت کے آغاز میں ہندوستانی مارکیٹ کو کپڑے سپلائی کرنے والے کی حیثیت سے ہندوستانی ملوں اور ہینڈلوم کی اضافی پوزیشن میں تبدیلی تیز ہوگئی اور ہینڈلوم صنعت کے لیے نئے مسائل پیدا ہوگئے۔ ۱۹۰۱ء کے قریب مل کپڑوں کی پیداوار ہینڈلوم کی پیداوار کی تقریباً نصف تھی ۱۹۱۴ء تک تقریباً برابر ہوگیا۔ جنگ کے دوران یہ تناسب ہینڈلوم کو مل سوت نہ ملنے سے بہت بگڑ گیا لیکن جب یہ سپلائی کافی بھی

ہوگئی تب بھی ملوں کے ذریعہ تیار کردہ کپڑے ہینڈلوم سے تقریباً ۵۰ فی صد سے زیادہ تھے۔

ملوں کی صلاحیت میں مستقل اضافہ اور ہینڈلوم کے جمود سے کپڑے کی مل پیداوار ہینڈلوم سے تیسری دہائی کے آغاز میں دوگنی اور آخر میں ڈھائی گنی تھی۔

ہندستانی مل صنعت کو کچھ فائدہ درآمد کی بے دخلی سے ہوا اور کچھ اس صنعت کی نشوونما ہینڈلوم صنعت کے مارکٹ پر اثر انداز ہونے لگی۔ فیشن کے بدل جانے سے بہ آسانی ہوئی، مخصوص اور واضح قسموں کے کپڑے کے عوض معیاری اور سادہ قسموں کا چلن ہوگیا یہ تغیر مرد اور عورت کے کپڑوں میں بیک وقت ہو رہا تھا۔ ۱۹۲۵ء کے بعد ہندوستانی مل عورتوں کے لائق کپڑے تیار کرنے لگی۔ ہینڈلوم انڈسٹری کے مخصوص علاقوں میں ملوں کی دخل درانداز ی کا اثر کئی جہتوں سے ہوا اس نے ہندستانی ہینڈلوم کے برآمدی مارکٹ کو اثر انداز کیا اور باہر بالخصوص جاپان سے اس قسم کے مل کے بنے کپڑوں کی درآمد بھی ہونے لگی۔ ہندستانی ملوں کے تحفظ کے لئے عمدہ درآمد شدہ سوت پر عائد ٹیکس نے بھی اندرونی اور بیرونی مارکیٹ میں ہینڈلوم کی قوتِ مقابلہ کو تباہ کر دیا۔ یہ تمام عناصر کارفرما تھے کہ سرد بازاری کا آغاز ہوا اور اس نے ہینڈلوم بنکر کے حالات ایسے بدتر ہوگئے کہ اس کی مثال نہیں ملتی۔ اس خرابی کا پتہ کپڑے کی پیداوار میں کمی سے نہیں ہوتا تھا۔

"چونکہ ہینڈلوم بنکر اپنے خاندان کی فاقہ کشی کا خطرہ مول لئے بغیر مارکٹ کی حالت کے مطابق اپنی پیداوار کو باقاعدہ نہیں بنا سکتے تھے اس لئے ہینڈلوم صنعت کی پوزیشن سمجھنے کے لئے صحیح کوئی یہ نہیں ہے کہ کل پیداوار کے ساتھ ہینڈلوم سے تیار ہونے والے کپڑے کی مقدار کا تناسب کیا تھا بلکہ یہ ہے کہ ہینڈلوم بنکر کی اجرت کیا تھی"۔[1] اس صنعت کے انحطاط کا پتہ بنکروں کی آمدنی سے چلتا ہے جو کافی کم ہوگئی تھی۔ بیکار ہینڈلوم کے اعداد و شمار سے اصل بیروزگاری کا حال معلوم ہوتا ہے۔ ۱۹۴۰ء میں حقیقت دریافت کرنے والی کمیٹی (Fact Finding Committee) نے اس کا اندازہ تقریباً ۱۲ فیصد لگایا تھا۔ آمدنی کے سلسلہ میں یہ کمیٹی اس نتیجہ پر پہنچی تھی کہ ۱۹۲۸ء اور ۱۹۴۰ء کے درمیان پورے ملک میں بنکروں کی آمدنی میں خطرناک حد تک کمی واقع ہوئی تھی اور بعض صورتوں میں یہ کمی ۷۰ یا ۸۰ فی صد تک پہنچ گئی تھی، ۱۹۴۰ء میں آمدنی بہت ہی کم ہوگئی تھی جس سے ناکافی روزگار اور معمولی اجرت کا اظہار ہوتا تھا اور زیادہ تر بنکروں کو اجرت ایسی ملتی تھی جو غیر تربیت یافتہ مزدوروں کو ملتی ہے۔

---

۱ ٹیرف بورڈ (۱۹۳۲)، حقیقت دریافت کرنے والی کمیٹی کی رپورٹ میں حوالہ دیا گیا ہے (ص ۲۲)

حقیقت دریافت کرنے والی کمیٹی (Fact Finding Committee) نے یہ پتہ لگایا کہ دہائیوں میں دیہی ہاتھ کرگھا صنعت زوال کا شکار ہوئی اور اب یہ زیادہ شہری دستی صنعت بن گئی ہے۔ اس عمل میں یہ صنعت واضح طور پر علاقوں میں محدود ہوکر رہ گئی ہے نیز پیداوار کی قسموں میں کافی جغرافیائی تخصیص آگیا تھا۔ بہرحال تنظیم کی قسموں میں کافی یکسانیت تھی۔ پست علاقوں میں آزاد بنکر زیادہ تھے جہاں موٹا کپڑا مقامی استعمال کے لئے تیار ہوتا تھا۔ دوسری جگہوں میں یہ مل سوت کی سپلائی اور دور کے مارکیٹ کے لئے پیداوار پر منحصر تھا، بنکر کا واسطہ درمیانی آدمی سے ہوا کرتا تھا جو سپلائی، پیسہ اور مارکٹ پر قابو رکھتا۔ بنکر کے لئے سوت کی لاگت بہت سے درمیانی آدمیوں کی وجہ سے اونچی تھی بنکر کے نقطہ نظر سے ہینڈلوم کی مصنوعات کے مارکٹ کی تنظیم بھی زیادہ لاگت کی محتاج تھی۔ امداد باہمی کی تنظیم ہنوز برائے نام تھی۔ خاص صورت یہ تھی کہ ایک آقا بنکر ہوتا تھا جو بنکروں کو اپنے گھروں میں روزگار دیتا تھا اور یہ انہیں کی ذات کا ہوتا تھا یا سوت یا کپڑے کا تاجر یا دونوں جو وہی کام کرتے تھے یا کارخانہ دار ہوتا تھا جو بنکروں کو ایک چھوٹے کارخانہ میں ایک ساتھ لاتا تھا نیز انہیں لوم اور دوسرے سامان بھی بہم پہنچاتا تھا۔ بہرحال بنکر کا پورا دارومدار درمیانی آدمی پر ہوتا تھا جو ان کا مالک ہوا کرتا تھا۔

ایک مرکز سے دوسرے مرکز اور ایک صوبہ سے دوسرے صوبہ میں اس صنعت کی منفعت میں فرق پایا جاتا تھا۔ دستیاب اعداد و شمار کا جائزہ لینے کے بعد حقیقت دریافت کرنے والی کمیٹی اس نتیجہ پر پہنچی کہ ۱۹۲۰ء اور ۱۹۴۰ء کے درمیان مدراس میں لوم کی تعداد میں اضافہ کا واضح نشان ملتا ہے اور اسی مدت میں بنگال میں لوم کی تعداد میں کمی واقع ہوئی ہے۔ مرکزوں کی منفعت میں فرق ایک اعتبار سے غیرضروری عناصر پر منحصر تھا اس کا تعلق مطابقت سے بھی جزوی طور پر تھا جس کا اظہار مقامی صنعت کے مصنوعات کی قسم۔ نئے سامان جیسے رنگ یا مصنوعی ریشم کا دھاگہ اور پراں ماکور (Fly shuttle) اور دوسرے تکنیکی سدھار کو اختیار کرنے میں ہو رہا تھا۔ اس دور کی جدت جس کا مستقبل پر کافی اثر ہونے والا تھا، پاور لوم کا استعمال تھا یہ انفرادی طور پر یا چھوٹے کارخانوں میں لگائے جاتے تھے اور ہینڈلوم کی طرح ہی کپڑے تیار کرتے تھے ہینڈلوم اور مل کے مقابلہ میں محدود قسم کی مصنوعات میں ان کو خاص فوائد حاصل تھے وہ زیادہ تر ہینڈلوم سے بنائی ہونے والے مراکز میں قائم ہو رہے تھے اور اچھے بنکر بھی زیادہ کام لے رہے تھے بمبئی پریسیڈنسی میں پاور لوم کا خاص طور پر مرکز تھا۔

۱۹۱۹ء کی اصلاحات کے بعد صوبائی حکومتوں کی پالیسی گھریلو صنعتوں کے ساتھ بالعموم اور ہینڈلوم کے ساتھ بالخصوص بدل گئی تھی۔ اس سلسلہ میں مدراس نے پیش قدمی کی جس نے پہلے ہی شعبہ جاتی تجربات کے ذریعہ اس صنعت کو امداد دینے کی ناکام کوشش کی تھی دوسرے دہے میں تقریباً تمام صوبوں اور کافی ہینڈلوم رکھنے والی بڑی ریاستوں نے بنکروں کے لئے تربیتی اسکول اور مظاہرہ کے مراکز کھولنے کا اقدام کیا۔ اس طرح پرّاں ماکو (Fly Shuttle) والی، جکارڈ اور دوسرے بہتر اوزار، رنگائی، چھپائی کے بہتر طریقے اور ترقی یافتہ ابتدائی مرحلے کی اشاعت کی۔ سرد بازاری کے بعد بڑھتے ہوئے بدتر حالات پر ان تمام کوششوں کا کوئی اثر نہیں ہوا اور صوبائی حکومتوں خصوصاً مدراس نے ہندوستان کی حکومت سے درخواست کی کہ وہ چنگی اور ٹیکس (cess) لگا کر اس کی مدد کرے۔ حکومتِ ہند نے اس تجویز کو قبول نہیں بلکہ ہینڈلوم کی امداد کے لئے صوبائی حکومتوں کو گرانٹ دینا منظور کیا۔ یہ گرانٹ پہلی بار ۵-۱۹۳۴ء میں دی گئی۔ یہ رقم تقریباً ۵ لاکھ سالانہ تھی۔ صوبائی حکومتوں کو سوت کی سپلائی کو بہتر بنانے، کپڑے کے لئے مارکٹ بہم پہنچانے، کپڑے کی عمدگی کے لئے سہولت دینے اور زیادہ پیداوار کی صلاحیت کو تقویت دینے میں اس کو استعمال کرنا تھا۔ حکومتوں کو استعمال ہونے والی ایجنسیوں اور انفرادی پروگرام مرتب کرنے میں کافی آزادی دی گئی۔ گرانٹ کی رقم مختصر تھی اور اس کا چند صوبوں میں مدد واثر ہی ہوسکتا تھا۔ ہینڈلوم بنکروں کی مسلسل پریشانیوں اور ملوں کے خلاف ان کے ناجائز مقابلہ کی شکایتوں سے متاثر ہوکر حکومت ہند نے ان کے مسائل کی طرف مزید توجہ دی اور اس طرح ۱۹۴۰ء میں حقیقت دریافت کرنے والی کمیٹی (Fact Finding Committee) کا قیام عمل میں آیا۔

جنگ کے درمیانی دور میں دیہی کاریگروں کی حالت میں کوئی اہم تبدیلی نہیں ہوئی۔ پچھلے دور میں جن رجحانات کا تجزیہ ہوا وہ بغیر کسی روک ٹوک کے جاری رہے۔ کاریگروں کا وہ طبقہ جو گاؤں کی پوری جماعت کو اپنی خدمات دیتا تھا اسے کچھ جزوی اجرت فصل کے حصے سے ملتی تھی اس قسم کی ادائیگی کا انتظام ایک کاری گر سے دوسرے کاری گر، ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ میں مختلف تھا۔ یہ ایک دور میں ہونے والی مطابقتوں اور تبدیلیوں کے بھی ماتحت تھا۔ بڑھئی اور لوہار جیسی مثالوں میں جن کی خدمات زرعی کاموں کے لئے لازم تھیں، روایتی اجرت میں کوئی تغیر رونما نہیں ہوا تھا۔ مگر یہ صورت کمہار کے ساتھ نہ تھی۔ روایتی اجرت میں تغیر

اس طرح رونما ہوتا تھا کہ کاشتکار ایک طریقہ سے یا دوسرے طریقہ سے اجرت کم کردیتے تھے اور یہاں تک کہ بالکل ہی بند کردیتے تھے۔ بے شک یہ عمل یکساں نہ تھا۔ یہ تدریجی تھا لیکن اس سے بہت سے کاریگروں کی زندگی نازک صورت حال سے ہمکنار ہوگئی تھی اور وہ پہلے سے زیادہ مزدوری پر وارو مدار کرنے لگے۔ دیہی کاریگروں میں جو ہر طرف پھیلے ہوئے تھے لیکن جنہیں فصل سے اجرت نہیں ملتی تھی، تیلی کی پوزیشن جنگ کے مابعد زمانہ میں واضح طور پر بدتر ہوگئی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ تیل کا میکانکی طریقہ تیزی سے اشاعت پذیر ہوگیا تھا۔ یہاں تک کہ تیلی کا اندرونی مارکٹ بھی سکڑنے لگا کیونکہ اس کا مقابلہ مل کے تیل سے تھا۔ صرف بڑے گاؤں ہی بس گاؤں کے کاریگروں کا پورا تکملہ موجود تھا جو نواح کے گھروں اور چھوٹے گاؤں کی ضرورتوں کو پورا کرتے تھے۔ گاؤں سے جو کاریگر وابستہ نہیں ہوتے تھے، وہ بڑے گاؤں میں مرکوز تھے یا جہاں خام مال کی سپلائی کے سرچشمہ ہوتے تھے۔ ریشم کے کیڑے پالنا تقریباً ہر جگہ ایک پیشہ تھا جو زراعت کے ضمن میں آتا تھا اور یہ زیادہ تر میسور بنگال اور کشمیر کے علاقوں میں محدود تھا بہر حال ریشم کی بنائی کپاس کی بنائی سے بھی زیادہ مرکوز اور شہری تھی۔ صوبہ متوسط بہار اور اڑیسہ اور آسام کے جنگلوں سے دستیاب ہونے والے ریشم پر جو بنائی مبنی تھی وہ زیادہ دیہی بنیاد پر قائم تھا۔ کھردرے دیہاتی کمبل کی بُنائی ہندوستان کے بہت سے حصوں میں عام تھی۔ پنجاب میں اون کی ہینڈلوم انڈسٹری کافی تھی اور سستے کمبل کی بُنائی پانی پت اور اس کے گرد گاؤں کی ایک بہت اہم دیہی صنعت تھی[1] گھریلو صنعتوں میں ایک بڑا گروپ ٹوکری تیار کرنے، چٹائی بنانے اور بید کا کام کرنے، رسی اور سوت وغیرہ بنانے اور ناریل کے ریشے سے رسیاں بنانے کا کام کرتا تھا۔ ان ساری چیزوں کا دارومدار ان مناسب خام اشیاء پر تھا جو مقامی طور پر دستیاب ہوتی تھیں۔ ایک یا دوسری چیز سے ٹوکری بنانے کا رواج گویا عام تھا حالاں کہ یہ کم از کم اجرت کا ضمنی پیشہ تھا۔ سن کا کپڑا FLAX پٹوا، جوٹ اور ناریل کے ریشے کی رسیاں ملک کے مختلف حصوں میں دوسری قسم کے پیشوں کی خام اشیاء تھیں بنگال کے جوٹ پیدا ہونے والے ملکوں میں عورتیں جوٹ سے رسی اور دھاگے بناتی تھیں جب کہ ناریل کے ریشے سے رسیاں بنانے کی صنعت کاری مالابار کی خاص گھریلو صنعت تھی اور یہ اتنی اہم تھی کہ "ریشہ کا سوت ایک حد تک ساحلی علاقوں کی کرنسی تھی"[2] سینک اور چھلکے وغیرہ

---

[1] بروینج ؛ پنجاب کی صنعتیں (۱۹۱۷ء)

[2] مدراس کی مردم شماری کی رپورٹ (۱۹۲۱ء)

سے وابستہ صنعتیں بھی خام اشیاء کی مقامی سپلائی کے اعتبار سے پھیلی ہوئی تھیں۔
مخصوص پیشوں میں ورکروں کی تعداد سے متعلق تاریخی رجحانات کا جائزہ عمومی آثار کی بنیاد پر ہی لیا جا سکتا ہے۔ یہ تصور کرنا سہل ہوگا کہ ایک طرف ہینڈلوم بنکر یا بڑھئی کی تعداد مستقل رہی یا کسی قدر بڑھی تو دوسری طرف کمہار یا تیلی کی تعداد مرورِ ایام سے گھٹ رہی تھی۔ بہرحال یہ عمل تدریجی اور سست گام تھا۔ متبادل صورتوں کی عدم دستیابی کے باعث کاریگر اسی وقت پیشہ چھوڑتا تھا جب کہ مخالف عناصر سختی سے کارفرما ہوتے تھے نیز پرانی عادتوں کا استحکام اور صارفین کی ترجیحات اور عام لوگوں کے افلاس سے کاریگروں کی خدمات کا بڑا مارکٹ محفوظ تھا گرچہ یہ مارکٹ آہستہ آہستہ سمٹ ہو رہا تھا۔
جس طرح ہینڈلوم صنعت میں شہری پن، مقامیت اور جغرافیائی تخصیص کے رجحانات کارفرما تھے۔ اسی طرح کاریگروں کی صنعت میں بھی موجود تھے۔ وہ سارے لوگ جن کی گاؤں میں موجودگی ضروری نہ تھی وہ رفتہ رفتہ آمد و رفت کی سہولتوں اور معیشت کے روپیہ پر بڑھتے ہوئے انحصار سے چھوٹے اور بڑے شہروں میں مجتمع ہو رہے تھے، ٹیکسٹائلز کی طرح زیادہ تر کاریگر صنعتوں میں مصنوعات میں کچھ مطابقت پیدا کی گئی تھی اور ٹیکنک میں کچھ سدھار ہوا تھا۔ صارفین کے مستقل سامان میں ہندوستانی گھروں کی سب سے اہم ضرورت کھانا پکانے اور دوسرے برتنوں کی تھی۔ تانبا، پیتل اور جرسی دھات کے سامان کی صنعتیں تمام خطوں کی اہم خصوصیت تھی دھات کے سامان کی صنعت مقامی طور پر مرکوز تھی اور جغرافیائی تخصیص بھی پیدا ہو گئی تھی۔ سونا اور چاندی کے کام کرنے والے سنار بھی ہر جگہ پائے جاتے تھے۔ برتنوں کو شکل دینے کے لئے پریس کا استعمال ہونے لگا۔ اور ورکشاپ ایک عام تنظیمی حقیقت بن گئی۔ لکڑی اور چمڑے سے متعلق صنعتی سرگرمیوں میں بھی ایسے رجحانات نظر آتے تھے۔ فنکارانہ دستی صنعتوں نے بھی جن کی مصنوعات کی مانگ پہلے کم ہو گئی تھی انہوں نے بھی خاص مراکز میں مخصوص اشیاء کے لئے ایک قسم کا توازن پیدا کر لیا تھا۔ اعلیٰ ٹیکسٹائلز اور کشیدہ کاری کے علاوہ دھات کے آرائشی کام ہوتے تھے خصوصاً نقاشی بدری یا گل کاری، ہاتھی کے دانت، صندل لکڑی، سینگ، پیتل کے نقشین برتن کے سامان، اونی قالین وغیرہ قابل ذکر تھے۔
شہری یا دیہی کاریگری کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اگر انھیں سرمایہ کی دشواریاں تھیں۔ اور خام اشیاء کے سرچشموں اور مارکٹ سے رابطہ بھی کم تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا ساہوکاروں اور

درمیانی آدمیوں پر پورا انحصار تھا، لاگت اونچی تھی اور آمدنی کم۔ اس سلسلہ میں جو تصویر پیش کی گئی ہے وہ ہر جگہ یکساں ہے خواہ دوسری دہائی میں کئے گئے یوپی یا بنگال کے ضلعوں کا سروے ہو یا بمبئی کی اقتصادی اور صنعتی سروے کمیٹی (۴۰-۱۹۳۸) (Bombay Economic and Industrial Survey Comittee 1938-40) کی رپورٹ ہو یا نیشنل پلاننگ کمیٹی کی دیہی اور گھریلو صنعتوں کی ذیلی کمیٹی (Rural and Cottage Industries Sub-Comittee) کے سوال نامہ (۴۰-۱۹۳۹) کے صوبوں اور ریاستوں کے سرکاری جوابات ہوں۔ یہاں تک کہ ٹوکری بنانے جیسی صنعت کے بارے میں ہم پڑھتے ہیں: "مارواڑی بچولئے بید ادھار سپلائی کرتے ہیں اور آمدنی کا زیادہ حصہ ہڑپ کر لیتے ہیں[1]۔" بریلی کی فرنیچر کی صنعت نسبتاً ماہرانہ اور منافع بخش سرگرمی کی مثال کے طور پر پیش کی جا سکتی ہے۔ یہاں سرکار کے کارپنٹری اسکول کی کارکردگی کے باعث بہتر درجہ کے بڑھئی پیدا ہو گئے تھے۔ لیکن چونکہ کاریگر اپنے گاہک سے قریب نہیں ہوتا تھا اور وہ ہمیشہ سرمایہ کا محتاج ہوتا تھا اس لئے یہ صنعت درمیانی آدمیوں کے ہاتھوں میں تھی اس لئے کاریگر قاعدے کے مطابق خوشحال نہ تھے۔ صنعت میں درمیانی آدمی کے نہیں ہونے سے صورت بہتر نہیں ہوتی تھی۔ مثال کے طور پر یہ قابل ذکر ہے کہ میرٹھ ضلع میں کمبل کی بنائی کرنے والوں کو اپنے خام مال کی سپلائی کے لئے ہر سال جماعت کے ساتھ راجپوتانہ اور پنجاب جانا پڑتا تھا[2]۔ تیسری دہائی کے آخیر سے متعلق سروے کی تفصیلات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کاریگر بڑی حد تک درمیانی آدمی پر منحصر کرتے تھے اور یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ تیسری دہائی میں بہت سی گھریلو اور چھوٹے پیمانہ کی صنعتوں میں انحطاط پیدا ہوا۔

یہ صرف حالات کا اتفاقی امر تھا کہ صنعت مسلسل فروغ پاتی رہی اور کاریگروں کے ساتھ نسبتاً مناسب سلوک روا رکھا گیا۔ مثال کے طور پر سورت کی وہ صنعت پیش کی جا سکتی ہے جو سونا چاندی کا کام کرتی تھی انیسویں صدی میں ہندوستان کے بہت سے شہروں میں سونے اور چاندی کے تار کی صنعت نے خوب فروغ حاصل کیا۔ تار اور گوٹا کناری (Tinsel) کی صنعت سے متعلق مونوگراف کا خیال ہے کہ کلکتہ انڈسٹری کے زوال کا آغاز ۱۸۷۷ء سے ہوا

۱۔ بنگال کی گھریلو صنعتوں کا سروے۔ ندیا ضلع (۱۹۲۴ء)

۲ یوپی کے ضلعوں کا صنعتی سروے۔ میرٹھ

جب ایک جرمن صنعت کار نے کلکتہ سے نمونے حاصل کئے اور پھر مشین کا تیار کردہ سوت درآمد کرنا شروع کیا۔ کلکتہ کی صنعت قائم رہی جب تک کہ مشین کی تیار کردہ درآمدات گھٹیا درجہ کی ہوتی تھیں۔ بہرحال ۱۸۹۰ء تک درآمدات کا معیار بلند ہوگیا تھا اس لئے یہ صنعت تیزی سے انحطاط پذیر ہوگئی۔ دہلی میں کنٹرول کرنے والی جماعت (Guild) کے انحطاط سے معیار میں انحطاط پیدا ہوگیا اور اس کے بعد خارجی مقابلہ نے اس کو پست کردیا۔ بریلی میں جہاں کچھ مشینی سدھار اختیار کیا گیا تھا وہاں مقامی مانگ کے لئے نقلی سامان سے صرف گھٹیا مال تیار کیا جاتا تھا اس صنعت کا سب سے ترقی پذیر مرکز سورت تھا اور جنگ کے قبل ہی سے یہاں پیداوار کے طریقوں میں سدھار لایا گیا تھا۔ پھر بھی سورت کی صنعت تقریباً ۱۹۲۰ تک انحطاط پذیر شکل میں تھی جنگ کے بعد سورت میں پیداوار کے طریقوں میں مزید سدھار کے لئے حکومت نے مدد کی اور باہر ٹریننگ کے لئے انتظام کیا۔ جنگ کے مابعد دور میں قابل غور تجدید ہوئی چونکہ ۱۹۲۲ء میں درآمد شدہ سونے کے تار پر ۳۰ فیصد محصولاتی ٹیکس لگایا اور چونکہ جنگ کے بعد سونے کے تار کا دام گھٹ جانے سے اس کا ہندوستان میں مصرف بڑھ گیا۔ ٹیرف بورڈ جس نے اس صنعت کا جائزہ ۱۹۳۰ میں لیا تھا اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ سورت اور بنارس (خصوصاً اول الذکر) جیسے ہندوستانی صنعت کے خاص مراکز نے شمالی اور مغربی ہندوستان کے تمام مارکٹ پر قبضہ جمالیا تھا۔ مدراس پریسیڈنسی کی ہینڈ لوم بنائی صنعت خاص طور پر عمدہ قسم کا درآمد شدہ سوت استعمال کرتی تھی ٹیرف بورڈ نے سفارش کی تھی کہ کچھ چاندی پر عائد ٹیکس کے اخراجات کو دور کرنے کے لئے ٹیکس میں ۵۰ فیصد اضافہ ہو اور کچھ محصولاتی ٹیکس سے حاصل ہونے والے تحفظ میں زیادتی ہو۔ اس سے اس صنعت کو تقویت ملی اور یہ فروغ پاتی رہی تنظیم میں سدھار اور صنعت کے مختلف طریقوں میں نئی راہیں اور نئے عمل آنے گئے بلکہ اس نے جدت اور اثر پذیری کا بھی ثبوت دیا۔ مزدوروں اور بیوپاریوں کی سماجی بناوٹ میں تسلسل کا درجہ قابل غور تھا اور اپنی تنظیموں کے ذریعہ مزدور مختلف عوامل میں نسبتاً بہتر سلوک کے حقدار ہوئے [1]

کچھ دنوں میں اس روایتی فہرست میں نئی کاریگر قسم کی صنعتوں کا اضافہ ہوا۔ سڑکوں کی تعمیر اور زراعت کے تجارتی ہونے کے نتیجہ میں دیہی گاڑیوں کی تیاری بڑی اہم ہوگئی تھی لیکن

---

[1] ۔ پورے بیان کے لئے دیکھیں آر۔ کے۔ پاٹل سورت میں سونے اور چاندی کی تجارت (۱۹۵۶ء)

یہ سارے ملک میں علاقائی طور پر محدود تھی۔ جنگ کے درمیانی دور میں یہ جمود اور انحطاط کا شکار ہوگئی[1]۔ ابتدا میں اس کا سبب یہ تھا کہ شہروں میں مال کے لئے موٹر کا استعمال ہونے لگا اور جب دیہات کی سڑکوں پر موٹر بس چلنے لگی تو شدید رکاوٹ کا تجربہ ہوا۔ دوسری سرگرمی بیڑی بنانے کی تھی جو بہت پھیلی ہوئی تھی اور لوگوں کو کافی روزگار دیتی تھی حالانکہ اس میں اجرت بہت کم تھی۔ اس کے ورکر زیادہ اپنے گھروں میں کام کی اجرت پر کام کرتے تھے پھر بھی ایک جگہ پر کافی مزدوروں کے جمع ہو جانے سے پیداوار بھی منظم ہونے لگی تھی۔ اس کے نتیجہ میں جو حالات پیدا ہوئے ان کی طرف مزدور سے متعلق رو آئل کمیشن (Royal Commission on Labour) کی توجہ مبذول ہوئی۔ چھوٹے پیمانہ پر صابن بنانے کی ایک دوسرے سرگرمی تھی جو بہت مقبول ہوئی۔

جنگ کے بعد بڑھتی ہوئی صنعتی سرگرمی اور نئے شہروں کے ظہور سے چھوٹے پیمانہ پر شروع ہونے والی سرگرمیاں خصوصاً بڑے شہروں میں اہم ہوگئیں۔ ان کی مثالیں۔ صندوق، سیف، کپ بورڈ، سازو سامان، بجلی سے ملمع کاری، تالے اور چھری کانٹے کے سامان کی تیاری میں مل جاتی ہیں۔ موٹر بس کے ذریعہ آمد و رفت ہونے نیز اس کو برقرار رکھنے اور مرمت کرنے والے کاموں کی وجہ کر موٹر باڈی اور آٹو مبائل کے پرزوں کے بنانے کا کام تیز ہوگیا۔ اس طرح بڑی صنعت کے مرکزوں میں مل کے پرزے اور دیگر مشین اور (Roller Skins) پھاوڑا جیسی بنانے والی سرگرمیاں پیدا ہوگئیں۔

حکومت کی پالیسی میں تبدیلیوں کے علاوہ جو بعد میں پیدا ہوئیں، دیہی اور چھوٹے پیمانہ کی صنعت کو پھر سے زندہ کرنے کے لئے سیاسی پارٹیوں خصوصاً انڈین نیشنل کانگریس کی قوت افزا مدد سے بھی بعض کاریگر صنعتوں کو فائدہ حاصل ہوا۔ خاص زور کھدر پر تھا یعنی ہاتھ سے کاتے ہوئے ہاتھ سے تیار شدہ کپڑا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہاتھ سے کتائی کا تقریباً ناپید عمل پھر سے زندہ ہوگیا۔ بہر حال آل انڈیا دیہی صنعتوں کی غیر سرکاری انجمن نے دوسری کئی صنعتوں میں باقاعدہ دلچسپی لی کسی حد تک ہاتھ سے تیار ہونے والی کاغذ کی صنعت کو اس نے پھر سے بحال کیا ہاتھ سے دھان کتائی میں امداد دی، شہد کی مکھی کی پرورش اور شہد تیار کرنے کی صنعت کو جدید طریقہ

---

[1]. بمبئی شہر میں مال ڈھونے والی بیل، گاڑیوں کی تعداد، ۱۹۱۸ میں ۹,۵۲۸ تھی جو گھٹ کر ۱۹۳۳ء میں ۱۳۸۷ ہوگئی: گڈگیل اینڈ گوگیٹ: موٹر بس ٹرانسپورٹیشن ان رکس ڈسٹر ص ۷۸ (۱۹۳۵ء)

پر لگایا، دیہات کے کولھوں میں سدھار کیا اور دوسرے تغیرات پیدا کئے۔ سیاسی تحریک سے دیسی صنعت کی مصنوعات کے حق میں انداز نظر بدلا جس کے باعث عارضی طور پر ان کے عام مانگ پر کافی اثر پڑا۔

صنعتی پالیسی

جنگ نے ہندوستان کے صنعتی افلاس کو نمایاں کر دیا اس سے حکومت یہ محسوس کرنے پر مجبور ہوگئی کہ ہمہ جہت صنعتی ارتقا کی قومی اہمیت کیا ہے۔ تجارت اور صنعتوں پر حکومت کا کنٹرول بتدریج آتا گیا اور جیسے ہی جنگ آگے بڑھی ویسے ہی بعض صنعتوں کو تقویت دینے کی فوری ضرورت کا احساس ہوا۔ جنگی سامانوں کی ضرورت خاص طور پر محسوس ہو رہی تھی اور فروری ۱۹۱۷ء میں کمانڈر ان چیف کے مشورہ پر مونیشنز بورڈ (Munitions Board) کا قیام عمل میں آیا۔ اس بورڈ کو بڑے اختیارات دیئے گئے، اس کا خاص مقصد ہندوستان کے صنعت کارانہ وسائل کو فروغ دینا اور انہیں جنگی مقاصد کے لئے استعمال کرنا تھا۔ یہ بھی دریافت کیا گیا کہ محض پیداوار کو تقویت دینا اور باقاعدہ کرنا کافی نہیں بلکہ کچھ کی ذمہ داری خود حکومت کو لینی ہے۔ ایک ایسی ٹون (Acetone) کا کارخانہ اور فوجی کپڑے اور چمڑے کا سامان تیار کرنے والے کارخانے اس طرح قائم کئے گئے۔

ہندوستان کی رائے عامہ نے ہمیشہ شور مچایا تھا کہ صنعتوں کو ٹھوس مدد دی جائے۔ آخر کار حکومت نے ۱۹۱۶ء میں ایک صنعتی کمیشن مقرر کیا تا کہ وہ خاص طور پر یہ تحقیق کرے کہ کس طرح حکومت صنعتی ترقی کے لئے براہ راست حوصلہ افزائی بہم پہنچا سکتی ہے۔ کمیشن کے حوالہ کی شرائط میں ٹیرف پالیسی کی بات شامل نہ تھی۔ ۱۹۱۸ء میں کمیشن نے یہ رپورٹ دی کہ حکومت صنعتی معاملات میں زیادہ مؤثر طور پر مداخلت کرے۔ اس نے سفارش کی کہ صنعتوں کے مرکزی اور صوبائی شعبوں کا قیام ہو، سائنٹفک اور ٹکنیکل خدمات بالخصوص آل انڈیا کیمیکل سروس کی تنظیم ہو، صنعتی اور ٹکنیکی تعلیم کے لئے مزید سہولتیں دی جائیں، حکومت کے ذریعہ ذخائر کی خریداری کی پالیسی میں تبدیلی ہو اور بعض قسم کی مالیاتی امداد اور ابتدائی (Pioneer) اور مظاہرہ (Demonstration) کارخانے کھول کر صنعت کو زیادہ براہ راست مدد بہم پہنچائی جائے۔ مرکزی اور صوبائی دونوں حکومتوں نے خاص طور پر یہ سفارشات منظور کرلیں۔ اسی درمیان، جنگی مالیات کے تقاضوں

نے حکومت کو درآمد شدہ اشیا پر معیاری محصولاتی ٹیکس لگانے پر مجبور کر دیا اور آزاد تجارت کا بالکل مکمل معیار عارضی طور پر ترک کر دیا گیا جس کی موافقت کے لئے کاٹن اکسائز ڈیوٹی عاید کرنی پڑی۔

جنگ کے فوراً بعد ہی اصلاحات کی منظوری نے نئی محصولی پالیسی کے افتتاح کو ممکن بنا دیا۔ ۱۹۲۱ء میں ایک محصولی کمیشن (Fiscal Commission) اس پالیسی کی نوعیت متعین کرنے لئے مقرر کیا گیا۔ کمیشن اس نتیجہ پر پہنچا کہ ہندوستان کا صنعتی ارتقاء نمایاں اور کافی نہ تھا اور اس نے اس بات پر زور دیا کہ ہندوستانی صنعتوں کی مزید ترقی ملک کے حق میں مفید ثابت ہو گی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اس مقصد کے حصول کے لئے ایک حفاظتی پالیسی لازم ہے لیکن جب اکثریت امتیازی حفاظت کی وکالت کر رہی تھی تو اقلیت حفاظت کی پالیسی کو محدود یا مشروط کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اکثریت نے سفارش کی تھی کہ تحفظ کے لئے صنعتوں کے انتخاب میں امتیاز برتنا چاہئے اور یہ امتیاز تحفظ کے درجہ میں برتا جانا چاہئے تاکہ لوگوں پر جہاں تک ممکن ہو بوجھ ہلکا ہو اور تحفظ چاہنے والی مخصوص صنعتوں کے دعووں کی تفتیش کے لئے ایک ٹیرف بورڈ کا قیام عمل میں آئے اور یہ بورڈ تحفظ کے دعووں کا جائزہ لیتے وقت اِن باتوں سے اپنے آپ کو مطمئن کرے (الف) صنعت کو قدرتی فوائد حاصل ہیں (ب) تحفظ کے بغیر یہ ترقی نہیں کر سکتی یا اتنی تیزی سے نہیں جتنی کہ لازمی ہے اور (ج) آخر کار وہ تحفظ کے بغیر عالمی مقابلہ کا سامنا کر سکتی ہے۔ حکومت نے یہ سفارشات منظور کر لیں اور جولائی ۱۹۲۳ء میں ایک ٹیرف بورڈ قائم کیا گیا۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ جنگ شروع ہونے کے دس سال میں حکومت نے صنعت کے بارے میں اپنی پالیسی بالکل بدل ڈالی اصلاحات کے نتیجہ میں صنعتیں صوبہ کے تحت آ گئیں اور صوبے مختلف طریقوں سے صنعتی کمیشن کی سفارشات کو عمل میں لائے۔ شروع میں ہر صوبہ میں صنعتوں کے شعبہ جات کھولے گئے لیکن بعد میں مالی دشواری اور دوسرے اسباب سے صوبائی حکومتوں کی سرگرمیاں ہر جگہ پوری طاقت سے جاری نہیں رہیں۔ آل انڈیا کیمیکل سروس کا پروجیکٹ ابتدائی مراحل ہی میں ترک کر دیا گیا اور صوبائی حکومتوں نے اپنا علیحدہ طریقہ عمل اختیار کیا۔ صوبائی حکومتوں نے مخصوص صنعتی مسئلوں کو حل کرنے کی کوشش کی۔ صوبائی قانون سازی کے ذریعہ الگ الگ صنعتوں کو اپنے اوپر ٹیکس عائد کرنے اور نیل اور لاکھ کے معاملہ میں اپنی آمدنی سے تحقیقی کام شروع کرنے کا اختیار ملا۔ تکنیکی تعلیم نے بھی کچھ پیشرفت کی تقریباً ہر صوبہ میں بُنائی اسکول

قائم کئے گئے۔ ہاتھ کرگھا بنائی صنعت کو مظاہرہ کرنے والی جماعتوں اور چلتے پھرتے تربیت دینے والوں سے مدد ملی زیادہ براہِ راست امداد کے سلسلہ میں بہت سے صوبوں میں مظاہرہ کرنے والی فیکٹریاں جاری کی گئیں لیکن ان میں سے زیادہ ناکام رہیں۔ بہت سی صوبائی حکومتوں نے قوانین پاس کئے جن کے تحت انہوں نے صنعتوں کو مالی امداد دی۔ صوبائی حکومتوں سے مالی امداد ملنے والی بڑی صنعتیں زیادہ تر ناکامیاب رہیں۔ چھوٹے صنعت کاروں کو تھوڑا بہت قرض ملا وہ زیادہ مفید ثابت ہوا پھر بھی سرد بازاری کی وجہ سے صوبائی حکومتوں کے لئے ایک فعال صنعتی پالیسی میں روپیہ لگانا دشوار ہوگیا۔ اور اس نے کاریگر صنعت اور جدید چھوٹے پیمانہ کی صنعت کے امکانات کو متاثر کیا۔ ہندوستان کی حکومت نے بھی اپنی ذخیرہ خرید پالیسی میں تبدیلی پیدا کی۔ ذخیرہ خرید کمیٹی (Stores Purchase Committee) کی سفارشات کی تقلید کرتے ہوئے ایک اسٹورز ڈپارٹمنٹ قائم کیا گیا اور یہ تسلیم کیا گیا کہ جب تک قیمت "مناسب" رہے۔ اس وقت تک دیسی مصنوعات کو ترجیح دی جانی چاہئے۔

اب تک سب سے اہم امداد حفاظتی ٹیکس یا سرکاری امداد (Bounties) کی شکل میں ملی جولائی ۱۹۲۳ء میں ٹیرف بورڈ کا قیام عمل میں آیا۔ اور اس نے مختلف صنعتوں کے تحفظ کے دعوی کی جانچ پڑتال کی ان کی سفارشات کی بنیاد پر ہی مختلف طریقوں سے اسٹیل انڈسٹری کو برابر مدد ملتی رہی اور یہ کہنا زیادہ مناسب نہیں ہوگا کہ ہندوستان میں لوہے اور فولاد کی صنعت کا سودمند قیام حکومت کی بدلی ہوئی محصولی پالیسی کی وجہ سے ہی ممکن ہوا دوسری بڑی صنعتوں کے سلسلہ میں اس پالیسی سے حاصل ہونے والے نتائج کا جائزہ پہلے ہی لیا جاچکا ہے۔

انیسواں باب

ریلوے اور سڑکیں

(۳۹ - ۱۹۱۴ء)

جنگ کا دور ریلوے انتظامیہ کے لئے بڑی دشواریوں کا دور تھا۔ فوج اور جنگی ذخیروں کے لانے جانے سے ریل پر بھاری بوجھ آگیا تھا اور اس وجہ سے بھی ریل کی ذمہ داریوں میں اور اضافہ ہو گیا تھا کہ جنگ کے دوران کوئلہ کا زیادہ حصہ سمندری راستے کے بدلہ ریل سے ہی لے جایا جاتا تھا۔ ایک طرف ریل سے انجام دی جانے والی خدمات کافی بڑھ گئی تھیں تو دوسری طرف ہندوستان میں ریلوے سازوسامان میں ابتری پیدا ہوگئی تھی۔ حکومت مرمت یا توسیع کا کام نہیں کر سکی کیونکہ ریلوے اسٹور اور دوسرے سامان حاصل کرنا ممکن نہ تھا اور جنگی مقاصد کے لئے میسوپٹامیہ کو ریل گاڑیوں کا سامان اور ریلوے اسٹور سپلائی کرنا ضروری تھا۔ میکے کمیٹی نے تخمینہ لگایا تھا کہ تقریباً ۱۹۰۵ء سے ہندوستان میں ریلوے سہولتیں اپنی مانگ کے مقابلہ میں ناکافی تھیں اور جنگ کے موقع پر پوزیشن تشفی بخش نہیں تھی۔ جنگ کے دوران یہ اور بدتر ہوگئی۔ اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے حکومت نے ۱۹۱۷ء میں ایک ٹریفک کنٹرولر کی تقرری کی اور بعد میں ایک مرکزی ترجیحی کمیٹی ر Central Priority Committee مختلف قسم کے سامانوں کے اضافی دعووں کے مطابق آمد و رفت کا انتظام کرنے کے لئے مقرر کی۔ کوئلہ کی خرید اور اس کے نقل و حمل کے مخصوص مسائل سے نپٹنے کے لئے کوئلہ کنٹرولر Coal Controller کا ایک عہدہ قائم کیا گیا۔ گرچہ آمد و رفت پر لگائی گئی پابندیاں ۱۹۱۹ء تک اٹھالی گئیں تاہم کوئلہ کی آمد و رفت پر کنٹرول کوئلہ کے نقل و حمل کے آفیسر Coal Transportation officer کے ذریعہ کچھ عرصہ بعد تک جاری رہا۔

جنگ کے دوران جو سخت قوانین تھے ان کی پابندی کرنا تجارت کے لئے لازمی ہوگیا لیکن جب دشواریاں جاری رہیں اور جنگ کے گرم بازاری دور ۲۰ - ۱۹۱۹ء میں حالات اور بدتر ہو گئے تو

فوری سدھار کے لئے رائے عامہ بلند ہونے لگی۔ اسی عرصہ میں ریلوے کی آسانیاں عوام کی حاجتوں سے کس حد تک کم تھیں اس کا پتہ اس شہادت سے معلوم ہوتا ہے جو اس سلسلہ میں ایکورتھ کمیٹی Ackworth Committee نے اختصار میں پیش کی تھی[1]۔ ۱۹۱۹ء کے سال ہی میں ایسٹ انڈین ریلوے کے لئے حکومت کا معاہدہ ختم ہونے کو تھا۔ اس لئے ہندستانی ریلوے کے انتظامیہ اور عموماً تمام متعلقہ مسائل کا جائزہ لینے کے لئے سکریٹری آف اسٹیٹ نے ۱۹۲۰ء میں ایک کمیٹی مقرر کی جس نے اپنی رپورٹ ۱۹۲۱ء میں پیش کی۔ اس کمیٹی نے جو تجاویز پیش کیں ان سے ہی بعد کی ریلوے پالیسی متعین ہوئی۔ اس کمیٹی نے متفقہ طور پر ریلوے کو مالیات دینے کے موجودہ طریقہ کی مذمت کی۔ مالیاتی بجٹ کے تقاضوں کے مطابق ریلوے کے سرمایہ پروگرام کے لئے سالانہ رقم لگانے کی پالیسی جب کہ ریلوے کے لئے کوئی رقم محفوظ نہیں رکھی گئی، ترقی کی رکاوٹ اور اس کی بے ترتیب نشوونما اور ضائع ہونے والے خرچ کا ذمہ دار تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسے برقرار رکھنے اور تجدید کے لئے خرچ ناکافی ہونے لگا۔ اس برائی کو دور کرنے کے لئے کمیٹی نے حکومت کو مشورہ دیا کہ وہ عام بجٹ سے ریلوے بجٹ کو علیحدہ کرنے کا دلیرانہ قدم اٹھائے۔ کنٹرول کے سرکاری آرگن کی ہئیت کیا ہو، اس سوال پر کمیٹی نے سفارش کی کہ ریلوے کے چیف کمشنر کا دفتر قائم کیا جائے اور ریلوے بورڈ کی ہئیت اور اس کے کام بالکل بدل دیئے جائیں۔ ریلوے انتظامیہ کو عوام سے قریب لانے اور ریلوے اور اس کے گاہکوں کے درمیان بہتر تعلقات پیدا کرنے کے لئے کمیٹی نے ایک مسند عدالت برائے شرح Rates Tribunal اور نمایندہ مشاورتی ریلوے کانسل قائم کرنے کی سفارش کی۔ انتظامیہ کے سوال پر کمیٹی کی رائے میں اختلاف تھا۔ کمیٹی ہندستانی ریلوے کو لندن سے انتظام کرنے کے طریقہ کی مذمت کرنے میں متفق تھی لیکن جب چیرمین اور چار دوسرے ممبران نے سفارش کی کہ چونکہ ضمانتی کمپنیوں سے معاہدے ختم ہو گئے اس لئے حکومت کو ریلوے کا انتظام براہ راست لے لینا چاہئے۔ دوسرے پانچ ممبران نے سفارش کی کہ کمپنی اور حکومت دونوں کا انتظام جاری رہنا چاہئے اور انھوں نے ایسٹ انڈین ریلوے کا انتظام لے لینے کے لئے ایک ہندوستانی کمپنی Indian domiciled Company بنانے کی اسکیم تجویز کی۔

ہندستانی رائے عامہ فی الواقعی براہ راست ریاستی انتظام کے حق میں تھی اور ۱۹۲۳ء میں دستور ساز اسمبلی نے ایسٹ انڈین اور گریٹ انڈین پینِنولار ریلوے کو حکومتی انتظام کے تحت

---

[1] رپورٹ، باب دوم

لے لینے کی تجویز پاس کی۔ ۱۹۲۵ء میں ان ریلووں کا انتظام لے لیا گیا اور تب حکومت نے براہ راست ریاستی انتظام کی پالیسی کے لئے زبان دے دی۔ اس کے بعد جب چالو کمپنیوں کے ساتھ معاہدے ختم ہو گئے تو خاص خاص ریلوے براہ راست ریاستی انتظام کے ماتحت آگئیں۔ ۱۹۲۹ء میں برما ریلوے بھی لے لی گئی اور دوسری ریلوے ۱۹۴۲ء اور ۱۹۴۴ء کے درمیان لے لی گئیں۔ دستور ساز اسمبلی نے ۱۹۲۴ء میں ریلوے بجٹ کو علیحدہ کرنے کی پالیسی کو بھی منظور کر لیا اور عام محاصل میں سالانہ متعین رقم دینے کے بعد ریل فینانس سالانہ جنرل بجٹ کی ستم ظریفی سے بالکل آزاد ہو گیا۔ فاضل رقم Reserve اب جمع ہونے لگی اور کئی برسوں میں مکمل ہونے والے واضح پروگرام مرتب کئے گئے۔ ریلوے تنظیم میں مناسب تبدیلیاں کسی قدر ایکورتھ کمیٹی کی سفارشات کے موافق بھی اس عرصہ میں لائی گئیں۔

ہندوستانی ریل کی کرایہ پالیسی کئی برسوں سے عوام کی سخت تنقید کا موجب بنی رہی عام اعتراض یہ تھا کہ کرایہ خاص طور پر اشیاء کی درآمد اور برآمد کے لئے سازگار ہے مگر اندرونی صنعتوں اور تجارت کے لئے ناسازگار۔ صنعتی کمیشن کا بھی بہت حد تک یہی خیال تھا۔ شروع سے ہی ہندوستانی ریلوں کی کرایہ پالیسی آمدورفت کو بڑھانے کے بدلے بھاری کرایہ لگانا تھی۔ کمپنیوں کی ضمانت نے آمدورفت کو بڑھانے کی ساری حوصلہ افزائی ان سے لے لی تھی اور حکوامت کرایہ کی پالیسی کو اثرانداز یا کنٹرول کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی[له] کرایہ پالیسی کی دوسری قابل اعتراض خصوصیت یہ تھی کہ مختلف کمپنیاں ایک دوسرے سے آمدورفت دور کرنے کے لئے تھوک کرایہ لگانے کا سسٹم رکھتی تھیں۔ اور بعض حالتوں میں اس طریقہ کا مواصلات کے دوسرے وسیلہ کی مقابلہ بازی کو مارنے کے لئے بیجا استعمال ہوتا تھا جیسا کہ بروچ اسٹیمشپ کمپنی کے ساتھ ہوا۔ کبھی کبھی لمبی مسافت کے بدلے مختصر مسافت کے لئے زیادہ کرایہ ہوتا تھا جیسا کہ ذخیرہ خریدار کمیٹی Stores Purchase Committee کمیٹی نے مثال دیتے ہوئے بتایا ہے کہ بمبئی سے لاہور کا کرایہ جلگاؤں سے لاہور کے کرایہ سے کمتر تھا، اس سے اس شکایت کو بڑی تقویت ملتی تھی[لله] مزید برآں، بہت سی خاص خاص شرحیں تھیں اور ساری شرحوں کو از سر نو بدلنے کی ضرورت تھی۔ ان شکایات کو کسی قدر رفع کرنے کے لئے ہی ۱۹۲۶ء میں حکومت

له این۔ بی مہتا: ہندوستانی ریلوے، ابواب چہارم و پنجم

لله ایکورتھ کمیٹی یہ نہیں سوچتی تھی کہ بندرگاہوں سے اور بندرگاہوں تک کے خاص کرایہ میں کوئی نامناسب ترجیح برتی جاتی ہے اس طرح کی شرح ہر ملک میں ہوا کرتی ہے۔

ہندنے ایک کرایہ مشاورتی کمیٹی مقرر کی تاکہ وہ کسی خاص شرح کے خلاف عوام کی شکایتوں پر غور کرے اور اپنی رپورٹ پیش کرے۔

۲۰-۱۹۱۹ء کا سال ریل کے لئے عجیب و غریب تنگی کا سال تھا۔ اس تنگی سے نجات بہرحال جلد ہی مل گئی جب سردبازاری آگئی۔ اس سردبازاری کا اثر یہ ہوا کہ ۱۹۰۰ء کے بعد پہلی بار ریلوے محاصل کا اہم وسیلہ ہونے کے بدلہ ۲۲-۱۹۲۱ء میں بھاری ذمہ داری کا موجب بن گئی اگر ہم تجدید کے بڑے پروگرام اور اس کے جاری رکھنے کی بھاری لاگت کو بھی شامل کرلیں۔ بہرحال تجارت اور مسافروں کی آمدو رفت سردبازاری سے پہلے ہی سنبھل گئی اور دو برسوں کے اندر ریل پھر کافی منافع دینے لگی۔

ایکورتھ کمیٹی کی سفارشات مان لینے اور ریل بجٹ الگ کرلینے سے ریل کی توسیع کی پالیسی مضبوط ہوگئی اور یہ برابر جاری رہی۔ سرمایہ خرچ کرنے کے بھاری پروگرام بنائے گئے اور یہ اندازہ لگایا گیا کہ ہر سال انڈین ریلوے لائن میں تقریباً ایک ہزار میل کا اضافہ کچھ برسوں تک ہوتا رہے گا۔ اس پروگرام کی سب سے زیادہ قابل ذکر خصوصیت یہ تھی کہ لمبے ٹرنک لائنز کے پروجیکٹ کا مقابلتاً فقدان تھا۔ دو راستوں کے علاوہ جو سنٹرل اور شمالی ہندوستان سے جنوب کے رابطہ کو آسان تر بناتے تھے یعنی رائے پور، وزگاپٹم اور قاضی پیٹ۔ بلارشاہ لائنز اور سنٹرل انڈیا کی کوئلہ کانوں سے گذرنے والی لائنز، نئے ریلوے پروجیکٹ کی تعداد تقریباً ۱۰۰ تھی اور ہر لائن اوسطاً ۴۹ میل کی لائن تھی پالیسی یہ تھی کہ مفید شاخوں اور معاونوں کے ذریعہ ٹرنک لائنز کے اندرونی خانوں کو بھر دیا جائے جس کی کمی کی شکایت عرصہ سے ہو رہی تھی۔

توسیع کا پروگرام ۱۹۲۴ء تا ۱۹۳۲ء کے درمیان زیر عمل آیا۔ اس مدت میں ریلوے لائنوں میں ۵۳۶۰ میل کا اضافہ ہوا۔ ۱۹۲۴ء میں انڈین ریلوے لائین مجموعی طور پر ۳۸،۰۳۹ میل تک پھیلی تھیں[1]۔ سردبازاری کی وجہ سے ریلوے کی مالی حالت بالکل بدل گئی اور ۱۹۳۲ء اور دوسری عالمگیر جنگ سے ریلوے لائن میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ جنگ کے دوران ملک سے باہر فوجی کاروائیوں کو مدد پہنچانے کے لئے کچھ لائنوں کو ہٹا لیا گیا۔ ۳۲-۱۹۲۴ء کے درمیان تیزی سے ہونے والی توسیع کے مالیاتی اثرات ریلوے نے بعد میں محسوس کئے۔ مالیاتی کنٹرول ڈھیلا پڑ گیا تاکہ تیزی سے تعمیرات کا کام ہو سکے اور لاگت کے اندازہ کی جانچ ٹھیک طریقہ سے نہیں کی گئی تھی انڈین ریلوے

---

[1] ہندوستانی ریلوے کے ایک سو سال (۱۸۵۳-۱۹۵۳)، باب پنجم (۱۹۵۳)

تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ میں نتائج حسب ذیل الفاظ میں پیش کیے گئے ہیں[۱]:

"ہم یہ محسوس کرنے پر مجبور ہیں کہ گذشتہ پندرہ برسوں میں اسٹیشن، ورکشاپ اور مارشلنگ یارڈ متوقع ضرورتوں کے مناسب اندازہ کے عوض ریلوے ٹکنیک میں قول فیصل کی طرح بنائے گئے تھے اور عقل مندی سے زیادہ وقار کا لحاظ رکھا گیا ان پھیلی ہوئی اسکیموں کی یہ بدترین خصوصیت ہے کہ حد سے زیادہ سود کے بوجھ سے ریلوے لدی ہے۔"

جنگ کے درمیانی برسوں میں موٹر کے ذریعہ آمد و رفت ہونے سے صورت حال کافی بدلنے لگی۔ موٹر ٹرانسپورٹ کے پھولنے پھلنے سے میونسپل اور میونسپل سے باہر سڑکوں کے حال پر توجہ مبذول ہونے لگی۔ یہ محسوس کیا گیا کہ موٹر ٹرانسپورٹ سے معیشت بالخصوص دیہی معیشت کے بہت سے پہلوؤں میں تغیر پیدا ہو سکتا ہے اور اس امکان سے سڑکوں کے پلان میں نئی تنظیم آئی۔ سڑکوں کی لمبائی، سڑکوں کی تعمیر اور نگہداشت پر خرچ کافی بڑھ گیا۔ انڈین روڈ ڈیولپمنٹ کمیٹی (۱۹۲۷ء) نے اس سوال کا جائزہ لیا اور اس نے پٹرول پر اسپشل ڈیوٹی لگانے کی سفارش کی جس کی آمدنی کا بیشتر صوبائی حکومتوں کو دیا جائے گا تاکہ وہ سڑکوں کی تعمیرات کا مبسوط پلان بروئے کار لائیں۔ اس کے بموجب ۱۹۲۹ء۔۳۰ میں سڑک کے لئے ترقیاتی فنڈ قائم کیا گیا۔ روڈ فنڈ قائم ہونے کے پہلے بھی کئی صوبوں کا سڑکوں کی ترقیات کے لئے خرچ کا تناسب بہت بڑھ گیا تھا اور سڑکوں کے ترقیاتی فنڈ سے ان صوبوں میں خرچ کا جو پیمانہ تھا اس میں فوری طور پر زیادہ اضافہ نہیں ہوا[۲]۔ اس کے بعد جلد ہی سرد بازاری کے آجانے سے سڑک کی تعمیر و مرمت پر خرچ میں مسلسل اضافہ کا رجحان رک گیا۔ تیسری دہائی کے دوران ملک میں میونسپل کے علاوہ پختہ سڑکوں میں صرف تھوڑا اضافہ ہوا تھا یعنی برٹش انڈیا میں سڑکیں ۱۹۳۰ء میں ۰۰۰،۰۰۰،۹ میل سے بڑھ کر ۱۹۳۹ء میں تقریباً ۰۰۰،۶۴ میل ہوگئیں۔

اس سرد بازاری کا اثر یہ ہوا کہ موٹر ٹرانسپورٹ کے بڑھتے ہوئے حجم کو باقاعدہ بنانے کا مسئلہ سامنے آگیا اس لئے کہ موٹر چلنے والی محدود سڑکوں کا نمایاں حصہ ریلوے کے متوازی تھا اور ریلوے کو شکایت تھی کہ ان سڑکوں پر موٹر ٹرانسپورٹ سے ان کی آمدنی اور خراب ہو جاتی ہے جو پہلے ہی

---

[۱] ایڈیم میں حوالہ شدہ ص ۳۷

[۲] میچل اینڈ کرکنس: ریل اور سڑک کے درمیان موجودہ مقابلہ بازی کی حالت سے متعلق رپورٹ، باب ہفتم (۱۹۳۳ء)

سے ابتر ہے۔ بنیادی اعتبار سے موٹر ٹرانسپورٹ کی باضابطگی مسافروں کی حفاظت اور چھوٹی لانوں
کے درمیان قاتلانہ مقابلہ بازی کو روکنے کے لئے لازمی تھی۔ ریل روڈ مقابلہ کی وجہ سے ہی پہلی سرکاری
جانچ پڑتال ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صوبائی حکومتوں کے درمیان کچھ مخالفت پیدا ہوئی جو روڈ ٹرانسپورٹ
کی ترقیات میں دلچسپی رکھتی تھیں آخر کار ۱۹۳۹ء میں موٹر سواری قانون Motor Vehicle Acts پاس
ہوا۔ اس کی دفعات کے مطابق تیسری جماعت کے خطروں کے خلاف بیمہ کرانا Insurance against
third Party Risk لازمی ہو گیا اور مسافروں اور مال ڈھونے والوں کو پرمٹ دینے کے
لئے صوبائی حکومتوں کو علاقائی ٹرانسپورٹ اتھوریٹیز قائم کرنا پڑا۔ خاص خاص راستوں کے لئے
مسافر اجازت نامہ Passenger Permission دیئے گئے اور مال کے اجازت نامے ایک خطہ
کے لئے جائز تھے اجازت نامہ رکھنے والوں میں باضابطگی لانے کے لئے کئی شرائط لگانا ممکن تھا۔

بیسواں باب

جنگ کا درمیانی دور: اختتامیہ

پہلی عالمگیر جنگ کی ابتدا اور دوسری عالمگیر جنگ کے آغاز کے درمیان ایک چوتھائی صدی کے عرصہ کو خوشحالی اور پریشانی کے ادوار میں تقسیم کرنا ممکن نہیں جیسا کہ پچھلے ابواب میں کیا گیا ہے۔ ان پچیس برسوں کے دوران قحط کا تو اثر کم رہا۔ ۱۹-۱۹۱۸ء اور ۲۱-۱۹۲۰ء کے قحط سب سے زیادہ سنگین تھے۔ معیشت کی زیادہ بہتر ہم آہنگی کے باعث قحط یا فصل کی خرابی کا اثر معاشی زندگی کو تباہ و برباد کرنے میں اتنا سنگین نہیں رہا جتنا کہ پہلے تھا۔ اس کے برخلاف جبکہ صرف قدرتی مظاہر کی اہمیت کسی قدر کم ہوگئی تو ہندوستان کی معیشت میں صنعت و تجارت کے دائرہ وار اُتار چڑھاؤ کے اثرات زیادہ نمایاں ہوگئے۔ جنگ کی گرم بازاری اور جنگ کے مابعد کی کساد بازاری اس سلسلہ کے ابتدائی مظاہر تھے تیسری دہائی میں ہندوستانی معیشت پر عالمگیر سرد بازاری کے اثرات اور زیادہ نمایاں تھے زرعی موسم کی نوعیت پر ابھی بھی دیہی سماج کی دولت کا دارومدار تھا بہر حال قیمتوں کے حشر خیز گراوٹ سے دیہی کسان تباہ و برباد ہو گئے اور اس سے زرعی موسم کا کوئی سروکار نہ تھا۔

ان پچیس برسوں میں آبادی کی نقل و حرکت سے نمایاں طور پر بدلتے ہوئے پیٹرن کا بھی اظہار ہوتا تھا۔ جنگ کے بعد جو قحط پڑے ان میں بہت زیادہ اموات نہیں ہوئیں۔ بہر حال ۱۹۱۸ء کی انفلوئنزا وبا میں کافی اموات ہوئیں اور اس کے نتیجہ میں ۱۹۲۱ء کی مردم شماری ۱۹۱۱ء کی مردم شماری میں مندرج آبادی کے مقابلہ میں بس تھوڑا سا ہی اضافہ ظاہر کرتی ہے اس طرح آبادی کے اضافہ اور اس کے جمود کی دہائیاں آتی جاتی رہیں اور یہ قدیم پیٹرن جاری رہا۔ دو آنے والی دہائیوں میں ایسا نہیں ہوا۔ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری سے معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستان کی آبادی ۱۹۲۱ء کی آبادی سے ۱۰،۶ فیصد بڑھ گئی ہے۔ ۱۹۴۱ء کی مردم شماری میں کچھ دشواری پیش آئی تھی۔ اور پورے اعداد و شمار کا تجزیہ نہیں ہو سکا اور نہ یہ شائع ہوا۔ مختصر طور پر جو فہرست ملتی ہے اس سے

۱۹۴۱ء میں تعداد کے اضافہ کی شرح اونچی معلوم ہوتی ہے۔ پوری آبادی ۳۸ کروڑ ۹۰ لاکھ درج کی گئی تھی جس سے ۱۰ برس میں ۱۵ فیصد کا اضافہ ظاہر ہوتا تھا۔ اس سے بھی زیادہ قابلِ غور بات یہ تھی کہ ملک کے تقریباً تمام حصّوں میں آبادی بڑھی ہے۔ یہاں تک کہ وہ علاقے جو کئی دہائیوں سے جمود کا شکار تھے ان کی آبادی میں نمایاں اضافہ ہوا۔

شہری آبادی کا تناسب ہر مردم شماری کی مجموعی آبادی میں کسی قدر بڑھتا رہا۔ اس کی فیصد شرح ۱۹۲۱ء میں ۲ء۱۰، ۱۹۳۱ء میں ۱۱ اور ۱۹۴۱ء میں ۸ء۱۲ تھی۔ ۱۹۲۱ء کی مردم شماری کے کمشنر نے دریافت کیا کہ زیادہ بڑے شہروں میں شہری آبادی کے مرتکز ہونے کا رجحان ملتا ہے۔ ۱۹۳۱ء میں بھی آبادی میں اضافہ سب سے زیادہ بڑے شہروں ہی میں نظر آتا تھا یعنی ان شہروں میں جہاں ایک لاکھ سے زائد آبادی تھی۔ ۴۱-۱۹۳۱ء کے دہے کے دوران ایک لاکھ یا اس سے زیادہ آبادی والے شہروں میں آبادی کا اضافہ ۱۸ فیصد ہوا۔ تھا جہاں پچھلی مردم شماریوں سے منفرد شہروں کی صورتوں میں کافی تغیرات ہوتے تھے وہاں ۱۹۴۱ء کی مردم شماری سے معلوم ہوا کہ بڑے شہروں کے پورے گروپ میں اضافہ ہوا ہے یہاں تک کہ بنارس اور سورت جیسے شہروں میں ۱۹۳۱ء اور ۱۹۴۱ء کے درمیان آبادی میں کافی اضافہ ہوا جہاں پہلے آبادی گھٹ گئی تھی یا جامد تھی۔

ہندوستان کی قومی آمدنی کے تخمینوں کا جو سروے ہوا ہے اس کے نتائج کی طرف اشارہ کرنا یہاں پر مفید ہو سکتا ہے۔ قومی آمدنی کے اعداد و شمار کے ماہرانہ جائزہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۶۰ء سے ۱۹۰۰ء تک فی کس آمدنی ۴۹-۱۹۴۸ء کی قیمت کے حساب سے تقریباً ۱۷ روپیہ سے بڑھ کر ۲۰ روپیہ ہو گئی یعنی تقریباً ۱۸ فیصد کا اضافہ ہوا۔ ا جس طرح اس مدت میں تقریباً ۲۲ فیصد کا اضافہ ہوا۔ اسی طرح قومی آمدنی اصلی معنوں میں ۴۰ فیصد سے کچھ زیادہ بڑھی یکساں قیمتوں کی اسی بنیاد پر قومی آمدنی ۱۹۰۰ میں ۲۰۰ روپیہ تھا جو ۱۹۳۰ء میں بڑھ کر ۲۶۰ روپیہ ہو گئی یعنی ۳۰ برسوں میں تقریباً ۳۰ فیصد کا اضافہ ہوا۔ اس کے بعد سطح ٹھہری رہی یا شائد دوسری عالمگیر جنگ کے بعد گھٹ کر تقریباً ۲۵۰ روپیہ پر آ گئی۔ ۱۹۰۰ء اور ۱۹۳۰ء کے درمیان کافی اضافہ ہوا۔ اس کے بعد ۱۹۵۰ء تک فی کس آمدنی کے اعتبار سے ٹھہراؤ رہا۔ اس اضافہ سے قومی پیداوار میں اضافہ کی شرح معلوم ہوتی ہے چونکہ ان دو ادوار کے درمیان آبادی کے اضافہ میں غیر یکساں شرح تھی۔ پہلے تیس برسوں میں آبادی میں اضافہ تقریباً ۱۸ فیصد

۱۔ ایم۔ مکھرجی: ہندوستان کی قومی آمدنی؛ رجحانات اور ترکیب و ساخت، باب دوم (۱۹۶۹ء)

ہوا لیکن دوسرے بیس برسوں میں یہ بڑھ کر ۲۹ فیصد ہو گیا۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ پہلے تیس برسوں میں قومی پیداوار میں اضافہ ۵۰ فیصد سے کچھ کم اور دوسرے بیس برسوں میں ۳۰ فیصد سے کچھ کم ہوا۔ ۱۹۳۰ء کے بعد جس ناموافق صورت کا پتہ چلتا ہے اس کے دو اسباب بتائے جا سکتے ہیں سرد بازاری اور عالمگیر جنگ۔

سرد بازاری کے اہم ترین نتائج میں سے ایک یہ تھا کہ خلاف دستور ہندوستان سے باہر سونا برآمد ہونے لگا چونکہ ہندوستان سونا بہت زیادہ پیدا نہیں کرتا ہے اس لئے سونے کی یہ برآمدات پچھلی دہائیوں میں جمع ہونے والے قیمتی دھاتوں کے اسٹاک سے ہی ہوتی تھیں۔ ہندوستان کے زیادہ تر لوگ اپنی بچت کا کم از کم ایک حصہ سونا اور چاندی کی شکل میں محفوظ رکھتے تھے۔ اس فارم کی اضافی اہمیت کا پتہ قومی آمدنی کے حسب ذیل تخمینوں سے چلتا ہے[1]۔ ۱۸۶۰ کے دہے میں ہندوستان میں ہر سال اوسطاً ۶۰ کروڑ روپیہ کی قیمت کا سونا چاندی ذخیرہ کیا جاتا تھا۔ ۱۰-۱۹۰۰ء کی مدت میں یہ اعداد ۹۰ کروڑ روپیہ کی تھیں۔ یہ اندازہ لگایا گیا تھا کہ اس مفروضہ پر کہ مجموعی بچت ۵ فیصد تھی اگر قیمتی دھاتوں کے ذخیرہ کو نظر انداز کر دیں تو پیداواری اثاثہ کے لئے بچت ۱۹۶۰ میں ۱ء۳ فیصد اور ۱۹۰۰ء میں ۳ فیصد کم ہو جائے گی۔ ۱۸۷۰ اور ۱۹۰۰ء کے درمیان یہ ذخیرہ اندوزی بہت زیادہ نہ تھی، اوسطاً ۳۰ کروڑ سالانہ تھی۔ ۱۹۱۰ سے ۱۹۳۰ تک کے زمانہ میں یہ پھر بہت بڑھ گئی یعنی سالانہ ۱۵۰ کروڑ سے زیادہ تھی۔ ۱-۱۹۳۰ء سے پہلی بار ہندوستان اپنے بین اقوامی قرضوں کی ادائیگی کے لئے سونے کی برآمد کرنا شروع کیا اور یہ سلسلہ جنگ کے آغاز تک چلتا رہا۔ اس دہے کے دوران ہندوستان کی سونے کی کل خالص برآمد ۳۰۰ کروڑ روپیہ سے زیادہ تھی[2]۔ قیمتی دھاتوں کو محفوظ رکھنے کی رسم کی عالمگیریت سے معلوم ہوتا تھا کہ معیشت کی کارکردگی میں اس سے بعض اہم گھریلو کاموں کو انجام دینے میں مدد ملتی ہے۔ جیسے رقت (liquidity) اور فوری ضمانت کے کام کے لئے تیسری دہائی میں ہندوستان سے کثیر خالص برآمدات ان عوامل کا نتیجہ تھیں جو پورے ملک میں بے مثل پیمانہ پر کسانوں اور دوسرے لوگوں کے قیمتی دھات نکالنے سے کارفرما ہوئے تھے۔ گرچہ اس صورت حال کا مفصل مطالعہ نہیں کیا گیا ہے پھر بھی اس نے معیشت کو کچھ برسوں کے لیے ضروری کافی کمزور بنا دیا ہے۔

۱- ح۔س

۲- اے۔ کے۔ بنرجی: ہندوستان کا توازن ادائیگی، باب دوم (۱۹۶۳ء)

کسی ملک کی اقتصادی ترقی و سمت کا پتہ لگانے کے لئے اس کی بیرونی تجارت میں نقل و حرکت سے متعلق اعداد و شمار کی چھان بین کرنا مفید ہوتا ہے۔ ۲۵ برسوں کی مدت کا شماریاتی سروے ہندوستان کی بیرونی تجارت کے خاص پیٹرن میں کسی تبدیلی کا پتہ نہیں دیتا ہے۔ تین مناسب برسوں کی مدت کی اوسط کا مقابلہ (۱۹۱۱-۱۲ء تا ۱۹۱۳-۱۴ : ۱۹۲۶-۷ تا ۱۹۲۸-۹ اور ۱۹۳۶-۷ تا ۱۹۳۸-۹) اس کی وضاحت کرے گا۔ ان ادوار میں آخری دور برما کو شامل نہیں کرتا ہے اور اس لئے اس کا پہلے دو ادوار سے براہ راست مقابلہ مناسب نہیں برما کو خارج کرنے سے خاص فرق یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہندوستان کی درآمدات کی فہرست میں اجناس، دلہن اور آٹا، تیل اور لکڑی کی درآمد میں اضافہ ہو جاتا ہے اور ہندوستان کی برآمدات کی فہرست میں اجناس، دلہن آٹا کی برآمد میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ برما کو خارج کر دینے سے جو فرق پیدا ہوتا ہے اس کا لحاظ رکھتے ہوئے یہ معلوم ہوگا کہ ان تمام تین ادوار میں پیٹرن مجموعی اعتبار سے یکساں رہا جبکہ اشیاء کے انفرادی گروپ اپنی جگہ بدلتے رہے۔ جوٹ اور کپاس اور تلہن کے بیجوں کے گروپ (بیج اور کھلی) کی ہیئت میں خاص تبدیلیوں کے باوجود برآمدات میں کوئی بات قابلِ غور نہیں۔ درآمدات میں اہم تبدیلیاں یہ ہوئیں کہ آخری دور میں چینی کی درآمد ختم ہوگئی اور کپاس کی مصنوعات کی درآمد میں قدر و قیمت کے لحاظ سے بہت کمی ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیرونی تجارت کے میدان میں تیسری دہائی کسی بھی دوسری دہائی سے زیادہ اہم تھی۔ سرد بازاری سے فطری طور پر بین الاقوامی تجارت میں بہت زیادہ کمی واقع ہوگئی۔ اور اس کے ساتھ سیاسی صورت حال نے اس سلسلہ میں سرکاری پالیسی کو نئی راہ پر لگا دیا۔ سامراجی ترجیح، سرکاری اور غیر سرکاری دو فریقی معاہدوں (جیسے جاپان کے ساتھ کپاس کا معاہدہ اور مودی۔ لیز معاہدہ) سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اگلے حالات سے واضح اور نمایاں علیحدگی اختیار کی گئی ہے۔ یہاں پر اس پالیسی کا فطری طور پر تعلق خارجی معاملات اور غیر ہندوستانی مفادات سے تھا۔ اس بدلی ہوئی پالیسی اور جنگ کے اعلان کے درمیان کا دور اتنا مختصر تھا کہ یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ آیا اس سے ہندوستان کی بیرونی تجارت کا کردار کسی قابل لحاظ اعتبار سے اثر انداز ہو سکے گا۔

جنگ کے درمیانی برسوں میں نئی صنعتوں کے قیام اور قدیم صنعتوں کی توسیع میں کچھ پیشرفت ہوئی۔ اس سلسلہ میں خاص سبب یہ تھا کہ حکومت کی صنعتی پالیسی بالخصوص محصولی پالیسی میں تبدیلی پیدا ہوگئی تھی۔ بہرحال بدلی ہوئی پالیسی کی تعریف واضح نہیں تھی اور سوائے چینی کی صنعت کے اس

اہم اشیاء کی برآمدات کی اوسط قدر و قیمت
(لاکھ روپے میں)

ترتیب	۱۹۱۱-۱۲ سے ۱۴-۱۹۱۳ تک کے لئے اوسط		۱۹۲۶-۷ سے ۹-۱۹۲۸ تک کے لئے اوسط		۱۹۳۶-۷ سے ۹-۱۹۳۸ تک کے لئے اوسط	
	اشیاء	قدر و قیمت	اشیاء	قدر و قیمت	اشیاء	قدر و قیمت
۱	اجناس، دلہن اور آٹا	۵۲۳۱،۰۲	جوٹ، خام اور تیار	۸۶۱۴،۷۴	جوٹ، خام اور تیار	۴۲۰۵،۷۶
۲	خام اور تیار جوٹ	۴۹۱۹،۴۸	کپاس خام اور تیار	۶۷۰۸،۱۵	کپاس، خام اور تیار	۳۹۹۳،۶۰
۳	کپاس، خام اور تیار	۴۴۳۰،۵۶	اجناس، دلہن اور آٹا	۳۸۹۵،۴۵	چائے	۲۲۵۷،۱۸
۴	بیج	۲۵۱۰،۸۳	چائے	۲۹۳۷،۵۷	بیج	۱۵۹۱،۶۰
۵	چائے	۱۳۷۳،۸۵	بیج	۲۵۱۳،۵۳	اجناس، دلہن اور آٹے	۱۰۸۷،۹۸
۶	چرسہ اور خام چمڑے	۱۰۹۷،۸۲	چمڑا	۸۵۸،۵۷	چمڑا	۶۶۳،۱۲
۷	چمڑا	۴۴۵،۳۰	چرسہ اور خام چمڑے	۸۵۱،۶۳	دھات اور کچی دھات	۶۳۵،۱۹
۸	اون، خام اور تیار	۲۷۴،۴۹	دھات اور کچی دھات	۸۳۶،۵۲	چرسہ اور خام چمڑا	۴۴۴،۰۶
۹	لاکھ	۲۰۳،۱۰	لاکھ	۷۰۳،۴۵	اون، خام اور تیار	۳۷۷،۰۷
۱۰	دھات اور کچی دھات	۱۷۸،۶۳	اون، خام اور تیار	۵۳۰،۷۹	کھلی	۲۵۶،۹۰
۱۱	کھلی	۱۲۱،۶۳	کھلی	۳۱۷،۰۴	پھل اور ترکاریاں	۲۰۱،۶۵
۱۲	تیل	۱۱۴،۵۱	خام ربر	۲۳۹،۰۳	تمباکو	۱۸۹،۲۵
۱۳	گرم مصالحہ	۹۲،۵۳	پیرافین موم	۲۲۴،۳۰	لاکھ	۱۷۴،۳۵
۱۴	ناریل کے چھلکا	۸۵،۳۹	گرم مصالحے	۱۸۴،۹۱	ابرک	۱۱۸،۸۶
۱۵	کوئلہ اور کوک	۷۸،۲۳	تمباکو	۱۱۳،۲۵	پیرافین موم	۹۴،۵۳
۱۶	پارافن موم	۵۹،۹۱	ناریل کا چھلکا	۱۰۶،۶۲	تیل	۹۱،۴۶
۱۷	خام ربر	۵۷،۴۷	ابرک	۹۷،۲۴	ناریل کا چھلکا	۹۰،۴۷
۱۸	پھل اور ترکاریاں	۵۲،۴۳	پھل اور ترکاریاں	۹۷،۱۵	ربر	۸۶،۴۸
۱۹	ابرک	۴۲،۵۸	تیل	۸۴،۴۴	کوئلہ اور کوک	۷۸،۴۸
۲۰	تمباکو	۴۲،۳۵	کوئلہ اور کوک	۷۶،۵۳	گرم مصالحہ	۷۵،۸۵
	کل در آمدات	۲۳۵،۶۹،۸۶	کل در آمدات	۳۱۶،۹۰،۵۷	کل در آمدات	۱۶۹،۹۴،۶۸

اہم اشیاء کی درآمدات کی اوسط قدر و قیمت
(لاکھ روپئے میں)

ترتیب	۱۲-۱۹۱۱ء سے ۱۴-۱۹۱۳ء تک کے لئے اوسط		۷-۱۹۲۶ء سے ۹-۱۹۲۸ء تک کے لئے اوسط		۷-۱۹۳۶ء سے ۹-۱۹۳۸ء تک کے لئے اوسط	
	اشیاء	قیمت	اشیاء	قیمت	اشیاء	قیمت
۱	کپاس اور کپاس کے سامان	۶۰۴۲٫۴۳	کپاس اور کپاس کے سامان	۶۹۶۱٫۱۵	کپاس اور کپاس کے سامان	۲۴۵۵٫۸۰
۲	دھات اور کچی دھات	۱۶۶۹٫۰۳	دھات اور کچی دھات	۲۶۴۲٫۲۱	مشینری اور مل کے سامان	۱۶۶۶٫۸۸
۳	چینی	۱۴۶۲٫۳۰	چینی	۱۶۵۶٫۱۹	تیل	۱۳۸۵٫۸۹
۴	مشینری اور مل کے سامان	۵۸۱٫۰۸	مشینری اور مل کے سامان	۱۵۹۶٫۶۴	دھات اور کچی دھات	۱۱۳۱٫۵۲
۵	ریشم، خام اور تیار	۴۲۸٫۰۴	تیل	۱۰۶۰٫۲۳	اناج، دلہن اور آٹا	۸۸۸٫۴۴
۶	تیل	۴۲۱٫۱۶	گاڑیاں	۸۳۶٫۶۳	گاڑیاں	۶۶۲٫۶۹
۷	لوہے کا سامان	۳۸۶٫۹۶	اشیاء اور تیلی کے سامان	۶۱۳٫۱۶	آلات اور اوزار	۵۶۲٫۶۰
۸	اون، خام اور تیار	۳۵۶٫۳۳	لوہے کا سامان	۵۱۸٫۱۱	کاغذ اور پیسٹ بورڈ	۳۳۹٫۶۴
۹	اشیاء اور تیل کے سامان	۲۲۵٫۴۳	اون، خام اور تیار	۴۹۵٫۰۲	رنگ کا مسالہ	۳۳۵٫۵۳
۱۰	شراب	۲۰۰٫۶۲	ریشم، خام اور تیار	۴۸۸٫۶۲	اون، خام اور تیار	۳۲۶٫۵۶
۱۱	آلات اور اوزار	۱۵۶٫۱۱	اناج، دلہن اور آٹے	۴۶۵٫۰۶	کیمیائی چیزیں	۳۰۳٫۴۳
۱۲	گاڑیاں	۱۴۶٫۸۱	اوزار اور آلات	۴۴۶٫۴۷	لوہے کا سامان	۲۹۵٫۹۵
۱۳	کاغذ اور پیسٹ بورڈ	۱۴۰٫۳۶	شراب	۳۵۹٫۰۰	اشیاء اور تیلی کے سامان	۲۶۹٫۳۲
۱۴	رنگنے کا مسالہ	۱۲۸٫۵۳	کاغذ اور پیسٹ بورڈ	۳۱۲٫۹۲	ریشم، خام اور تیار	۲۴۰٫۵۳
۱۵	دوائیں	۱۰۸٫۸۸	رنگ کا مسالہ	۲۵۳٫۶۰	شراب	۲۲۶٫۹۳
۱۶	کیمیائی چیزیں	۹۶٫۰۸	کیمیائی چیزیں	۲۵۲٫۳۱	دوائیں	۲۲۱٫۲۴
۱۷	لکڑی اور عمارتی لکڑی	۶۴٫۴۲	دوائیں	۱۹۶٫۸۱	لکڑی اور عمارتی لکڑی	۲۱۱٫۳۲
۱۸	اجناس، دلہن اور آٹے	۱۶٫۹۳	لکڑی اور عمارتی لکڑی	۹۶٫۶۴	چینی	۲۹٫۳۶
	کل درآمدات	۱۶۰۹۴٫۰۵	کل درآمدات	۲۴۴۷۹٫۱۱	کل درآمدات	۱۵۰۴۵٫۳۰

پالیسی کے اختیار کرنے سے کوئی بڑے یا فوری نتائج پیدا نہیں ہوئے۔ یہ کہا نہیں جا سکتا کہ ہندوستان نے اس دور میں اپنے کو صنعتی بنانے میں کوئی نمایاں ترقی کی ہے۔ کسی بھی پیمانہ جیسے معیشت میں لوہے اور فولاد کا استعمال یا سلفیورک ایسڈ یا بجلی پیدا کرنے کے لحاظ سے ہندوستان صنعتی اعتبار سے پس ماندہ اور تقریباً جامد رہا۔ ہندوستان کے اندر فولاد کی پیداوار سے اس کے اندرونی استعمال میں اضافہ نہیں ہوا۔ لوہے اور فولاد کا ہندوستان میں استعمال "جامد رہا دو عالمگیر جنگوں کو علیحدہ کرنے والے دور میں اوسطاً ۱۰ لاکھ ٹن سالانہ استعمال میں آتا تھا"۔[1] سربازاری کے برسوں میں یہ اوسط اور نیچے آگئی اور فی کس کے لحاظ سے لوہے اور فولاد کا ہندوستان میں ۱۹۳۹ء میں استعمال ۱۹۱۴ء سے واضح طور پر کم ہو گیا۔

صنعتی ترقی کی ایک اہم پہلی ضرورت یہ ہے کہ صنعتی سرمایہ کاری میں بہنے والا سرمایہ کافی ہونا چاہئے۔ یہ پہلے ہی دیکھا جا چکا ہے کہ ہندوستان کی معیشت ایسی ہے کہ بچت کی شرح بہت ہی کم ہے اور قیمتی دھات کا کثیر حصہ ذخیرہ اندوز ہو جاتا ہے۔ اس طرح یہ بھی نمایاں رول ادا کرتا ہے، اس لئے یہ فطری تھا کہ شہری علاقوں میں ہی صنعتی ترقی ہوئی جہاں سرمایہ اندوزی کے امکانات کچھ روشن تھے۔ جدید صنعت کی ترقی کے ساتھ ادارے کی مناسب تنظیم بھی وجود میں آئی۔ جنگ کے درمیانی برسوں میں ایسی تنظیم کی قانونی ہیئت کے سلسلہ میں کچھ ترقی ہوئی۔ یہ سب سے زیادہ نمایاں سرمایہ اور قرض کے میدان میں تھا۔ ۱۹۲۰ء میں امپیریل بنک آف انڈیا پہلے کے تین پریسیڈنسی بینکوں کو ملا کر آئین کے ذریعہ قائم ہوا۔ یہ خاص طور پر کمرشیل بینک کی طرح کام کرتا رہا۔ بہرحال سرکاری فنڈ کا کام بھی اس کے سپرد کیا گیا۔ اس نے ابتدائی طور پر پورے ملک میں کم سے کم شاخ کھولنے کی ذمہ داری لے لی۔ دوسری دہائی کے اواخر میں حکومت نے مرکزی اور صوبائی بینکوں کی تحقیقاتی کمیٹیاں مقرر کیں جن کی رپورٹ ملک میں بینک کاری اور کریڈٹ کے انتظامات کی کارکردگی پر بڑی روشنی ڈالتی ہے ۱۹۳۴ء میں قریب میں ہونے والی دستوری تبدیلیوں کے پیش نظر ریزرو بینک آف انڈیا کا قیام عمل میں آیا۔ یہ صحیح معنوں میں مرکزی بینک تھا جس کے ذمہ ملک میں کرنسی اور کریڈٹ دونوں کا انتظام سپرد تھا۔ جنگ کے درمیانی برسوں میں ہندوستانی مشترک سرمایہ بینکوں اور ان کی کارکردگی کو کافی فروغ ہوا تھا اور چند ہندوستانی شہروں میں "سرمایہ مارکٹ" کا ارتقا ہوا تھا۔

۱۔ آئی۔ پی۔ جے تھومس: ہندوستان کی بنیادی صنعتیں، ص ۱۰ (۱۹۴۸)

۱۹۳۷ء کا کمپنیز ایکٹ ہندوستان کی پبلک کمپنیوں، تجارتی اور صنعتی اور بینک کاری کمپنیوں کے کاموں کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ گرچہ زیادہ تر معاملوں میں ہندوستانی قانون سازی برطانوی روایات کی تقلید کرتی تھی لیکن ہندوستانی کمپنیوں کے قانون کے لحاظ سے اسے "مینجنگ ایجنسی" سسٹم کی عجیب و غریب خصوصیت سے نپٹنا پڑا۔ مینجنگ ایجنسی کا طریقہ ہندوستان میں شروع ہوا کیونکہ غیر ممالک میں رجسٹرڈ ہونے والی کمپنیوں کے لئے ضروری ہو گیا کہ وہ اپنے کاموں کی نگرانی کے لئے ہندوستان میں قابلِ اعتماد نمائندے مقرر کریں ایک وجہ یہ بھی تھی کہ خود ہندوستان میں وہ ادارے اور طریقے پیدا نہیں ہوئے تھے جو پبلک لمیٹڈ کمپنیوں کی نشو و نما اور انہیں جاری کرنے کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔ بہرحال چند برسوں میں مینجنگ ایجنسی کی بہت سی خامیاں سطح پر آگئیں جو مینجنگ ایجنٹوں اور ساجھیوں کی نابرابر پوزیشن سے پیدا ہوئی تھیں۔ ۱۹۳۷ء کے کمپنی ایکٹ کی اہم ترین دفعہ یہ تھی کہ مینجنگ ایجنسی کے تمام ہونے والے معاہدوں کی مدت بیس سال کی تھی اور ایکٹ کے پاس ہونے کے بیس سال بعد تمام پرانے معاہدوں کا از خود خاتمہ ہو جائے گا اگر یہ پہلے ختم نہیں ہوئے انتظام کردہ کمپنیوں کے ساتھ مینجنگ ایجنٹ کی رضامندی ہونے پر اس ایکٹ میں دوسری کئی پابندیاں بھی داخل کی گئیں۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے دورِ حکومت میں ایک تجارتی کمپنی اور ایک قوم کی بھلائی کی ذمہ دار حکومت کے مفادات میں واضح تضاد پایا جاتا تھا۔ ۱۸۵۷ میں جب حکومت کا اختیار شاہی تاج کے ہاتھوں منتقل ہو گیا تو یہ عملی دشواری ختم ہو گئی۔ اس تبادلہ سے بہرحال حکومت ہند کی صنعتی یا تجارتی پالیسی میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ ۱۸۵۷ء کے بہت قبل برطانیہ کا پرائیویٹ سرمایہ ہندوستان کے جدید کاروبار میں لگ گیا تھا۔ ۱۸۵۷ کے بعد پارلیمانی مداخلت کے ذریعہ ہندوستان اور ہندوستان سے باہر برطانیہ کا اقتصادی مفاد حکومت ہند کی پالیسی پر غالب رہا کیا۔ اس کا پورا پتہ مالیاتی یا محصولی پالیسی یا تجارت وصنعت کی پالیسی سے چلتا تھا۔ پھر بھی تاج شاہی کے ہاتھوں میں اختیارات کے آجانے سے ہندوستان میں برطانوی حکومت رفتہ رفتہ ہندوستان کے مطالبات سے اس حد تک آشنا ہونے لگی جہاں تک برطانوی مفادات محفوظ رہتے تھے۔ وقتی علاقائی قحط سے نپٹنے کے لئے پالیسی کے ذریعہ اقدامات کا آغاز کیا گیا۔ اس میں مداخلت کاری اور سرپرستی کے عناصر کارفرما تھے۔ تعمیرات عامہ کی پالیسی پہلے بیرونی تجارت اور دفاع کے مقاصد کے لئے سڑک اور پل کی تعمیر تک محدود تھی لیکن اب یہ آبپاشی کی بڑی اسکیموں میں بھی داخل ہو گئی اور یہ اس کی

دوسری مثال ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز تک حکومت ہند کا ایجنڈا زیادہ وسیع پیمانہ پر سوچا گیا، اوراس میں زراعت سے لے کر علم آثار قدیمہ تک شامل کر لیا گیا۔ پھر بھی فعال صنعتی پالیسی پر ویٹو کا استعمال ہوتا رہا۔ انتظامیہ میں سخت ارتکاز قائم رہا اور منصوبہ بندی اور انتظامی امور پر دفترشاہی کا سخت غلبہ رہا اس لئے پالیسی اور اقدامات ایسے تھے کہ سرکاری ایجنسی کے ذریعہ ملک کے بڑے حصوں میں وہ بیک وقت بروئے کار لائے گئے۔ ان کے اختیار کئے جانے اور مؤثر ہونے کی حد بہرحال محدود رہی۔

سیاسی اور انتظامی نظام میں کچھ تبدیلی کے باعث ہندوستان کا مخصوص نقطہ نظر ۱۹۱۹ء کے بعد اپنا کچھ اثر ظاہر کرنے لگا۔ بعض مثبت پالیسیاں خصوصاً محصولی تحفظ کی پالیسی اختیار کی گئی لیکن ان کا انتظام بہرحال معنوی اعتبار سے منفی رہا۔ دوعملی (Dyarchy) کے ماتحت عوامی وزارتیں شاذونادر ہی اتنی طاقتور اور مستحکم ہوتی تھیں کہ وہ تعمیر نو اور ترقیات کے سلسلہ میں حوصلہ مند پالیسی اختیار کریں اور انتظامی سلسلہ سے عائد ہونے والی دوسری بندشوں سے کسی صوبہ میں باضابطہ پالیسی کا ابھرنا ناممکن ہو گیا تھا۔ ۱۹۳۷ء میں عوامی وزارتوں کے آنے سے ہی نئے انقلابی خیالات کے تجربات شروع ہوئے۔ وزارتوں کی زندگی بہرحال بہت تھوڑی ثابت ہوئی۔ اس طرح گرچہ جنگ کے درمیانی دور سے مستقبل کی تبدیلیوں کی سمت کے کئی نشانات ملتے تھے پھر بھی ہندوستان اس دور میں بنیادی طور پر برطانوی مفاد کے ماتحت اور اسی سے متعین ہونے والی معیشت بنا رہا۔

ترقی اردو بورڈ کی چند اہم مطبوعات

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱۔	اُجرتیں	مورس ڈاب	10/50 روپے
۲۔	رنجیت سنگھ	نریندر کرشن سنہا	9/25 روپے
۳۔	آریہ سماج کی تاریخ	لالہ لاجپت رائے	10/50 روپے
۴۔	یورپ کے عظیم سیاسی مفکرین	محمد ہاشم قدوائی	15/50 روپے
۵۔	مغلوں کا نظام مال گزاری	نعمان احمد صدیقی	9/00 روپے
۶۔	ہند آریائی اور ہندی	سنیتی کمار چیٹرجی	13/50 روپے
۷۔	انسانی ارتقا	ایم۔ آر۔ ساہنی	13/75 روپے
۸۔	معاشیات کے بنیادی اُصول	سراج الحسن	12/25 روپے
۹۔	مفتاح التقویم	حبیب الرحمان خاں صابری	28/00 روپے
۱۰۔	انیس کے مرثیے	(مرتبہ) صالحہ عابد حسین	20/00 روپے
۱۱۔	کھاتہ نویسی اور کھاتہ داری	کیو۔ ایچ۔ فاروقی	12/00 روپے
۱۲۔	ہندوستانی خارجہ پالیسی کی بنیادیں	بمل پرساد	12/25 روپے
۱۳۔	زبان اور قواعد	رشید حسن خان	17/00 روپے
۱۴۔	فن طباعت	بلجیت سنگھ مطیر	7/25 روپے
۱۵۔	ظہیر الدین محمد بابر	ایل۔ ایف ولیمز رش بروک	13/25 روپے
۱۶۔	فرہنگ آصفیہ (مکمل سٹ)		150/00 روپے
۱۷۔	ارضیات کے بنیادی تصورات	ڈی۔ اوبرو چیف	22/00 روپے
۱۸۔	تالستائے	محمد یٰسین	9/25 روپے
۱۹۔	پوشکن	ظ۔ انصاری	12/00 روپے
۲۰۔	تاریخ دستورِ انگلستان	سید علی محسن	6/00 روپے

ملنے کا پتہ:-

بیورو فار پروموشن آف اردو۔ ویسٹ بلاک 8

آر۔ کے۔ پورم ، نئی دہلی ـــــــ 110022